حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۂ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۷۷۷۷۶۲۰ ، ۷۷۷۰۰۹۴

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

النعم المرغوبۃ

(فی)

النعم المرکوبۃ

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

(اس وعظ کے متعلق ضروری تمہید)

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست　آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

:(یعنی):

افتتاح اسٹیشن تھانہ بھون ٹاؤن

ناظرین میں سے جن حضرات کو کبھی تھانہ بھون آنیکا اتفاق ہوا ہوگا انکو معلوم ہوگا کہ تھانہ بھون کا ریلوے اسٹیشن آبادی سے قریب دو میل کے فاصلہ پر واقع تھا اس لئے حضرت حکیم الامت دام مجدہم السامی کو جیسے تھانہ بھون کے قریب ریل کے جاری ہونیکی خوشی تھی کہ اس سے احباب کو آنے جانے میں سہولت ہوگئی ساتھ ہی یہ بھی تمنا تھی کہ اسٹیشن آبادی سے متصل بن جائے تو زیادہ سہولت و راحت ہو جائے کیونکہ رات کے وقت اور برسات کے موسم میں سفر کرنیکے لئے تو اسٹیشن کا دور ہونا بہت ہی گراں گذرتا تھا۔ الحمد للہ کہ حضرت اقدس کی یہ تمنائے دیرین پوری ہوگئی کہ حکام ریلوے نے اس تکلیف کا احساس کرکے ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو تھانہ بھون کی آبادی سے متصل عیدگاہ کے پاس جو آبادی سے پانچ منٹ کی مسافت ہے ایک دوسرا اسٹیشن عارضی طور پر بنام تھانہ بھون ٹاؤن کھولدیا اور یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر امتحان میں یہ اسٹیشن کامیاب ہوگیا تو ہم جلد اس کو مستقل کر دینگے۔ یہ وعظ اسی جدید اسٹیشن کے افتتاح کی خوشی میں ہوا ہے تاکہ اس نعمت کا شکر ادا کیا جائے۔

پس جن صاحبوں کو حضرت حکیم الامت دام مجدہم سے قلبی تعلق ہے اُن کو چاہیئے کہ وہ بھی اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ حضرت مولانا کی تمنا کو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا۔ اور اس کی ساتھ عملاً بھی اس اسٹیشن کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں جسکی صورت یہ ہے کہ جو صاحب تھانہ بھون کا قصد کریں وہ سہارنپور و شاہدرہ وغیرہ میں جب تھانہ بھون کا ٹکٹ لیں تو **تھانہ بھون ٹاؤن** کے نام سے ٹکٹ لیں اور اسٹیشن پر اُتریں صرف **تھانہ بھون** کا ٹکٹ نہ لیں کیونکہ یہ نام قدیم اسٹیشن کا ہے جدید اسٹیشن کا نام تھانہ بھون ٹاؤن ہے فقط

ظفر احمد عفا اللہ عنہ (جامع وعظ ہذا)

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم ۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم ۰ وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس ان ربکم لرؤف رحیم ۰ والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ۰ ویخلق ما لا تعلمون ۰

یہ سورۂ نحل کی آیات ہیں جنمیں حق تعالیٰ نے خاص انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔ ہرچند کہ حق تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا شمار بھی نہیں ہو سکتا چنانچہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے ارشاد فرمایا ہے وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے) مگر اس کثرت و تعدد کی ساتھ وہ دو قسم پر منقسم ہیں۔ ایک قسم تو وہ نعمتیں ہیں جنسے ملابست زیادہ ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن سے ملابست زیادہ نہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ جن نعمتوں کے ساتھ تلبس زیادہ رہتا ہے ان کی طرف تو کچھ توجہ ہوتی بھی ہے اور ان کا شکر بھی کر لیتے ہیں کبھی کبھی زبان سے بھی دل کی موافقت کے ساتھ یہ لفظ نکل جاتا ہے کہ اللہ تیرا شکر ہے اور جنکی ساتھ تلبس کم ہے انکی طرف التفات بھی کم ہے اور ان کا شکر بھی کم کیا جاتا ہے بلکہ غالب حالت یہ ہے کہ ان کا شکر نہیں کیا جاتا۔ ان نعمتوں میں سے جنکی ساتھ تلبس کم ہے اور اسی لئے انکی طرف التفات کم ہے مرکوبات بھی ہیں (یعنی سواری کی چیزیں) کیونکہ ظاہری نعمتیں چند ہیں ماکولات۔ مشروبات۔ ملبوسات۔ منکوحات۔ مسکونات۔ (معلومات ۲) اور مرکوبات میں نے قافیہ کے لئے مرکوبات کہہ دیا ہے ورنہ مستعمل مراکب ہے مجھے اسکی تحقیق نہیں کہ مرکوب کی جمع مرکوبات صحیح ہے یا نہیں تحقیق کر لیا جائے۔ ان میں سب سے زیادہ تلبس تو اول کی تین نعمتوں سے ہے یعنی ماکولات ومشروبات وملبوسات سے اسی لئے عام طور پر لوگ انہی کو نعمتوں میں شمار کرتے ہیں اور اسی پر شکر کرتے ہیں چنانچہ کھانا کھاکر پانی پی کر عام طور سے لوگ خدا کا شکر کرتے ہیں اور نیا کپڑا پہن کر بھی بعض لوگ شکر بجا لاتے ہیں (اور معلومات سے عوام کو تلبس کم ہے اہل علم کو زیادہ ہے مگر اسکی طرف ان میں سے التفات بہت کم لوگوں کو ہے ہاں جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو اکثر التفات ہوتا ہے اور اس پر بھی شکر ادا کرتے ہیں ۱۲) اسکے بعد تلبس زیادہ منکوحات ومسکونات سے ہے کیونکہ بیوی سے ہر روز تلبس ہوتا ہے اور

ہر نعمت کی دو قسم

گھر سے بھی گو دن میں تلبس کم ہو مگر رات میں ضرور ہوتا ہے اسی لئے حدیث میں جو آیا ہے کہ تین چیزوں میں نحوست ہے اور حضرت عائشہ رض کی روایت میں یہ ہے کہ اگر نحوست کسی چیز میں ہوتی تو ان تین میں ہوتی المرأة والدار والفرس یعنی عورت میں اور مکان میں اور گھوڑے میں ۔ یہ پہلی روایت کی تفسیر ہے تو اسکی وجہ یہی ہے کہ ان سے تلبس زیادہ ہے اور جس چیز سے زیادہ تلبس ہوتا ہے اس کے آثار پر نظر زیادہ ہوتی ہے اور اسکے عیوب سے تکلیف بھی زیادہ ہوتی ہے اور فرس ہر چند کہ مرکوبات سے ہے اور میں نے اوپر کہا تھا کہ مرکوبات سے تلبس کم ہے اور حدیث میں اسکو دار و مراۃ کی ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ساتھ بھی تلبس زیادہ ہے (بناءً علی الوجہ الذی ذکرناہ) سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ فرس کے ساتھ مالک فرس کو تلبس اختلاط زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اُس کو کھلاتا پلاتا ہے اُس کی خدمت کرتا ہے خصوصاً اہل عرب کو زیادہ اختلاط تھا ۔ وہ گھوڑوں سے بہت محبت کرتے تھے حتیٰ کہ اپنی اولاد کی طرح محبت سے اُن کو پالتے تھے اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ گھوڑوں کے انساب بھی محفوظ رکھتے تھے ۔ اسی لئے عرب کے اشعار میں آپ کو گھوڑوں کی بہت تعریف ملے گی حضرت حسان بن ثابت (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر خاص ہیں ۱۲) فرماتے ہیں عہ

تظل جیادنا متمطرات یلطمھن بالخمر النساء

(ہمارے گھوڑے فتح مکہ کے دن کیسے بعد دیگرے آگے بڑھتے ہونگے اور عورتیں اپنی اوڑھنیوں سے اُن کے منہ پر طمانچہ مارتی ہونگی) یا یہ مطلب ہے کہ ہماری عورتیں اپنی اوڑھنیوں سے اُن کے منہ صاف کرینگی ۔ یعنی جنگ میں جو غبار وغیرہ ان کے منہ پر لگ گیا ہوگا میدان جنگ سے واپسی پر اُس کو اپنے دوپٹوں سے دور کرینگی اختار المعنی الاول المولوی حبیب احمد فی ترجمۃ کلام الملوک والمختار عندی المعنی الثانی وھو الذی اختارہ صاحب مجمع البحار

عہ یعنی جب مردوں کو مقابلہ کی تاب نہ رہیگی تو عورتیں گھروں سے نکلکر مقابلہ کریں گی اور گھوڑوں کے منہ پر اوڑھنیاں ماریں گی ۔ قال ابن اسحٰق فبلغنی عن الزہری انہ قال لما رای رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم النساء یلطمن الخیل بالخمر تبسم الی ابی بکر الصدیق اھ ای وذکر قول حسان ہذا کذا فی السیرۃ لابن ہشام (صفحہ ۲۵۱ ج ۲) قلت وقد رائیت فی موضع ولا احضرہ الآن انہن کن نساء الانصار وہذا یناسب المعنی الذی ذکرتہ ثانیاً ای کن یمسحون وجوہ الخیل بخمرہن تصدیقاً بقول حسان شاعر الانصار ۱۲ ظفر

صحیح ۲۵۴ ای تمیحن النساء بہا و استعار لہ اللطم ای تنفضن ما علیہا بخمرھن لیز
لن الغبار لعزتہا عندھم اھ) پس اختلاط کے اعتبار سے تو گھوڑے کیساتھ تلبس زیادہ ہے مگر رکوب کے
اعتبار سے تلبس کم ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ مرکوبات اُن نعمتوں میں سے ہیں جنکی ساتھ تلبس کم ہی
یعنی رکوب کے اعتبار سے کم ہے۔ اسی لئے نکاح پر شکر کیا جاتا ہے گھر بنا کر شکر کیا جاتا ہے اور
سواری کا جانور خریدتے وقت تو شاید شکر کر لیا جاتا ہو مگر سواری کے وقت بہت کم شکر
کرتے ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ نعمت مرکوب کی طرف التفات کم ہے اس لئے میں اس وقت
اس نعمت کا بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس پر توجہ و التفات زیادہ ہو اور اس کا بھی شکر ادا کیا
جائے اور اسوقت یہ مضمون جو اختیار کیا گیا ہے حالانکہ پہلے سے بیان کا خیال نہ تھا اس کی وجہ یہ ہی
کہ بعض صاحبوں نے درخواست کی ہے اور یہ درخواست ایسے وقت کی ہے جبکہ ایک خاص نعمت ہمکو عطا ہوئی
ہے کہ ایک خاص مرکوب میں ہمکو سہولت کا سامان عطا کیا گیا ہے اس وجہ سے یہ مضمون جو نعمت
مرکوبات کے متعلق ہے اختیار کیا گیا ہے۔ اب سمجھئے کہ ایک بڑی نعمت تو ان مرکوبات کے
متعلق یہ ہے کہ وہ باوجود اتنی قوت کے ہمارے مطیع ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس مقام پر جتنے
مرکوبات کا ذکر فرمایا ہے وہ سب کے سب ہم سے زیادہ قوی ہیں۔ اور ہم شتر کی برابر تو کیا ہوتے شتر مرغ
بھی نہیں بلکہ اس سے بھی کمزور ہیں۔ شتر مرغ عجیب جانور ہے۔ صورت میں تو اونٹ کے مشابہ ہے
مگر اس کے دو بازو بھی ہیں جیسے پرندے کے ہوتے ہیں مگر ان سے وہ اُڑ نہیں سکتا ہاں بھاگتا خوب ہے
اب نہ وہ بوجھ لادنے کے قابل ہے کیونکہ پرندوں میں شمار کیا جاتا ہے نہ پرندوں ہی میں داخل ہے۔
کیونکہ نام کے ساتھ شتر بھی لگا ہوا ہے فرید عطار فرماتے ہیں کہ نفس کی حالت بھی بالکل شتر مرغ
جیسی ہے۔ صوفیہ ہر جگہ سے سبق لے لیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

چوں شتر مرغ شناس ایں نفس را ‏ نے کشد بار و نہ پرد بر ہوا
گر بپرگویش گوید اشترم ‏ ور نہی بارش بگوید طائرم

اگر اس پر بوجھ لادو تو کہتا ہے کہ میں تو پرندہ ہوں اور جو اُڑنے کو کہو تو کہتا ہے میں تو شتر ہوں
کہیں اونٹ بھی اُڑا ہے۔ غرض نفس سے جو کام بھی لو تو وہ بہانہ ڈھونڈھتا ہے جیسے ہندوستان
کے سود خوار کہ اگر ان سے یہ کہو کہ سود حرام ہے اس سے توبہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ دار الحرب

دو انعام کا مضمون

۶

مرکوبات ایک نعمت یہ ہے کہ باوجود قوی ہونے کے انسان کے تابع ہیں

نفس کی حالت شتر مرغ جیسی ہے

ہندوستان کے سود خوار بھی شتر مرغ جیسے ہیں

میں سود لینا جائز ہے بعض علماء کا اس پر فتوی ہے اس لئے ہم لیتے ہیں اور اگر کہو کہ اسکی زکوٰۃ کیوں
نہیں دیتے تو کہتے ہیں کہ مال حرام میں بھی کہیں زکوٰۃ فرض ہے۔ اب دینے کے وقت وہ سود ہوگیا
اور حرام۔ اور لینے کے وقت حلال تھا۔ بہرحال شتر مرغ تو کمزور جانور ہے گو نام میں شتر ہے مگر وہ بار
برداری کے قابل نہیں۔ لیکن اونٹ گھوڑا بیل۔ بھینسا۔ خچر وغیرہ اس قدر قوی ہیں کہ اگر ان میں سے
کوئی آدمی کے اوپر پیر رکھدے تو اس سے اُٹھا بھی نہ جائے مگر خدا تعالیٰ کی کیسی نعمت ہے کہ
ایسے قوی جانوروں کو ایک ذرا سا لونڈا لکڑی لئے ہوئے ہانکتا ہے اور سب کان دبائے
اُسکے آگے آگے ہو لیتے ہیں کیا غضب کی تسخیر ہے۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ سوار ہوتے ہوئے
اس نعمت کو یاد کرو اور اس کا شکر کرو۔ وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین ۹
اور یوں کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اسکو ہمارا تابع کردیا حالانکہ ہم قوت وطاقت سے
خود اسکو قابو میں نہ کرسکتے تھے۔ یہاں تسخیر کے یہ معنی ہیں کہ اُنکو تمھارے تابع کردیا۔ اور کسی جگہ
تسخیر کے معنی کام میں لگا دینا بھی ہے جیسا کہ الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموات والارض
اور وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم الیل والنہار کیونکہ ظاہر ہے کہ سموات و
ارض کی تمام اشیاء ہمارے تابع نہیں۔ نہ شمس و قمر نہ لیل و نہار بلکہ یہاں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ
تمام عالم کو تمھارے کام میں لگا دیا گیا ہے۔ بہرحال جن جانوروں کو ہم اپنا تابع دیکھتے ہیں یہ
تسخیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ورنہ اگر کسی وقت اللہ تعالیٰ جانور کو مست کردیں اور وہ سرکشی پر
آجائے تو انسان کی کچھ حقیقت نہیں کہ قوت سے اس کا مقابلہ کرسکے بلکہ اگر مقابلہ کریگا تو خارجی اسباب
سے کریگا جیسے بندوق وغیرہ۔ مگر جانور کے پاس گھر کے آلات موجود ہیں جیسے سینگ وغیرہ
اسکو خارجی اسباب کی ضرورت نہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سوار ہوتے ہوئے
اس نعمت تسخیر کو یاد کرکے خدا تعالیٰ کی حمد کرو اسکے بعد یہ بھی یاد کرو وانا الی ربنا لمنقلبون
کہ ہم اپنے پروردگار کے پاس جانے والے ہیں اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ نعمت معاش کو

عہ اس موقع پر حافظ محمد حسن علی خانصاحب بہیں گڑھی پختہ گڑھی سے آگئے تو حضرت مولانا نے انکو دیکھکر فرمایا کہ آپ نے بڑی
ہمت کی کیونکہ وہ صبح کی نماز سے پہلے گھوڑی پہ سوار ہوکر وعظ کی خبر سنکر آئے تھے اور جلدی ہی آگئے حضرت مولانا نے
گذشتہ تقریر کا خلاصہ انکی خاطر سے دوبارہ بیان فرمایا اور فرمایا کہ بیان ابھی شروع ہوا ہے زیادہ نہیں ہوا۔ ۱۲ جامع

یاد کر کے معاد کو بھی یاد کرو تو مشہور ربط ہے۔ اور بعض اہل لطائف نے کہا ہے کہ اس کا ربط یہ
ہے کہ اس سواری سے دوسری سواری کو یاد کرو یعنی جنازہ کو. جسکے متعلق کسی نے کہا ہے ؎

اگر خزانہ و لشکر ہزار ہووے گا — دھر لینگے تجھکو جنازہ پر تخت شاہی سے

عوام تو اس ربط سے خوش ہوئے ہونگے کیونکہ چٹ پٹا مضمون ہے مگر اہل علم جانتے ہیں کہ
پختہ بات کون سی ہے (اور ایک ربط یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انا الی ربنا لمنقلبون میں اس امر
کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تسخیر حیوانات من جانب اللہ ہے کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آنیوالا
ہے کہ خود دوسروں کے ہاتھوں میں مردہ بدست زندہ ہو گے پس اس حالت کو یاد کر کے سمجھ لو کہ
اس حیات چند روزہ میں جو تم حیوانات کو اپنا مسخر دیکھتے ہو یہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو
تم خود تو اپنے وجود اور ذات پر بھی قابض نہیں ہو دوسروں پر تو کیا قابض ہوتے ۱۲ جامع)

ذکر نعمت کی جامع اقرار بالقلب و باللسان تعلیم کرنی ...

اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کی تعلیم فرمائی ہے ایک وتذکروا نعمۃ ربکم
دوسرے وتقولوا سبحان الذی سخر لنا ھذا یعنی اس نعمت کو دل سے بھی یاد کرو اور زبان سے
بھی اس کا اقرار کرو پس ہر چند کہ دل سے استحضار بھی کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے اسکی قولاً بھی
تعلیم فرمایا ہے تاکہ اس سے استحضار بالقلب آسان ہو جائے کیونکہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ زبان
سے ذکر کرنے میں قلب آسانی کے ساتھ ذاکر ہو جاتا ہے اسی واسطے فقہاء نے نیت صلوٰۃ بالقول
کو مندوب فرمایا ہے جس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بدعت انہوں نے کہاں سے نکالی.

نیت صلوٰۃ باللسان کا افضل ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیت باللسان کا کہیں ثبوت نہیں. مگر میں کہتا ہوں کہ اگر عملاً
ثبوت نہیں تو قولاً ثبوت موجود ہے اور قول بھی حق تعالیٰ کا دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس آیت
میں ذکر بالقلب و ذکر باللسان کو جمع فرمایا ہے پس جو حکمت یہاں ذکرین کے جمع کرنے میں ہے
اسی حکمت کی وجہ سے اگر فقہاء نیت صلوٰۃ میں جمع ذکرین کو افضل فرمائیں تو کون سا جرم ہے پھر
میرے پاس اسکی نظیر سنت سے بھی موجود ہے یعنی تلبیہ جس میں ذکر باللسان فضل ہے بلکہ شرط احرام
ہے محض نیت سے احرام منعقد نہیں ہوتا جب تک تلبیہ نہ کہے (پھر تلبیہ میں رفع صوت بھی مسنون ہے
جیسا کہ حدیث میں ہے العج والثج اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تلبیہ بالقلب کافی تھا۔
زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے تو یہی جواب دیا جائیگا کہ ذکر باللسان کو ذکر بالقلب کی

تفسیر میں دخل ہے پس یہی حکمت یہاں بھی موجود ہے ۱۲) یہ تو درمیان میں ایک علمی لطیفہ تھا۔
میں یہ کہہ رہا تھا کہ مرکوبات میں ایک نعمت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے قوی مخلوقات
کو انسان کا تابع کر دیا ہے اور یہ نعمت ہم کو بلا کسب و اکتساب کے حاصل ہے انہیں حق تعالیٰ
کا انعام پوری طرح ہر شخص کو محسوس ہو سکتا ہے۔ اور جو نعمت انسان کو کسب و اکتساب سے
حاصل ہوتی ہے اس میں تو وہ کبھی دعویٰ بھی کرنے لگتا ہے جیسے قارون نے کہا تھا انما اوتیتہ
علی علم عندی جب اس کو لوگوں نے نصیحت کی کہ جیسے خدا تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے
تو دوسروں پر احسان کر تو کہنے لگا کہ یہ مال تو مجھے ایک علم کی بدولت حاصل ہوا ہے جو میرے
پاس ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کو کیمیا آتی تھی لیکن تفسیر اس پر موقوف
نہیں۔ میرے نزدیک علم سے مراد سلیقہ اور لیاقت ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی
ذاتی لیاقت اور سلیقہ سے یہ مال حاصل کیا ہے (نعوذ باللہ) خدا کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ خیر
قارون کم بخت کا یہ اعتقاد ہوگا مسلمانوں کا خدا نہ کرے یہ اعتقاد کیوں ہونے لگا وہ تو ہر نعمت
کو عطائے حق سمجھتے ہیں۔ خواہ سبب سے ہو یا بلا سبب کے، اور کسب سے حاصل ہو یا بلا کسب کے مگر یہ
ضرور ہے کہ جو نعمت بلا سبب ظاہری اور بدون کسب کے حاصل ہو اس نعمت کا اثر زیادہ ہوتا ہے جیسے کوئی
ہمیں بہت سا روپیہ ہدیہ میں دے جائے اور جو روپیہ تجارت اور ملازمت یا مزدوری سے
حاصل ہو اس کے نعمت ہونے کی طرف التفات کم ہوتا ہے گو اعتقاد قارون جیسا نہ ہو مگر
حالت ایسی ہے جس سے دیکھنے والے کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس کو نعمت نہیں سمجھتے بلکہ
اپنے علم و ہنر کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص گھوڑا خریدنے جا رہا تھا۔
راستہ میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ کہا بازار
جا رہا ہوں، گھوڑا خریدوں گا۔ دوست نے کہا کہ انشاء اللہ بھی کہہ لو۔ بولا اس میں انشاء اللہ
کی کیا بات ہے؟ گھوڑا بازار میں ہے۔ روپے میری جیب میں ہیں اب جا کر خرید لونگا۔ بس روپیہ
پاس ہونے سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ سب کام اس کے قبضہ میں ہے۔ مگر کبھی اللہ تعالیٰ اس کا
عجز ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی رحمت ہے اگر انسان پر ابتلاء واقع نہ ہو تو استدراج میں تو
یہ تباہ ہو جائے بس مصائب و بلاؤں میں بھی حکمتیں ہیں۔ بڑی حکمت تو یہی ہے کہ اس سے

انسان کو اپنی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے اپنا عجز مشاہد ہوجاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

گر خدا خواہد نہ گفتند از بطر　　پس خدا بنمود شان عجز بشر

مولانا نے کنیزک کے قصہ میں فرمایا ہے کہ بادشاہ نے اُس کے معالجہ کے لئے بڑے بڑے اطبار کو جمع کیا جن کو اپنے علم و فن پہ ناز تھا مگر حق تعالیٰ نے اُن کو اُن کا عاجز ہونا دکھلا دیا جو دواء وہ استعمال کراتے اُس سے اُلٹا اثر ہوتا تھا ؎

از قضا سرکنگبیں صفرا فزود　　روغنِ بادام خشکی می نمود

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت　　آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

پس دراصل ہر زخم کا مرہم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے ان کے سوا کسی کے قبضہ میں شفا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسی طرح امراض باطنہ کا علاج بھی حق تعالیٰ ہی فرماتے ہیں عارفین کو تو اس کا شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے اور غیر عارفین کو بھی کبھی حق تعالیٰ اپنی قدرت دکھلاتے رہتے ہیں مگر ان کو عارفین کی برابر مشاہدہ اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ غور نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں رہتے اور عارفین اللہ تعالیٰ کے معاملات کو جو اُن کے ساتھ ہو رہے ہیں غور سے دیکھتے رہتے ہیں اس لئے ان کو خوب مشاہدہ ہوتا ہے کہ فلاں مصیبت سے ہمارے فلاں مرض کا علاج کیا گیا ہے۔ اور فلاں تکلیف ہماری فلاں خطا کا بدلہ ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جب مجھ سے حق تعالیٰ کی کوئی نافرمانی ہوجاتی ہے تو میں اُس کا اثر اپنے گھر والوں میں اور سواری کے جانور میں مشاہدہ کرتا ہوں کہ اُس دن یہ سب کے سب مجھ سے نافرمان ہوجاتے ہیں۔ گھر والے بات کا جواب نہیں دیتے اور میرا مقابلہ کرتے ہیں۔ گھوڑا پوری طرح سواری نہیں دیتا شرارت کرنے لگتا ہے۔ یہ واقعات کم و بیش سب کو پیش آتے ہیں مگر عام لوگ اس کو اتفاقیات پر محمول کرتے ہیں یا گھر والوں کی بدخلقی پر اور گھوڑے کے عیب پر کیونکہ اُن کو نہ اپنے افعال پر نظر ہے نہ اُن کے نتائج پر توجہ ہے۔ مگر بعض دفعہ حق تعالیٰ ایسی دست بدست سزا دیتے ہیں جس سے ہر شخص کو محسوس ہوجاتا ہے کہ یہ میرے اس فعل کی سزا ہے اور اسی کو میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ کی اس میں بڑی رحمت ہے۔ اگر کبھی کبھی ایسا نہ ہوا کرے تو انسان کی آنکھیں ہی نہ کھلیں چنانچہ وہ گھوڑا خریدنے والا یہ کہکر کہ

ف ۱۰ عارفین کو بلا و مصیبت کی حکمت کا شب و روز مشاہدہ ہوتا رہتا ہے

انشاء اللہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بازار میں پہنچا تو کسی جیب کٹ نے جیب میں سے روپئے نکال لئے۔ گھوڑے کا سودا کر کے جو اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں میدان صاف تھا شرمندہ ہو کر ناکام واپس ہوا۔ اتفاق سے وہ دوست پھر ملا اور کہا کیا حال ہے؟ کہنے لگا ہم بازار گئے تھے انشاء اللہ گھوڑا خریدنے کا قصد تھا انشاء اللہ جیب کٹ نے جیب میں سے روپے نکال لئے۔ انشاء اللہ اب خالی ہاتھ گھر جا رہا ہوں انشاء اللہ۔ ایسا سبق ملا کہ اب موقع بے موقع بھی انشاء اللہ کا ورد ہو گیا

غرض انسان کی یہ عادت ہے کہ جو چیز بلا سبب و بلا کسب کے اسکو حاصل ہو اسکو تو نعمت سمجھتا ہے اور جس کے اسباب اس کے قبضہ میں ہوں اور اُسکے کسب کو اُس میں دخل ہو اسکو نعمت نہیں سمجھتا اور اگر اعتقاداً سمجھے بھی تو شان نعمت کا زیادہ اثر اسکے اوپر ظاہر نہیں ہوتا۔ اس لئے ایسی نعمتوں کے نعمت ہونے پر متوجہ کرنے کے لئے حق تعالیٰ مرکوب کی نعمت کو بیان فرماتے ہیں اور اس میں بھی یہاں رکوب کو نہیں بیان فرمایا کیونکہ رکوب سے جو نفع حاصل ہوتا ہے یعنی طی طریق اسکو بعض لوگ پیادہ چلکر بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسی بات بیان فرمائی ہے جو کھلی نعمت ہے جو ظاہراً انسان کی قدرت سے باہر ہے یعنی وتحمل اثقالکم الیٰ بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس کہ مراکب تمہارے بوجھ لاد کر ایسے مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں تم اس بوجھ کو تو کیا پہنچاتے خود بھی نہ پہنچ سکتے تھے مگر سخت مشقت اور مصیبت کے ساتھ۔ یا یہ ترجمہ ہو کہ مع بوجھ کے اس جگہ نہ پہنچ سکتے تھے مگر مشقت کی ساتھ۔ سواری کی چیزوں میں یہ نعمت کھلی نعمت ہے۔ اس میں کسی کو یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ ہم کو سواری کی ضرورت نہیں بلکہ سب اپنے کو اس کام میں سواری کا محتاج سمجھتے ہیں۔ مگر سبحان اللہ۔ حق تعالیٰ کا کلام کیسا اچھا ملا ہے کہ اس نعمت میں بھی صرف یہ نہیں فرمایا لم تکونوا بالغیہ بلکہ اس کی ساتھ الا بشق الانفس بھی بڑھا دیا کہ ہاں سخت مصیبت کیساتھ پہنچنا پہنچانا ممکن تھا۔ اس میں ہم کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم کی گئی ہے کہ بات ایسی کہو جو ہر حال میں صحیح ہو۔ کوئی اس پر نقض وارد نہ کر سکے۔ پس ہر چند کہ یہاں بظاہر یہ دعویٰ بالکل تام ہے کہ تم بوجھ لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں بدون سواری کے نہیں پہنچ سکتے تھے مگر کوئی معقولی اُسپر یہ کہہ سکتا تھا

کہ ایک صورت سے پہنچ سکتے ہیں وہ یہ کہ سارا سامان ایک دم سے نہ اٹھایا جاتا بلکہ اس کے مختلف عدد بنا کر ایک عدد کو تھوڑی دور پر رکھدیں پھر دوسرے کو لیجائیں پھر تیسرے کو۔ اس طرح ایک ایک کرکے سب کو ایک جگہ پہنچادیں پھر وہاں سے ایک ایک کرکے سب کو قریب کی دوسری جگہ پہنچا دیں تو اس طرح بدون سواری کے بوجھ کو لیجا سکتے ہیں اور یہ احتمال عقلی ایک معقولی مولوی صاحب نے ہم کو بتلایا۔ انہوں نے اس عقلی احتمال کو واقع کرکے دکھلا دیا۔ ہمارے ایک دوست میرٹھ یا کیرانوی وہ شاملی کے اسٹیشن پر بہت سا بوجھ لیکر اترے اور قلیوں سے کہا کہ اس کو باہر ٹمٹم کے پاس پہنچادو اور مزدوری طے کرلو۔ قلیوں نے بہت مزدوری مانگی آپنے انکار کردیا اور کہا ہم خود لیجائیں گے قلی ہنسنے لگے کہ یہ اکیلا آدمی اتنا سامان کیونکر لیجائیگا۔ مگر انہوں نے قلیوں کو نیچا دکھا دیا۔ آپنے یہی کیا کہ سارے سامان کو جو ایک دو عدد کی صورت میں تھا کھولا اور اس کے متفرق عدد ہلکے ہلکے بنائے۔ پھر قلیوں کے سامنے ہی ایک عدد کو اٹھا کر دور رکھ آئے مگر اتنی دور کہ سامان بھی زیر نظر رہے پھر دوسرا عدد اٹھا کر لے گئے پھر تیسرا۔ یہ حکمت دیکھکر قلی ڈھیلے ہوگئے اور سمجھ گئے کہ یہ تنہا سارے سامان کو باہر لیجا سکتے ہیں تو اب وہ خود ہی تھوڑی مزدوری پر راضی ہو گئے۔ واقعی یہ صورت ہمارے ذہن میں تو نہ آتی۔ مگر وہ معقولی آدمی تھے۔ انہوں نے یہاں بھی معقول سے کام لیا تو اگر آیت میں الا بشق الانفس نہ ہوتا تو کوئی معقول یہ احتمال نکالکر آیت پر اعتراض کرسکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے یہ جملہ بڑھا کر کلام کو مضبوط کردیا کہ اگر پہنچاتے بھی تو بڑی مصیبت سے پہنچاتے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مصیبت بہت ہے (دن بھر میں اس طرح دو تین کوس بھی طے نہیں ہوسکتے۔ بڑی منزل تو کسی طرح طے ہی نہیں ہوسکتی) اور گو یہ احتمال بہت بعید ہے کہ اس صورت سے کوئی شخص بوجھ کو پہنچا سکے۔ مگر حق تعالیٰ نے اس بعید احتمال کا بھی لحاظ فرمایا جس میں ہم کو تعلیم ہے کہ کلام میں بہت احتیاط کرنا چاہیئے۔ دیکھو ہماری کیسی شان ہے کہ لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون۔ ہم سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا مگر پھر بھی ہم اپنے کلام میں کس قدر احتیاط کرتے ہیں پس تم کو بھی احتیاط فی الکلام کا عادی ہونا چاہیئے۔ قرآن میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر کا قصہ مذکور ہے اسکی بنا بھی اسی مسئلہ کی تعلیم پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام میں ایک بے احتیاطی ہوگئی تھی کہ وعظ میں کسی نے آپ سے سوال کیا ای الناس اعلم کہ اسوقت

سوال ایک معقولی مولوی کی ایک حکایت

۱۳

احتیاط فی الکلام حضرت موسیٰ و خضر کا واقعہ بھی

آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اطلاق کیساتھ جواب دیا أنا
کہ میں سب سے زیادہ عالم ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ علوم شرائع اور علوم نبوت میں سب سے بڑا عالم میں
ہوں اور اسی مراد کے اعتبار سے کلام صحیح تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انبیاء اولوالعزم
سے ہیں ہزاروں انبیاء ان کی شریعت کے متبع ہوئے ہیں اور خود اُن کے زمانہ میں بھی حضرت
ہارون علیہ السلام نبی تھے مگر وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے اور موسیٰ علیہ السلام کسی نبی
کے تابع نہیں بلکہ مستقل صاحب شریعت تھے۔ پس علوم شرائع و نبوت میں اُس وقت اُن سے
زیادہ عالم کوئی نہ تھا مگر آپ نے جواب میں لفظاً یہ قید بیان نہ فرمائی تھی بلکہ اطلاق کیساتھ جواب دیا
اس پر عتاب ہوا اور وحی نازل ہوئی بلی عبدنا خضر ھو اعلم منک کہ کوئی آپ سے زیادہ عالم
کیوں نہیں۔ ہمارا بندہ خضر آپ سے زیادہ عالم ہے یعنی بعض علوم میں وہ زیادہ عالم ہیں گو وہ
علوم شرائع اور علوم نبوت سے افضل نہ ہوں مگر آپ کے اطلاق کلام پر تو علم خضر سے نقض وارد
ہو سکتا ہے کیونکہ علم میں تو وہ بھی داخل ہے۔ میں اس مقام پر علم موسیٰ اور علم خضر کا فرق تفصیل
کیساتھ بیان کرنا نہیں چاہتا کیونکہ دوسرے مقامات پر اس کا بیان مفصل ہو چکا ہے۔ مگر اجمالاً
اتنا کہے دیتا ہوں کہ خضر علیہ السلام کا علم کشف کونی تھا اور اس علم کو علم نبوت اور کشف
الٰہی سے جو کہ موسیٰ علیہ السلام کا علم تھا کوئی نسبت نہیں مگر فی نفسہ وہ بھی ایک علم ہے اور علم لدنی
ہے جس میں وہ موسیٰ علیہ السلام سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے محض تنبیہ قولی پر اکتفا
نہیں فرمایا بلکہ عملی اصلاح فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جاؤ خضر سے ملو اور اس کے علوم کو دیکھو۔
اسکو مشائخ صوفیہ سمجھتے ہیں علماء ظاہر عملی اصلاح کو کچھ نہیں جانتے (الا الاسم والرسم ۱۲)
علماء تو کسی کے اندر تکبر دیکھیں گے تو اُس کی اصلاح میں صرف تکبر کی مذمت اور وعیدیں بیان
کر دینگے اور بس۔ اور شیخ اس طرح اصلاح کرتا ہے کہ جاؤ فلاں مسافر کے پیر دباؤ جو خراب خستہ
حالت میں پڑا ہے جسکی رال بھی چل رہی ہے۔ اب مرید چونکہ شیخ کے سامنے چوں نہیں کر سکتا
اس لئے جھک مار کر جاتا ہے اور پیر دباتا ہے گو دل دل میں شیخ کو کوستا بھی ہو کہ بڑے متشدد
ہیں مگر ایسا کوسنا ہزار کوس بھاگ جاتا ہے وہ شیخ کو نہیں لگتا پھر اس غریب مسافر پر غصہ
آتا ہے کہ یہ کم بخت کہاں سے آمرا تھا جو میرے سپرد اسکی خدمت ہوئی۔ مگر یہ غصہ فضول ہے اگر

وہ نہ آتا تو شیخ کسی اور تدبیر سے علاج کرتا مثلاً نمازیوں کے جوتے سیدھے کراتا۔ شروع میں تو یہ علاج پہاڑ کی برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ گراں معلوم ہوتا ہے مگر چند روز میں نفس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ ایسے ایسے کام کرتے کرتے نفس کو تواضع کی عادت ہو جاتی ہے پھر نفس درست ہو جاتا ہے۔

عادت کے اوپر ایک اور حکایت یاد آئی مولوی صدیق احمد صاحب گنگوہی جو گڑھی میں بھی مدرس رہے ہیں اپنی حکایت بیان فرماتے تھے کہ جب میں نیا نیا دیوبند کے مدرسہ میں گیا تو ایک رئیس کے یہاں میرا کھانا مقرر ہوا۔ اس زمانہ میں دیوبند کے لوگ طلباء کی بہت عزت کرتے تھے اب کی خبر نہیں مگر جہاں تک میرا خیال ہے دیوبند کے لوگ اب بھی دوسری جگہ کے لوگوں سے زیادہ طلباء کی عزت کرتے ہیں۔ اور جو زمانہ ہم نے دیکھا ہے اسوقت تو بہت ہی عزت کرتے تھے کہ طلباء کو دیکھکر رؤسا اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور طلباء کو عزت کیساتھ بٹھلاتے تھے۔ اس زمانہ میں چونکہ عوام متواضع تھے اس لئے طلباء کو گھروں سے کھانا لانا معیوب نہ تھا اور شاید پہلے بزرگوں نے اسی واسطے طلباء کیلئے یہ صورت اختیار کی ہو تا کہ ان کا تکبر زائل ہو۔ مگر اب میری رائے نہیں ہے کہ طلباء گھروں پر کھانا لینے جائیں کیونکہ اب اہل دنیا طلباء کو ذلیل حقیر[ع] سمجھنے لگے۔ اگر طلباء ان کے گھروں پر روٹی کے واسطے جائیں گے تو وہ اور زیادہ ان کو ذلیل سمجھیں گے۔ ہاں مؤذن اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ اہل محلہ سے اپنا حق وصول کرتا ہے وہ ان کی مسجد کی خدمت کرتا ہے اور اپنی خدمت کا معاوضہ طلب کرتا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی درزی کسی رئیس کے یہاں اپنے پیسے مانگنے جائے اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ اور گو طلباء کا بھی حق مسلمانوں کے ذمہ ہے مگر لوگ عام طور پر اس حق کو اپنے اوپر نہیں سمجھتے اور جو شخص اپنے ذمہ حق نہ سمجھتا ہو اس سے جبراً حق وصول کرنا ذلت ہے ہم کو اس کی ضرورت نہیں۔ قیامت کے دن ان کو خود معلوم ہو جائیگا کہ انہوں نے دین اور اہل دین کی کس قدر

ع اور یہ تعلیم انگریزی کے شائع ہونیکا نتیجہ ہے کیونکہ علم دین کے حاصل کرنیوالوں کو ایسے ہی رؤسا حقیر سمجھتے ہیں جنھیں انگریزی تعلیم کا اثر آگیا ہے اور دین سے بے تعلقی ہوگئی ہے اور جو رؤسا اس اثر سے محفوظ ہیں وہ اب بھی طلباء و علماء کی عزت کرتے ہیں۔ واللہ المستعان ۱۲ ظ۔

ف: تواضع کی عادت سے تکبر زائل ہو جاتا ہے

ف: [illegible] ایک حکایت

۱۳

ف: آجکل طلبا کو گھروں سے کھانا لانا مناسب نہیں

ف: مؤذن اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے

حق تلفی کی ہے۔ تو مولوی صدیق احمد صاحب کہتے تھے کہ اول وقت جو میں روٹی لینے گھر پر گیا تو قدم نہ اٹھتا تھا پھر گھر پر پہنچ کر آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی کہ روٹی بھیج دو۔ شرم کے مارے دیوار سے لگ کر خاموش کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں صاحب خانہ جو ایک رئیس تھے خود ہی باہر آئے اور مجھے کھڑا دیکھا تو کہنے لگے کہ آپ کا ہی کھانا میرے غریب خانہ پر مقرر ہوا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ سنکر انہوں نے فوراً چارپائی منگائی اور مجھے عزت سے بٹھلایا اور پوچھا آپ کھانا یہاں ہی کھائیں گے یا مدرسہ لیجائیں گے۔ میں نے شرم کی وجہ سے کہا۔ یا کہ یہیں کھاؤں گا انہوں نے فوراً ملازم سے کہا کہ آپ کے ہاتھ دھلاؤ اور گھر میں سے کھانا لاکر آپ کو کھلا دو۔ جب کھانے سے فارغ ہوکر مدرسہ میں آیا تو ساتھیوں نے کہا کہ تم کھانا نہیں لائے؟ میں نے کہا کہ مجکو تو گھر تک جانا ہی محال تھا اور میں سب کے سامنے ہاتھ پر رکھکر روٹیاں یہاں تک بھی لاتا میں نے تو وہیں کھالیا۔ ساتھیوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہمارے اندر بعضے ایسے بھی ہیں جن کا کھانا کہیں مقرر نہیں۔ تو جن کا مقرر ہے وہ سب ملکر اُن کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں تو سب کا کام چل جاتا ہے شام سے تم کھانا یہیں لانا۔ میں نے کہا بہت اچھا لاؤنگا۔ کہتے تھے کہ شام کو جو میں کھانا لایا تو بار بار دل میں یہ آتا تھا کہ زمین پھٹ جائے تو میں اس میں سما جاؤں۔ مگر دو تین وقت لانے کے بعد پھر دل کھل گیا اور اب تو یہ حالت ہے کہ اگر تم کہو تو بھنگی کے گھر سے میں کھانا لے آؤں۔ سو واقعی چند روز تک ایسا کام کرنے سے جس میں نفس کی ذلت ہو نفس ذلت کا عادی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے مشائخ تکبر وغیرہ کی عملی اصلاح کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ عبد القدوس رح کے پوتے مولانا ابو سعید صاحب رح جب سلطان نظام الدین بلخی رح کے پاس دولت باطنیہ کی طلب میں پہنچے ہیں تو آپ نے سنا ہوگا کہ انہوں نے کیسی کیسی تکبر شکن خدمتیں اُن سے لی ہیں تاکہ امراض نفس کا عملی علاج ہو پھر جیسی اُن کی اصلاح ہوئی ہے سب کو معلوم ہے۔ غرض اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قولی اصلاح پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عملی اصلاح بھی فرمائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر کے پاس جانیکا حکم ہوا پھر حالانکہ حق تعالیٰ تمام جغرافیہ عالم سے موسیٰ علیہ السلام کو واقف فرما سکتے تھے۔ مگر موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر کا موقع و مکان تعیین کے ساتھ نہیں بتلایا بلکہ اجمالاً اتنا بتلایا کہ وہ مجمع البحرین پر

ملیں گے۔ اور حکم ہوا کہ ایک مچھلی تل کر ساتھ لے لو جب وہ زندہ ہو کر توشہ دان سے نکل بھاگے تو سمجھ لینا کہ خضر علیہ السلام اسی جگہ ہیں۔ اس اجمال کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام سالہا سال کے سفر کیلئے تیار ہو کر چلے کہ نہ معلوم کب اور کتنی مدت میں پہنچنا ہوگا چنانچہ نص میں ہے واذ قال موسیٰ لفتٰہ لا ابرح حتی ابلغ مجمع البحرین او امضی حقبا۔ اس اجمال میں بھی موسیٰ علیہ السلام کی اصلاح تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی طلب دیکھیے کہ سالہا سال تک چلنے پر مستعد ہو گئے۔ سبحان اللہ۔ پھر حق تعالیٰ کی امداد یہ ہوئی کہ مجمع البحرین تک جانے میں تو ان کو ذرا تکان نہیں ہوئی ہاں جب موقع سے تجاوز ہو گیا تو اب تکان محسوس ہوا (اللہ تعالیٰ طالبین کی اسی طرح امداد فرمایا کرتے ہیں کہ طریق کو ان کے لئے آسان کر دیتے ہیں ١٢) چنانچہ آپ نے خادم سے فرمایا کہ آج کے سفر سے تکان معلوم ہوا ہے لاؤ ناشتہ لاؤ۔ اس پر خادم نے عرض کیا کہ میں آپ سے کہنا بھول گیا۔ وہ مچھلی تو کل، وہی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم تو اسی کے منتظر تھے۔ واپس لوٹو منزل مقصود اسی جگہ ہے جہاں سے ہم آگے بڑھ گئے۔

پھر اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے درخواست کی ھل اتبعک علیٰ ان تعلمن مما علمت رشدا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ جو علم آپ کو حاصل ہے وہ آپ مجھے بھی سکھلا دیں۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تھے ان کو استیذان کی ضرورت نہ تھی مگر ادب یہی ہے کہ استاد سے اجازت لے اور اپنی طلب کو ظاہر کرے اور علماء تو صرف الفاظ ظاہرہ کے درپے ہوتے ہیں مگر صوفیہ نے اس سے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ چلنا ہو تو بلا اجازت اس کے ساتھ نہ چلے بلکہ اجازت لیکر ساتھ چلنا چاہیے کیونکہ ساتھ چلنے سے بعض دفعہ دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے اس کی آزادی میں خلل پڑتا ہے چنانچہ ایک دفعہ برسات کے زمانہ میں ایک مولوی صاحب رات کے وقت میرے ساتھ ہو لئے۔ میں نے ان کی وجہ سے اچھا راستہ ان کے لئے چھوڑ دیا اور خراب راستہ خود اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندھیرے میں ایک گڑھے کے اندر میرا پیر گرا جس سے تمام کپڑے خراب ہو گئے۔ اگر وہ میری ساتھ نہ ہوتے

عہ قلت وفیہ تنبیہ لسیدنا موسیٰ علیہ السلام عن نقصان علمہ حیث لم یشعر بتجاوزہ عن المقصود وفیہ کان تنبیہا ایضاً علی ان العلم الذی اوتیہ نفر من جنس ہذا العلم الذی لحقک النصب بعدہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ١٢ ظ

١٦- موسیٰ علیہ السلام کی شاگردی کی درخواست خضر سے

بدون اجازت کسی کے ساتھ نہ چلنا چاہیے

ساتھ چلنے میں دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے اس لئے اجازت

تو میں خراب راستہ کیوں اختیار کرتا۔ ایک دفعہ ایک وکیل صاحب ایک مجلس نکاح سے گھر تک میرے ساتھ ہولئے حالانکہ اس وقت آنت آتر جانے کے سبب تقاضے کے ساتھ گھر جارہا تھا انکی وجہ سے مجھے باتوں میں مشغول ہونا پڑا اور آہستہ آہستہ چلا۔ تنہا ہوتا تو تیزی کے ساتھ جاتا۔ مگر وہ ظالم گھر پر پہنچنے کے بعد بھی واپس نہ ہوئے بلکہ دروازے پر جم کر کھڑے ہو گئے اور باتوں کا سلسلہ قائم رکھا آخر مجبور ہو کر مجھے بے مروتی سے کہنا پڑا کہ اب مجھے جانے دیجئے مگر وہ پھر بھی نہ ٹلے تو میں منہ موڑ کر خود ہی چل دیا۔ آج کل لوگوں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ دوسرے کو ان کے فعل سے تکلیف ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے بھی اگر رات کو اُٹھتے تو اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ ان کی نیند خراب نہ ہو انکو تکلیف نہ ہو حالانکہ وہ محبوبہ ہونیکے ساتھ خود محب وجان نثار بھی تھیں اور ایسی جاں نثار تھیں کہ حضور کی شان میں فرماتی ہیں ؎

لواحی زلیخا لو رأین جبینہ   لآثرن بالقطع القلوب علی الیدٖ

زلیخا کو ملامت کرنے والیاں اگر حضور کا چہرۂ مبارک دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھ کاٹنے کے دل کے ٹکڑے کر ڈالتیں۔

ایشیائی مذاق کے اعتبار سے جو کہ عرب کا سادہ مذاق تھا یہ کلام غایت عشق کو ظاہر کر رہا ہے۔ اور زلیخا کے جس قصہ کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے اُس کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ جب زلیخا کا عشق مصر میں مشہور ہوا تو وہاں کی عورتوں نے اس کو ملامت کی کہ غلام پر فریفتہ ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام اس وقت غلاموں ہی کی طرح فروخت ہو کر اسکے ہاتھ میں آئے تھے یہ باتیں سُنکر زلیخا نے اُن کے اعتراض کا عملی جواب دینا چاہا زبان سے کچھ نہیں کہا۔ تدبیر یہ کی کہ اُن کو دعوت کے بہانہ سے اپنے گھر بلایا اور یوسف علیہ السلام کو پردہ میں کر دیا پھر سب عورتوں کے سامنے چاقو سے کاٹ کر کھانے کے پھل اور میوے رکھدیئے اور ہر ایک کے سامنے ایک ایک تیز چاقو رکھدیا۔ جب عورتوں نے چاقو ہاتھ میں لے لیا اور پھل تراشنے کا قصد کیا تو عین اس موقعہ پر زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو بُلایا کہ ذرا یہاں تو آؤ (وہ سمجھے کسی کام سے بلاتی ہوگی۔ چونکہ وہ ظاہر میں آقا تھی اس لئے خدمت کے ارادہ سے تشریف لے آئے ۱۲) اب جو وہ سامنے گئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ... حضرت عائشہ ... ۱۷

اور عورتوں کی نظر اُن کے حُسن و جمال پر پڑی تو سب کے ہوش اُڑ گئے۔ بدحواسی میں چاقو سے پھل کی جگہ اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔

اب تو زلیخا کو موقعہ ملا کہ کیوں تمہارے حواس کہاں گئے۔ ہوش تو ٹھکانے کر دیں تو ایک دن بھی ایسی بدحواس نہیں ہوئی سب نے شرمندہ ہو کر کہا۔ حاش للہ ماھذا بشرا ط ان ھذا الا ملک کریم۔ کہ بخدا یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ زلیخا نے کہا فذلکن الذی لمتننی فیہ کہ دیکھ لو یہی ہے جس کی محبت پر تم نے مجھے ملامت کی تھی اس قول کا ترجمہ کسی نے شعر میں خوب کیا ہے ؎

این ست کہ خون خوردہ و دل بردہ بسے را ۔۔۔ بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

تو حضرت عائشہؓ ان عورتوں کے بارہ میں فرماتی ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا جمال دیکھکر تو انہوں نے ہاتھ ہی کاٹے تھے اگر ہمارے حضور کا جمال جہاں آرا دیکھ لیتیں تو دل و جگر کے ٹکڑے کاٹ ڈالتیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ کو حضور سے کس درجہ کا عشق تھا تو کیا اُن کو حضور کے کسی فعل سے کلفت ہو سکتی تھی۔ ہرگز نہیں مگر باں ہمہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور آدھی رات کو اُٹھے فقام رویدا و انتعل رویدا و فتح الباب رویدا وخرج من الباب رویدا۔ آہستہ سے اُٹھے آہستہ سے نعلین پہنے آہستہ سے دروازہ کھولا آہستہ سے باہر نکلے۔ آپ نے اس قدر احتیاط کی مگر حضرت عائشہ کے تو دل کو آپ سے تعلق تھا۔ آپ کا جُدا ہونا تھا کہ دل پر اس کا اثر ہوا اور فوراً آنکھ کھل گئی۔ جب آپ کو بستر پر نہ پایا تو آپ کو وساوس عاشقانہ آنا شروع ہوئے ؎

عشق است و ہزار بدگمانی ۔۔۔ باسایہ ترا نمی پسندم

یہ خیال ہوا کہ شاید کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہیں اور جب عاشق کی یہ حالت ہے کہ باسایہ ترا نمی پسندم۔ تو باغیرہ ترا نمی پسندم تو بدرجۂ اولی ہوگا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ حضرت عائشہ سے رہا نہ گیا اور فوراً اوڑھنی اوڑھکر آپ کے نشانات قدم کو دیکھتی ہوئی پیچھے پیچھے چلیں۔ دیکھا کہ آپ بقیع الغرقد میں (جو مدینہ کا قبرستان ہے) مُردوں کیلئے دعا کر رہے ہیں

اس کے بعد کا قصہ سامعین کو غالباً معلوم ہوگا کیونکہ مواعظ میں بیان ہو چکا ہے۔

مقصود اس سے یہ تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کی راحت کا اس قدر اہتمام تھا مگر آج کل لوگوں کو اس کا مطلق اہتمام نہیں۔ اسی لئے بدون اجازت کسی کے ساتھ ہو لیتے ہیں خواہ اس پر گرانی ہی ہو۔ صوفیہ نے اس سے منع کیا ہے اور قصہ موسیٰ و خضر سے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ ساتھ چلنے کے لئے بھی اجازت لینا چاہیئے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خضر سے ساتھ رہنے کی اجازت لی۔ اس کے جواب میں خضر علیہ السلام نے استادانہ ناز سے کام لیا کہ تم میری ساتھ رہکر تحمل نہیں کر سکتے ممکن ہے اُن کو کشف سے معلوم ہو گیا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطا پر متنبہ کرنے کے لئے بھیجا ہے اس لئے ان کی ساتھ ناز استادانہ برتنا مناسب ہے کہ اس سے اصلاح کامل ہوگی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ستجدنی انشاء اللہ صابرا ولا اعصی لک امرا کہ نہیں انشاء اللہ آپ مجھے صابر و متحمل پائیں گے اور میں کوئی بات آپ کے خلاف نہ کرونگا۔ سبحان اللہ! کیسی شان ہے کہ ابھی تو تمام عالم کے پیشوا اور مقتدا بنے ہوئے تھے اور آج دوسرے کی شاگردی اور اطاعت پر آمادہ ہیں۔ اس پر حضرت خضر نے فرمایا فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیء حتی احدث لک منہ ذکرا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو چپ چاپ ساتھ ہو لیں کسی معاملہ میں خود سوال کی ابتدا نہ کریں۔ جب تک میں خود نہ بتلاؤں۔ ع۵

اس میں خاموشی کی تعلیم تھی۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ سالک کو سکوت لازم ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ہر در و لیشے کہ چون و چرا کند دہر طالب علمے کہ چون و چرا نکند ہر دو را در چراگاہ باید فرست۔ اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام کو خضر نے طریقت کی یعنی طریق باطنی کی تعلیم دی تھی۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ طریقت شریعت سے جدا نہیں۔ شریعت ہی کی تکمیل ظاہر و باطن کا نام طریقت ہے اور اس میں موسیٰ علیہ السلام سے حضرت خضر زیادہ عالم نہ تھے اور جو واقعات ملاقات خضر کے بعد ظاہر ہوئے

ع۵ لکون ما اصاب موسیٰ لوم۔ جہتہ الکلام و سرعتہ القول و بداہتہ الجواب و علاجہ التانی فی الکلام واللہ برد التامل نیہ قیل ان تیلفظ بہ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ۔

ہیں جن میں حضرت خضر نے اپنا علم ظاہر کیا تھا ان کو طریقت سے کچھ بھی علاقہ نہیں بلکہ وہ تو محض کسب تکوینی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کشف کوئی نہ کمال ہے نہ مقصود ہے۔ ہاں بلا طلب کے کسی کو حاصل ہو جائے تو نعمت ہے کیونکہ وہ بھی ایک علم ہے۔

اور میں نے جو خضر کے اقوال سے مسائل سلوک مثلاً سکوت سالک وغیرہ کا استنباط کیا ہے سو نہ اس وجہ سے کہ یہاں سلوک کی تعلیم تھی بلکہ اس وجہ سے کہ خضر فی نفسہ شیخ طریقت تھے اُن کا مذاق یہی تھا۔ تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم عملاً کس طرح دی کہ اُن کو خضر کا شاگرد بنایا گیا جو اُن سے کسی طرح بھی درجۂ قرب میں زیادہ نہ تھے۔ نہ علوم شرائع و نبوت میں افضل تھے۔

اسی کی طرف یہاں الا بشق الانفس بڑھا کر ہم کو متوجہ کیا گیا ہے کہ دیکھو ہم نے کلام میں کس قدر احتیاط کی ہے تمکو بھی احتیاط کرنا چاہیئے۔

۴۰

اب سمجھو کہ میں نے لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس کے ترجمہ میں یہ کہا ہے کہ تم اس شہر میں مع اسباب و اثقال کے نہ پہنچ سکتے تھے۔ حالانکہ نص میں صرف بالغیہ وارد ہے۔ بالغیہ بھا نہیں ہے مگر قرینہ مقام سے یہ بات معلوم ہے کہ مراد بھی ہے کہ تم مع اسباب و اثقال کے وہاں نہ پہنچ سکتے تھے کیونکہ اگر بلوغ مع الاثقال مراد نہ ہوتا تو لم تکونوا بالغیہ کو تحمل اثقالکم سے ربط نہ ہوگا۔عہ پس ربط اس بات کو چاہتا ہے کہ لم تکونوا بالغیہ سے مراد لم تکونوا بالغیہ بھا ہے۔ اور جب یہ مراد ہے تو مقام مبلغیہ کو مقتضی ہے اب یہ سوال ہوگا کہ اس کی جگہ بالغیہ کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مبالغہ کیلئے عہ بالغیہ اختیار فرمایا کہ تم مع اسباب کے تو کیا جریدہ بھی وہاں نہ پہنچ سکتے تھے۔ اور مبالغہ خلاف احتیاط نہیں۔ کیونکہ مخاطب پر مبالغہ کا مبالغہ ہونا مخفی نہیں رہتا۔

بالغہ خلاف احتیاط نہیں

عہ قلت ولا یخفی ما فیہ فان الربط حاصل بدون ذلک ایضا والمعنی تحمل اثقالکم الی بلاد بعیدۃ لم تکونوا واصلین الیہا مشاۃ خفافا متجردین ایضا ای ومع الاثقال بالاولی ۱۲ ظ۔ عہ قلت وعندی لا مبالغۃ فیہ فان بعض البلاد لا تیسر الوصول الیہا ماشیا متجردا الا بشق الانفس فی نفس الامر وقولہ الی بلد عام لکونہ نکرۃ فیصدق الکلام بالبلاد والبعیدۃ غایۃ البعد التی لا یقدر الانسان ماشی علی وصولہا الا فی شہر بسنین مع التعب الشدید واللہ تعالیٰ اعلم فغیہ ولالۃ علی نعمۃ المرکوب ایضاً قلت وہذا من باب اختلاف الذوق فان بعض الربط قریب عند واحد بعید عند آخر ۱۲

اس کے بعد ارشاد ہے والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ط یعنی خدا تعالیٰ نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے سواری اور زینت کیلئے۔ یہاں حق تعالیٰ نے دو نعمتیں بیان کی ہیں۔ ایک رکوب (سوار ہونا) دوسرے زینۃ چونکہ یہ مجموعہ سب انعام میں نہیں ہے اس لئے اسکو خیل وبغال وحمیر کے ساتھ ذکر فرمایا۔ کیونکہ اونٹ کی سواری میں کوئی زینت نہیں ہاں گھوڑے کی سواری میں بڑی زینت ہے اور خچر میں بھی زینت ہے کیونکہ وہ گھوڑے کے قریب ہی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض رؤسا رتھ میں خچر کو بھی جوڑتے ہیں مگر گدھے میں شاید کلام ہو کہ اس میں کون سی زینت ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ گدھے بھی سب گدھے نہیں ہوتے بلکہ بعضے گدھے خچر کے قریب ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ جیسے خچر گھوڑے کے قریب ہے اسی طرح خر خچر کے قریب ہے اور قریب کا قریب قریب ہے مگر اسپر معقولی طلبہ کو یہ اعتراض ہوگا کہ اس طرح تو کلکتہ بھی قریب ہے کیونکہ ہمارے سے دہلی قریب ہے اور دہلی سے علی گڑھ، اس سے ٹونڈلہ، اس سے کانپور، اس سے الہ آباد، اسی طرح قریب ہے قریب کو ملاتے جاؤ اور اخیر میں کہدینا کہ قریب کا قریب قریب ہے۔ مگر انہوں نے غور نہیں کیا کیونکہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قریب کا قریب قریب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے درمیان وسائط زیادہ نہوں اور عرفاً ایک دو واسطہ سے بعد نہیں ہوتا اس سے زیادہ سے بعد ہو جاتا ہے اور قرآن میں کلام محاورات کے موافق ہے اس کو عرف سے سمجھنا چاہیئے۔ سو عرف میں ایک دو واسطہ بعید نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً کوئی اپنے کو فاروقی صدیقی کہے تو اس میں بعد نہیں۔ اور کوئی اپنے کو نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرے تو اس میں بعد ہوگا جیسے ایک بھنگی ڈوبنے لگا تھا اس نے چلا کر کہا۔ ارے میں ڈوبا مجھے بچاؤ تو کسی نے اس کے حال پر توجہ نہ کی تو اس نے یوں کہنا شروع کیا کہ نبی زادہ ڈوبا جاتا ہے جلدی بچاؤ۔ یہ سنکر لوگ دوڑ پڑے اور اسکو نکال لیا۔ دیکھا تو بھنگی ہے۔ کہا تو نبی زادہ کدھر سے ہوگیا تو وہ جواب دیتا ہے کہ آدم علیہ السلام نبی تھے یا نہیں؟ کہا ہاں۔ کہا میں آدم کی اولاد میں ہوں یا نہیں؟ تو میں بھی نبی زادہ ہوا۔

تیسرے یہ کہ گدھا غریب تو خواہ مخواہ ہی ذلیل اور بدنام ہے ورنہ عقلاً اس میں ذلت کی کیا چیز ہے مشہور یہ ہے کہ گدھا بیوقوف ہوتا ہے۔ مگر ایک گدھے والے جو شہزادہ تھے اور پیرزادہ کا کام

اونٹ کی سواری میں زینت نہیں

گھوڑے کی سواری میں زینت ہے

ایک بھنگی کا لطیفہ

گدھا غافل

کرتے تھے مجھ سے کہتے تھے کہ گدھا بڑا عاقل ہوتا ہے اب ہمیں تحقیق کی ضرورت نہیں بس تقلید ہی کافی ہے
ہاں اسکی آواز البتہ منکر ہے مگر یہ ذلت کا سبب نہیں ہو سکتا۔ آخر توپ کی آواز ہی کونسی اچھی ہے
کان کے پردے پھاڑ ڈالتی ہے مگر ذلیل نہیں پس یہ مسلم کہ گدھے کی آواز بری ہے۔ خصوصاً جب کہ
سب مل کر بولیں ہمیں اس کا زیادہ تجربہ ہے کیونکہ ہم گدھوں کے محلہ میں رہتے تھے اس لئے مجھے اسپر
اتفاق ہے اور نص میں بھی تو اس کی آواز کو انکر الاصوات کہا گیا ہے مگر صورت کے منکر ہونے سے
اس کی ذات میں ذلت نہیں آئی اور ایک عجیب بات ہے کہ گرمیوں کے موسم میں خصوصیت کے ساتھ
گدھے زیادہ بولتے ہیں اسی کی بنا پر بعض ملحدین نے اس حدیث پر اعتراض کیا اذا سمعتم
نہیق الحمار فتعوذوا باللہ فانہ رأی شیطانا (کہ جب گدھے کی آواز سنو تو اللہ کی پناہ
مانگو کیونکہ اس نے شیطان کو دیکھا ہے اور اس کو دیکھکر بولا ہے) کہ اگر وہ شیطان کو دیکھکر بولتا
ہے تو اس کی کیا وجہ کہ گرمیوں میں زیادہ بولتا ہے۔ کیا گرمیوں میں شیطان کو زیادہ دیکھتا ہے؟ اس کا
ایک جواب تو یہ ہے کہ ہاں یہ بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ شیاطین نار سے پیدا ہوئے ہیں ممکن ہے انکو حرارت
سے خوشی ہوتی ہو اس لئے گرمیوں میں زیادہ پھیلتے ہوں اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں
انہ رأی شیطانا قضیہ مطلقہ ہے جو بعض ازمنہ میں وقوع سے بھی صادق ہو سکتا ہے لہذا
نہیق حمار کے بعض افراد بھی اگر رویت شیطان سے ناشی ہوں یہ قضیہ صادق ہو جائیگا۔ یہ ضرور
نہیں کہ ہر نہیق کا سبب رویت شیطان ہی ہو اور یہ وہ بات ہے جو میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں
ایک عالم کے جواب میں بیان کی تھی۔ اور یہ وہ وقت تھا جبکہ یونان نے ترکی حکومت کو شکست
دیکر ادرنہ یا نوپل وغیرہ فتح کر لئے تھے جس سے بعض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب
اور تزلزل آگیا تھا اور ملاحدہ تو یہ بلا کہنے لگے تھے کہ خدا بھی نصرانیت کا حامی ہے۔ اسلام اور
مسلمانوں کا حامی نہیں۔ اس پر دہلی کے بعض مخلصین نے مجھے بلایا کہ یہاں بیان کی سخت ضرورت ہے
تاکہ اس قسم کے شبہات کا ازالہ کیا جائے چنانچہ میں گیا اور اسی موضوع پر بیان ہوا جس میں اس
قسم کے شکوک و شبہات کا بہت خوبی کیساتھ بحمداللہ ازالہ کر دیا گیا اور خاتمہ پر بطور اتمام حجت کے
میں نے یہ بھی کہدیا کہ اگر اب بھی کسی کے ذہن میں کچھ شبہ اور وسوسہ ہو تو ظاہر کر دے ایسا نہ ہو کہ
میرے جانے کے بعد یوں کہا جائے کہ یہ شک رہ گیا اور وہ شبہ رہ گیا اور یہ بات منجانب اللہ اتمام حجت

حدیث اذا سمعتم نہیق الحمار پر ملاحدہ کا اعتراض اور اس کا جواب ۴۴

کے لئے میری زبان سے نکل گئی تھی ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس طرح تحدی کیساتھ اعلان کرتا اس پر ایک پنجابی عالم کھڑے ہوئے اور کہا اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصالحون (اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھدیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک میرے نیک بندے ہونگے) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے مالک کفار ہوگئے۔ میں نے کہا مولانا آپ تو عالم ہیں ذرا یہ تو دیکھئے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے یا مطلقہ ہے؟ چونکہ وہ عالم تھے اتنی ہی بات سے سمجھ گئے اور کہا بس میں سمجھ گیا اب کچھ شبہ نہیں رہا۔ (حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہونگے کفار کبھی مالک نہ ہونگے۔ بلکہ اس میں اطلاق کیساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہونگے اور اطلاق کے صدق کیلئے ایک بار وقوع کافی ہے چنانچہ بحمد اللہ حضرات صحابہ روئے زمین کے مالک بن چکے ہیں۔ زمانہ عروج اسلام میں کوئی سلطنت مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتی تھی۔ اور یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آیت میں ان الارض سے مراد یہی دنیا کی زمین ہے۔ ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق وسباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارض جنت ہے۔ کہ جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہونگے۔ اس پر کچھ بھی اشکال نہیں خوب سمجھ لو ۱۲) بہرحال حدیث پر کچھ اشکال نہیں ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ نہیق حمار کا سبب رویت شیطان ہے مگر یہ دائمی سبب نہیں ممکن ہے کبھی وہ اپنی طبیعت سے بھی چیختا ہو اور قضیہ کے مطلقہ یا دائمہ ہونے پر نظر کرنے سے بہت سے اشکال رفع ہوجاتے ہیں مگر اہل علم اس پر نظر نہیں کرتے اسلئے بعض اشکالات کے جواب میں پریشان ہوجاتے ہیں ان کو چاہیئے کہ جب کسی آیت یا حدیث پر اشکال وارد کیا جائے کہ یہ حکم فلاں مادہ میں متخلف ہے فوراً اس پر اول نظر کی جائے کہ آیت یا حدیث میں حکم دائمی ہے یا مطلق، تو انشاء اللہ معلوم ہوگا کہ زیادہ اشکالات کا منشا یہ ہے کہ لوگوں نے مطلقہ کو دائمہ سمجھ لیا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ گدھے کی آواز کا منکر ہونا مسلم ہے مگر اس سے زینت پر کیا کلام ہے۔ آواز کو زینت میں کچھ دخل نہیں بلکہ جس فن کی زینت عام طور پر آواز ہی سے سمجھی جاتی ہے یعنی فن موسیقی اس میں بھی اہل کمال آواز کی عمدگی کو کمال نہیں سمجھتے بلکہ کمال

ف: ان الارض یرثہا عبادی الصالحون پر اعتراض اور جواب

۲۴

ف: آواز کی عمدگی کمال نہیں

ع وہذا ہو الذی اختارہ الشیخ فی تفسیرہ بیان القرآن وعلی ان اکثر المفسرین علی ذلک واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ

دوسری شے کو سمجھتے ہیں چنانچہ ہمارے اُستاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو ایک زمانہ میں جبکہ مولانا گورنمنٹ کے مدارس کے ممتحن مقرر تھے اور اجمیر میں ملازم تھے فن موسیقی سیکھنے کا شوق ہوا اور اس شوق کا منشا صرف یہ تھا کہ مولانا کو جامعیت کا شوق تھا. ہر علم کو حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے سوا اور کچھ منشا نہ تھا. کیونکہ مولانا کے ہم عمروں میں سے ایک ثقہ نے (جنکا نام مولوی رعایت الحق تھا) مجھ سے بیان کیا ہے کہ مولانا بچپن اور جوانی میں بھی ویسے ہی نیک تھے جیسے بڑے ہو کر نیک تھے. مولانا نے جوانی میں بھی کبھی معصیت کا ارتکاب نہیں کیا۔

غرض مولانا نے ایک میر صاحب سے جو فن موسیقی کے ماہر تھے اس فن کو حاصل کیا۔ پھر مولانا کو تو اس شغل سے خدا تعالیٰ نے اس طرح نکالا کہ ایک دن آپ اپنے حجرہ میں بیٹھے ہوئے جو لب سڑک بالاخانہ پر تھا موسیقی کی مشق کر رہے تھے کہ ایک مجذوب نیچے سے گذرا اور اس نے پکار کر کہا ارے مولوی! تجھے خدا نے اس کام کے واسطے پیدا نہیں کیا دوسرے کام کیواسطے پیدا کیا ہے. مولانا کے دل میں تو اسی وقت سے نفرت پڑگئی اور اس شغل کو چھوڑ دیا۔ اور مولانا کے اُستاد کو اس طرح نفرت ہوئی کہ ایک دفعہ کوئی راجہ اجمیر آیا وہ اس فن کا شائق تھا اس نے سب اہل کمال کو جمع کیا ان میں وہ میر صاحب بھی تھے. اُنہوں نے جب گانا شروع کیا تو راجہ کے ہمراہ جو ایک اُستاد تھا اس نے ان کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا. یا کہ سبحان اللہ کیا گلا پایا ہے بس اس پر انہوں نے ستار وغیرہ پھینک دیا اور کہا لعنت ہے اس کام پر جس میں کمال حاصل کرنے کی داد وہ ملتی ہے جو ایک ڈوم کو داد دی جاتی ہے کہ کیا گلا پایا ہے. کیا موسیقی اس کا نام ہے کہ آواز اچھی ہو. آواز تو ایک رنڈی کی اور ایک بچہ کی مجھ سے اچھی ہو سکتی ہے. اگر میرے فن کی یہی قدر ہے تو میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں اس واقعہ سے انکو گانے بجانے سے نفرت ہوگئی اور دونوں اُستاد شاگرد اس کام سے تائب ہو گئے. یہ بظاہر مولانا کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے مولانا کے اُستاد کو بھی آپ کی صحبت کی برکت سے توبہ نصیب کی. تو دیکھئے حالانکہ گانے بجانے کی خوبی اور زینت آواز ہی سے ہے مگر اہل کمال کی نظر میں اس کی کچھ وقعت نہیں بلکہ وہ کمال کسی اور چیز کو سمجھتے ہیں پس آواز کی خرابی سے گدھے کی زینت میں خرابی نہیں. مگر اس کو زیور اور عمدہ زین لگام پہنایا جائے تو گھوڑے کی طرح یہ بھی اچھا لگے گا. بمبئی میں دو سیٹھ بے اولاد تھے اُنہوں نے

اپنا حوصلہ نکالنے اور شوق پورا کرنے کے لئے ایک گدھے اور گدھی کی شادی کی تھی اولاد والے تو اپنے بیٹا بیٹی کی شادی میں دل کے حوصلے نکالتے ہیں اور نام ونمود کے لئے بیدریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں بے اولادوں کو یہ خبط سوجھتا ہے کہ لاؤ جانوروں ہی کو بیٹا بیٹی بناکر اُن کا بیاہ کردو۔ چنانچہ ایک سیٹھ کا گدھا تھا ایک کی گدھی تھی۔ ایک گدھے کا باپ بنا ایک گدھی کا اور دونوں کو خوب عمدہ لباس پہنایا گیا۔ گدھی کو زیوروں سے آراستہ کیا گیا تو یقیناً وہ گدھی زینت میں گھوڑے سے کچھ کم نہ رہی ہوگی۔ ہندوستان کے گدھے اس واسطے بھی اچھے نہیں لگتے کہ ان کی خدمت نہیں کی جاتی جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں گدھے کی سواری کو معیوب سمجھا جاتا ہے اگر یہاں گھوڑے کی طرح گدھے کی بھی سواری کا رواج ہوجاتا اور گھوڑے کی طرح اُس کی خدمت کی جاتی تو اتنا بُرا نہ لگتا۔ چنانچہ عرب کے گدھے یہاں کے گدھوں سے اچھے ہوتے ہیں خصوصاً نجد کے ۱۲ ان میں زینت بھی ہے اور سواری کا کام بھی گھوڑے کی برابر دیتا ہے۔ اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ لباس اور زیور وغیرہ سے اونٹ عـه میں بھی زینت آجائے گی وہ بھی اچھا لگنے لگے گا؟ تو میں کہتا ہوں ہاں لیکن اسکی بیڈھنگی رفتار ساری زینت کو کھودیتی ہے ؎

طاؤس را بہ نقش ونگارے کہ ہست خلق تحسین کنند و او خجل از زشت پائے خویش

اور یہاں ایک اور نکتہ قابل غور ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لتركبوها پر تو لام غایت داخل کیا ہے اور زینة پر لام داخل نہیں کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ رکوب تو ایسی غرض ہے جو قابل قصد ہے جو شان غایت کی ہوتی ہے اور زینت قابل قصد نہیں بلکہ امور زائدہ میں سے ہے۔ اس لئے اس کو بصورت غایت ذکر نہیں فرمایا گو معنیً غایت ہی ہے لیکن یہ امر متصوداً قابل تحقیق ہے کہ اگر کوئی شخص زینت ہی کے لئے اور اسی قصد سے کسی چیز کا استعمال کرے مثلاً عمدہ لباس پہنے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جائز ہے

عـه میں کہتا ہوں کہ لباس کی زینت قابل اعتبار نہیں یہ تو محض عارضی ہے لباس وزیور تو ایک بیجان تصویر میں بھی زینت پیدا کردیتا ہے اور اوپر اس کا ذکر محض تبرعاً ہوا ہے اور بظاہر آیت میں اونٹ کیلئے رکوب و زینت کا بیان نہ کرنا اس پر مبنی ہے کہ اصل خلقت ابل رکوب و زینت کیلئے نہیں ہے بلکہ حمل اثقال الی بلاد بعیدہ کیلئے ہے گو اس سے رکوب و زینت کا کام بھی لے لیا جائے اور اصل خلقت خیل و بغال و حمیر رکوب و زینت کیلئے ہے گو ان سے بھی حمل اثقال کا کام لے لیا جائے۔ فلا یلزم نفی الرکوب والزینۃ عن الابل واللہ اعلم ۱۲ ظ

مگر اطلاق کی ساتھ نہیں جس سے اہل تفاخر کو گنجائش مل سکے بلکہ اس میں تفصیل ہے جس کو میں موارد سے سمجھتا ہوں، وہ تفصیل یہ ہے کہ عمدہ لباس اپنا جی خوش کرنے کے لئے یا اپنے کو ذلت سے بچانے کے لئے یا دوسرے شخص کی اکرام کیلئے پہنے تو جائز ہے مثلاً اگر ہمکو یہ معلوم ہو جائے کہ سید نا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فلاں جگہ تشریف فرما ہیں تو ہم یقیناً عمدہ لباس پہنکر جائیں گے اور اس وقت مقصود حضور کی تعظیم ہوگی۔ انسان اپنے معظم کے سامنے اچھے ہی لباس میں جایا کرتا ہے۔ تاکہ اس کی عظمت ظاہر ہو۔ ہاں عمدہ لباس اس نیت سے پہننا حرام ہے کہ اپنی عظمت ظاہر کی جائے اور دوسروں کی نظر میں اپنی بڑائی ثابت کی جائے خلاصہ یہ ہوا کہ لباس میں چار درجے ہیں۔ ایک تو ضرورت کا درجہ ہے۔ دوسرا آسائش کا۔ تیسرا آرائش یعنی زینت کا۔ یہ تین درجے تو مباح ہیں بلکہ پہلا درجہ واجب ہے۔ اور چوتھا درجہ نمائش کا ہے یہ حرام ہے اور یہ لباس ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر چیز میں یہی چار درجے ہیں ایک ضرورت، دوسرے آسائش، تیسرے آرائش، چوتھے نمائش، ضرورت کا قافیہ بھی اگر مل جاتا تو اچھا ہوتا کہ کلام میں زینت ہو جاتی اور زینت جائز ہے۔ غرض دوسروں کی نظر میں اپنی وقعت بڑھانے کو زینت کرنا حرام ہے باقی نفس زینت حرام نہیں دیکھئے شریعت کے کیسے پاکیزہ حدود ہیں اور اس میں کس قدر وسعت ہے کہ چار درجوں میں سے صرف ایک درجہ کو حرام کیا گیا ہے۔ باقی سب کی اجازت ہے مگر افسوس ملحدین آنکھیں بند کر کے شریعت پر تنگی کا الزام لگاتے ہیں۔ واللہ ان لوگوں نے شریعت کو دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہی تو سمجھا نہیں اسکے بعد ارشاد ہے ویخلق مالا تعلمون اور اللہ تعالیٰ وہ چیزیں پیدا کرتے ہیں جن کو تم نہیں جانتے۔ مطلب یہ ہے کہ مخلوقات الٰہیہ کا تمہاری معلومات ہی میں انحصار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر نہیں۔ مثلاً زمین کے اندر بعض جراثیم ایسے پیدا ہوتے ہیں جو انسان وحیوان کے لئے قاتل ہیں اور بعض مواد ایسے پیدا ہوتے ہیں جو موذیات کو فنا کرنے والے ہیں ہم کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سا مادہ کب پیدا ہوا اور کب فنا ہو گیا یہ تو آیت کی تفسیر تھی اب میں اس کے متعلق چند فوائد ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

چند فوائد

ایک فائدہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ایک سواری ریل ایجاد ہوئی ہے بعض ذہینوں کو

۲۶

اس کے متعلق اس کی تلاش ہے کہ ریل کا ذکر بھی قرآن شریف میں کہیں ہے یا نہیں ہر چند کہ اسکی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ قرآن حرفت و صنائع اور ایجادات کے بیان کرنیکو نازل نہیں ہوا جیسا کہ بارہا میں نے اس پر متنبہ کیا ہے اور قرآن کو جو تبیاناً لکل شیء کہا گیا ہے تو وہاں کل شیء سے مراد کل شیء من امور الدین ہے نہ کہ کل شیء ولو من امور الدنیا۔ اس لئے یہ تحقیق مذکور محض ایک امر زائد ہے لیکن تبرعاً میں اس کو بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ اس وقت یہ بیان ایک ایسی ہی نعمت کے شکریہ میں ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریل کے متعلق ہم کو عطا فرمائی ہے اور جسکو دوسرے مرکوبات کے ساتھ وصف مرکوبیت میں مشارکت بھی ہے۔ سو بعض ذہنیوں نے اس کو سورۂ یٰس کی اس آیت وآیۃ لھم انا حملنا ذریتھم فی الفلک المشحون وخلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون میں داخل کیا ہے کہ اس میں ریل کا بھی ذکر آ گیا ہے (کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اس بات میں بھی قدرت کی دلیل موجود ہے کہ ہم نے ان کی اولاد٥ کو بھری بھری کشتیوں میں سوار کیا اور ہم نے ان کے لئے کشتی کے مثل اور چیزیں بھی پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں) اور ریل سب سے زیادہ کشتی اور جہاز کے مشابہ ہے کہ جیسے جہاز میں انسان اپنی تمام ضروریات کو ساتھ لے کر سفر کرتا ہے ایسے ہی ریل میں کر سکتا ہے مگر یہ قرآن کی تحریف ہے کیونکہ یہاں خلقنا لھم صیغہ ماضی کا ہے تو لازم آئیگا کہ ریل کا وجود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی ہوا اور اس کا بطلان ظاہر ہے بلکہ اس سے مراد بعض کے نزدیک تو اونٹ ہے اور اس کا لطف تو عربیت کے جاننے سے زیادہ آئیگا کیونکہ اہل عرب اونٹ کو سفائن البر یعنی خشکی کا جہاز کہتے تھے۔ چنانچہ یہ مصرعہ مشہور ہے سفائن بر والسراب بحارھا اور میرے نزدیک اس سے مطلق انعام مراد ہیں کیونکہ سورۂ زخرف میں ہے وجعل لکم من الفلک والانعام ما ترکبون یہاں فلک اور انعام دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انعام و کشتی باہم متناسب ہیں مگر مماثلت کی صورت جب ذہن میں آئے گی کہ کشتی تو چھوٹی ہو اور جانور بڑا۔ یہ نہیں کہ جانور چھوٹا ہو

٥ تجار عموماً اپنی اولاد ہی کو سفر میں بھیجتے تھے اور خود دکان پر رہتے تھے اس لئے اولاد کا سوار کرنا مذکور ہوا۔ ۱۲ ذل

اور جہازسے اس کا موازنہ کرو جیسے بیربل اور اکبر شاہ کا قصہ ہے کہ اکبر نے بیربل سے کہا تھا کہ مثل مشہور ہے راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔ سو اول کی دو ضدیں تو واقعی سخت ہیں باقی تیسری کیا مشکل ہے۔ بیربل نے کہا حضور سب سے سخت تو یہی ہے۔ البتہ اگر عقل ہو تو پھر مشکل نہیں۔ اکبر شاہ نے کہا اس میں عقل کی کون ضرورت ہے۔ بیربل نے کہا بہت اچھا میں بچہ بنتا ہوں۔ آپ میری ضد پوری کیجئے۔ بادشاہ نے کہا۔ اچھا تم بچہ بنو اور ضد کرو ہم ہر ضد کو پورا کریں گے۔ بیربل نے بچوں کی طرح رونا شروع کیا اور کہا ہم تو ہاتھی لیں گے۔ اکبر نے فیل خانہ سے ہاتھی منگوا دیا۔ اس نے پھر رونا شروع کیا اور کہا ہم تو کلھیا لیں گے۔ اکبر نے کلھیا بھی منگوا دی وہ پھر رونے لگا اور کہا ہاتھی کو کلھیا میں رکھو۔ یہاں اکبر عاجز ہو گیا۔ اور کہا اچھا تم جو کہتے تھے کہ اگر انسان عاقل ہو تو بچوں کی ضد پوری کرسکتا ہے۔ یہاں عقل کیا کام دے گی۔ بیربل نے کہا حضور عقل کے ساتھ بچہ کی ضد ضرور پوری کی جاسکتی ہے۔ اکبر نے کہا اچھا لو ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو۔ چنانچہ آپ نے اسی سبق کو دوہرایا کہ ہم تو ہاتھی لیں گے۔ بیربل نے بازار سے مٹی کا ننھا سا ہاتھی منگا دیا۔ پھر کہا ہم تو کلھیا لیں گے اس نے بڑی سی کلھیا منگا دی۔ پھر کہا ہاتھی کو اس میں بند کرو۔ بیربل نے ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دیا اور کہا حضور نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی ضد پر فیل خانہ سے ہاتھی منگایا۔ آپ کو بچہ ہی کے مناسب ہاتھی منگانا چاہئے تھا۔ اسی طرح یہاں فلک و انعام میں مناسبت کا لحاظ کر کے کشتی چھوٹی اور جانور بڑا لینا چاہیئے۔ اور بعض حضرات نے ریل کو سورۂ نحل کی اس آیت ویخلق ما لا تعلمون میں داخل کیا ہے (کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی چیزیں پیدا کریگا جن کو تم نہیں جانتے) گو یہ تحریف تو نہیں ہے مگر بعید ضرور ہے کیونکہ یخلق بظاہر صیغہ حال ہے اور ظاہر ہے کہ ان سواریوں میں جو آج کل ایجاد ہوئی ہیں صحابہ کے زمانہ میں کوئی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اور اگر اس کو مستقبل لیا جائے تو صحابہ کچھ سمجھے ہی نہ ہوں گے۔ پھر یہ ایجادات خلق کے بعد تو معلوم ہوگئیں اور اس آیت کے تحت میں وہی اشیاء داخل ہوسکتی ہیں جو بعد خلق کے بھی معلوم نہ ہوں اس لئے اس کی تفسیر میں

عہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اجمالاً اتنا سمجھ گئے ہونگے کہ آئندہ زمانہ میں سواری کیلئے کچھ اور اشیاء بھی پیدا ہوں گی تفصیل سمجھنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ نص میں ما لا تعلمون موجود ہے ۱۲ عہ اگر یخلق کو استقبال اور لا تعلمون کو حال پر محمول کیا جائے تو اشکال وارد نہ ہوگا۔ ای یخلق فی المستقبل ما لا تعلمونہ ایہا المخاطبون بالقرآن اولا فی ہذا الوقت ولا بعد فی ذلک لکون بعض الخطابات مخصوصاً بالصحابۃ کقولہ وارضا لم تطؤہا ۱۲ ظ۔ قلت وہو بعید فی ذوقی والتعمیم کلہا للحال الخطاب عام للقرائن وتخصیص الخطاب فی لم تطؤہا القرینۃ التخصیص تکییف القیاس ۱۲۔ اشرف

پہلی بات وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کے لئے مثل نعم مذکورہ کے نافع ہیں اور تم کو ان کی خبر بھی نہیں جیسے مواد ارضیہ جو موذیات کو فنا کرتے رہتے ہیں اور نافع ہونے کی قید باقتضار مقام ہے کہ اشیاء نافعہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ پس حاصل مقام کا یہ ہوا کہ ہم ایسے نفع رساں ہیں کہ بعض چیزوں کی تم کو خبر بھی نہیں اور ہم ان سے تم کو نفع پہنچا رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ بس وہی چیزیں تمہارے نفع کی پیدا کی ہیں جو تم کو معلوم ہیں جیسے نعم مذکورہ اور اس تقریر پر یخلق مالا تعلمون کا ربط بھی نعم مذکورہ سے ظاہر ہو گیا یعنی ربط تقابل۔

اور بعض حضرات نے ما یفتح اللہ من رحمۃ فلا ممسک لہا میں ریل کو داخل کیا ہے کیونکہ بعض سلف نے فرمایا ہے کہ من رحمۃ میں ہر وہ نعمت داخل ہے جو بندوں کی راحت و آسانی کے لئے ایجاد ہوئی ہے۔ چنانچہ شعدف وغیرہ کو بھی انہوں نے اس میں داخل کیا ہے اس میں البتہ زیادہ بعد نہیں۔ اسی واسطے میں نے بھی اپنی تفسیر کے حاشیہ میں اس مقام پر لکھدیا ہے کہ من رحمۃ کے عموم میں ریل بھی داخل ہے۔ اور اتفاق عجیب یہ ہوا کہ جس دن میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا تھا اسی دن پہلے پہل ہمارے قصبہ کے سامنے سے ریل گذری ہے اس لئے میں نے تفسیر کے حاشیہ میں یہ بھی لکھدیا کہ بحمد اللہ آج ہماری بستی کے سامنے سے عیدگاہ کے قریب ریل گذری ہے اور اس کی سابقہ ریل کے جاری ہونیکا سنہ اور تاریخ بھی لکھدی تاکہ محفوظ رہے[ع]۔ غرض اس آیت میں ریل کا داخل کرنا بعید نہیں اور خود میں نے بھی اسی میں اس کو داخل کیا تھا۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک بات اس سے بھی زیادہ قریب آئی ہے وہ یہ کہ اگر ذکر کو حقیقی اور حکمی کے لئے عام لیا جائے تو میرے نزدیک ریل کا ذکر وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس میں سب سے اقرب طرق کی ساتھ ہو جاویگا کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں مراکب میں وجہ نعمت اس غایت کو بیان فرمایا ہے کہ وہ تمہارا بوجھ ایسے بلاد تک پہنچاتے ہیں جہاں تم بدون مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تو جس سواری میں بھی یہ غایت موجود ہوگی وہ حکماً اس نعمت میں داخل ہو کر مثل انعام کے نعمت کی ایک فرد ہوگی اور ریل میں یہ غایت سب سے زیادہ موجود ہے تو وہ بھی حکماً اس نعمت میں داخل ہے۔ اور جب

[ع] اس ریل کے تھانہ بھون میں جاری ہونیکا وقت جو تفسیر کے حاشیہ پر لکھا ہے ۲۳ ماہ صفر ۱۳۲۵ھ ہجری ہے۔

نعمت میں داخل ہے تو جس طرح نعمت انعام پر ہم کو شکر کی تعلیم دی گئی ہے اسی طرح نعمت ریل پر بھی شکر ادا کرنا چاہیئے مگر اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔

ف: ریل بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور یہیں پر مولانا شیخ محمد صاحب کی حکایت

میں نے بچپن میں مولانا شیخ محمد صاحبؒ کا (جو تھانہ بھون کے بڑے علماء میں سے تھے ۱۲) ایک وعظ سنا تھا اس وقت میری عمر زیادہ نہ تھی مگر مولانا سے مجھے محبت تھی اور مولانا کو مجھ سے محبت تھی اس لئے میں کوشش کر کے وعظ میں شرکت کیا کرتا تھا اس لئے مجھے مولانا کے مواعظ کی کچھ کچھ باتیں اب تک یاد ہیں چنانچہ ایک بار مولانا نے وعظ میں فرمایا کہ مجھے ریل کا نعمت ہونا ابھی تک محسوس نہ ہوا تھا یعنی اس طرف التفات نہ ہوا تھا مگر ایک دن جو ریل میں بیٹھا اور جلدی سے منزل پر پہنچ گیا تو اس وقت اس نعمت کی بڑی قدر ہوئی اور معلوم ہوا کہ ریل بھی حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو ہم لوگوں کو عطا ہوئی ہے۔ پس میں آپ صاحبوں کو بھی مطلع کرتا ہوں کہ اس کو نعمت سمجھو اور اس کا شکر ادا کرو۔ تو جب بڑے بڑے علماء کو اس کا نعمت ہونا جلدی معلوم نہیں ہوا تو عوام کو اگر اس کا نعمت ہونا معلوم نہ ہو تو زیادہ شکایت نہیں۔ مگر تنبیہ کے بعد تو احساس ہونا چاہیئے اس لئے میں بھی مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی طرح کہتا ہوں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھو اور اس پر شکر کرو اور شکر مراکب کے دو صیغے قرآن میں وارد ہیں۔ ایک سُبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون جو رکوب انعام کے وقت اللہ تعالیٰ نے ہم کو تعلیم فرمایا ہے اور دوسرے بسم اللہ مجرىها ومرسٰها ان ربی لغفور رحیم جو رکوب سفینہ کے وقت نوح علیہ السلام نے اختیار فرمایا تھا اور چونکہ ریل کو حمل اثقال میں انعام کے ساتھ بھی مشابہت ہے اور سرعت سیر وغیرہ میں کشتی کے ساتھ اس لئے بہتر ہے کہ دونوں کو جمع کر لیا جائے۔

رمم

ف: ریل پر سوار ہونے کے وقت دعا پڑھنا چاہیئے

ایک فائدہ یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ ریل کو دیکھ کر مجھے جہنم یاد آتا ہے کیونکہ اس کا انجن جہنم کی اس صفت کا مصداق ہے وھی تفور تکاد تمیز من الغیظ کہ اس قدر جوش کھاتا ہے گویا غصہ اور قہر سے ابھی پھٹ پڑے گا۔ اور ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے کہ ریل کے تیسرے درجہ جہنم کی اس صفت کا مذکر ہوتا ہے کلما دخلت امۃ لعنت اختھا کہ جیسے جہنم میں ایک جماعت دوسری جماعت پر لعنت کرے گی۔ ایسے ہی ریل میں تیسرے

ف: ریل سے جہنم کی یاد تازہ ہوتی ہے

درجہ والے آپس میں خوب لڑتے ہیں جب کسی اسٹیشن پر نئے نئے مسافر تھرڈ میں بھرتے ہیں
تو جو پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں وہ انہیں کوستے برا بھلا کہتے ہیں کہ سارے اسی گاڑی میں آجاؤ
تمہارے واسطے اور کہیں جگہ نہیں رہی۔ منہ پر آنکھیں نہیں کہ یہ تو پہلے ہی سے بھر رہی ہے
بس تمہاری سزا یہ ہے کہ کھڑے رہو۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ جگہ تو بہت ہے سیدھے
ہو کر بیٹھو کیا تم ہی نے کرایہ دیا ہے۔ تم ریل کے مالک ہو پھر خوب گالم گلوچ اور جھگڑا فساد
ہوتا ہے۔ اُس وقت بالکل یہی منظر ہوتا ہے کلما دخلت امة لعنت اختها۔ اور جب
کہتے ہیں کہ ہم نے بھی تو ٹکٹ لیا ہے اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے لکل ضعف۔ اور جب کہتے
ہیں کہ تم کو ہم پر کیا ترجیح ہے۔ اُس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے فما کان لکم علینا من فضل۔
اور ایک شان اس میں جنت کی بھی ہے۔ وہ یہ کہ جنت میں جب چیز کو دل چاہیگا وہ جلدی مل
جائیگی۔ اس بات میں ریل جنت کے مشابہ ہے کہ جس چیز کو دل چاہتا ہے ریل کے ذریعہ سے جلدی
حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ کلکتہ اور پٹنہ اور کے میوے یہاں دوسرے دن پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے
شہروں میں ہر ملک کی چیزیں ہر وقت ملتی ہیں نیز جیسے جنت میں جہاں جانے کو دل چاہا فوراً
پہنچ گئے۔ اسی کا نمونہ گو ذرا سی ہی نمونہ ہو اس میں بھی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے اور اس کے متعلق
اسٹیشنوں کا اندازے تقارب اور ہر اسٹیشن پر ضرورت کی چیزیں ملنا بالکل بلاد سباط کو
یاد دلاتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے وجعلنا بینهم وبین القری التی بارکنا فیها
قری ظاهرة وقدرنا فیها السیر سیروا فیها لیالی وایاما آمنین اور گو یہ نعمت دنیوی
تھی مگر اس پر ناشکری کی مذمت اس طرح فرمائی گئی فقالوا ربنا باعد بین اسفارنا وظلموا
انفسهم فجعلناهم احادیث ومزقناهم کل ممزق الآیہ پس اسی طرح یہ ریل بھی اللہ تعالیٰ
کی ایک نعمت ہے اس کا شکر کرنا چاہیئے اور اس کے اندر جو مشابہتیں جنت و دوزخ کی مذکور
ہوئیں ان پر اگر نظر کی جائے تو نعمت ظاہرہ کی ساتھ اس سے نعمت باطنہ یعنی تذکر آخرت بھی حاصل ہو گی
اور ریل میں یہ نعمت عامہ تو سب لوگوں کیلئے تھی جس کا یہاں تک ذکر ہوا اور ایک نعمت خاص
ہماری بستی کو یہ حاصل ہوئی ہے کہ ہمارا اسٹیشن پہلے بہت دور تھا اب خدا کے فضل سے بہت
قریب ہو گیا۔ جس سے قصبہ والوں کو اور باہر سے یہاں آنے والوں کو بہت ہی راحت اور آسانی

ریل میں جنت کی بھی شان ہے

۳۱

ریل دنیوی نعمت کا بیان اور خاص نعمت بستی پر اسٹیشن کے قریب ہو جانے کی

ہوگئی اس کا بھی ہم لوگوں کو شکر کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لئن شکرتم لازیدنکم (اگر شکر کروگے تو میں نعمت کو ترقی دونگا) اس لئے انشاء اللہ امید ہے کہ یہ نعمت جس حال میں اسوقت ہے اس سے ترقی پاجائیگی (مثلاً یہ کہ اسٹیشن جو قریب بنا ہے عارضی سے مستقل ہوجائیگا ۱۲) اور چونکہ شریعت کی ہم کو یہ بھی تعلیم ہے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ کہ نعمت جن لوگوں کے واسطہ سے تم کو ملے ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے اس لئے جو لوگ اس امر میں ساعی ہوئے ہیں ہم کو ان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ یہ بھی شکر نعمت کا تتمہ ہے اور اُن کے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ زبان سے ان کی تعریف کی جائے۔ اُن کو دعا دی جائے اور ان کے اس احسان کو لوگوں میں ظاہر کیا جائے۔ مع رعایۃ الحدود وفیہ ۱۲

(اور سب سے زیادہ منعم حقیقی اللہ جل جلالہ کا شکریہ ادا کیا جائے کہ بدون اُن کی مشیت و حکم کے کچھ نہ ہوسکتا تھا۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی نے اس قصبہ پر یہ انعام فرمایا ورنہ بظاہر اس کی کچھ امید نہ رہی تھی اللھم ما اصبح بنا من نعمۃ او باحد من خلقک فمنک وحدک لا شریک لک فلک الحمد ولک الشکر دائما ابدا حمدا الابرید قائلہ الا رضاک ۱۲ جامع) اور اس نعمت الٰہیہ کا شکریہ بہت دنوں تک کرنا چاہیئے بھول نہ جائیں۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی نعمتوں کے شکریہ کی توفیق دے۔ اور ادائے شکر بالعمل کی بھی توفیق دے اور دخول جنت کے ساتھ اتمام نعمت فرمائیں۔ آمین۔ وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین ہ

نوٹ :۔ اس بیان کے بعد حضرت حکیم الامۃ نے فرمایا کہ ایک فائدہ اس آیت کے متعلق اور ذہن میں تھا جو بیان نہ ہوسکا۔ وقت پر ذہن سے نکل گیا۔ اگر بعد ظہر کے طبیعت اچھی رہی تو بیان کردونگا۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً
رَوَاہُ الْبُخَارِی

سلسلہ

التبلیغ

کا

۳۴

وعظ مسمّی بہ

المجاهده

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

مواعظ اشرفیہ ۱۲ حصے مجلد اعلیٰ در چھ جلد ۶۰۰/- علاوہ ڈاک خرچ

دعوات عبدیت ۹ حصے کامل مجلد اعلیٰ در چار جلد ۳۵۰/- علاوہ ڈاک خرچ

الابقاء کے ممبروں کیلئے خاص رعایت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمی بہ
المجاہدہ

این	کہاں ہوا	مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور
متی	کب ہوا	۲ رمضان [illegible]ھ بوقت شب بعد عشاء
کم	کتنی دیر ہوا	[illegible] گھنٹہ
کیف	کس ہیئت سے ہوا	قائماً
لمہ	کیا سبب تھا	اہل مدرسہ اور طلبہ کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون بیان ہوا	مجاہدہ کی ضرورت اور اس کا بیان کہ صرف اصلاح عقائد اصلاح عمل کیلئے کافی نہیں بلکہ مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے کہ اسکے بغیر عمل سہل نہیں ہوتا
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	علماء و طلبہ کو خصوصاً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	(شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد رحمہ اللہ)
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۵۰۰ تقریباً و مجمع نساء اسکے علاوہ
الاشتات	متفرقات	

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ من کان یرجو لقاء اللہ فان اجل اللہ لات وھو السمیع العلیم ۰ ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ

۳۴

ان اللہ لغنی عن العلمین ٥ والذین امنوا وعملوا الصلحت لنکفرن عنهم سیئاتهم و
لنجزینهم احسن الذی کانوا یعملون ٥ صاحبو! اسوقت ایک ضروری مسئلہ اصلاح
عمل اور طرز عمل کے متعلق بیان کرنیکا قصد ہے اور وہ مسئلہ ایسا بدیہی ہے کہ اسکے ثبوت کیلئے
مشاہدہ ہی کافی دلیل ہے کسی نص کی ضرورت نہیں کیونکہ نص کی ضرورت تو اثبات احکام یا اخبار
عن الغیب کیلئے ہوا کرتی ہے۔ اور جو امور مشاہدہ کے متعلق ہوں ان کے لئے مشاہدہ کے سوا اور
کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی ہاں اگر کوئی تبرعاً دلیل بھی بیان کردے تو اس سے مدعیٰ اور مؤکد
ہو جائے گا چنانچہ وہ مسئلہ جو اسوقت بیان ہوگا اسی قسم کا ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت و معلوم ہے مگر
میں نے اسوقت حسب معمول آیات کی تلاوت تبرعاً کردی ہے کیونکہ ان آیات کو اس مسئلہ
سے ایک ظاہر علاقہ ہے۔ اب وہ مسئلہ سننا چاہئے اور اسکی ضرورت بھی اس کے سننے سے معلوم
ہو جائے گی کیونکہ جی یہ چاہا کرتا ہے کہ جو کچھ بیان ہو کسی ضروری مسئلہ کے متعلق ہو ورنہ یوں تو
بیان کرنے کو بہت سی باتیں ہیں مگر بلا ضرورت کے لوگوں کا وقت صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا
اب غور سے سنئے کہ ہم لوگوں سے اپنے عمل کے بارہ میں ایک غلطی ہو رہی ہے جس کی تفصیل یہ ہے
باب عمل میں آجکل دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جنکو صرف اعتقادی درستی کا خیال ہے
وہ عمل کو عظیم بالشان ہی نہیں سمجھتے اسلئے انکو اصلاح عمل اور تکثیر اعمال کا اہتمام ہی نہیں۔ اگر
یہ لوگ یوں کہتے کہ عقیدہ کا درجہ عمل سے زیادہ ہے تو ہم کو ان سے منازعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ
اس کا ہمکو بھی انکار نہیں واقعی یہ درست ہے کہ عمل کا درجہ عقیدہ سے مؤخرہ ہے مگر اس سے یہ کیونکر
لازم آیا کہ عمل فضول و بیکار ہے کیا جو چیز کسی سے مؤخر ہو وہ بیکار ہوا کرتی ہے کیا آپ کو معلوم
نہیں کہ شاخوں کا مرتبہ جڑ سے مؤخر ہے مگر باینہمہ کوئی بھی شاخوں کو بیکار نہیں کہہ سکتا کیونکہ
ہر شخص جانتا ہے کہ وہ درخت بارآور نہیں ہو سکتا جس کی شاخیں نہ ہوں اگرچہ اس کی جڑ
کیسی ہی مضبوط ہو ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ خالی عقیدہ جس میں عمل نہ ہو بارآور نہ ہوگا
مجرد عقائد سے بغیر عمل کے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو مطلوب شارع ہے گو کبھی بعض
کیفیات بغیر اعمال کے حاصل ہو جائیں مگر کیفیات خود مطلوب نہیں باقی جو ثمرہ شارع کے نزدیک
مقصود ہے وہ بغیر اعمال کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمکو اخبار شارع سے یہی معلوم ہوا ہے کہ بدون

۴۵

عقیدہ و عمل دونوں کی درستی کے ثمرۂ مقصودہ کے حصول کا یقین نہیں ہوسکتا گو یہ ممکن ہے کہ بعض کو صرف عمل کی درستی سے بھی حاصل ہو جائے مگر بوجہ وعدہ نہ ہونے کے اس کا یقین نہیں۔ ان لوگوں نے قرآن کی صرف ایک آیت یاد کرلی ہے ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون جس سے یہ سمجھ لیا کہ محض علم کافی ہے یعنی اصلاح عقیدہ اور یہ نہ دیکھا کہ قرآن میں بہت جگہ یہ بات بھی مصرح ہے کہ عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے بھی برابر نہیں ہوسکتے سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کالذین آمنو وعملوا الصلحت سواء محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون ایک مقام پر ارشاد ہے۔

ام نجعل الذین آمنو وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار۔

ایک جگہ ارشاد ہے افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا لایستوٗن بہرحال ثابت ہوگیا کہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ دین سے جو خاص ثمرہ مطلوب ہے، وہ بغیر عمل کے حاصل نہیں ہوسکتا ایک غلطی تو یہ تھی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض لوگ اعمال کی ضرورت تو سمجھتے ہیں مگر اعمال کی ساتھ کسی اور شئے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہیں ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عقیدہ اور عمل دونوں کو ضروری سمجھا مگر اس میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ انہوں نے تصحیح عقائد کے بعد اصلاح اعمال اور تکمیل اعمال ومواظبتِ اعمال کیلئے صرف ارادہ کو کافی سمجھا حالانکہ تجربہ اور مشاہدہ اسپر دلالت کرتا ہے کہ اصلاح اعمال کی سہولت کیلئے ایک اور شئے کی بھی ضرورت ہے اگرچہ نفس اصلاح ممکن ہے یعنی وہ امر اصلاح کا موقوف علیہ عقلاً نہیں ہے اور نہ عادۃً اس معنی کر موقوف علیہ ہے کہ اس کے بغیر کسی طرح بھی عمل نہ ہوسکے لیکن اس معنی کر ضرور موقوف علیہ ہے کہ بدون اس کے عمل بسہولت نہیں ہوسکتا پس وہ سہولت میں موقوف علیہ ہے گو صدور عمل بغیر اسکے ہوسکتا ہے۔ اسکی مثال ریل کی سی ہے کہ جیسے مسافت طویلہ بدون ریل کے بسہولت طے نہیں ہوسکتی اگرچہ بدقت طے ہوسکتی ہے ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح عقائد کے بعد گو صدور عمل تکلف بدون اس خاص شئے کے ہوسکتا ہے مگر بسہولت نہیں ہوسکتا بلکہ سہولت اعمال کیلئے اس خاص شئے کی ضرورت ہے مجھے اسوقت اسی کا بیان کرنا

مقصود ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جسکے معلوم نہ ہونے سے باب عمل میں بہت لوگ غلطی کررہے
ہیں حاصل اس شئے کا یہ ہے کہ صدور اعمال بعد اصلاح عقائد کے گو ارادہ سے ہو سکتا
ہے لیکن اس ارادہ کے کچھ معاوقات وموانع مزاحم ہو جاتے ہیں جس سے صدور اعمال دشوار
ہو جاتا ہے اور اس دشواری سے بعض اوقات عدم صدور اعمال کی نوبت آجاتی ہے تو
سہولت کیلئے اس شئے کی ضرورت ہوئی۔ اس شئے کے حصول کے بعد صدور اعمال بالکل
سہل ہو جاتا ہے۔ اور میں اسکو تجربہ سے ثابت کرنا چاہتا ہوں ابھی آیت سے استدلال
نہیں کرتا کیونکہ آیت میں دوسرے معانی بھی محتمل ہیں اسلئے اول میں تجربہ سے اس کا ثبوت
دیتا ہوں پھر بعد میں تبرعاً آیات سے تائید کردوں گا۔ سنئے اس شئے کا نام ہے مجاہدہ نفس
اور مخالفت نفس یہ بات بہت قابل قدر ہے اسکو معمولی نہ سمجھئے۔ اب تجربہ سے اسکی
ضرورت کو معلوم کیجئے کہ یہ تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نماز پڑھنے
کو بہت لوگوں کا جی بھی چاہتا ہے ترک صلوٰۃ سے ان کا دل بھی بُرا ہوتا ہے مگر پھر بھی بہت لوگ
نماز نہیں پڑھتے باوجودیکہ سب کو عقیدہ فرضیت صلوٰۃ کا حاصل ہے۔ اسی طرح بعضے ارادہ
کرکے پڑھتے بھی ہیں مگر وہ ارادہ بعض عوائق سے مضمحل ہو کر موثر نہیں رہتا اور اسوجہ سے
نماز پر دوام نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صدور و دوام اعمال کیلئے صرف اصلاح عقائد
یا ارادہ ضعیفہ کافی نہیں ہے بلکہ کسی اور شئے کی ضرورت ہے جسکے بعد صدور ودوام ورسوخ
اعمال ضروری ہے اور وہ تکمیل اعمال کا موقوف علیہ ہے اور وہ شئے مجاہدہ نفس اور مخالفت
نفس ہے چنانچہ بے نمازی اسی واسطے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا اتباع کرتا ہے اور اسکو
آرام دیتا ہے۔ اگر وہ مجاہدہ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا۔ یہاں شاید کوئی یہ سوال کرے کہ جو لوگ
نماز پڑھتے وہ کونسا مجاہدہ کرتے ہیں ان کے نفس کو کونسی مشقت ہے بلکہ الٹا ہم تو یہ دیکھتے ہیں
کہ ان کو نماز فوت ہونے سے رنج ہوتا ہے تو فوت میں مشقت ہوئی اس کا جواب یہ ہے کہ
ان کو مشقت تو ہے مگر شوق کی وجہ سے وہ مشقت باقی نہیں رہی اور شوق ہی کی وجہ
سے ان کو اس میں لذت آنے لگی جس کا اعلیٰ مرتبہ وہ ہے جو حدیث میں وارد ہے
جعلت قرة عيني في الصلوة اور یہ درجہ تو کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کہ

۴۷

نماز سے لذت اور راحت حاصل ہو تو کم و بیش مشقت رہتی ہی ہے مگر جسکو یہ درجہ حاصل ہے اس کو بھی اول مشقت و مجاہدہ کرنا پڑا ہے پھر مجاہدہ کرتے کرتے یہ حال ہوگیا کہ مشقت مغلوب اور شوق و لذت غالب ہوگئی یہ تو خواص کی حالت ہے اور عام طور پر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ نمازی آدمی بھی بعض دفعہ نماز میں کسل کرنے لگتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی توفیق سے وہ کسل دور ہو جاتا ہے اور یہ توفیق عادۃً ان کے مجاہدہ پر مرتب ہوتی ہے کیونکہ ان کا ارادہ نفس کی مخالفت ہی کا ہوتا ہے نفس کی موافقت میں ترک صلوٰۃ کا ارادہ نہیں کرتے ارادہ کے بعد ذرا دہ ہمت سے کام لیتے ہیں کہ توفیق حق شامل حال ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے حدیث میں اسباغ الوضوء علی المکارہ کا ثواب زیادہ وارد ہے اور اسی واسطے حدیث میں آیا ہے حجبت النار بالشہوات وحفت الجنۃ بالمکارہ کہ جہنم شہوتوں سے محجوب ہے اور جنت مشقتوں سے گھری ہوئی ہے یعنی جیسے باغوں کے گرد کانٹوں کی باڑہ ہوتی ہے ایسے ہی جنت کے گرد مکارہ ہیں جس سے مراد اعمال شاقہ ہیں تو جو شخص جنت کے اعمال کر رہا ہے یعنی وہ اعمال جو موجب دخول جنت ہیں یقیناً وہ مکارہ کو پھاند کر آیا ہے اگر وہ مکارہ کو پھاند کر نہیں آیا تو جان لے کہ یہ رستہ جنت کا نہیں ہے بس بات یہ ہے کہ مکارہ کو پھاند کر تو آیا ہے مگر اس کے شوق اور غلبہ حال سے وہ مکارہ لذیذ ہوگئے جیسے کوئی عاشق محبوب سے ملنے کو دس پانچ کوس طے کر کے آیا ہو تو مشقت تو اس نے ضرور کی گو عشق کی وجہ سے اسکو اس میں لذت ہی آئی ہو۔ اگر ایسے نہ ہوتے تو یہ اہل جنت نہ ہوتے کیونکہ اہل جنت کی تو شان یہ ہے کہ وہ جنت میں جاکر یوں کہیں گے الحمد للہ الذی اذہب عنا الحزن ط ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ ط لا یمسنا فیہا نصب ولا یمسنا فیہا لغوب ہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ان کی ساتھ غم لازم تھا گو جسمانی ہی تھا بہر حال وہ شبہ بالکل رفع ہوگیا کہ نمازی کونسا مجاہدہ کرتے ہیں حاصل جواب کا یہ ہے کہ شوق کی وجہ سے مشقت نہاں ہو جاتی ہے اور یہی خاص خاص لوگوں میں ہے ورنہ غالب طبائع میں تو شوق و محبت کم ہے ان میں تو مشقت موجود ہے اور ہمارے پاس اس جواب کے علاوہ ایک کافی جواب یہ بھی ہے کہ الشاذ کالمعدوم اگر کوئی

۲۰۸

نمازی ایسا بھی ہو جسکو اصلا مشقت نہوئی ہو اور نہ ہوتی ہو مادر زاد ولی ہو تو یہ شاذ ہے
اس سے گفتگو نہیں۔ غرض غالب حالت یہی ہے کہ نماز روزہ وغیرہ میں مشقت ہوتی ہے
اور اس مشقت میں بعض اوقات مانعیت کی نوبت پہونچ جاتی ہے اور اس مشقت کی
مانعیت کا علاج مجاہدہ ہے۔ پس ترتیب صحیح یہ ہے کہ اوّل تو عقیدہ صحیح کرے اور عقائد و
علوم صحیحہ حاصل کرے کہ اس سے اعمال کی تحریک ہوتی ہے۔ مثلاً یہ عقیدہ حاصل کیا کہ
اللہ تعالیٰ خالق و رازق ہیں اس سے خدا تعالیٰ کے احسانات اپنے اوپر معلوم ہونگے
اور ذکر و فکر احسانات سے محبت و اطاعت کی تحریک ہوتی ہے۔ اور یہ تحریک باعث
عمل ہے مگر اس باعث کی ساتھ بعض اشیاء مانع بھی ہوتی ہیں اور وہ موانع غالباً دو ہیں
ایک اسباب تنعم دوسرے ضعف نفس یعنی باوجود عقیدہ صحیح ہونے کے اور تحریک طاعت
پیدا ہونے کے بھی بعض دفعہ نفس ضعف و کم ہمتی کی وجہ سے یا اسباب تنعم اور سامان
راحت میں منہمک ہونے کے سبب سے نماز روزہ وغیرہ سے سستی کرتا ہے اور بعض دفعہ
نفس اپنی تسویل سے ان موانع کے ساتھ عقائد صحیحہ سے بھی مانعیت کا کام لیتا ہے اور یہ نہایت
حیرت کا مقام ہے یعنی عقائد و علوم صحیحہ سے تو طاعات و اعمال صالحہ کی تحریک ہوتی ہے
مگر نفس کبھی ایسی شرارت کرتا ہے کہ عقیدہ صحیحہ سے ترک اعمال میں کام لیتا ہے مثلاً کسی وقت
گناہ کا تقاضا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ گناہ سے جہنم میں
جائے گا اس وقت نفس عقائد صحیحہ میں سے ایک عقیدہ سامنے کر کے پہلے عقیدہ پر غلبہ
حاصل کرنا چاہتا ہے یعنی یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں اور اس عقیدہ کی اسطرح
تقریر کرتا ہے کہ واقعی گناہ کر کے جہنم میں جانیکا اندیشہ ہے مگر یہ جب ہے کہ گناہ سے توبہ
نہ کی جائے اور اگر توبہ کر لیجائے تو سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور میں عزم کرتا ہوں
کہ فوراً توبہ کر لوں گا اور ایک دفعہ کے بعد پھر یہ گناہ نہ کرونگا تو دیکھئے نفس کیسا شریر ہے
کہ عقیدہ صحیحہ سے معصیت میں مدد لیتا ہے حالانکہ اس عقیدہ کی تعلیم کا حاصل صرف
یہ ہے کہ جس شخص سے پہلے گناہ ہو چکے ہوں اور اب وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا چاہے
تو اس کی تسلی کیلئے یہ عقیدہ تبلایا گیا ہے تاکہ گنہگاروں کی ہمت شکستہ نہو اور وہ مایوس

۴۹

ہو کر خدا سے بے تعلقی ہی کو اپنے لئے تجویز نکرلیں دوسرے یہ کہ بجز انبیاء علیہم السلام کے اتقیاء و صلحا بھی معصوم نہیں بعض دفعہ ان سے بھی جہالت کی وجہ سے خطا سرزد ہو جاتی ہے اب اگر یہ عقیدہ نہ تبلایا جاتا کہ اللہ تعالی غفور رحیم ہے تو وہ ہرگز اپنے تقوی و صلاح ماضی کیطرف عود نکر سکتے بلکہ یہ سمجھ لیتے کہ اب تو ہم گنہگار ہو ہی چکے ہیں جہنم میں جائیں ہی گے پھر نفس کی لذات میں بھی کیوں کمی کی۔ خطا اور لغزش کے بعد اتقیا و صلحا کو تقوی و صلاح کی طرف واپس لانے والا یہی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی غفور رحیم ہے۔ اس سے انکو توبہ و استغفار کی ہمت ہوتی ہے اور چند روز تک بار بار توبہ و استغفار کرنے سے ان کی تسلی ہو جاتی ہے کہ انشاءاللہ وہ گناہ معاف ہو گیا خوب سمجھ لو اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ مخالفین اسلام نے جو اس تعلیم پر اعتراض کیا ہے کہ یہ تعلیم جرائم پر جری کرنی والی ہے یہ ان کی غلطی ہے جس کا منشا قلت تدبر ہے اگر وہ غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ تعلیم نہوتی تو ایک دفعہ جس سے گناہ ہو جاتا وہ عمر بھر جرائم ہی میں گرفتار رہتا ایک دفعہ یا چند دفعہ خطا ہو جانے کے بعد نیکی اور تقوی و صلاح کی طرف واپس لانے والا یہی عقیدہ ہے جسپر وہ اعتراض کر رہے ہیں۔ پس یہ عقیدہ تو مخلوق کے دلوں میں خدا کی محبت بڑھانے والا ہے جس سے مخلوق کو اپنے خالق سے تعلق پیدا کرنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور جرائم کو کم کرنے والا ہے اور استیصال جرائم کیلئے اس کی ساتھ دوسرا عقیدہ یہ ہے ان اللہ شدید العقاب کہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے اسی لئے قرآن میں جہاں اللہ تعالی کی رحمت و مغفرت کا ذکر ہے وہاں ساتھ ہی سطوت و شدت انتقام کا بھی ذکر ہے جس کا ایک نمونہ یہ ارشاد ہے نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم وان عذابی ہو العذاب الالیم اسی طرح کثیر مواقع میں (مخالفین کی فہم پر ہم کو تعجب ہے کہ وہ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جس سے ان کا دل خود راضی نہیں وہ انصاف کیساتھ اپنے دل کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے یقیناً وہ یہی کہے گا کہ میں ایسا پروردگار چاہتا ہوں جو رحیم و کریم ہو کہ اپنے جان نثاروں کی تقصیر و خطا سے درگذر کرتا ہو باغیوں اور دشمنوں کو سخت سزا دیتا ہو۔ یقیناً نظام عالم کا قیام ایسے ہی بادشاہ سے ہو سکتا ہے جو نہ محض سخت ہو کہ دوست بھی اس سے مطمئن نہوں نہ محض نرم ہو کہ دشمن بھی بیفکر ہو جائیں

۴۰

جب یہ عقلی قاعدہ اور مسلم مسئلہ ہے تو اسلام اسی کے موافق تعلیم کرتا ہے تو اعتراض کیوں کیا جاتا ہے ؟ اجابۃ ؟ غرض نفس کی شہوت وغیرہ بعض دفعہ عقائد صحیحہ سے مخالف کام لینے لگتی ہے اس لئے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جو اس مانع کا مقابلہ کرے اور وہ مجاہدہ ہے کیونکہ ان سب موانع کا حاصل یہ ہے کہ نفس لذت و آرام چاہتا ہے والعلاج بالضد پس اس کا علاج یہی ہے کہ نفس کو مشقت و تعب کا عادی بنایا جائے۔ اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ اب لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو محض اصلاح عقائد کو اصلاح عمل کے لئے کافی سمجھتے ہیں انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ عقیدہ کے مزاحم بعض موانع ہوتے ہیں اس لئے ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جس سے یہ موانع دور رہوں ورنہ وہ حالت ہوگی سے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ... پر طبیعت ادھر نہیں آتی

تو دیکھئے ایسی ضروری چیز اور لوگ اس سے بالکل غافل ہیں جو لوگ اعمال میں کوشاں بھی ہیں وہ بھی یوں چاہتے ہیں کہ بدون مشقت کے کام ہو جائے یعنی جنکو دین کا شوق بھی ہے وہ بھی مشقت سے گھبراتے ہیں تو یہ لوگ حقیقت میں طالب نہیں بلکہ ہوسناک ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ طالب دنیا کو تحصیل دنیا میں جسقدر مشقت ہوتی ہے اتنی مشقت د پریشانی دین میں نہیں ہوتی دوڑ دھوپ اور جسمانی تکالیف تو الگ رہیں طالب دنیا کو قلبی تشویش اور پریشانی بھی بہت ہوتی ہے اور طالب دین کو جسمانی مشقت بھی طالب دنیا کی برابر ہرگز نہیں ہوتی باقی قلبی تشویش و پریشانی تو اسکے پاس بھی نہیں پھٹکتی یہ اور بات ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے آخرت و جہنم کی اس کو دہشت ہوتی ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی۔ پس طالب دنیا اور طالب دین کے اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب دونوں کی طلب کو دیکھو تو دنیا والے باوجود اسقدر دوڑ دھوپ اور پریشانی کے یوں کہتے ہیں سے

دست از طلب ندارم تا کام من برآید ... یا تن رسد بجانان یا جان ز تن برآید

جب وہ دنیا کے کام میں اس قدر مشقت برداشت کرتے ہیں تو خدا کے کام میں اگر کسی کو خدا کی محبت ہے یہ درخواست کیوں ہے کہ سارا کام بدون مشقت کے ہو جائے مثلاً بعض لوگ

الم

نظر بد کے گناہ میں مبتلا ہیں جب ان سے کہا جاتا ہے کہ نگاہ نیچی رکھو اور مت دیکھو کیوں کہ دیکھنا اختیاری امر ہے اس کا ترک بھی اختیاری ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نظر کے روکنے پر قادر نہیں مگر واللہ یہ جواب بالکل غلط ہے یہ شخص قادر ضرور ہے مگر وہ مشقت سے گھبراتا ہے اور یوں چاہتا ہے کہ بدون مشقت کے قادر ہو جاؤں اس کے نزدیک قدرت کے معنی یہی ہیں کہ بدون مشقت کے آسانی سے کام ہو جائے سو اس معنی کر واقعی قادر نہیں مگر ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی یوں چاہے کہ بدون منہ میں لقمہ دیے کھانا کھالوں اور جب اس طرح پیٹ نہ بھرے تو کہنے لگے کہ کھانا بہت مشکل ہے ہاتھ ہلاؤ روٹی تک لیجاؤ اس کو توڑو پھر لقمہ بناؤ منہ میں دو پھر چباؤ پھر نگلو۔ اگر اسی کا نام دشواری ہے کہ کچھ بھی نہ کرنا پڑے تو واقعی نظر بد سے بچنا دشوار ہے اور تم اس کے روکنے پر قادر نہیں مگر اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کوئی عاقل اسکو تسلیم نہیں کر سکتا کہ قدرت علی العمل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اصلا مشقت نہ ہو اور عجز عن العمل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسیقدر مشقت ہو جب یہ معنی مسلم نہیں تو وہ لوگ جو اپنے کو غض بصر سے عاجز کہتے ہیں غور کریں کہ وہ ایسی حماقت میں مبتلا ہیں انہوں نے قدرت و عجز کی حقیقت ہی غلط سمجھ رکھی ہے ورنہ یہ لفظ کبھی زبان پر نہ لاتے کہ ہم غض بصر پر قادر نہیں۔ غرض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے نظر بد کو روک لیں سو قرآن میں اس کا ذمہ کہاں ہے وہاں تو مطلق حکم ہے قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم (مسلمانوں کو حکم دیدیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں) یعنی خواہ تکلیف ہو یا نہ ہو مشقت ہو یا نہ ہو کچھ پروا نہیں ان کو ہر حال میں غض بصر کرنا چاہیئے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت کا مطلب یہی ہے کہ باوجود مشقت کے غض بصر کرنا چاہیئے۔ اور اس مشقت کو برداشت کرنا چاہیئے یہ بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے کہ قرآن کی تعلیم کا اکثر طرز یہ ہے کہ ممنوعات میں انہی چیزوں سے صراحۃً منع کیا گیا ہے جکا تقاضا طبیعت انسانیہ میں ہوتا ہے اور جن کا تقاضا طبیعت میں نہیں بلکہ طبیعت انسانیہ کو اس سے خود نفرت ہے اس سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا چنانچہ اکل ربوا سے شراب پینے سے منع کیا گیا ہے مگر پیشاب پاخانہ کھانے سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا تقاضا تھا اس کا تقاضا نہ تھا ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب دوسرا

۴۲

مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملاؤ کہ جس چیز کا تقاضا طبیعت میں ہو اس سے رکنا مشقت و دشواری کا سبب ہے یہ مقدمہ عقلی اور بدیہی ہے اب سمجھئے کہ جب قرآن میں نظر بد سے منع کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ طبائع میں اس کا تقاضا ہے اور جس کا تقاضا طبیعت میں ہو اس سے روکنا سبب مشقت ہے تو آیت کا تو خود یہی مطلب ہوا کہ باوجود مشقت کے اس گناہ سے بچو مگر آجکل کے دینداریوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے سب کچھ ہو جائے اسی کی میں شکایت کر رہا تھا کہ یہ کیسی طلب دین ہے جس میں راحت کی طلب ہے حالانکہ طالب دنیا ذرا سی مردار دنیا کیلئے جان و دل سے مرتے کھپتے رہتے ہیں اور طالب دین کو بغیر مشقت کے حصول دین و اصلاح اعمال کا انتظار ہو رہا ہے افسوس

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

صاحبو اگر آپ اسی انتظار میں رہیں گے کہ بدون مشقت کے اعمال کی اصلاح ہو تو یہ شہوات نفسانیہ دل میں اپنی جڑیں ایسی مضبوط کر لیں گی کہ پھر واقعی اس کی اصلاح میں سخت مشقت کی ضرورت ہو گی کیونکہ ان شہوات سے جس قدر مسامحت و مساہلت کی جاتی ہے اسی قدر ان کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت لوگ اسی کے منتظر ہیں کہ کسی بزرگ کی توجہ سے ہماری اصلاح ہو جائے یا وظیفہ سے یا تعویذ سے نفس مہذب ہو جائے حاصل یہ کہ خود کچھ کرنا نہ پڑے۔ یاد رکھو یہ سخت غلطی ہے نفس تمہارا راہ مار رہا ہے اور یہ شیطان کی بڑی رہزنی ہے نفس کی اصلاح بدون مجاہدہ کے نہیں ہو سکتی توجہ اور وظیفہ سے اصلاح [illegible] نفس کی [illegible] میں ترقی ہو جاتی ہے آگے کو راہ مفتوح ہو جاتا ہے رذائل کی اصلاح [illegible] ہوتی ہے الا نادرا والنادر کالمعدوم۔ [illegible] دقیق اور رہبانیت تعمیق شیطان کی رہزنی یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ مشقت سے ترک معصیت میں کام لیتا خود معصیت کو ترک معصیت کا ذریعہ بناتا ہے یعنی جب کسی متقی کو بار بار نگاہ نیچی کرنے سے مشقت ہوتی ہے تو شیطان اس کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ میاں ایک دفعہ اسکو خوب جی بھر کے دیکھ لو اس سے ہوس پوری ہو جائیگی پھر نہ دیکھنا تو یہ روز روز کا رونا تو موقوف

۴۴۲

ہو جائے گا مگر واللہ اس جی بھر کے گناہ کرنے سے تو اس کی رگیں اور مضبوط ہو جائیں گی۔ پھر
اس کا اس گناہ سے نکلنا بہت دشوار ہو جاویگا کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ شہوت کو نظر سے
ترقی ہوتی ہے پھر جب جی بھر کے دیکھنے سے بھی آگ نہیں بجھتی تو شیطان یہ سبق پڑھاتا ہے
کہ ایک دفعہ جی بھر کے اس سے منہ کالا کر لو پھر توبہ کر لینا۔ اس کے بعد پھر ہر روز یہی
ہوتا رہتا ہے کہ آج توبہ کر دوں کل توبہ کر دوں ابھی جی نہیں بھرا اگر اب توبہ کرونگا تو پھر
تقاضا ہوگا چنانچہ بعض تو اسی انتظار میں ختم ہو گئے اور توبہ نصیب نہ ہوئی اور بعض کو سالہا سال
کے بعد عنایت حق نے سنبھالا تو توبہ کی توفیق ہوئی مگر ذخیرہ گناہوں کا کتنا جمع ہو گیا یہ تو
عملی خرابی ہوئی اور اعتقادی خرابی یہ ہے کہ یہ شخص ترک معصیت کا مقدمہ خیال کر کے
معصیت کو طاعت سمجھنے لگتا ہے پس یاد رکھو کہ ترک معصیت کیلئے بھی معصیت کا اختیار
کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ ابتدا ہی سے اس معصیت کے تقاضے کا مقابلہ کرنا چاہیئے ؎

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے — بہ نیروی شخصے بر آید ز جائے
وگر ہمچناں روزگارے ہلی — بگردونش از بیخ بر نگسلی
سرچشمہ باید گرفتن بمیل — چو پر شد نہ شاید گذشتن بہ پیل

اور جو شخص ترک معصیت کیلئے اغتیا معصیت کو ذریعہ بناتا ہے اس سے بھی یہی غلطی
ہوئی کہ اس نے مشقت سے بچنا چاہا مگر ے سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست
خوب سمجھ لو کہ مشقت سے بچنا ہی غلطی ہے۔ مرد ہو کر رہو نامرد نہ بنو۔ اور مرد اسی کا نام ہے
جو شیطان کا مقابلہ کرے پھر گناہوں سے بچنے میں مشقت اول اول ہی ہوتی ہے پھر ذرا
مشقت نہیں ہوتی جو اس سے بھی گھبراتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ گلستاں پڑھنے
سے گھبرائے اس کو سب عقلاً بھی جواب دیتے ہیں کہ یہ مشقت چند روزہ ہے پھر تم کو گلستاں
میں وہ لطف آئیگا کہ تم اسکو خود نہ چھوڑو گے اور اگر آج ذرا سی مشقت سے گھبراؤ گے تو پھر
جاہل رہوگے اور اس سے زیادہ مشقت کرنا پڑے گی یعنی پھاوڑہ چلانا پڑے گا۔ اسیطرح
گناہ کے چھوڑنے میں جو ذرا سی مشقت ہے اگر اس سے گھبراؤ گے تو اس سے بڑھکر مشقت
کا سامنا ہوگا ایک تو اسوقت جبکہ گناہ کا ارتکاب کروگے کیونکہ گناہ کرنے میں علاوہ عذاب

آخرت کے دنیا میں بھی عذاب ہوتا ہے گناہ سے دونوں جہان میں تکلیف ہوتی ہے۔ شاید
کسی کو یہ شبہ ہو کہ گناہ کرنے میں کیا مشقت ہے تو صاحبو! واللہ جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں
وہ سخت مصیبت میں گرفتار ہیں سکون قلب واطمینان کا انکو خواب بھی نہیں آتا ہر وقت
ان کا دل وحشت زدہ رہتا ہے اور گناہ کر کے اسکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا کہیں ٹھکانا
نہیں وہ خود اپنی نظر میں بہت ذلیل ہو جاتا ہے اور جب اسکو کوئی مصیبت پیش آجاتی
ہے۔ اس وقت تو اسکو ایسی پریشانی ہوتی ہے کہ بدحواس ہو جاتا ہے تو واللہ گناہ کرنے
والے بڑی غلطی میں ہیں کہ گناہ سے جو غرض تھی یعنی مسرت وہ بھی انکو حاصل نہیں ہوتی یہ
تو دنیا کی تکلیف ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے جو بہت سخت ہے مگر بعض لوگ
سیر بھر بوجھ اٹھانے کا تجربہ کر کے کئی من بوجھ اٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں یہ ان کی حماقت ہے انکی یہ پہلوانی
اسی وقت تک ہے جب تک کئی من کا بوجھ سر پر رکھا نہیں گیا جس دن بڑا بوجھ سر پر رکھا جائیگا
ان کا کچومر ہی نکل جائیگا ایسے ہی بعض لوگ جہنم کے پہلوان معلوم ہوتے ہیں مگر اس کو دیکھا
نہیں اسلئے ساری پہلوانی ہے اور جس دن دیکھ لیں گے اس دن یہ حالت ہوگی۔ یوم
یعض الظالم علی یدیہ یقول یالیتنی اتخذت مع الرسول سبیلا ۵ یا ویلتی لیتنی
لم اتخذ فلانا خلیلا ۵ لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاءنی وکان الشیطان للانسان
خذولا ۵ بس امراض باطنہ کے بھی علاج کا وہی طریقہ ہے جو امراض جسمانیہ کا ہے
کہ جب مرض لاحق ہو اسیوقت اس سے دور رہنے اور بچنے کی تدبیر کرو اسکو لپٹانے کا بھی نام
نہ لو اور گو گناہ سے بچنے میں کسی قدر مشقت ہوتی ہے مگر وہ تھوڑی دیر کی مشقت ہے پھر
راحت ہی راحت ہوگی مثلاً کسی کو حسن پرستی کا مرض ہو تو اسکو چاہیئے کہ حسین سے باتیں
کرنا ملنا ملانا اسکو گھورنا بالکل چھوڑ دے کہ یہ سخت مضر ہے گو اسوقت ٹھنڈک پہونچتی ہے مگر
اس کے بعد جڑ مضبوط ہو جاتی ہے اور عمر بھر کی مصیبت جان کو لگ جاتی ہے چونکہ اسوقت
مجھے زیادہ تر فروع ہی کا بیان مدنظر ہے اسلئے چند فروع مجاہدہ کی اور بھی بیان کرتا ہوں مثلاً
غضب کے روکنے میں بعض وقت تکلیف ہوتی ہے اور یہ مجاہدہ ہے مگر اس کے بعد ایک
خاص فرحت وراحت ہوتی ہے اور اگر غصہ کو نہ روکا گیا بلکہ جو زبان پہ آیا کہتا گیا تو اسوقت

۴۵

تو نفس خوش ہوتا ہے مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد دل میں کدورت ہوتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہی نفس جو پہلے بہکا رہا تھا بعد میں ملامت کرتا ہے اور اسکے بعد غصہ کے نتائج بد دیکھکر نوبت ہی قلق ہوتا ہے گو نفس ان کی تاویلات بھی کرے مگر پھر بھی اسکو کدورت ضرور ہوتی ہے تجربہ کرکے دیکھا گیا ہے کہ غصہ روکنا ہمیشہ اچھا ہوا اور جب اسکو جاری کیا گیا تو اس کا انجام ہمیشہ برا ہوا اور دل کو قلق بھی ہمیشہ ہوا جیسے مریض کو طبیب کہتا ہے کہ پرہیز کرو دوا پیو تو اس کو بد پرہیزی سے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے کیونکہ بد پرہیزی کا برا انجام بہت دلوں تک رہتا ہے اسی طرح گناہ کرکے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ گناہ کے بعد نفس خود اپنے کو ملامت نہ کرے پھر بعضے اس ندامت کے بعد ہمیشہ کیلئے گناہ سے توبہ کر لیتے ہیں اور بعضے ایک بار توبہ کرکے پھر گناہ کرتے ہیں پھر توبہ کرتے ہیں توبہ تو دل لگی ہو گئی اگرچہ یہ ثابت ہے کہ توبہ اگر سو بار بھی ٹوٹ جائے تب بھی قبول ہو جاتی ہے مگر یہ شرط تو ضروری ہے کہ توبہ کی حقیقت تو پائی جائے مگر اکثر حالت تو یہ ہے کہ جو لوگ ایک گناہ سے بار بار توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ صرف زبانی ہوتی ہے ورنہ عین توبہ کے وقت بھی ان کا یہ عزم ہوتا ہے کہ یہ گناہ پھر بھی کرینگے۔ میں اسی کو دل لگی کہ رہا ہوں۔ اسلئے جب کوئی شخص اعمال صالحہ کا قصد کرے یا اصلاح نفس کا ارادہ کرے تو وہ اپنے کو اس کام کے لئے پہلے تیار کرلے کہ اول اول مشقت برداشت کرنا اور نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی پھر مجاہدہ و مخالفت نفس کے مراتب مختلف ہیں ایک مرتبہ مبتدی کے مجاہدہ کا ہے ایک منتہی کے مجاہدہ کا ہے مبتدی کو تو مجاہدہ میں اول اول دشواری زیادہ ہوتی ہے اور منتہی چونکہ اپنے نفس کو مہذب کر چکا ہے اس سے اعمال صالحہ بلا تکلف صادر ہونے لگتے ہیں مگر ایک مجاہدہ کی ان کو بھی ضرورت ہے یعنی نفس کی نگہداشت کی کہ ہر وقت اس کے افعال و حرکات پر نگاہ رکھے غافل نہ ہو اور یہ مجاہدہ کچھ زیادہ دشوار نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو وہ سوار ہے جسکے نیچے ایسا گھوڑا ہے جسپر ابھی سواری شروع کی گئی ہے اسکو زیادہ ہوشیاری کی بھی ضرورت ہے اور زیادہ مشقت کا بھی سامنا ہے کیونکہ نیا گھوڑا بہت شرارت کرتا ہے اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے دوسرا وہ شخص ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہے

۴۶

جو سواری میں شائستہ ہو چکا ہے اس کو زیادہ مشقت کا تو سامنا نہیں مگر ہوشیار بیٹھنے کی اسکو بھی ضرورت ہے، کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی کبھی بمقتضائے حیوانیت شوخی کرنے لگتا ہے مگر وہ شوخی ایسی ہوتی ہے کہ سوار کی ذرا سی دھمکی اس کے دفع کرنے کو کافی ہے لیکن اگر سوار بالکل غافل رہا تو کسی وقت یہ شائستہ گھوڑے کے اوپر سے بھی ضرور گرے گا پس نفس کی نگہداشت کا مجاہدہ منتہی کو بھی لازم ہے۔ اب یہاں سے میں سالکین کی ایک غلطی پر تنبیہ کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ بعض دفعہ مہذب نفس بھی شوخی شرارت کرنے لگتا ہے سو بعض لوگوں کو یہ حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے نفس میں کوئی برا میلان دیکھکر بڑے گھبراتے ہیں کیونکہ ان کے ذہن میں یہ جم گیا ہے کہ مجاہدہ سے اخلاق رذیلہ بالکل زائل ہو جاتے ہیں اور منشا اس خیال کا یہ ہے کہ اکثر وسط طریق میں وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ تقاضائے معاصی گویا بالکل نہیں رہا حالانکہ اخلاق طبعیہ مجاہدہ سے زائل نہیں ہوتے بلکہ مغلوب و مضمحل ہو جاتے ہیں اور اکثر سلوک کے وسط میں غلبہ حالات و کیفیات کی وجہ سے بہت زیادہ مغلوب و مضمحل ہو جاتے ہیں اس طرح کہ زائل معلوم ہونے لگتے ہیں پھر انتہا میں جب غلبہ حالات کم ہو جاتا ہے اور تمکین حاصل ہوتی ہے تو اخلاق طبعیہ پھر ابھرتے ہیں اس وقت سالک گھبراتا ہے اور رنج کرتا ہے کہ افسوس ہنوز روز اول ہی ہے میرا تو سارا مجاہدہ ہی بیکار گیا نفس تو اسی حالت میں ہے جس حالت میں پہلے تھا اور یہ رنج اسلئے مضر ہے کہ اس کے اس رنج و غم سے شیطان کو راہ ملتا ہے کہ وہ اسکو تعطل کی طرف لیجاتا ہے اور اس حالت میں اس شخص میں شکستگی بھی بیحد ہو جاتی ہے کہ بات بات میں کہتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں ہوں اور ظاہر میں تو یہ تواضع ہے مگر اس میں رنگ شکایت کا ہے گویا خدا تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو بھلا کر یہ سمجھتا ہے کہ جب میرے اندر گناہ کا تقاضا موجود ہے تو اب میرے پاس کوئی نعمت نہیں حالانکہ یہ سخت ناشکری ہے پھر اس سے بڑھکر یہ کہ یہ شخص اپنی تمام ریاضات گذشتہ کو یاد کر کے اپنے دل میں یوں کہتا ہے کہ میں بڑا بدقسمت ہوں کہ اتنی محنت کے بعد بھی مجھے ناکامی ہی رہی بس اب میرے واسطے کیا رہا کچھ نہیں۔ اور بعض اوقات یہ شخص اپنی کامیابی سے مایوس ہو کر نفس کو بالکل آزادی دیدیتا

۴۷

ہے کہ جب مجاہدات کے بعد بھی ناکامی ہی ہے تو نفس کو مصیبت میں کیوں ڈالا یہ شخص اس غلطی میں اسلئے مبتلا ہوا کہ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں مجاہدہ کرکے تقاضائے گناہ سے بھی معصوم ہوگیا اور اب میرے اندر سے اخلاق رذیلہ بالکل نکل گئے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کشاکشی ہمیشہ رہتی ہے ہاں مبتدی جیسی نہیں رہتی اسلئے میں کہتا ہوں کہ اعمال صالحہ کا جب قصد کرے تو اول ہی نفس کو یہ سمجھالے کہ ان اعمال میں مشقت ہمیشہ رہے گی اور عمر بھر مجاہدہ کرنا ہوگا۔ اور یہاں سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ شیخ کتنی بڑی نعمت ہے کہ وہ کیسے کیسے عقبات سے سالک کو نکالتا ہے اور اس کا عقبات سے نکالنا یہی ہے کہ وہ حقائق صحیحہ پر مطلع کرتا اور غلط اعتقادات سے بچاتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری ولا | دامنِ رہبر بگیر و پس برآ
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق | عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

اور فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں دام و دانہ ست اے خدا | ما چو مرغان حریص بے نوا
بے عنایاتِ حق و خاصان حق | گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

خدا کے خاص بندوں کی کسی پر عنایت ہوجائے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ بہرحال خوب سمجھ لو کہ اعمال صالحہ میں مشقت ہمیشہ رہتی ہے کیونکہ وہ اعمال نفس کی خواہش کے خلاف ہیں نفس ان میں منازعت ضرور کرتا ہے قلیل یا کثیر اسلئے مخالفت نفس کی عمر بھر ضرورت ہے اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ اور یہاں سے بعض واعظین کی غلطی معلوم ہوگئی کہ وہ یہ آیت یعنی واذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالی کو مسلمانوں کے حق میں پڑھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو نماز میں کسل کرے وہ منافق ہے بات یہ ہے ان لوگوں کو قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ کسل کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ عمل میں مشقت کا سامنا ہو مگر عقیدہ میں ضعف یا شک ہو تو یہ وہ کسل نہیں ہے جو منافقین کی شان تھی یہ تو کسل طبعی ہے اور طبعی کسل اعمال شرعیہ میں مخلصین کو بھی ہوسکتا ہے

۱۸/۳

کیونکہ یہ اعمال نفس پر گراں ہیں نفس ان میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اور اعمال شرعیہ
میں مشقت کا سامنا ہونا آیت وما جعل علیکم فی الدین من حرج کے خلاف نہیں کیونکہ
آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین فی نفسہ آسان ہے دشوار نہیں یہ اور بات ہے کہ منازعت
نفس کی وجہ سے اس میں دشواری آجائے کیونکہ یہ ضرور ہے کہ اعمال شرعیہ میں
نفس کی خواہشوں کو پامال کیا جاتا اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے اور یہ نفس کو ضرور
گراں ہے تو اس منازعت وکشاکشی کی وجہ سے دشواری آجانا یسر فی نفسہ کے خلاف
نہیں اسی لئے قرآن میں وما جعل علیکم فی الدین من حرج سے پہلے وجاہدوا فی اللہ
حق جہادہ بھی آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ دین میں مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے پس ایک
جزو ہی کو مت دیکھو دونوں جزوں کو ملاؤ تو حاصل وہی نکلے گا جو میں نے عرض کیا ہے۔
اب سنئے کہ ... تو طبعی کسل ہے جس کا منشا منازعت نفس ہے یہ منافقین کے ساتھ خاص
نہیں اور ایک اعتقادی کسل ہے کہ اس شخص کو نماز کی فرضیت پر اور خدا اور رسول
پر ہی ایمان نہیں ہے محض کسی مصلحت کی وجہ سے نماز پڑھ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دل
سے نہ پڑھے گا بلکہ بیگار سی ٹالیگا اور کسل کی ساتھ نماز ادا کرے گا یہ کسل منافقین کی
شان ہے اور خدا نہ کرے کہ کسی مسلمان کی ایسی شان ہو۔ بہر حال اعمال شرعیہ میں مجاہدہ
کی ضرورت عمر بھر کے لئے ہے مبتدی کو بھی اور منتہی کو بھی اور دونوں کو کبھی نہ کبھی اعمال
میں منازعت نفس کی وجہ سے کسل بھی پیش آتا ہے مبتدی کو زیادہ منتہی کو کم اس کسل ہی
کے رفع کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے نیز کسی وقت دونوں کا نفس معاصی کا تقاضا کرتا
ہے اس کے مقابلہ کے لئے بھی مجاہدہ کی دونوں کو ضرورت ہے۔ تو ایک غلطی تو مبتدی
کرتا ہے کہ وہ اپنے کو مشقت سے بچانا چاہتا ہے اور مجاہدہ کرتا ہی نہیں بلکہ اسی انتظار
میں ہے کہ سارا کام بدوں مشقت کے ہو جائے اور ایک غلطی منتہی کرتا ہے کہ وہ
ابتدا میں مجاہدہ کرکے آئندہ کیلئے مجاہدہ سے اپنے مستغنی سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی
ہے کیونکہ طبائع بشریہ پھر عود کرتے ہیں اور اسوقت منتہی کو بھی معاصی کا تقاضا ہوتا ہے
اور اس کا نفس بھی طاعات میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اس وقت اس کو بھی مجاہدہ کی

۴۹

ضرورت ہوتی ہے مگر مبتدی اور منتہی کے مجاہدہ میں بڑا فرق ہے جس کی مثال اوپر گذر چکی ہے کہ جیسے ایک شخص تو شائستہ گھوڑے پر سوار ہو اور ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس پر آج ہی سواری کی گئی ہے۔ شائستہ گھوڑے کے سوار کو بھی ہوشیار بیٹھنے کی ضرورت ہے کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی شوخی شرارت کرنے لگتا ہے مگر اس کے دبانے میں اس قدر مشقت نہیں ہوتی جسقدر نئے گھوڑے کے دبانے میں ہوتی ہے اس لئے منتہی کا اپنے گذشتہ مجاہدہ وریاضت کو بیکار و بیہودہ سمجھنا بھی غلط ہے اور آئندہ کے لئے بھی وہ مجاہدہ سے مستغنی نہیں اور اعمال صالحہ کا کرنا کسی وقت بھی مشقت سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ فروع میں اس کی ایک اور مثال یاد آئی مثلاً کسی شخص کے اندر کبر ہے تو اس کے دو علاج ہیں ایک علمی اور ایک عملی علاج تو مثلاً یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور یوں سمجھے کہ مجھے اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسروں کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص یقینی معیوب ہو وہ معیوب ظنی سے بدتر ہے اسلئے مجھے اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا چاہیئے اور عملی علاج یہ ہے کہ جسکو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو اسکی ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آؤ اور یہ عملی علاج جزو اعظم ہے بدون اسکے علمی علاج تنہا کافی نہیں مگر اس کا بجالانا دشوار ضرور ہے۔ ہر شخص سے آسان نہیں مگر تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جب تک یہ عملی علاج نکیا جائیگا کبر دور نہ ہوگا۔ ایسے ہی حسد کا علاج یہ ہے کہ جس سے حسد ہو اسکے لئے ترقی خیر کی خوب دعا کیا کرے اور اسکی ساتھ احسان بھی کرتا رہے چند دن میں حسد دور ہوجائیگا مگر یہ بات آسان نہیں گو فی نفسہ یہ سب اعمال آسان ہیں مگر نفس کی منازعت کی وجہ سے دشوار ہو رہے ہیں۔ مگر ان میں دشواری اول اول ہی ہے کیونکہ نفس کی کشاکشی ابتدا میں زیادہ ہوتی ہے پھر زیادہ منازعت نہیں رہتی مگر ایک دو مرتبہ عملی علاج کرکے بیفکر نہونا چاہیئے بلکہ اسکو مدت دراز تک جسکو شیخ محقق تجویز کرے کرنا چاہیئے کیونکہ ایک دو دفعہ سے مرض کی جڑ نہیں جاتی اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

غرض یہ طریقہ ہے اعمال کی اصلاح کا اور باطن کی اصلاح کا کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اسکو مشقت کا عادی بنایا جائے مگر آجکل لوگوں سے مشقت تو ہوتی نہیں۔

۵۰

یوں چاہتے ہیں کہ ہمارے آرام میں بھی خلل نہ آوے اور اعمال کی بھی اصلاح ہوجائے
باطن کی بھی اصلاح ہوجائے چنانچہ ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے ایسا وظیفہ تبلادو جس سے
نماز قضا نہ ہو میں نے کہا کہ اگر وظیفہ قضا ہونے لگا تو اس کے واسطے دوسرا وظیفہ پڑھوگے
پھر اس کے واسطے تیسرا یہ تو سلسلہ غیر متناہی چلے گا اس کا علاج تو یہ ہے کہ جسدن نماز قضا
ہو اس دن بھوکے رہو یا ہر رہ صدقہ کرو اور یہ صدقہ نہ تو اتنا زیادہ ہو جس کا تحمل نہ ہو نہ
اتنا کم ہو جس کی نفس کو خبر بھی نہ ہو بلکہ درمیانی درجہ کا ہو جس سے نفس پر کسیقدر گرانی ہو اور
اس سے کہدو کہ جب تو نماز قضا کرے گا میں تجکو یہی سزا دوں گا۔ اور یہ علاج میں نے یا صوفیہ
نے اپنی طرف سے اختراع نہیں کیا بلکہ نصوص سنت میں اس کی اصل موجود ہے حدیث میں
ہے من قال تعال اقامرک فلیتصدق یعنی جس کی زبان سے یہ کلمہ نکل جائے کہ آؤ جوا
کھیلیں وہ صدقہ کرے اسی طرح حیض کے زمانہ میں غلطی سے جماع ہوجائے تو وہاں بھی
صدقہ کا حکم ہے ابتدائے حیض میں ایک دینار اور آخر میں نصف دینار۔ اور اس میں راز
یہ ہے کہ صدقہ کرنے سے نفس پر زیادہ مشقت پڑتی ہے وہ اس سے بچنے کیلئے تھوڑی مشقت
کو برداشت کرلیتا ہے اور یہ کام اس سے چھوٹ جاتے ہیں تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان مواقع کیلئے کوئی وظیفہ نہیں تبلایا بلکہ ایسا علاج تبلایا جس میں نفس کو مشقت ہے اس سے
صاف معلوم ہوا کہ اصلاح نفس کا طریقہ مجاہدہ ہی ہے وظیفوں سے اصلاح نہیں ہوا کرتی۔
شاید طلبہ کو یہاں یہ شبہ ہو کہ امام ابوحنیفہؒ تو غرامت مالیہ کو ناجائز فرماتے ہیں پھر تم یہ جرمانہ
کیونکر تبلاتے ہو۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اپنے اوپر جرمانہ کرنا جائز ہے دوسروں پر جائز
نہیں اور ہم یہی تو تعلیم کرتے ہیں کہ جب عمل میں کوتاہی ہو تم خود اپنے اوپر جرمانہ کیا کرو یہ تو نہیں
کہتے کہ مریدوں سے کوتاہی ہو تو ان پر جرمانہ کرکے تم وصول کیا کرو اگر کوئی شیخ ایسا کرے
تو بیشک ناجائز کا مرتکب ہوگا۔

یہ تو وہ امراض تھے جو مردوں اور عورتوں میں مشترک تھے اب میں بعض ان امراض کا
علاج تبلاتا ہوں جو مستورات کی ساتھ خاص ہیں کیونکہ اسوقت مستورات کا مجمع بھی موجود ہے
سو مستورات میں ایک مرض یہ ہے کہ جب چند عورتیں جمع ہونگی تو ہمیشہ دنیا کی باتیں کریں گی

۵۱

مرد کبھی جمع ہوتے ہیں تو کبھی خدا و رسول کی باتیں بھی کر لیتے ہیں مگر عورتوں کے مجمع میں خدا و رسول کی باتیں کبھی سننے میں نہیں آئیں بلکہ ان کی تمام تر گفتگو زیور کپڑے روپے پیسے کے متعلق ہوتی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان میں زیور کی محبت اور لباس کی محبت زیادہ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ زیور کا استعمال کم کر دیا جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ اپنے گھر میں استعمال کم کرو کیونکہ اپنے گھر میں تو عموماً عورتیں زیور پہنتی ہی نہیں اور لباس بھی معمولی ہی پہنتی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی دوسرے کے جاؤ تو زیور کم پہنکر جاؤ اور لباس بھی معمولی پہنکر جاؤ باقی سارے زیور کو اور قیمتی جوڑوں کو اپنے گھر میں پہنو کیونکہ شریعت نے عورتوں کو چاندی سونے کا زیور اور ریشم کا کپڑا صرف اسی لئے حلال کیا ہے تاکہ وہ شوہر کے سامنے اس سے زینت کر سکیں تو ان کے استعمال کا اصلی محل اپنا ہی گھر ہے مگر اب عورتوں نے اس تعلیم کے خلاف یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ شوہر کے سامنے تو معمولی حالت میں رہیں گی اور دوسرے گھر بن ٹھنکر جائیں گی تو یہ عمل خلاف شریعت بھی ہے اور اس سے زیور و لباس کی محبت بھی بڑھتی ہے اسلئے عورتوں کو شریعت کی اصل تعلیم پر عمل کرنا چاہئے کہ اپنے گھر میں سب زیور لباس پہنا کریں اور دوسرے گھر میں معمولی زیور و لباس پہنکر جایا کریں اس سے زیور و لباس کی محبت ان کے دل سے کم ہو جائے گی اور سب سے بڑا مجاہدہ یہ ہے کہ شادی اور دوسری تقریبات کے موقعہ پر سادے کپڑے اور سادا زیور پہنکر جایا کریں۔ اصلاح تو اسی طرح ہوگی بغیر اس کے کتابیں پڑھنے اور وعظ سننے سے کچھ نہ ہوگا۔ رہا یہ کہ نوبت دشوار ہے دل پر آرا چل جائے گا کہ بھری برادری میں سب تو اچھے زیور و عمدہ لباس سے آئیں اور ہم سادے لباس معمولی زیور میں ہوں تو صاحبو! دنیا کا بھی تو کوئی کام بدون محنت کے نہیں ہوتا اے اللہ دینداری ہی کی بابت ایسی سستی کیوں ہے کہ لوگ دیندار بدون محنت کے بننا چاہتے ہیں۔

؎ ناز پرور دۂ تنعم نہ برد راہ بدوست عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ اتنی محنت کرو جس سے نفس تھک جائے بعضے اہل مجاہدہ ایسے بھی ہیں چنانچہ ہمارے ساتھ سفر حج میں جہاز میں ایک شخص تھے وہ کئی کئی دن تک کچھ نہ کھاتے اور جب کھانے بیٹھتے تو کئی دن کی خوراک ایک ہی وقت میں کھا جاتے لوگوں نے

۵۴

ان سے کہا کہ یہ کیا واہیات ہے کہ ایک وقت میں تم کئی دن کی خوراک کھا جاتے ہو کہا
میں مجاہدہ کرتا ہوں کیونکہ مجاہدہ کی ایک قسم تو ترک اکل ہے اور ایک قسم اکثار اکل
یہی ہے کہ اتنا کھائے کہ نفس پریشان ہو جائے کیونکہ مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان
کرنا ہے اور جس طرح ترک طعام سے پریشان ہوتا ہے بہت کھانے سے بھی پریشان ہوتا ہے
سو یہ قول غلط ہے مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کو مشقت
کا خوگر بنانا اور راحت و تنعم کی عادت سے نکالنا ہے اور اس کے لئے اتنا مجاہدہ کافی ہے
جس سے نفس پر کسیقدر مشقت پڑے بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ بالکل
معطل ہو جائے گا تو خوب سمجھ لو کہ محنت ہمیشہ مستحسن نہیں بلکہ جب اعتدال سے ہو اور
اس پر نتیجہ اچھا مرتب ہو اسوقت مستحسن ہے اس پر مجھے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ
کا مقولہ یاد آیا کہ آپنے ایک مدرس کو مدرسہ سے الگ کرنا چاہا اور مہتمم صاحب نے ان کی سفارش
کی کہ یہ محنتی بہت ہیں تو مولانا نے فرمایا کہ اگر محنت ہی مطلوب ہے تو مجھے چالیس روپے تنخواہ
دیکر مدرس اول کیوں بنایا بلکہ ایک پنہاری کو چکی دیکر درسگاہ میں بٹھلا دو وہ مجھ سے
زیادہ محنت کرے گی اور مزدوری صرف دو آنہ لیگی۔ پس مجاہدہ میں افراط بھی مذموم ہے بلکہ
اعتدال کی رعایت لازم ہے اسی کو شیخ سعدی فرماتے ہیں ؂

نہ چنداں بخور کز دہانت برآید ۔۔۔ نہ چنداں کہ از ضعف جانت برآید

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک
قواما ہ یعنی خدا کے خاص بندے وہ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں
نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ وہ خرچ اس کے درمیان میں معتدل ہوتا ہے پس مجاہدہ میں بھی اعتدال
کی رعایت کرنا چاہیئے۔ مگر اس اعتدال کو بھی آپ اپنی رائے سے تجویز نہ کیجئے کیونکہ بیمار
کی رائے بیمار ہوتی ہے اس طریق میں اپنی رائے سے کامیابی نہیں ہوتی۔ ؂

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست ۔۔۔ کفر ست دریں مذہب خودبینی و خودرائی

بلکہ کسی محقق سے درجہ اعتدال معلوم کیجئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں علمائے قوانین ظاہرہ و باطنہ
پیدا کئے ہیں ان سے رجوع کرو اور ان سے طریق مجاہدہ معلوم کرو۔ پھر جیسے طالبان

عمل میں دو فرقے ہیں ایک وہ جو محنت سے بچنا چاہتے ہیں دوسرے وہ جو محنت میں غلو کرتے ہیں اسی طرح طالبان علم میں بھی دو فرقے ہیں ایک وہ جو یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا بھی نہ پڑے اور عالم ہو جائیں اس کی ترکیب انہوں نے یہ نکالی کہ مدرسہ میں داخل ہو کر کسی جماعت میں شریک ہو گئے اور کبھی کبھی درس میں بھی شریک ہو گئے پھر دس دن بارہ دن کو غائب ہو گئے نہ مطالعہ ہے نہ تکرار ہے نہ سبق کے وقت توجہ ہے جماعت نے کتاب ختم کر لی تو ان کی بھی ختم ہو گئی وہ درسیات سے فارغ ہو گئی تو یہ بھی فارغ کہلانے لگے گو واقع میں بالکل ہی فارغ ہوں یعنی کورے تو یاد رکھو اس طرح علم نہیں آیا کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسوں ہی کے واسطے فرمایا ہے ؎

لو کان ہذا العلم یدرک بالمنی ماکان یبقی فی البریۃ جاہل

فاجہد ولا تکسل ولا تک غافلا فندامۃ العقبیٰ لمن تیکاسل

اور بعضے محنت میں افراط کرتے ہیں کہ اتنی محنت کرتے ہیں کہ دماغ بھی خراب ہو جائے۔

افراط تفریط دونوں برے ہیں۔ شریعت کو ہر شے میں اعتدال مطلوب ہے، اہل مجاہدہ کا ایک افراط یہ بھی ہے کہ بعضے تقلیل غذا میں غلو کرتے ہیں بعضے ہاتھ کو سکھاتے ہیں بعضے لباس نہیں پہنتے بلکہ آگ سلگا کر سردی گذارتے ہیں یہ وہ مجاہدے ہیں جو آجکل جوگیوں میں رائج ہیں اور غضب یہ ہے کہ بعضے مسلمان بھی ان مجاہدات کو کمال اور جوگیوں کو باکمال سمجھنے اور ان کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ کچھ کمال نہیں کیونکہ بدن کو مار دینے کیا ہوتا ہے مطلوب تو وہ مشقت ہے جس سے نفس پر مشقت ہو یہ ضرور ہے کہ مشقت نفس میں بعض دفعہ مشقت جسم کو بھی دخل ہوتا ہے مگر اس میں اعتدال ضروری ہے مثلاً روزہ رکھ لیا جائے اعتکاف کر لیا جائے بس یہ مشقت کافی ہے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔ صاحبو! جس طرح طبیب دوا تجویز کر کے اس کی مقدار بھی خود ہی تجویز کرتا ہے اسی طرح آپ کو مجاہدہ کی مقدار بھی شریعت ہی سے معلوم کرنا چاہیے جبکہ اصل مجاہدہ کو آپ نے شریعت ہی سے معلوم کیا ہے۔

اب یہاں ایک بات اور سمجھئے کہ مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں ایک مجاہدہ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی کیا جائے مثلاً نوافل کی تکثیر سے نماز کا عادی کرنا اور روزہ کی کثرت سے حرص طعام وغیرہ

کم کرنا اور ایک مجاہدہ یعنی مخالفت نفس ہے کہ جسوقت نفس معصیت پر داعی ہو اس وقت اسکے تقاضے کی مخالفت کرنا۔ اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ بھی اسی کی تحصیل کیواسطے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہوگا تو اسکو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی۔ لیکن اگر کسی کو بدون مجاہدہ جسمانیہ کی مخالفت نفس پر قدرت ہوجائے تو اسکو مجاہدہ جسمانیہ کی ضرورت نہیں مگر ایسے لوگ شاذ و نادر ہیں اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدہ جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کے چار ارکان ہیں ترک طعام۔ ترک کلام۔ ترک منام۔ و ترک اختلاط مع الانام اور ترک سے مراد تقلیل ہے ترک کلی مراد نہیں۔ جو شخص ان ارکان اربعہ کا عادی ہو جائیگا واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائیگا کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا مگر میرا مقصود اسوقت مجاہدہ جسمانیہ کا بیان کرنا نہیں ہے بلکہ مجاہدۂ نفسانیہ کا بیان مقصود ہے کہ گناہ کے وقت نفس کو روکو اور اس میں جو مشقت لاحق ہوتی ہے اسکو برداشت کرنا چاہئیے کیونکہ بدون مشقت کے کوئی کام نہیں ہو سکتا نہ دنیا کا نہ دین کا۔ یہ ہے وہ مسئلہ جسکی ضرورت تھی اور لوگ اس سے غافل ہیں یعنی مخالفت نفس کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے اس کی مخالفت کرو۔ اور یہ بات اس وقت آپ کو حاصل ہوگی جبکہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی مخالفت کیا کرو۔ مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے بلکہ اس کی درخواست کو رد کر دیا جائے دس دفعہ میں سے ایک دفعہ اس کی جائز خواہش پوری کر دی اور نو دفعہ ٹالدی جب مباحات میں تم مخالفت نفس کے عادی ہوگے اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہوگے اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے وہ بعض اوقات تقاضائے معصیت کے وقت اسکو نہیں دبا سکتا تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے یہاں سے معلوم ہوا کہ صوفیہ نے جو ارکان اربعہ مجاہدہ کے تجویز کئے ہیں اس میں انہوں نے ابتداع نہیں کیا اول تو احادیث میں غور کرنے سے ہر رکن کی اصل مل سکتی ہے دوسرے انہوں نے تسہیل مخالفت نفس عند ارادۃ المعصیۃ کیلئے یہ نوع مجاہدہ کی بطور تدبیر کے تجویز کی ہے تدبیر میں نصوص کی بھی حاجت نہیں البتہ نصوص کے خلاف نہ ہونا چاہئیے خلاصہ یہ کہ لوگوں نے جو یہ سمجھ لیا ہے کہ

۵۵

دین کے کاموں میں مشقت برداشت کرنیکی ضرورت نہیں غلط ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ
دین سارا مجاہدہ ہی ہے کیونکہ دین نام ہے۔ پابندی کا اور پابندی نفس کو گراں ہے۔
پس بدون مجاہدہ کے دین کامل نہیں ہوسکتا۔ اب میں اس مسئلہ کو ان آیات پر منطبق کرنا
چاہتا ہوں جو میں نے شروع میں تلاوت کی ہیں۔ میں نے تین آیتیں تلاوت کی ہیں ایک
من کان یرجو لقاء اللہ فان اجل اللہ لآت وہو السمیع العلیم یہ آیت راجع الی العقیدہ ہے
ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں تو اللہ کا وہ وقت معین ضرور
آنیوالا ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اقوال کو) خوب سنتے اور (ان کے افعال واحوال کو)
خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اوپر بعض مسلمانوں کو جو کفار کی ایذاء سے گھبراتے تھے
تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ان کو صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائیگا کہ ہم ایمان
لے آئے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی حالانکہ ہم ان سے پہلے مسلمانوں کو بھی آزمائش
سے پرکھ چکے ہیں اسکے بعد جملہ معترضہ کے طور پر کفار کو یہ مضمون سنایا گیا ہے کہ کیا ان کا
یہ خیال ہے کہ وہ ہم سے بھاگ جائیں گے سو ان کی یہ تجویز بہت بیہودہ ہے اس جملہ
معترضہ میں کفار کی تنبیہ کیساتھ مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی بھی کر دی گئی کہ کفار کی یہ ایذائیں
چھوڑنے والی نہیں پھر ہم ان کو اچھی طرح پکڑنے والے ہیں اس کے بعد پھر مسلمانوں کی طرف
روئے سخن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں ان کو تو ایسے واقعات سے
پریشان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ کا وہ وقت مقرر ضرور آنے والا ہے (اسوقت سارا غم
غلط ہو جائیگا) اور اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں (تو وہ ان کی باتوں کو سنتے اور کاموں
کو جانتے ہیں اسوقت ان کی طاعات قولیہ اور طاعات فعلیہ سب کا اجر دیکر ان کو خوش
کرینگے) اس آیت میں رجا سے مراد اعتقاد جازم ہے مگر اس میں ایک لطیفہ ہے جسکی وجہ سے
اعتقاد کو لعنوان رجا بیان فرمایا وہ یہ کہ آیت کی ہے جسکے مخاطب کفار بھی ہیں جو قیامت کے معتقد
نہ تھے منکر تھے اسلئے اللہ تعالیٰ نے آیت کو رجا و امکان سے شروع فرمایا جس سے کفار کو بھی انکار
نہیں ہوسکتا کیونکہ استحالہ کی تو اس میں کوئی بات ہی نہیں اور جب ممکن ہے تو ارشاد فرماتے ہیں
کہ جسکو لقاء اللہ کا امکان بھی معلوم ہو۔

ہم اسکو بتلاتے ہیں کہ اس کا وقوع بھی ضرور ہونے والا ہے پس ہماری خبر کے بعد اس کے وقوع میں شک نکرنا چاہیئے وہو السمیع العلیم یہ صفات یہاں بہت ہی مناسب ہیں کیونکہ ایمان کے دو جزو ہیں ایک تصدیق بالقلب دوسرے اقرار باللسان کیونکہ قدرت کے وقت اقرار باللسان بھی فرض ہے تو ایمان کے بیان میں ان صفات کا ذکر بہت ہی خوشنما ہے تاکہ بندوں کو اطمینان ہوجائے کہ ہمارا ایمان خدا تعالی سے مخفی نہیں رہ سکتا ان کو ضرور اس کا علم ہوتا ہے تصدیق قلبی کو بھی جانتے ہیں اور اقرار لسانی کو بھی سنتے ہیں یہ آیت تو باب العقائد کے متعلق تھی۔ اس کے بعد دوسری منزل مجاہدہ ہے جو تصحیح عقائد سے موخر ہے اور تکمیل اعمال سے مقدم ہے یعنی اعمال کی تحریک تو عقائد ہی سے ہوجاتی ہے مگر تکمیل اور رسوخ مجاہدہ سے ہوتا ہے اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے ومن جاہد فانما یجاہد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العلمین یعنی جو شخص کچھ محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی واسطے محنت کرتا ہے بیشک اللہ تعالی تمام اہل عالم سے بے نیاز ہے (اسکو کسی کی محنت و مجاہدہ کی ضرورت نہیں) میرا مقصود اس جگہ یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالے نے اول عقائد کا ذکر فرمایا پھر مجاہدہ کا ذکر اعمال کے ذکر سے جو آئندہ تیسری آیت میں آتا ہے پہلے فرمایا اس کے کچھ تو معنی ہیں سو ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں اور کوئی وجہ ہو میرے ذہن میں اس کی وجہ یہ آئی ہے کہ اس ترتیب سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ عقائد مذکورہ آیت اولی کے صدور اعمال مذکورہ آیت ثالثہ میں موثر ضرور ہیں مگر وہ تاثیر بلا واسطہ کمزور ہوتی ہے اور بواسطہ مجاہدہ کے قوی ہوجاتی ہے اس لئے مجاہدہ کے توسط بین العقائد والاعمال ظاہر کرنے کے لئے یہ ترتیب اختیار کی گئی ہے اب آیت کا مطلب سنئے مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے واسطے مجاہدہ کرتا ہے یہ جملہ اسواسطے فرمایا کہ نصیحت کا اثر کامل ہو کیونکہ جب نصیحت میں ناصح کی کوئی غرض ہوتی ہے اثر کم ہوتا ہے اور دنیا میں بے غرض نصیحت کرنے والا بجز انبیاء علیہم السلام کے کوئی نہیں مگر انبیاء کی نصیحت تو خدا ہی کی نصیحت ہے وہ تو محض مبلغ سفیر ہیں باقی سب کی کچھ نہ کچھ غرض ہوتی ہے اسی لئے امام غزالی رح نے لکھا ہے کہ جیسا شاگرد کو استاد کا ممنون ہونا چاہیئے ایسا ہی استاد کو بھی شاگردوں کا ممنون ہونا

۵۷

چاہیئے کیونکہ اگر شاگرد نہوتے تو استاد کے علوم میں ترقی نہ ہوتی کیونکہ تجربہ یہ ہے
کہ بہت سے علوم استاد کے قلب پر درس کے وقت القا ہوتے ہیں اور یہ شاگرد
کی کشش سے ہوتا ہے جیسے بچہ ماں کی پستان چوستا ہے تو دودھ اتر آتا ہے اگر بچہ
دودھ پینا چھوڑ دے تو چار دن میں اس کی پستان خشک ہو جائیں اسی طرح ترقی فی العلوم
میں شاگردوں کا استاد پر احسان ہے۔ پس دنیا میں جس پر بھی کوئی احسان کرتا ہے محسن الیہ
کی طرف سے بھی اسپر کوئی نہ کوئی احسان ضرور ہے بجز حضرت حق کے کہ ان کو کوئی کچھ نفع
نہیں پہونچا سکتا۔ ان کے افعال معلل بالاغراض ہیں وہ جس پر جو احسان کرتے ہیں بالکل
بے غرض اور سراسر عنایت و کرم ہی ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

اسی لئے یہاں فانما یجاہد لنفسہ پڑھا گیا تاکہ نصیحت کا اثر کامل ہو جائے کہ ہم کو تمہارے
اعمال و مجاہدات سے ذرا بھی نفع نہیں جو کچھ نفع ہے سراسر تمہارا ہی ہے پھر مجاہدہ کر کے
اپنی ہی ذات پر احسان کرو کسی دوسرے پر احسان نہ کرو ان اللہ لغنی عن العلمین بیشک ۵۸
اللہ تعالیٰ کی ذات اہل عالم سے بے نیاز ہے یہ لفظ ہمارے محاورہ میں خدا تعالیٰ کے
متعلق چند مقام پر استعمال کیا جاتا ہے بعض جگہ اس کا استعمال بری طرح کیا جاتا ہے
اس سے احتراز کرنا چاہیئے یعنی جب کوئی جوان موت ہو جاتی ہے جو چھوٹے چھوٹے
بچے چھوڑ کر مر گیا ہو تو اس وقت برادری والے تعزیت کو جمع ہوتے ہیں اور میت
کی موت کا ذکر ہوتا ہے تو ایک کہتا ہے ہائے ہائے کیسا جوان تھا جوانی چڑھ رہی تھی
دوسرا کہتا ہے ابھی ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا عمر نے وفا نہ کی تیسرا کہتا ہے کہ
کیسی بیوقت موت ہوئی بچے کیسے ذرا ذرا سے چھوڑ گیا ان کی پرورش کی بڑی دقت
ہوگئی چوتھے بوڑھے بجکڑ سب کے جواب میں کہتے ہیں میاں اس کی ذات بڑی بے نیاز ہے
وہ بے پرواذات ہے اس موقع پر اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ نعوذ باللہ کارخانہ
خداوندی میں بڑا اندھیر ہے مصالح عباد پر مطلق نظر نہیں بس جو جی میں آیا کر دیا جو چاہا
حکم دیدیا تو خدائی کیا ہوئی اودھ کی سلطنت یا ان بناؤ نگر کا راج ہو سو یہ کلمہ

اس موقع پر تو بہت سخت ہے اسکے تو یہ معنی ہوئے کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں حالانکہ قرآن خدا
کی رحمت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ غرض یہ معنی میں نے اسلئے بیان کر دیئے تاکہ کوئی
آیت میں لفظ غنی کو اس معنی پر محمول نکرے بلکہ قرآن میں غنی کو دو معنی مین استعمال کیا
گیا ہے ایک یہ کہ خدا کو تمہارے عمل صالح سے کوئی نفع نہیں یہاں یہی معنی ہیں دوسرے
یہ کہ خدا کا تمہارے کفر و معاصی سے کچھ ضرر نہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ان تکفروا
فان اللہ غنی عنکم کہ اگر تم کفر کرو تو خدا تعالیٰ کو اس سے ضرر نہ ہوگا۔ تیسری آیت اعمال
کے متعلق ہے والذین آمنو وعملوا الصالحات لنکفرن عنہم سیئاتہم ولنجزینہم
احسن الذی کانوا یعملون یہاں ایمان کا مکرر ذکر اسلئے فرمایا تاکہ معلوم ہوجائے کہ
عمل بدون ایمان مقبول نہیں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک
کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرمادیں گے یعنی جہنم سے ان کو نجات دینگے
اور ان کو جزاء حسن دینگے میرا مقصود جو کچھ تھا وہ بحمد اللہ حاصل ہوگیا کہ ایمان وعمل
صالح مقصود اصلی ہے اور مجاہدہ اسی کی تکمیل کے واسطے ہے کہ بدون مجاہدہ کے عمل
صالح علی سبیل الکمال حاصل نہیں ہوتا چنانچہ برادری کی رسمیں بھی لوگوں سے اسی واسطے
نہیں چھوٹتی ہیں کہ وہ مجاہدہ سے کام نہیں لیتے رسوم قدیمہ کے چھوڑنے میں نفس کو کلفت
ضرور ہوتی ہے لیکن اگر نفس مجاہدہ کا عادی ہو تو اس سے گھبرائے گا نہیں نہ ذلت
کی پروا کرے گا نہ کسی کے طعن کی پروا کرے گا اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ذلت
اور طعن کی پروا کرنا محض اسوجہ سے ہے کہ دین کی وقعت نہیں یا دیندار بننے کی خواہش
نہیں کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ جس چیز کی وقعت انسان کی نظر میں ہو یا اس سے محبت
ہو تو اس کی تحصیل میں ذلت وطعن کی ہرگز پروا نہیں۔ چنانچہ بہت سے شرفاء کو آپ
دیکھیں گے کہ وہ بازاری عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں کیا اس سے برادری میں ان کی
ذلت نہیں ہوتی یا لوگ طعن نہیں کرتے مگر چونکہ اسکو اس سے محبت ہے اسلئے کسی کی بات
کی پروا نہیں کرتا اسی طرح بعض لوگ اپنی لڑکی کو ایسے لڑکے سے بیاہ دیتے ہیں جو ذات
میں یا نسب میں ان سے کم ہے مگر مالدار بہت بڑا ہے اس موقعہ پر بھی برادری کی طرف

بہت کچھ لعنت ملامت ہوتی ہے مگر نفع کے سامنے کسی بات کی پرواہ نہیں کی جاتی۔
اے اللہ! دین ہی اسواسطے رہ گیاہے کہ یہاں ہر مانع کی پرواکی جاتی ہے کوئی کہتاہے
کہ اس میں چھوڑنے میں ذلت ہے کوئی کہتاہے کہ برادری طعن دے گی کہ خرچ کرتے ہوئے
جان نکلتی تھی اسلئے شریعت کی آڑلیلی کوئی کہیگا کہ ان کو دوسروں کے یہاں کھانا ہی آتا ہے
کھلانا نہیں آتا میں تسلیم کرتاہوں کہ برادری سب کچھ کہے گی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ سب
باتوں میں برادری کے کہنے کی پرواہ نہیں کی جاتی بعض لوگ کسی غریب کی زمین یا گھر کا کوئی
حصہ دبا لیتے ہیں برادری تو وہاں بھی برا بھلا کہتی ہے کوئی چماری سے یا لونڈوں سے منہ
کالا کرتاہے وہاں بھی تو لوگ اسکو ذلیل کرتے اور گلی کوچوں میں برا بھلا کہتے پھرتے ہیں
اگر تم برادری کی باتوں کو ایسا ہی ماننے والے ہو تو براہ کرم ان باتوں میں بھی برادری
کی طعن وملامت کی پرواکر لیا کرو۔ کچھ نہیں یہ تو محض بہانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ
تمہارا خود اس میں کرنے کو جی چاہتا ہے اگر تمہارا جی نہ چاہتا تو تم کسی کی بھی
پروانہ کرتے جیسا دوسرے کاموں میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ پھر جو لوگ برادری
کی ملامت کا بہانہ کرتے ہیں ان کے واسطے ایک اور جواب ہے۔ وہ یہ کہ جیسے
تمہاری دنیا کی ایک برادری ہے دین کی بھی تو ایک برادری ہے یعنی علماء وصلحاء
ہم نے مانا کہ اس میں چھوڑنے میں دنیا کی برادری تم کو برا کہے گی مگر دینی برادری تم کو
اچھا کہے گی اور شاباشی دے گی اور تمہارے حق میں دعا کرے گی اور اس سے بڑھکر
ایک اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہونگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہونگے
اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کتنی بڑی چیز ہے افسوس خدا کے مقابلہ میں برادری کی رضامندی
کی پرواکرنا کتنی سخت بات ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جو حضرت شعیب علیہ السلام
نے اپنی قوم کی حالت کے متعلق فرمائی تھی قال یقوم ارھطی اعز علیکم من اللہ واتخذتموہ
وراءکم ظہریا ان ربی بما تعملون محیط ۔ بعض لوگ آپس میں نااتفاقی رکھتے ہیں
اور مصالحت نہیں کرتے وہ بھی اسی واسطے کہ مشقت سے گھبراتے ہیں
اگر وہ نفس کو مجاہدہ کا عادی کر لیتے تو کسی کو ایک دوسرے سے معافی

چاہیے میں پس وپیش ہوتا گو معافی چاہنا ابتداً بہت مشکل ہے مگر جو شخص مجاہدہ سے نفس کو پامال کر چکتا ہے اسکے لئے ایک ٹھنگی سے بھی معافی چاہنا دشوار نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ آجکل جو لوگ نفاق و اتحاد کا لکچر دیتے ہیں یہ کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ یہ لکچرار بھی اور لکچر سننے والے بھی اول مجاہدہ سے نفس کی اصلاح کریں بدون اس کے ہرگز اتفاق واتحاد قائم نہیں ہوسکتا چنانچہ اگر اس لکچرار ہی کی رائے سے کوئی دوسرا شخص کسی میں مخالفت ظاہر کردے تو یہ اتحاد واتفاق کا سب لکچر بھول جائیں گے اور دوسرے شخص کی مخالفت وتذلیل وتحقیر کے درپے ہوجائیں گے پھر دونوں میں ایسی بری طرح مخالفت چلتی ہے کہ اخبار کے کالم کے کالم دونوں کی طرف سے گالیوں میں بھرے ہوئے شائع ہوتے ہیں جس سے دونوں کی تہذیب اور اتفاق واتحاد کی حقیقت کھل جاتی ہے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے کہ لوگ اتحاد واتفاق کیلئے تقریریں تو کرتے ہیں مگر اس کی جڑ کو کوئی مضبوط نہیں کرتا اتحاد واتفاق کی جڑ تواضع ہے متکبرین میں کبھی اتفاق نہیں ہوسکتا اگر ہوگا تو اسی طرح کہ ایک شخص اپنے تکبر کو چھوڑ کر تواضع اختیار کرے سبحان اللہ یہ مقولہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور یہ ایسے حجرہ نشین کا مقولہ ہے جس نے سیاسی میدان میں قدم بھی نہیں رکھا مگر واللہ سب سیاست داں انکے سامنے بچے ہیں کوئی شخص بھی اتحاد واتفاق کے لئے اس سے بہتر نسخہ نہیں بتلا سکتا پس اتحاد واتفاق کی جڑ تواضع ہے اور تواضع کی اصل مجاہدۂ نفس ہے کیونکہ تواضع اس کا نام نہیں کہ زبان سے اپنے کو خاکسار بنیاز مند ذرۂ بیمقدار کہدیا بلکہ تواضع یہ ہے کہ اگر کوئی تم کو واقعی ذرۂ بیمقدار اور خاکسار سمجھکر برا بھلا کہے اور حقیر وذلیل کرے تو تم کو انتقام کا جوش پیدا نہو اور نفس کو یوں سمجھا لو کہ واقعی تو تو ایسا ہی ہے پھر برا کیوں مانتا ہے اور اگر کسی کی برائی سے کچھ رنج واثر بھی ہو تو یہ تواضع کا اعلیٰ درجہ ہے کہ مدح وذم برابر ہوجائے مطلب یہ کہ عقلاً برابر ہوجائے کیونکہ طبعاً تو مساوات نہیں ہوسکتی ہاں کوئی مغلوب الحال ہو تو اور بات ہے اسی طرح طلبہ اور مدرسین میں ایک مرض ہے کہ اپنی غلطی کا کبھی اقرار نہیں کرتے اگر کوئی بات زبان سے غلط نکل جائے یا کتاب کے کسی مقام کی غلط تقریر

٦١

ہوجائے اور کوئی طالب علم اس کی صحیح تقریر کرے تو مدرس اس کو ہرگز تسلیم نہ کرے گا جہانتک
ممکن ہوگا اپنی بات کو بنانے کی کوشش کرے گا اس کا منشا یہی ہے کہ یہ شخص نفس کو مشقت
میں ڈالنا نہیں چاہتا مشقت سے بچانا چاہتا ہے کیونکہ غلطی کا اقرار کرلینا نفس پر بہت گراں
ہے اور گرانی کی وجہ یہ ہے کہ نفس اسکو سبب ذلت سمجھتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے
بخدا اقرار خطا سے اور عزت بڑھ جاتی ہے ہم نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ
علیہ کو بارہا دیکھا ہے کہ جب درس کے وقت کتاب کے کسی مقام پر شبہ ہوجاتا تو کتاب
ہاتھ میں لیکر اپنے ماتحت مدرس کے پاس چلے جاتے اور فرماتے کہ مجھے اس مقام پر
شرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرمادیں بھلا مدرس اول ہو کر ماتحت مدرس
سے ایسی درخواست کرنا کوئی معمولی بات تھی بہت بڑی بات تھی مگر کیا اس سے
نعوذ باللہ مولانا کی عزت و وقعت کم ہوگئی بخدا ہرگز نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ ہوگئی
چنانچہ آج یہ بات مولانا کے محاسن میں بیان ہورہی ہے اور ان کے دیکھنے والے آج
ان صورتوں کو ترستے ہیں کہ ہائے وہ لوگ کہاں گئے جن کو وجہ کمال کے اپنے نقص کے اقرار
میں ذرا بھی پس وپیش نہ تھا اور اب ایسا زمانہ آگیا کہ ناقصوں کو بھی اپنے نقص کے اقرار سے عار ہے
بلکہ وہ اپنے لئے کمال کے مدعی ہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بھی
عادت تھی کہ درس کے وقت اگر کسی مقام کی تقریر میں آپ سے لغزش ہوجاتی اور کوئی
ادنیٰ طالبعلم پھر عرض کردیتا کہ حضرت اس مقام کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے تو مولانا فوراً
اس کی بات کو ہاں کرکے صاف فرمادیتے کہ میں نے غلطی کی صحیح مطلب وہ ہے جو تم نے
بیان کیا پھر ایک دفعہ پر بس نہ ہوتا تھا بلکہ بار بار اس جملہ کو دہراتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی
میں نے غلط مطلب بیان کیا تھا۔ وہ طالبعلم شرمندہ ہوجاتا کہ میں نے ناحق تقریر کی مگر مولانا اپنی
غلطی کے اقرار سے نہ رکتے تھے اور واللہ اس سے مولانا کی عزت ومحبت وعظمت پہلے سے
زیادہ بڑھتی تھی پس نفس کا یہ خیال غلط ہے کہ اقرار خطا سے ذلت ہوتی ہے اور بالفرض اگر
ذلت ہوتی بھی ہے تو کیا تم کوئی کام ذلت کا نہیں کرتے ہو اگر ایسا ہی ذلت سے بچنا ہے تو
کسی شخص کے مکان سے طلبہ کھانا بھی نہ لایا کریں اور کوئی مولوی صاحب چندہ کیواسطے

بھی نہ جایا کریں کیا اس میں ذلت نہیں ہوتی بھلا جب مولوی چندہ کے لئے دورہ کرتے ہیں عوام اسکو بہت ذلت سے دیکھتے ہیں خصوصاً جس چندہ میں خطاب خاص ہو گئیں تو بہت ہی ذلت ہوتی ہے اور دوسرے پر جبر بھی ہوتا ہے اسی لئے مجھے ایسے چندہ کے جواز میں کلام ہے۔ جو خطاب خاص سے وصول کیا جاتا ہے مگر طلبہ و علماء اس کے جواز کی کوشش کرتے ہیں اور ذلت کی پروا نہیں کرتے پھر اقرار خطا ہی میں ذلت کی پروا کیوں ہے بس وجہ یہ ہے کہ چندہ وغیرہ میں گو ذلت ہے مگر روپیہ تو ملتا ہے اور اقرار خطا میں روپیہ نہیں ملتا سو آپ تو اہل علم ہیں آپ کی نظر تو نفع عاجل پر نہ ہونا چاہیئے بلکہ نفع آجل پر ہونا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ اقرار خطا میں خدا کی رضا ضرور ہے حدیث میں من ترک الجدال والمراء بنی لہ بیت فی الجنۃ او کماں قال اور کہاں تک فروع بیان کروں آپ غور کر کے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم جتنے گناہوں میں مبتلا ہیں سب کی اصل یہ ہے کہ ہم نفس کو مشقت سے بچانا چاہتے ہیں اور جتنے اوامر کو ہم ترک کر رہے ہیں اس کی اصل بھی یہی ہے پس معلوم ہوا کہ اصلاح اعمال و اصلاح نفس کا مدار عادی مجاہدہ پر ہے اسی مسئلہ کو بتلانے کے واسطے اسوقت یہ بیان اختیار کیا تھا جو الحمد للہ بقدر ضرورت بیان ہو گیا اب دعا کیجیئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ گناہوں کے چھوڑنے کی ہمکو ہمت عطا فرمائیں کہ یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے پھر اسپر دو کامیابیاں مرتب ہونگی ایک تو بڑی کامیابی خود گناہوں کا چھوٹ جانا ہے کیونکہ جرائم کا نہ ہونا یا کم ہونا بھی بڑی کامیابی ہے دوسرے رزق میں وسعت ہوگی کیونکہ اعمال صالحہ کو اور گناہوں کے چھوڑنے کو رزق کی وسعت میں بہت بڑا دخل ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولٰکن کذبوا فاخذناھم بما کانوا یکسبون اسی طرح معاصی کو تنگی رزق و نزول بلا میں بڑا دخل ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جس قوم میں سود کی کثرت ہوگی اللہ تعالیٰ اس پر قحط مسلط کر دینگے اور جس قوم میں زنا کی کثرت ہوگی اس پر طاعون وغیرہ ایسے امراض مسلط ہونگے جو پہلے لوگوں نے دیکھے

۶۴

بھی سنتے پس مجاہدہ میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی کامیابی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ دینی اور دنیوی اور تمدنی اور سیاسی تمام مصالح کی بنیاد اور جڑ یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کی مخالفت کا عادی بنے اور نفس کو مشقت کا عادی بنائے اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق شامل حال ہو

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا
ومولانا محمد
وعلیٰ آلہ واصحابہ
وبارک
وسلم

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اشرف علی

۱۳ ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمی بہ

الصلات فی الصلوات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الصّلات فی الصلوٰت

ای ثمراتہا فیہا ۱۲ منہ

این	کہاں ہوا	مکان حضرت حکیم الامۃ تھانہ بھون
متی	کب ہوا	شب ۲ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ بعد مغرب
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۵ منٹ
کیف	کس ہیئت سے ہوا	پلنگ پر بیٹھکر
لم	کیوں ہوا	بعض مہمان مستورات کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	نماز کی فضیلت کہ تمام اعمال میں مقصود بالذات نماز ہی ہے بقیہ اعمال مقصود بغیرہ ہیں
من ای شان	کس طبقہ کے مناسب تھا	تمام مسلمانوں کو عموماً
من ضبط	کسنے ضبط کیا	(شیخ الاسلام مولانا) ظفر احمد عثمانی (رحمہ اللہ)
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مرد تقریباً ۳۰ مجمع مستورات انکے علاوہ تھا
الاشتات	متفرقات	نماز کی فضیلت میں یہ بیان بہت ہی عجیب ہے ۔ ۱۲ ظفر

ﮧ تلخیص یعنی اسلامی بیں الثمرات والتی تطلع علیہا ۲۴ فی الصلوات دی فی ذاتہا وفی غیرہا

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم ۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۔ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے جو کوہ طور پر عطائے نبوت کے وقت ارشاد ہوا ہے جس میں

حکم ہے نماز کا یہ حال ہے اسوقت کے مضمون کا وجہ اسکے اختیار کرنیکی یہ ہے کہ بعض مہمانوں نے جنہیں
زیادہ مستورات ہیں بیان کی فرمائش کی ہے کہ کچھ احکام ہمکو بھی سنا دیئے جائیں ان کی مصلحت
سے یہ بیان تجویز کیا گیا چونکہ وقت مختصر ہے یعنی مغرب سے عشا تک اس لئے مختصر ہی بیان کا
قصد ہے کیونکہ مضامین طویلہ بھی مختصر ہو سکتے ہیں مگر ان کو اجمال کے درجہ میں رکھا جائے گویا جتنا
مالہ و ما علیہ کے بیان میں تطویل نہ کی جائے بلکہ اصل مقصود پر نظر رکھی جائے تو طویل مضمون بھی
مختصر ہو سکتا ہے چنانچہ نماز کا بیان جسقدر طویل ہے سبکو معلوم ہے فقہا کی کتابوں میں بھی
اس کی بحث بہت طویل ہے اور صوفیہ کے رسائل میں بھی اگر اس کی پوری تفصیل کی جائے تو
زمانہ دراز چاہیئے پھر اس مختصر وقت میں جو ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ کی مقدار ہے کیونکہ اتنی ہی دیر
بیان کرنیکا ارادہ ہے پوری تفصیل کیونکر ہو سکتی ہے لیکن وہی بات ہے جو میں کہہ چکا ہوں
کہ اگر درجۂ اجمال پر کفایت کی جائے تو طویل بیان بھی مختصر ہو سکتا ہے چنانچہ اس وقت یہی
ارادہ ہے کہ مختصر بیان کرونگا مگر وہ مجمل تو ہوگا مبہم نہ ہوگا انشاء اللہ جس قدر بیان ہوگا واضح ہوگا
اور چونکہ بیان مستورات کی فرمائش سے تجویز ہوا ہے اسلئے مضمون بھی ان کے مناسب اختیار
کیا گیا اور وہ مضمون نماز کا ہے کیونکہ مستورات شریعت کے اور کاموں کی مشتاق بھی
ہیں اور مستعد بھی ہیں مگر نماز سے بہت ہی کاہل اور غافل ہیں نماز کا نہ ان کو زیادہ شوق
ہے نہ اس کے لئے ہمت کرنیکا خیال ہے اور دراصل ساری کوتاہی کا منشا یہ ہے کہ نماز
کا شوق نہیں اگر شوق ہوتا تو سب کوتاہی خود بخود رفع ہو جاتی اور جتنے بہانے کئے
جاتے ہیں سب کا جواب وہ شوق ہی دیدیتا اور یہاں سے ایک بات کام کی یاد آگئی جو شاید
پہلے بیانات میں بھی مذکور ہوئی ہے چونکہ وہ نہایت کام کی بات ہے اسلئے اسوقت بھی بیان
کرتا ہوں وہ یہ کہ صرف بندہ کے ارادہ سے کام نہیں ہوتا یہ مطلب نہیں کہ ہو نہیں سکتا بلکہ
دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہوتا نہیں ہے بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے خصوصاً دوام و استمرار
تو محض ارادہ سے ہوتا ہی نہیں بلکہ ایک اور چیز ہے جسکو داعیہ اور تقاضا کہا جاتا ہے کام
اس سے ہوتا ہے اسی کا نام شوق ہے جو کام محض ارادہ سے ہو وہ دوامًا نہیں ہو سکتا بلکہ

۶۷

ے ارادہ صرف ایک گھنٹہ بیان کرنے کا تھا مگر بلا قصد دو گھنٹے تک طویل ہو گیا ۱۲ ظ۔

کام داعیہ سے ہوتا ہے جو محض وہبی ہے ہر چند کہ ارادہ بھی مخلوق حق ہے مگر پھر بھی اس میں اکتساب کو بھی دخل ہے جسکی وجہ سے بندہ کی طرف بھی اس کی اسناد کی جاتی ہے اور تقاضا محض موہوب ہے اور اس کی ہی ضرورت ہے کیونکہ اکتساب کا حال تو معلوم ہو گیا کہ بعض لوگ زمانۂ دراز سے تہجد کی تمنا کرتے ہیں اور اب تک اس میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ اب تک ان میں محض شوق عقلی ہے شوق طبعی جسکو تقاضا کہتے ہیں وہ ابھی ان کو حاصل نہیں ہوا۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن اعمال کا دوام ہم سے صدور ہوتا ہے یہ محض موہبت ہے حق تعالیٰ نے ایک داعیہ آپ کے اندر پیدا کر دیا ہے جو کشاں کشاں آپ کو عمل کی طرف لیجاتا ہے اسلئے ہمکو اپنے اعمال پر ناز نہ کرنا چاہیئے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بچہ ہے جو لکھنا نہیں جانتا مگر دوات وقلم کو دیکھکر خوش ہوتا ہے اور لکھنے کی کوشش کرتا ہے آپنے اس سے کہا لکھو اور اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑ اپنے ایک دو لفظ لکھدیئے ان کو دیکھکر بچہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے یہ لفظ لکھے اور آپ بھی تعریف کرتے ہیں کہ اب تو تم منشی ہو گئے بس اسی طرح حق تعالیٰ آپ سے کام لیتے ہیں اور نام آپ کا کر دیتے ہیں کہ تم نے نماز پڑھی قرآن پڑھا ذکر کیا اسی لئے حدیث میں استعمل کا لفظ آیا ہے اسی ایک عارف فرماتے ہیں ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں　　　مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

اور ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل　　　نسیم صبح تیری مہربانی

اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں فاما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ واقعی حق تعالیٰ کی طرف سے تیسیر ہوتی ہے کہ جو کام دوسروں کو دشوار تھا آپ کیلئے آسان کر دیا اور یہ آسانی داعیہ سے ہوتی ہے اسی کا نام توفیق ہے جو لوگ راستہ طے کرتے ہیں وہ اسکو خوب جانتے ہیں کہ سب کام حق تعالیٰ کی تیسیر ہی سے ہوتے ہیں گو اعتقاد تو ہر مسلمان کو ہے مگر ان کو اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ وہ راستہ طے کر رہے ہیں جسمیں انکو عقبات پیش آتے ہیں اسوقت ان کو حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور عقبات اسی کو پیش آتے ہیں جو کام کرنے والا ہو رستہ پر چل رہا ہو اور اس کو طے کرنے کی فکر میں ہو اور جو کام ہی نہ کرے

راستہ طے کرنے کا قصد ہی نہ کرے اسکو کیا پیش آئے گا خاک ۔ آجکل ایک سنئے درویش ہیں
جو لوگوں کو مرید کرنے لگے ہیں اور خود کسی محقق سے تعلق نہیں نہ اجازت ہے ان سے کسی نے
کہا کہ تم کو طریق میں کوئی اشکال پیش آتا ہوگا تو کس سے حل کرتے ہوگے کیونکہ تمہارا کسی محقق
سے تو تعلق ہے ہی نہیں تو جواب دیا کہ مجھے اشکال ہی نہیں ہوتا سائل نے جواب مجھ سے نقل کیا
میں نے کہا وہ سچ کہتے ہیں تم ان کی تکذیب نہ کرو کیونکہ اشکال تو اسے پیش آئے گا جو کچھ کام
کرے اور وہ کچھ کرتے ہی نہیں کورے ہیں ان کو کیا اشکال ہوتا غرض جو لوگ کام کرتے
ہیں ان کو عقبات پیش آتے ہیں اور اس وقت ان کو اس حقیقت کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جو کچھ
کام ہوتا ہے حق تعالیٰ کے کام لینے سے ہوتا ہے اگر وہ کام نہ لیں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا ایک
عارف کا قصہ غالباً عوارف میں لکھا ہے اور غالباً محض احتیاط کے لئے کہدیا ہے ورنہ مجھے
اچھی طرح یاد ہے کہ یہ قصہ اسی میں ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے ارادہ کیا کہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کروں تو کلمہ
زبان سے نہ نکلا زبان بند ہوگئی ہرچند زبان کو حرکت دی مگر لا الٰہ الا اللہ زبان سے نہ نکلا چونکہ ان
لوگوں کی دوسروں سے زیادہ تربیت ہوتی ہے گو رحمت عامہ اور تربیت عامہ سب پر ہے مگر ان پر
رحمت خاصہ ہوتی ہے اور تربیت بھی ان کی خاص طور پر ہوتی ہے اسلئے ان کو ایسی ایسی باتیں پیش
آتی ہیں تاکہ ہر وقت متنبہ رہیں بس یہ سمجھ گئے کہ یہ کسی جرم کی سزا ہے جو مجھ سے صادر ہوا ہے مگر اسوقت
یاد نہ آیا آخر سوچنا شروع کیا اور حضرت حق سے بھی دعا کی کہ مجھے اس جرم پر مطلع کیا جائے تاکہ اس سے بہ
اہتمام کی ساتھ توبہ کروں دیر کے بعد یاد آیا کہ کتنے برس کا عرصہ ہوا ایک کلمہ لا ابالی پن میں زبان سے
نکل گیا تھا جس میں حضرت کی شان میں کچھ گستاخی تھی آج مدت کے بعد اسکی سزا دی گئی اللہ اکبر کیسا
حلم ہے کہ فوراً گناہ کی سزا نہیں دیتے کبھی تو ہاتھ کے ہاتھ سزا مل جاتی ہے اور کبھی دیر میں سزا ہوتی
ہے اور زیادہ یہی ہے کہ فوراً سزا نہیں دیتے ہر فعل میں حکمت ہوتی ہے پس کسی گناہ پر اگر فوراً سزا
نہ ہو یا کچھ عرصہ تک نہ ہو تو اس سے بےفکری نہ چاہئے ۔ کیونکہ سزا میں تعجیل لازم نہیں غرض ان بزرگ
نے جرم یاد آنے کے بعد اس سے توبہ کی اور زبان جاری ہوگئی ان حضرات کو ایسے ایسے
واقعات پیش آتے ہیں جن سے افعال کا موہبت ہونا ان کو مشاہد ہو جاتا ہے واقعی وہی کام لینا
چاہتے ہیں جو ہماری زبان سے ذکر جاری ہوتا ہے اور ہمکو نماز کی توفیق ہوتی ہے ورنہ

اگر وہ زبان بند کر دیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں اور طریق حق کو تو کیا مجال ہے کہ ہم خود طے کر سکیں جس کی شان یہ ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا کہ میبالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

بس اب جو لوگ واصل ہیں وہ خود واصل نہیں ہوے کہ منزلیں طے کر کے حق تعالیٰ تک پہونچے ہوں بلکہ گویا حق تعالیٰ ہی خود ان کے پاس پہونچ گئے انہوں ہی نے مسافت کو کم کر دیا ورنہ بڑا طویل قصہ تھا تو اب یوں کہنا چاہیئے کہ ؎

خود بخود آں شہ ابرار بر می آید نہ بزور و نہ بزاری نہ بزر می آید

شاعر نے تو بت عیار کہا تھا میں نے اسکو بدلکر شہ ابرار کر دیا کیونکہ وہ لفظ ایسے موقعہ پر خلاف ادب ہے۔ بہر حال کام شوق سے ہوتا ہے کہ قلب میں داعیہ پیدا ہو جائے محض ارادہ سے کام نہیں ہوتا اور عورتوں کو نماز کا شوق اور تقاضا نہیں ہے دوسرے اعمال کا شوق بھی ہے تقاضا بھی ہے چنانچہ روزہ کا عورتوں کو شوق بھی ہے اور اس کے لئے مردوں سے زیادہ مستعد ہیں اور جنہیں بخل زیادہ نہیں ان کو زکوۃ دینے کا بھی شوق ہے اور حج کا ولولہ بھی ان میں بہت ہے مگر نماز کا نہیں اسی کی شکایت ہے شاید آپ یہ کہیں کہ ابھی تو تم کہہ چکے ہو کہ شوق وہبی ہے کسبی نہیں پھر شکایت کیا اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک شوق وہبی ہے مگر شوق پیدا کرنیکے اسباب تو اختیاری ہیں تو میری شکایت کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں شوق پیدا کرنیکے اسباب بھی اختیار نہیں کرتیں۔ اگر کسی میں بطور وہب کے شوق نہیں ہے تو اسکے اسباب اختیار کر کے کسب کے شوق کو حاصل کرنا چاہیے گو اسوقت بھی وہ حاصل ہوگا وہب ہی سے مگر حق تعالیٰ نے اکثر وہب کیلئے بھی کچھ اسباب کسبیہ ایسے بنا دیے ہیں جنکے اختیار کرنے پر عادۃً وہب مرتب ہو جاتا ہے اور مقصود حصول وہب ہے خواہ خود بخود ہو جائے یا تمہارے کسب پر مرتب ہو جائے اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اسی طرح خود بخود شوق پیدا ہو جائے تو کیا اور اسباب اختیار کرنے پر مرتب ہو جائے تو کیا ہر حالت میں مقصود حاصل ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسباب ترتب شوق اختیاری ہیں تو اب

میری شکایت صحیح ہے اور اس شکایت کا حاصل یہی ہے کہ گو شوق وہبی ہے مگر جن اسباب پر اس وہب کا ترتب ہوتا ہے وہ اختیاری ہیں انکو کیوں نہیں اختیار کیا گیا دیکھو دخول جنت اور حصول مغفرت محض وہبی ہے چنانچہ حدیث میں لا یدخل الجنۃ احد بعملہ کہ عمل سے جنت میں کوئی نہ جائے گا بلکہ محض فضل سے جائے گا مگر باینہمہ ارشاد ہے سارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا کعرض السموات والارض اس میں جنت ومغفرت کی طرف مسارعت کا امر ہے گویا ارشاد ہے کہ جنت ومغفرت کو حاصل کرو حالانکہ جب وہ موہبت محضہ ہے اور اختیار سے خارج ہے تو اسکو کیسے حاصل کریں اور غیر اختیاری کی تحصیل کا امر کیا بات وہی ہے کہ گو یہ چیزیں فی نفسہ وہبی ہیں اور بالذات اختیاری نہیں مگر عادۃً جن اسباب پر اس موہبت کا ترتب ہو جاتا ہے وہ اسباب اختیاری ہیں اسلئے انکی ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو اختیارات کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ ان کی تحصیل کا امر ہے اور انکی طرف مسارعت نکرنے پر شکایت ہے اب سوال ہوتا ہے کہ کیا جنت ومغفرت کے حاصل کرنے کا کوئی راستہ ہے جسکی طرف دوڑیں اور دوڑ کر جنت میں پہونچ جائیں مولانا اس اشکال سے گھبرا کر پھر سنبھل کر فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار می باید دوید

کہ واقعی گو اس دنیا میں جنت تک پہونچنے کا کوئی راستہ اور سوراخ نظر نہیں آتا مگر تم کو چاہیئے کہ یوسف علیہ السلام کی طرح دنیا سے پریشان ہو کر بھاگنا شروع کر دو یعنی جتنا تم عمل کر سکتے ہو اتنا عمل شروع کرو پھر وہ خود تمہارے سامنے راستہ کھول دیں گے جیسے یوسف علیہ السلام کے قصہ میں مشہور ہے کہ جب زلیخا نے انکو سات دروازوں کے اندر طلب کیا اور ہر دروازہ کو مقفل کر دیا تو ظاہر میں بھاگنے کے سب راستے بند تھے مگر انہوں نے خدا کے بھروسہ پر اپنا عمل شروع کر دیا کہ وہاں سے بھاگے یہ تو ان کا فعل تھا آگے حق تعالیٰ کی امداد تھی کہ جس دروازہ پر پہونچے اس کا قفل ٹوٹتا گیا اور دروازہ خود بخود کھلتا گیا اسی طرح آپ اپنا کام شروع کیجئے اور ان اسباب کو اختیار کیجئے جن پر عادۃً وہب کا ترتب ہوتا ہے جو لوگ واصل ہیں جس معنی کر کہ اصطلاح میں وصول کہا جاتا ہے ان سے پوچھئے کہ وہ کیونکر واصل

۷۱

ہوئے کہاں اپنے اختیار سے واصل ہوئے ہرگز نہیں کیونکہ وصول کو اتفاقاً وہبی مانا گیا ہے اور
جو واصل ہیں ان کو تو اسکے وہبی ہونیکا مشاہدہ ہے وہ کبھی اسکو اختیاری نہیں کہہ سکتے
چنانچہ چین نہ آئے گا نماز ہی سے راحت حاصل ہوگی بدون نماز پڑھے دل بےچین رہیگا اور
یہ بات کچھ دین ہی کے کاموں کیساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیا کا بھی کوئی کام بدون مجاہدہ کے
درست نہیں ہوتا دیکھو خوشنویسی ہی ہے اس میں مبتدی کو کیسی محنت پڑتی ہے کہ ایک جیم
کی نوک پلک درست کرنے میں عرصہ لگتا ہے بہت دیر میں ایک جیم بنتا ہے اس کے بعد
استاد کے سامنے لیگئے تو وہ کہتا ہے کہ غلط ہے مگر اسی طرح محنت کرتے چند روز میں ایسی مہارت
ہو جاتی ہے کہ آنکھ بند کر کے بھی لکھے تو حرف صحیح ہی ہوگا اور ایک منٹ میں پچاس جیم لکھدیگا
عادۃ اللہ یہی ہے کہ محنت کا نتیجہ راحت ہے اور مشقت کا ثمرہ سہولت ہے اسوقت
دروازہ کی طرف سے ایک بچہ کی آواز رونے کی آئی اور دیر تک آتی رہی حضرت نے فرمایا
کہ اسواسطے میرا جی نہیں چاہتا مستورات میں بیان کرنیکو حالانکہ سب بچوں کو باہر کر دیا گیا تھا
مگر پھر ماماؤں میں اتنی سرکشی ہے کہ بچہ کو دور لیجا کر خاموش نہیں کرتی دروازہ ہی پر کھڑی رُلا رہی
ہے (۱۲) میں یہ کہہ رہا تھا کہ مشقت کا ثمرہ سہولت ہے حق تعالٰے فرماتے ہیں ان مع العسر
یسراً (کہ مشقت کے ساتھ سہولت ہے) اس کی ایک تفسیر تو مشہور ہے ہی کہ مع بمعنی بعد
ہے اور مطلب یہ ہے کہ عسر کے بعد یسر ہوتا ہے اور یسر اُخروی مراد ہے مگر میں کہتا ہوں کہ
مع اپنے معنی پر ہے اور دنیا میں بھی عسر کی ساتھ یسر ہے اور یہ عسر اعمال کا ہے روزانہ
یہ خاصیت ہے کہ جو مشقت پہلے دن تھی وہ اگلے دن نہیں رہتی اور جو اگلے دن ہے وہ
اس کے بعد نہیں رہتی اس سے معلوم ہوا کہ عسر کے ساتھ ساتھ ہی یسر ہے جو تدریجاً ظہور میں
آتا ہے تو حسن عمل کا آپ کو شوق نہ ہو اسکے لئے مجاہدہ کرنا چاہئے انشاء اللہ مجاہدہ کے بعد
ایک دن شوق عطا ہو جائے گا جو محض وہب سے ہوگا اب جنکو شوق حاصل ہے وہ سمجھ
لیں کہ تم کو شوق از خود نہیں بلکہ حقیقت میں یہ شوق ہے حق تعالٰی تم کو کشاں کشاں لیجا
رہے ہیں وہ اس پر ناز نہ کریں کہ ہم کو حج کا شوق ہے یا زکوٰۃ کا شوق ہے یہ سب حق تعالٰے
کا فضل ہے ورنہ فی نفسہ آپکا بھی وہی حال ہوتا جو بدشوقوں کا حال ہے چنانچہ دیکھ لیا جائے کہ جنکو زکوٰۃ

کا شوق ہے ان کو زکوٰۃ یا نفقہ واجبہ دینا تو آسان ہے جو انفاق معین ہے مگر غیر معین انفاق ان کو آسان نہیں۔ یہ گراں ہوتا ہے زکوٰۃ دینے کے بعد اور کسی موقع ضرورت پر خرچ کرتے ہوئے ان کی جان نکلتی ہے کیوں؟ محض اسلئے کہ حق تعالیٰ نے انکو اس کا شوق نہیں دیا داعیہ پیدا نہیں ہوا مگر یہ غنیمت ہے کہ یہ لوگ بھی بخیل میں داخل نہیں انکو بخیل نہیں کہہ سکتے کیونکہ حق واجب کو تو وہ ادا کرتے ہیں اور عورتوں کو جو صوم و حج و زکوٰۃ کا شوق ہے اس کی ایک طبعی لم بھی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ طبعی لم سب میں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس سے خالی بہت ہی کم ہونگی گو بعضی اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہیں جن کو محض محبت حق کی وجہ سے ان عبادات کا شوق ہے لیکن اکثر کی حالت یہ ہے کہ ان کو اس طبعی لم کی وجہ سے بھی شوق ہے جسکو میں بیان کرنا چاہتا ہوں اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ان عبادات کا اگر شوق ہو بھی تو چنداں کمال نہیں کیونکہ ان میں حظ نفس بھی فی الجملہ موجود ہے گو وہ حظ جائز ہی ہو مگر خالص عبادت ہونے کی وجہ سے تو شوق نہوا اور یہ میں اسلئے کہتا ہوں تاکہ ناز ٹوٹ جائے اور عورتیں اپنے اس شوق پر ناز نکریں کہ ہمکو روزہ اور حج کا شوق ہے کیونکہ شوق وہی معتبر ہے جو محض اللہ کے واسطے ہو نفس کی آمیزش نہ ہو سو حج کا شوق تو اکثر عورتوں کو اسلئے بھی ہے کہ ایک جگہ پڑے پڑے طبعاً جی اوکتا جاتا ہے اس میں سفر ہے ذرا چلنا پھرنا نصیب ہوتا ہے۔ دوسرے اسمیں تمیز و تفرد کی شان بھی ہے کیونکہ یہ ایسی عبادت ہے جسکے کرنیوالے تھوڑے ہیں جس نے ایک دفعہ حج کر لیا وہ پچاس عورتوں میں تنہا حجن شمار ہوتی ہیں اور اس میں ایک حظ ہے کہ ہم دوسروں سے ایک صفت میں متمیز ہیں اور زکوٰۃ کا شوق اول تو عورتوں میں بہت کم ہے اکثر تو زکوٰۃ دیتی ہی نہیں اور جو دیتی بھی ہیں انکو زکوٰۃ کا اسلئے شوق ہے کہ اس میں بھی حظ نفس ہے کیونکہ دوسرے کو کچھ دینا موجب تعلی ہے۔ دینے والا محسن ہوتا ہے اور لینے والا احسانمند ہوتا ہے اور یہ بھی نفس کے لئے بڑا حظ ہے کہ دس آدمی اسکے احسان سے دبے ہوئے ہیں گو وہ اس احسان کی وجہ سے کوئی اپنی غرض اور اپنا کوئی کام ان سے نہ لے کیونکہ اس صورت میں تو زکوٰۃ کا ثواب ہی باطل ہو جائے گا نہیں بلکہ صرف زکوٰۃ دینے ہی سے دوسرا آدمی اس سے نیچا اور یہ دینے والا اس سے اونچا ہو جاتا ہے۔ الید العلیا خیر من الید السفلی اور یہ بھی بڑا حظ ہے دوسرے یہ کہ

دفعہ کسی غریب کی خستہ حالت دیکھکر انسان کا دل خود بھی کڑہتا اور دردمند ہوتا ہے تو اس کی امداد کرکے اپنا بھی جی خوش ہوتا اور درد کم ہوجاتا ہے یہ بھی ایک حظ ہے گو منہی عنہ نہو اسی لئے بعض بزرگوں نے اپنے مریدوں سے ایسا مجاہدہ کرایا ہے جو محض مجاہدہ ہی مجاہدہ ہو یعنی اس میں حظ نفس نہو چنانچہ ایک بزرگ نے اپنے مرید کو ذکر شغل تعلیم کیا مگر عرصہ تک اسکو کچھ اثر نہ ہوا فتح باب نہ ہوا تو شیخ نے پوچھا کہ میاں کیا تمہارے پاس کچھ دینار ہے جس سے تم کو محبت ہے کہا حضرت ہاں سَو دینار ہیں جنسے مجکو محبت ہے فرمایا ان کو اپنے پاس سے الگ کردو مرید نے منظور کرلیا شیخ نے پوچھا کس طرح الگ کروگے کہا حضرت کسی غریب کو دیدونگا فرمایا نہیں بلکہ یوں الگ کرو کہ ایک دینار روزانہ سمندر میں ڈال آیا کرو اب اہل ظاہر اسپر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تو اضاعت مال ہوا جو منہی عنہ ہے مگر ان صاحبوں نے اس منشا کو نہیں سمجھا جسپر مشائخ کی نظر ہے اسی لئے وہ اہل تربیت پر اعتراض کرتے ہیں بات یہ ہے کہ اضاعت مال واقعی منہی عنہ ہے مگر یہاں اضاعت ہی نہیں کیونکہ اضاعت وہ ہے جسمیں کوئی منفعت ومصلحت نہ ہو اور یہاں اصلاح نفس منفعت ہے اصلاح کا کوئی خاص طریق متعین کرنا امر اجتہادی ہے سو اگر کسی مربی نے اسکو اسلئے ترجیح دی ہو کہ اس میں اصلاح کامل ہے تو کچھ بعید نہیں اور کامل اسلئے سمجھا گیا کہ یہ مجاہدہ محضہ ہے اور انفاق متعارف میں حظ بھی ہے جس میں مجاہدہ میں کمی ہوگئی اسلئے اسکو ترجیح دیدی مگر دیکھنا یہ ہے کہ اسکی علت کیا ہے علت یہ ہے کہ اس میں نعمت کی بیقدری ہے۔ اور اسلئے انہوں نے یہ حکم دیا کہ ایک دینار روزانہ سمندر میں ڈالدیا کرو کہ یہ صورت نفس کو بہت ہی کھلنے والی ہے کیونکہ آمین کوئی حظ نہیں پھر وہ بھی ایک دفعہ ڈالنے کو فرماتے تو سہل تھا اور روزانہ ایک دینار کا ڈالدینا تو نفس کو بہت ہی کھل دے گا کہ ہر دن دلپر ایک آرا سا چلے گا اب مجاہدہ پورا ہونیکے بعد محبت مال سے اس کا دل بالکل خالی ہوجائے گا بتلایئے اس منشا کے سمجھنے کے بعد اسپر کیا اعتراض ہے۔ غرض عورتوں کو زکوٰۃ کا شوق اسلئے بھی ہے کہ دوچار مسکینوں کے ہاتھ پر پیسے رکھنے سے جی خوش ہوتا ہے اس میں نفس کو حظ حاصل ہوتا ہے اور روزہ کا جو عورتوں کو شوق ہے اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ فطرۃً روزہ ان پر آسان ہے کیونکہ انپر رطوبت وبرودت کا غلبہ ہے اور روزہ شاق انپر ہوتا ہے

جنہیں رطوبت کم ہے اور حرارت غالب ہے چنانچہ مردوں کی یہی حالت ہے کہ انپر رطوبت کا غلبہ نہیں اور حرارت کا بھی غلبہ ہے اسی لئے ان کو روزہ گراں ہے دوسرے یہ ہے کہ کھانا ان کے ہاتھوں سے تیار ہوتا یا کم از کم نگاہ سے تو ہر وقت گذرتا ہے اس سے بھی ان کی بھوک پیاس مرجاتی ہے ہم نے ایک مرتبہ زمانہ طالب علمی میں بڑے اہتمام سے گلگلے پکائے تھے مگر تیار ہونے کے بعد جو وہ سامنے آئے تو طبیعت افسردہ ہوگئی اور کچھ زیادہ مزا نہ آیا کیونکہ سارا اہتمام اپنے ہاتھوں سے ہوا تھا اپنے سامنے پکے اور تیار ہوے تھے تو دیکھ دیکھ کر نیت بھر گئی اسی وجہ سے مردوں کو عموماً تجربہ ہے کہ دعوت کا کھانا اپنے گھر کے کھانے سے لذیذ معلوم ہوتا ہے گو وہاں بجز دال گوشت کے کچھ بھی نہ ملے مگر پھر بھی لذیذ معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ دفعتہً وبغتتہً سامنے آجاتا ہے پہلے سے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ملے گا اور گھر کے کھانے کی خبر پہلے ہی سے ہوجاتی ہے کہ آج یہ کھانا پکے گا اس علم کی وجہ سے وہ کھانا گو ہیئتہً جدید ہو مگر من کل وجہ جدید نہیں ہوتا غرض اور جسقدر عبادتیں ہیں سب میں کچھ نہ کچھ حظ نفس بھی ہے اس لئے عورتوں کو ان کا شوق ہے اور نماز میں کچھ حظ نہیں چنانچہ حج میں جو آزادی تھی وہ نماز میں نہیں بلکہ اسکے خلاف یہاں پابندی ہے کہ چاروں طرف سے جکڑ دیئے گئے نہ کسی سے بات کرسکتے ہیں نہ ادہر ادہر دیکھ سکتے ہیں گو کوئی حسی مشقت تو نہیں ہے جو سبکو نظر آئے جیسے کوئی بوجھ اٹھوایا جاتا یا ایک دو میل چلایا جاتا یہ کچھ نہیں مگر ایسی مشقت ہے جو خود اس شخص کو محسوس ہوتی ہے اور وہ مشقت تقیید کی ہے کیونکہ پابندی اور قید خود گراں ہے مثلاً ایک جگہ ایک پلنگ پر بیٹھا رہنا خود فی نفسہ گراں نہیں اگر آزادی کے ساتھ بیٹھنا ہو چنانچہ بعض دفعہ دن بھر ایک جگہ بیٹھے رہتے ہیں لیکن اگر کوئی آپ سے یہ کہہ جائے کہ آدھ گھنٹہ تک تم میرا اسی جگہ انتظار کرنا یہاں سے جانا نہیں تو اب یہ آدھ گھنٹہ بیٹھنا گراں ہے اور منٹ منٹ بھاری ہوتا ہے کیونکہ آزادی فوت ہوگئی یہ بات نہیں رہی کہ جب چاہیں اٹھکر چلدیں یہی حال نماز کا ہے کہ تکبیر تحریمہ کہتے کے بعد سے نماز پوری کرنے تک بندھ گئے اب نہ بول سکتے ہیں نہ چل پھر سکتے ہیں نہ کھا پی سکتے ہیں یہ نفس پر گراں ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے نماز ہی کے متعلق یہ فرمایا ہے انہا لکبیرۃ اور کسی عبادت کے متعلق یہ بات

نہیں فرمائی کیونکہ اور عبادات میں کچھ حظ نفس بھی ہے اور پابندی نہیں اور نماز میں حظ
نفس کچھ نہیں اور پابندی سخت ہے (اور جسکو نماز میں حظ آتا ہے وہ نفس کو مارنیکے بعد
آیا ہے تو اسکو حظ نفس نہیں کہ سکتے ۱۲) پھر دوسری گرانی یہ ہے کہ نماز دن میں پانچ دفعہ ہے
اور عبادات میں یہ کثرت نہیں چنانچہ زکوٰۃ سال میں ایک دفعہ فرض ہوتی ہے حج عمر بھر میں
ایک دفعہ فرض ہے اور روزہ گو سال میں تیس دن کا ہے مگر اس میں وحدت کی شان بھی ہے
کیونکہ سب روزے متواتر ایک ہی مہینہ میں ہیں اور نمازیں تعدد ایسا ہے جسمیں وحدت کی
شان نہیں کیونکہ سب نمازیں مسلسل ایک وقت میں نہیں ہیں بلکہ فصل کیساتھ علیحدہ علیحدہ
وقت میں ہیں اور بجز فجر و ظہر کے بقیہ نمازوں میں فصل بہت ہی قلیل ہے جس کی وجہ سے
زیادہ وقت نماز ہی کی فکر میں گذرتا ہے ایک نماز پڑھکر آئے اور دوسری کا فکر سوار ہے
گویا اس طرح سارے دن نماز ہی میں رہتے ہیں لحدیث لا یزال احدکم فی الصلوٰۃ
ما انتظر الصلوٰۃ دیوبند میں ایک معقولی طالب علم آئے تھے جو بے نمازی تھے کیونکہ معقولیوں
کے نزدیک مہارت فی المعقول کی شرط ارتکاب معصیت بھی ہے اور معاصی بھی خاص خاص
جنکا بیان اس مجلس میں خلاف تہذیب ہے اسلئے وہ معقولی صاحب نماز نہ پڑھتے تھے
کیونکہ یہ معصیت بھی مہارت فی المعقول کی ایک شرط ہے اور دیوبند کے مدرسہ میں ماشاءاللہ
نماز کی بہت پابندی ہے طلبہ خود بھی نماز پڑھتے ہیں اور جو بے نمازی ان میں آ پھنسے اسکو بھی
کسنکر ساتھ لیجاتے ہیں چنانچہ ان معقولی صاحب کو بھی نماز کیواسطے لیگئے ایک نماز پڑھکر بیٹھے
تھے کہ تھوڑی دیر میں دوسری نماز کی تیاری ہوئی اور ان کو بھی لے گئے پھر تیسری نماز کی
تیاری ہوئی پھر چوتھی کی تو وہ معقولی کہنے لگا کہ ہم نے سنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
پر اول پچاس نمازیں معراج میں فرض ہوئی تھیں پھر آپ کی درخواست پر پچاس سے پانچ رہ گئیں
مگر دیوبند کے مدرسہ میں پوری پچاس ہی فرض ہیں کہ یہاں تو نماز کے سوا کچھ کام ہی نہیں ابھی
نماز سے فارغ ہو کر آئے اور چین سے بیٹھے بھی نہیں کہ پھر نماز اس سے نمٹ کر آئے تھے
کہ پھر تقاضا ہے۔ چلو نماز کو یہاں تو ہر وقت نماز ہی نماز ہے۔ واقعی جسکو نماز کی عادت
نہ ہو اسکو یہ پانچ وقت کی نماز پچاس وقت کی برابر معلوم ہوتی ہے کیونکہ گو یہ ظاہر

ہیں پانچ ہیں مگر وحدت اور تسلسل کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ فصل کیساتھ ہیں اور فصل بھی زیادہ نہیں جسکی وجہ سے سارا دن نماز ہی کی فکر میں گذرتا ہے نمازی آدمی بیفکری کیساتھ کسی کام میں منہمک نہیں ہوسکتا یہانتک کہ بیفکری سے سو بھی نہیں سکتا رات کو بار بار آنکھ کھلتی ہے کہ کہیں صبح کی نماز کا وقت نہ نکل جائے توسبحان اللہ اوہ جو حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالے نے لیلۃ الاسراء میں پچاس کی جگہ پانچ نمازیں مقرر فرماکر ارشاد فرمایا تھا خمس وہی خمسون لا یبدل القول لدی وما انا بظلام للعبید کہ یہ پانچ نمازیں ہیں اور یہ پچاس ہی کی برابر ہیں میرے یہاں بات بدلا نہیں کرتی تو ثواب کے اعتبار سے تو یہ پانچ نمازیں پچاس کے برابر ہیں ہی کیونکہ ہر نیکی دس نیکی کی برابر ہے لیکن ظاہری اثر اور تاثیر کے اعتبار سے بھی یہ پانچ پچاس کے ہی برابر ہیں کیونکہ سارا دن انہی میں مشغول ہوگیا ہے اور اس طرح نمازی ہر وقت گویا نماز ہی میں رہتا ہے اور ان پانچ کا پچاس کے برابر ہونا بے نمازیوں کو محسوس ہوتا ہے جو اول اول نماز شروع کرتے ہیں گو نمازیوں کو احساس نہو اب نمازیوں کو غور کرنا چاہئیے کہ تم سے قوی تو اس سے عاجز ہیں اور تم پانچوں وقت سہولت سے نماز پڑھ لیتے ہو یہ کیا بات ہے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تم میں دوسروں سے زیادہ قوت ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ تم کہاں کے قوی ہو بس بات وہی ہے جو پہلے میں نے بیان کی تھی کہ حق تعالی نے تمہارے اندر داعیہ پیدا کردیا ہے اور ان میں وہ داعیہ نہیں ہے تو حقیقت میں تم خود نماز نہیں پڑھتے بلکہ حق تعالی تم سے پڑھواتے ہیں ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت راتہمتے برآہوے چین بستہ اند

ایک مصلحت شرعیہ سے تمہارا نام کردیا گیا گو اس میں کچھ واقعیت بھی ہے گو وہ بھی عطا ہی کی ہوئی تھی پس اگر آپ کی مثال اس بچہ کی سی نہیں جو لکھنا بالکل نہیں جانتا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر تم کوئی حرف لکھدو تو اس بچہ کی مثال تو ضرور ہے جو لکھنا کچھ کچھ جانتا ہے مگر نہایت بدخط ہے اور آپ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر صحیح اور خوبصورت جیم لکھدیں تو گو اس صورت میں یہ لفظ من وجہ اس کا لکھا ہوا بھی ہے مگر یہ بات کس کی بدولت ہوئی کہ ایک خوشنما خوبصورت لکھا گیا کہ میر پنجہ کش نے بھی اس پر صاد کردیا یہ کسی دوسرے کی بدولت ہے تو آپ اپنے اعمال

کی ایسی ہی مثال سمجھئے بس واقعہ یہ ہے کہ لا جبر ولا قدر ولکن الامر بین بین میں جبر کا قائل نہیں ہوں کہ فرقہ جبریہ کی طرح آپ کو جبر کی طرف لیجاؤں اور اختیار کی بالکل نفی کردوں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنے نمازی اور ذاکر شاغل ہونے پر ناز کا حق نہیں کیونکہ ان اعمال کا صدور تنہا آپ کی قوت ارادیہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک دوسری قوت بھی کام کر رہی ہے جسکی بدولت آپ نمازی بنے ہوئے ہیں یعنی داعیہ اور وہ محض موہوب ہے یہ تو نمازیوں کے متعلق ہے کہ وہ اس امر موہوب پر نظر کرکے اپنے ناز کا علاج کریں اور بے نمازیوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ اس داعیہ کی تحصیل کا قصد نہیں کرتے۔ اور اسی داعیہ سے آپکو اس بات پر بھی تنبہ کرتا ہوں کہ آپ بے نمازیوں کو حقیر نہ سمجھیں یہ مطلب نہیں کہ انکو تنبیہ و زجر نہ کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کو ذلت کی نگاہ سے نہ دیکھیں زجر و تنبیہ کرو مگر اسکی ساتھ اپنے کو ان سے افضل نہ سمجھو بلکہ محض شفقت کی وجہ سے تنبیہ کرو پس زجر و تنبیہ تو اس بنا پر کرو کہ یہ اپنی قوت ارادیہ سے کام کیوں نہیں لیتے اور اپنے کو ان سے افضل اسلئے نہ سمجھو کہ یہ موہبت ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو ہم بھی ایسے ہی ہوتے جیسے یہ ہیں تو دیکھئے زجر و تنبیہ عدم تحقیر کی ساتھ کس سہولت سے جمع ہوگئی یہاں سے ایک شاعر کا قول باطل ہوگیا جو اس قسم کی الجھنوں سے پریشان ہوکر کہتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ شاعر باذوق تو ہے مگر محقق نہیں محقق کبھی احکام شرعیہ میں ایسا نہ کہے گا کیونکہ وہ سب اضداد کو جمع کر دیتا ہے یعنی جو ناقصوں کی نظر میں اضداد ہیں ورنہ واقع میں احکام شرعیہ کے اندر اضداد کا جمع ہے ہی نہیں چنانچہ امر بالمعروف اور عدم تحقیر مسلم میں لوگ تضاد کا اعتقاد کرتے ہیں کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم دوسرے شخص کو کسی گناہ پر زجر و تنبیہ بھی کریں اور اسکو حقیر بھی نہ سمجھیں تو میں نے بتلا دیا کہ اسکو زجر و تنبیہ تو اسلئے کرو کہ اس نے اپنی قوت ارادہ و اختیار سے کام کیوں نہیں لیا لیکن حقیر اسلئے مت سمجھو کہ تم جو اس گناہ سے محفوظ ہو محض اپنے ارادہ و اختیار سے محفوظ نہیں ہو بلکہ حق تعالیٰ نے تم میں ایک داعیہ پیدا کر دیا ہے جو کشاں کشاں طاعات کی طرف لیجاتا اور معاصی سے روکتا ہے اور گو یہ داعیہ ارادہ و اختیار

۷۸

ہی کے استعمال سے عطا ہوا ہے اور اس عاصی کو بھی ارادہ و اختیار کے استعمال سے یہ داعیہ
عطا ہو سکتا تھا مگر فی نفسہ تو امر موہوب ہے مکسوب نہیں پھر آپ کو اپنی فضیلت اور دوسرے
کی ذلت کے اعتقاد کا کیا حق ہے خوب سمجھ لو۔ بہرحال میں بے نمازیوں کی شکایت اور ان کو
زجر و تنبیہ سے منع نہیں کرتا یہ جائز ہے بلکہ مامور بہ ہے چنانچہ میں اس وقت خود بھی ان کی شکایت
کر رہا ہوں اور چونکہ مجھے زجر و تنبیہ کا اختیار نہیں ہے اس لئے میں ترغیب کا مضمون بیان
کرتا ہوں جس سے سامعین کو نماز کی فضیلت معلوم ہوگی اور فضائل سنکر امید ہے کہ رغبت ہو جائے
اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں اقم الصلوٰۃ لذکری ۔ حضرت سیدنا موسیٰ
علیہ السلام سے کوہ طور پر بہت سی باتیں ہوئیں انہی میں یہ حکم بھی ہوا اوپر سے ارشاد ہے
فلما اتٰہا نودی یا موسیٰ ۝ انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوی وانا اخترتک
فاستمع لما یوحیٰ انی انا اللّٰہ لا الٰہ الا انا فاعبدنی ۝ اول تو ان کو نبوت کی خبر دی گئی کہ میں نے
تمکو نبوت کے واسطے منتخب کیا ہے اب کان لگا کر اس بات کو سنو جو تم پر وحی کی جاتی ہے
انی انا اللّٰہ لا الٰہ الا انا کہ میں اللہ ہوں معبود ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں اس کے بعد
ارشاد ہے فاعبدنی اس میں فاء تفریع کے لئے ہے جو انی انا اللّٰہ پر متفرع ہے کہ جب میں
ہی معبود حق ہوں تو اب تم میری عبادت کرو اسکے بعد ارشاد ہے واقم الصلوٰۃ لذکری
کہ نماز کو میری یاد کیواسطے قائم کرو یعنی اس کی پابندی کرو تو نماز کی کتنی بڑی شان ہے کہ توحید
کے بعد عبادت کا مطلقاً امر ہوا جس میں نماز بھی داخل تھی مگر اہتمام بالشان کے لئے نماز کو
الگ بیان فرمایا شاید کسی کو شبہ ہو کہ بنی اسرائیل پر شاید صرف نماز ہی فرض ہو اور کوئی عبادت
فرض ہی نہ ہو تو یہ شبہ غلط ہے کیونکہ روزہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی تھا جیسا کتب
علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم کی تفسیر میں آدم علیہ السلام پر صوم ایام بیض اور
شریعت موسویہ میں صوم عاشورا، شریعت عیسویہ میں رمضان کے فرض ہونے کو مفسرین نے
ذکر کیا ہے اور زکوٰۃ بھی فرض تھی جیسا سورۂ مائدہ میں آیت لئن اقمتم الصلوٰۃ وآتیتم الزکوٰۃ کا
خطاب بنی اسرائیل کو مذکور ہے پھر بھی نماز کو سب سے مقدم کیا بلکہ اس موقعہ پر نماز کے سوا
کسی اور عبادت کا امر ہی نہیں ہوا بلکہ اسکے بعد معاد کا ذکر شروع ہو گیا ان الساعۃ آتیۃ

۷۹

اکا د اخفیہا الایات تو ایسے وقت میں جبکہ حق تعالیٰ کی تجلی ہو رہی تھی جس کی حقیقت ہم اسکے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک نور تھا مگر تیز ایسا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اسکو نہ سمجھے پھر اسوقت حق تعالیٰ کی طرف سے کلام بھی ہو رہا تھا اس کی حقیقت بھی کوئی نہیں بیان کر سکتا

سہ تو ندیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغاں را

بعض کہتے ہیں کہ کلام نفسی بواسطہ تھا اور بعض کہتے ہیں کلام نفسی بلاواسطہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ کلام لفظی ہی تھا اور اسلم یہ ہے کہ اس میں سکوت کیا جائے اور اگر کوئی سوال کرے تو یہ جواب دیدیا جائے سہ

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

بہرحال خواہ حقیقت کچھ ہی ہو مگر موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر حق تعالیٰ ہمکلام ہوئے تھے اور اسوقت ایک خاص تجلی بھی ہو رہی تھی اس وقت میں غور کر لیجئے کہ حق تعالیٰ نے جن باتوں کا موسیٰ علیہ السلام کو امر کیا ہوگا وہ باتیں کس درجہ کی ہونگی ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی ملاقات میں محبوب جن باتوں کا حکم کرتا ہے وہ نہایت عظیم الشان ہوتی ہیں خصوصاً جبکہ ملاقات بھی اس شان خاص سے ہو کہ تجلی بھی ہو اور ہمکلامی بھی ہو تو ایسے خاص وقت میں حق تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نماز کا حکم فرمایا ہے جو کہ موسیٰ علیہ السلام کیلئے معراج اور خاص قرب کا وقت تھا پھر آپ اپنے حضور کی معراج کو دیکھ لیجئے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں خاص قرب میں کس عبادت کا حکم ہوا نصوص سے صراحۃً معلوم ہے کہ معراج میں نماز ہی کا حکم ہوا ہے نہ زکوٰۃ اسوقت فرض ہوئی نہ روزہ نہ حج بلکہ یہ سب عبادتیں مدینہ میں فرض ہوئیں اور نماز آسمان پر فرض ہوئی بلکہ آسمان سے بھی اوپر۔ اس سے بھی نماز کا خاص شرف واضح ہے تو اس میں غور کر کے نماز کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے۔

اب میں اقم الصلوٰۃ لذکری میں ایک نکتہ بیان کرتا ہوں جس سے نماز کی فضیلت دیگر عبادات پر بہت زیادہ ثابت ہوتی ہے اور یہ محض نکتہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے وہ یہ کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ثمرہ کیلئے مقصود ہوں اور ثمرہ عمل کا مغائر ہو دوسرے وہ جو ثمرہ کے لئے مقصود نہیں بلکہ لذاتہٖ مقصود ہے اور جو ثمرہ اسکے ساتھ مذکور ہے وہ اسکا مغائر نہیں بلکہ

۸۰

عین ہے مثلاً ہم کسی حاکم سے ملنے جائیں اور وہ ہمکو کوئی کام بتلائے تو بعض کام تو ایسے ہوتے ہیں جو خود مقصود نہیں بلکہ ان کا ثمرہ مقصود ہے مثلاً حاکم یہ کہے کہ تم انٹرنس پاس کرلو تو ہم تم کو فلاں عہدہ دیدینگے یہاں انٹرنس پاس کرنا خود مقصود نہیں بلکہ عہدہ مقصود ہے جو اس کا ثمرہ ہے اور یہ ثمرہ عمل کا غیر ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ یوں کہے تم ہمارے پاس ہر روز آیا کرو یہاں یہ عمل خود مقصود ہے کیونکہ حاکم کے دربار میں حاضری نصیب ہوگا یہ خود بڑی چیز ہے گو اس پر ثمرات بھی مرتب ہوتے ہیں مگر ان ثمرات کے ساتھ خود حاضری دربار بھی بڑا مقصود ہے چنانچہ بہت لوگ اس حاضری ہی کیلئے بڑی بڑی کوششیں کرتے ہیں گو اسکے حصول کے بعد کوئی ثمرہ بھی حاصل نہو۔ اب میں نماز کے متعلق دعویٰ کرتا ہوں کہ نماز میں جتنے اعمال ہیں اور نماز ان اعمال سے مرکب ہے وہ سب اجزا ایسے ہیں کہ اعمال تو ہیں ہی مگر ثمرات بھی ہیں یعنی ان اعمال کے لئے کوئی ایسا ثمرہ نہیں جسکے اعتبار سے ان اعمال کو مقصود بالعرض اور اس ثمرہ کو مقصود بالذات کہا جائے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجزاء صلوٰۃ خود مقصود بالذات ہیں جسکو میں ابھی ثابت کئے دیتا ہوں اور جب اجزاء کا یہ حال ہے تو صلوٰۃ کا حال بھی اس سے معلوم ہوگیا کہ وہ بھی مقصود بالذات ہے کیونکہ اجزاء میں اور مجموعہ میں محض اعتباری تغایر ہے اور تغایر اعتباری محض فرض ہی فرض ہے امور واقعیہ میں اس کا اعتبار فضول ہے اور کسی عمل کا مقصود بالذات ہونا اور مقصود بالعرض نہونا یہ اس کی بڑی فضیلت اور اعلیٰ درجہ کا کمال ہے۔ اب سنئے کہ نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی محبوب عاشق سے کہے کہ ہمکو دیکھو اور ہم سے باتیں کرو ہر چند کہ دیکھنا اور باتیں کرنا ایک عمل ہے مگر ایسا عمل ہے کہ خود ہی عمل ہے اور خود ہی ثمرہ مقصودہ ہے اس سے کوئی اور ثمرہ مقصود نہیں عاشق کے دل سے پوچھو وہ اس عمل سے کسی غیر کو مقصود نہ سمجھے گا کیونکہ وہ تو عمر بھر اسی کو ترستا تھا کہ کسی طرح ایک نگاہ محبوب کو دیکھ لوں اور اس سے ایک دو بات کرلوں تو اب جبکہ محبوب نے اسکو اپنے دیکھنے اور اپنے سے ہمکلام ہونیکا امر کیا ہے یقیناً اسکو اس رؤیت و کلام سے کسی اور ثمرہ کی طلب نہوگی بلکہ اسی کو مطلوب سمجھیگا رہا یہ اشکال کہ صاحب اصل مقصود تو لذت ہے جو رؤیت و کلام محبوب سے حاصل ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے

۸۱

کہ احکام طبعیہ میں لذت رویت و کلام کا غیر نہیں بلکہ عین ہے کیونکہ وہ ان کی ساتھ ساتھ
معاً حاصل ہوتی ہے دونوں میں تقدم و تاخر زمانی نہیں اور احکام طبعیہ میں تقدم و
تاخر زمانی ہی سے تغائر ہوا کرتا ہے نہ کہ تقدم و تاخر ذاتی سے جو چیزیں زماناً ساتھ ساتھ ہوں
گو ذاتاً ان میں ایک مقدم ایک مؤخر ہو عرفاً ان کو طبعاً متحد ہی سمجھا جاتا ہے تو ہر چند کہ نظر
سے لذت ہوگی مگر عاشق کے نزدیک وہ نظر کا غیر نہیں بلکہ اسکو تو نظر من حیث ہو ہو ہی مقصود
ہوگئی ہے یہی وجہ ہے کہ عاشق کو تمنائے دیدار و آرزوے لقاء کیساتھ لذت کی طرف التفات بھی
نہیں ہوتا غرض نماز ایسا ہی عمل ہے کہ عمل بھی ہے اور ثمرہ بھی ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا
کہ نماز کسی ثمرہ کے بھی اعتبار سے مقصود بالعرض نہ ہو بلکہ دعوی یہ ہے کہ نماز من کل الوجوہ مقصود بالعرض
نہیں بلکہ اسکے اندر بھی مقصودیت بالذات کا ایک درجہ موجود ہے پس نماز سے رضائے حق اور دخول
جنت کا مقصود ہونا اور اس ثمرہ کے اعتبار سے اس کا مقصود بالعرض ہونا ہمارے دعوے کے منافی
نہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کھانے کا اخیر مقصود جزو بدن ہونا ہے مگر مقصود عاجل لذت
ہے جسکی وجہ سے یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ کھانا اچھا پکا ہوا ہو مرچ بھی مرغ ہو دستر خوان بھی اجلا ہو
روٹی بھی صاف و عمدہ ہو جلی ہوئی اور سیاہ نہ ہو تاکہ کھا کر لذت آوے یہ اہتمام بلیغ بتلاتا ہے
کہ لذت بھی خود مقصود ہے ورنہ بدل ما یتحلل تو ہر طرح کی غذا ہو سکتی ہے اسی طرح نماز کا ثمرہ
اخیر گو حصول رضا اور دخول جنت ہے مگر اجزاء صلوٰۃ خود بھی مقصود بالذات ہیں۔ اب انکی
مقصودیت کو سنئے کہ نماز کی حقیقت کیا ہے نماز قیام و قعود و رکوع و سجود و قراءت سے
مرکب ہے اور ان ارکان کے ساتھ تسبیح و تقدیس اور ذکر بھی لگا ہوا ہے یہ نماز کے اجزاء ہیں
اب بتلایئے کہ اگر نماز فرض نہ ہوتی تو جو چیزیں اب نماز کے اندر ہیں کیا آپ ان کو نہ ڈھونڈتے ؟
یقیناً آپ خود ان کو ڈھونڈھتے اور ان کی طلب و تلاش میں عمر ختم کر دیتے کیونکہ ہر عاشق کو
اس کی تمنا ہوتی ہے کہ محبوب کے سامنے اپنا عجز و نیاز ظاہر کرے اور اس کی تعریف و ثنا میں رطب اللسان
رہے اور اس کی یاد سے دل کو تسلی دے تو کیا آپ کو حق تعالے سے محبت نہیں ؟ کوئی شخص
اس کا اقرار نہیں کر سکتا کیونکہ اول تو حق تعالے سے انسان کو فطری محبت ہے اور ہونا بھی
چاہئے کیونکہ حق تعالیٰ کے اندر صفات کمال ایسی ہیں جن کی وجہ سے محبت ہونا ہی چاہئے

۸۲

کیونکہ استقراء سے اسباب محبت تین صفتیں ہیں جمال وکمال ونوال (یعنی عطا و سخا) اور محبت
کسی صفت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے ذات سے محبت نہیں ہوا کرتی الا نادراً کسی کو تو حسن وجمال
کی وجہ سے کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو بتلائیے حق تعالیٰ سے بڑھکر کون حسین وجمیل ہے کوئی
بھی نہیں کسی کو کسی کے ساتھ کمال کی وجہ سے محبت ہے جیسے استاد کی ساتھ شاگردوں کو اور
منصف عادل بادشاہ کیساتھ ہر شخص کو محبت ہوتی ہے گو وہ اس کی رعایا بھی نہو یا جیسے
سخی بادشاہ سے ہر ایک کو محبت ہوتی ہے گو اسکو ابھی تک کچھ بھی نہ ملا ہو میرے ایک
دوست کہتے تھے کہ مدینہ منورہ میں ایک عالم بہت عسرت میں ہیں اور حیدرآباد سے
ان کی کوئی تنخواہ بھی نہیں مگر ریاست حیدرآباد کیلئے بہت دعا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس
ریاست سے مسلمانوں کو بہت فیض ہے اب کہئے ان کو نواب حیدرآباد سے کیوں محبت ہے
محض صفت سخاوت کی وجہ سے اور کبھی نوال وعطا کے سبب محبت ہوتی ہے تو حق تعالیٰ سے
بڑھکر کون صاحب نوال وکمال ہوگا کہ وہ عاصی ومطیع سبکو روزی دیتے ہیں غرض جو اسباب
محبت کے ہیں ان میں حق تعالیٰ سب سے اکمل ہیں بلکہ اگر نظر کو غائر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اوصاف
ثلثہ کی وجہ سے آپ کو جس سے بھی محبت ہے وہ حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کی محبت ہے دیکھئے اگر دیوار
پر آفتاب کی روشنی پڑ رہی ہو اور کوئی شخص اس کو دیکھ کر دھوپ پر عاشق ہو جائے تو حقیقت میں یہ آفتاب
ہی کا عشق ہے کیونکہ صفت کا عشق موصوف کا عشق ہے اسی طرح جس شخص کو کسی آدمی کے ساتھ
اسکے جمال یا کمال ونوال کی وجہ سے محبت ہے وہ درحقیقت حق تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ
یہ صفات اس میں اپنے آپ پیدا نہیں ہوگئے بلکہ جس نے اس کی ذات کو پیدا کیا ہے اسی نے
یہ صفات اسکے اندر پیدا کئے ہیں تو نقش کی محبت دراصل نقاش کے ساتھ محبت ہے کیونکہ نقش
خود تو نہیں بن گیا کسی نے اسکو بنایا ہے پس کسی عالم سے محبت ہونا حق جل وعلا سے محبت ہے ایسے
ہی کسی محسن سے محبت ہونا حق تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ جو صفات ان میں تم دیکھ رہے ہو وہ حق تعالیٰ
کی صفات کا ظل ہے اسی نظر کو عمیق کرکے اگر دل میں قائم کرلیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت جلد
بلاواسطہ محبت ہو جائے گی جس کی صورت یہ ہے کہ آپ ہر چیز کو دیکھ کر یہ سوچا کریں سے
چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگار ہا۔ ہائے جس نے ایسی ایسی چیزیں حسین و باکمال بنائی

۸۳

ہیں وہ خود جیسا ہو گا۔ بہر حال یہ بات تو میں نے تبرعاً بیان کردی ورنہ اصل یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ سے طبعی محبت ہے مگر اس کو اس محبت کا احساس نہیں اور احساس کچھ مشکل بھی نہیں ہیں جو بات ابھی بتلائی ہے اس کو کر دیکھئے بہت جلد اس محبت کا احساس ہو جائے گا اور جب اس کا احساس ہو گا تو آپ محب ہوں گے اور حق تعالیٰ محبوب ہوں گے اب بتلائیے کہ محبت کا یہ تقاضا ہوتا ہے یا نہیں کہ میں محبوب کا نام لوں محبوب سے باتیں کروں محبوب کے سامنے کھڑا ہوں اسکے سامنے اپنا عجز و نیاز ظاہر کروں حضرت محبت وہ چیز ہے جو کسی حال میں محبوب کا نام لئے بغیر چین سے نہیں بیٹھنے دیتی مجنوں کو لیلیٰ سے محبت تھی تو یہ حال تھا کہ کبھی کبھی بیٹھا بیٹھا ریت میں لیلیٰ کا نام لکھا کرتا تھا اور اسی سے دل کو تسلی دیا کرتا تھا مولانا فرماتے ہیں ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد ۔۔۔ در بیابان غمش بنشستہ فرد

ریگ کاغذ بود و انگشتان قلم ۔۔۔ می نمودے بہر کس نامہ رقم

گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں ۔۔۔ می نویسی نامہ بہر کیست ایں

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم ۔۔۔ خاطر خود را تسلی می کنم

نیز محبت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ عاشق دوسروں کی زبان سے بھی اس کا نام سننا اور تذکرہ سننا چاہتا ہے ابو نواس کہتا ہے ؎

الا فاسقنی خمراً وقل لی ہی الخمر ۔۔۔ ولا تسقنی سراً متی امکن الجہر

اسکو شراب سے محبت تھی تو کہتا ہے کہ شراب پلاتا جا اور یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے شراب ہے کیونکہ محبوب کا نام سننے سے بھی لذت آتی ہے اگر سننے میں لطف نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی سے کیوں فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھو میں سننا چاہتا ہوں اور وہ صحابی فرماتے ہیں اعلیک اقرأ وعلیک انزل۔ یعنی آپ کو سننے کی کیا ضرورت ہے آپ پر تو قرآن نازل ہی ہوا ہے مگر آپ فرماتے ہیں کہ نہیں سننے کو جی چاہتا ہے کیونکہ خود پڑھنے میں توجہ منقسم ہوتی ہے اپنی قرأت کی طرف بھی اور سننے میں ہمہ تن ادھر ہی توجہ ہوتی ہے عشاق غور کر کے دیکھ لیں کہ جیسا خود اپنی زبان سے ان کو محبوب کا تذکرہ پسند ہے اسی طرح دوسرے کی زبان سے بھی تذکرہ سننے کو جی چاہا کرتا ہے اور ایسا جی چاہتا ہے کہ اسکے ضمن میں کی

۸۴

دوسرے کا تذکرہ ٹھونسدیا جائے تو سخت ناگوار ہوتا ہے اس پر ایک حکایت یاد آئی مولانا مظفر حسین صاحب سے ایک رئیس نے کہا کہ حضرت حدیث میں آتا ہے لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (متفق علیہ) یعنی کوئی شخص اس وقت تک مومن و مسلمان نہ ہوگا جبتک کہ اپنے والد اور اولاد اور سب آدمیوں سے زیادہ میرے ساتھ محبت نہ ہو اور میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنے باپ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے تو کیا میں مومن نہیں مولانا نے اسوقت کچھ جواب نہیں دیا دوسری باتوں میں لگ گئے اور باتوں باتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا اور آپ کے کمالات بیان کرنا شروع کئے وہ رئیس غایت شوق سے حضور کا تذکرہ سنتے رہے جب مولانا نے دیکھا کہ ان کو بہت لطف آرہا ہے تو درمیان ہی میں حضور کا تذکرہ چھوڑ کر فرمانے لگے کہ اچھا اسکو تو رہنے دیجئے اب آپ کے والد صاحب کے کمالات بیان کرتا ہوں انمیں بھی بڑے بڑے کمالات تھے بس وہ رئیس یہ سنکر بے چین ہوگئے اور کہا حضرت آپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں یہ والد صاحب کا قصہ کہاں سے ٹھونسدیا توبہ توبہ کیا ان کے کمالات بھی کوئی چیز ہیں جو حضور کے کمالات کے ساتھ بیان کئے جائیں مولانا اس سے میرا دل بہت دکھا اس کو چھوڑیے اور حضور ہی کا تذکرہ کیجئے مولانا نے فرمایا کیوں صاحب اگر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے والد کے ساتھ محبت ہے تو حضور کے تذکرہ میں ان کا تذکرہ ناگوار کیوں ہوا اور اس سے دل کیوں دکھا۔ بس شکر کیجئے کہ آپ کو حضور ہی کیساتھ زیادہ محبت ہے جسکا احساس تقابل کے وقت ہوتا ہے اب تو ان رئیس کی آنکھیں کھل گئیں اور مولانا کو بہت دعائیں دیں۔

واقعی عارفین قیل وقال سے جواب نہیں دیا کرتے وہ عملی جواب دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلی ہوجاتی ہے اگر مولانا دلائل سے ان رئیس کا اطمینان کرنا چاہتے تو وہ اطمینان ہرگز حاصل نہ ہوتا جو اس عملی جواب سے ہوا سو بحمد اللہ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حق تعالیٰ سے محبت نہ ہو۔ محبت سبکو ہے اور جان و مال و اہل وعیال سے بھی زیادہ ہے کوئی مسلمان اس سے خالی نہیں مگر وجود متحرک کیونت تحریک ہوتی ہے۔ غور کرلیا جائے کہ اگر ایک مجلس میں کسی مسلمان کے باپ کو گالی دیجائے اور اسی مجلس میں کوئی شخص نعوذ باللہ حضور

۸۵

صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے تو دل کو ٹٹول کر دیکھو کہ کس پر زیادہ غصہ آئیگا یقیناً جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ کہا ہے اسپر غصہ زیادہ آئیگا۔ بہرحال عاشق کا دل اسکے لئے بیچین ہوتا ہے کہ محبوب کا نام لے اس کا تذکرہ سنے اس سے باتیں کرے یہ سب باتیں نماز میں موجود ہیں ہاں صرف ایک کسر ہے کہ دیدار نہیں تو اس میں حضرت حق کی طرف سے کوئی مانع نہیں وہ ہر وقت تجلی ہی مستور نہیں ہیں بلکہ مانع عاشق کی طرف سے ہے کہ اسکی آنکھ پر پردہ پڑا ہوا ہے ؎

شد ہفت پردہ چشم این ہفت پردہ چشم بے پردہ ورنہ ماسے چوں آفتاب دارم

اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لن ترانی فرمایا گیا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے اگر مانع ادہر سے ہوتا تو لن اری فرماتے اور اگر ادہر سے مانع ہوتا تو معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور جنت میں ہم کو کیسے رویت ہوگی کیونکہ ذات حق میں تو تغیر نہیں ہو سکتا جو یہ احتمال ہو کہ پہلے ذات میں مانع تھا اب نہیں رہا بلکہ ہم میں ہی تغیر ہو جائیگا کہ اسوقت رویت کے متحمل نہیں ہیں پھر متحمل ہو جائیں گے کیونکہ ہم متغیر ہیں اسی طرح حدیث میں جو آیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ مجھ میں اور حق تعالیٰ میں ستر ہزار حجاب حائل ہیں وہ مانع بھی ذات میں نہیں جبریل علیہ السلام ہی کے اعتبار سے مانع ہے اور ان حجابات میں حکمت بھی ہے جو وجہ الٰہی پر ہیں بلکہ بقاء عالم کے لئے ان کا ہونا ضروری ہے ورنہ مسلم کی حدیث میں ہے کہ اگر حق تعالیٰ ان حجابات کو رفع کر دیں تو لاحرقت سبحات وجہہ ما انتہی الیہ بصرہ تمام عالم جل بھنکر فنا ہو جا اس سے بھی ہمارا ہی نقص ثابت ہوا کہ ہم ان انوار کے متحمل نہیں اگر وہ بے حجاب ہو جائیں تو سب نیست و نابود ہو جائیں مگر جنت میں ہماری یہ حالت نہ رہے گی وہاں استعداد و تحمل پیدا ہو جائے گی تو اسوقت بلاواسطہ رویت ہوگی اور سب حجابات مرتفع ہو جائیں گے اور ان کے رفع سے ہم ہلاک نہ ہونگے البتہ ادراک کنہ کا اسوقت بھی نہ ہوگا اور اسی کو فرمایا ہے۔ لا یبقی علی وجہہ الا رداء الکبریاء غرض اسوقت ہم ان حجب کے سبب کو حق تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتے مگر قاعدہ یہ ہے کہ جس محبوب کی ذات کو عاشق نہ دیکھ سکے وہاں تعلقات قرب ہی سے دل کو تسلی دیتا ہے۔ تو نماز میں گو رویت نہیں مگر کیا قرب کے تعلقات اسمیں تھوڑے ہیں چنانچہ آپ حق تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں ان کا نام لیتے ہیں انکی تعظیم و تقدیس کرتے ہیں تو کیا

٨٦

وصال کامل نہو سکنے کی صورت میں عاشق کو یہ باتیں مطلوب نہیں ہوتیں غور کیجئے اگر نام لینے سے بھی ممانعت ہوتی تو کیا حال ہوتا دیوبند میں ایک شخص کسی طالب علم پر عاشق تھا اور اس کا نام لیکر بار بار پکارر ہا تھا اس طالبعلم نے عاشق کے ایک ڈھول مارا اور کہا خبردار جو آج سے تونے میرا نام لیا غور کیجئے جب عاشق کو نام لینے سے بھی روکدیا جائے تو اس کے دل پر کیا حالت گذرے گی پھر اسکے بعد نماز میں حق تعالٰے نے اپنے ساتھ ہمکلامی کی اجازت دیدی ہے کہ ہمارے ساتھ بات چیت کرو یہ کتنا بڑا شرف عطا ہوا حدیث میں ہے کہ جب بندہ الحمد للہ رب العلمین کہتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں حمدنی عبدی پھر الرحمن الرحیم مالک یوم الدین کہتا ہے تو فرماتے ہیں مجدنی عبدی کہ اب میرا بندہ میری تعریف کر رہا ہے اب میری بزرگی بیان کر رہا ہے یہ آپ کے کلام ہی کا تو جواب ہے اور جواب بھی کیسے مزے کا کہ بار بار آپ کو اپنا بندہ فرماتے ہیں اس کا لطف عشاق سے پوچھو ایک عارف فرماتے ہیں ؎

اگر یک بار گوید بندۂ مومن ز فوق عرش گذر دخندۂ من

(وہ اگر کہدے مجھے اپنا غلام سب سے پیارا نام ہو میرا یہی)

شاید آپ کہیں کہ اس جواب کو ہم تو نہیں سنتے تو سمجھ لیجئے کہ اسوقت آپ کے مناسب یہی ہے کہ کانوں سے آپ جواب کو نہ سنیں لیکن جب مخبر صادق خبر دے رہے ہیں کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں تو پھر اس جواب میں شبہ کی کیا گنجایش ہے دیکھئے اگر آپ کسی محبوب کی پس پردہ تعریف کریں اور بعد میں کوئی شخص پردہ کے اندر سے آکر تم سے کہدے کہ محبوب تمہاری باتوں کو سنکر بہت خوش ہو رہا تھا اور چپکے چپکے کہہ رہا تھا کہ واقعی یہ میرا عاشق ہے تو بتلایئے اس خبر سے آپ کا کیا حال ہوگا یقیناً عاشق کو وجد آجائے گا اور بار بار پوچھے گا کہ ہاں کیا کہا تھا تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس ادنی مخبر کے قول سے بھی کم ہو گیا جو آپ کو اسپر وجد نہیں آتا بس یقین رکھئے کہ حق تعالیٰ یقیناً آپ کی بات کا جواب دیتے ہیں گو آپ کے کان نہ سنیں لیکن ذرا مجاہدہ کر کے دیکھو تو دل ضرور سنے گا محبوبوں کی باتیں یونہی ہوا کرتی ہیں وہ عشاق کی طرح ڈھول نہیں بجایا کرتے مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقان نہان ست ستیر　　عشق عاشق با دو صد طبل ونفیر

یہاں غنیمت ہے اگر کھلم کھلا ان کے جواب کو نہیں سنا تو یہ بھی بہت ہے کہ ان کے جواب دینے کی خبر تو سن لی۔ ؎

مرا از زلف تو موئے بسندست　　ہوس را رہ مدہ بوئے بسندست

یہ بوئے زلف ہی تو ہے کہ حدیث سے حضرت حق کے جواب کی خبر پہونچ گئی۔ اگر عشق کے ساتھ عاشق میں نیازمندی بھی ہو تو اسکو ان باتوں کی قدر ہوگی یہ حوصلہ سے زیادہ ہوس ہے کہ آپ علی الاعلان جواب سننے کے درپے ہوں ؎

آرزو مے خواہ لیک اندازہ خواہ　　برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

ایاز قدر خود بشناس بلکہ تم ایاز بھی نہ بنو سراپا نیاز بنجاؤ غرض یہ تعلقات قرب بھی ایک گونہ مشاہدہ ہی ہے گو بواسطہ سہی۔ سو اگر مشاہدہ بلا واسطہ نہیں ہے تو مشاہدہ بواسطہ ہی کو غنیمت سمجھو۔ ایک مشاہدہ بواسطہ یہ بھی ہے کہ تمام مخلوق مرآۃ حق ہے آپ مصنوعات باری میں نظر کر کے یہ سوچئے ؎ چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا۔ اس سے آپ کو صفات کمالیہ حق کا مشاہدہ ہوگا یہ تو مشاہدہ عامہ ہے اور نماز میں اس سے بھی بڑھکر مشاہدہ ہے وہاں یہ دیکھو کہ قلب تجلی گاہ حق ہے اس وقت ذوقاً تمکو حق تعالیٰ رائی العین معلوم ہونگے اہل ذوق اسکو جانتے ہیں بس دنیا میں تو اتنا ہی مشاہدہ کافی ہے۔ یہاں اس سے زیادہ ہوس نہ کرو کہ تمہارے حوصلہ سے باہر ہے اس حوصلہ سے آگے تمنا پر مجھے حضرت حاجی صاحبؒ کی ایک بات یاد آئی کہ بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا آپ کے سامنے ظاہر کی تو فرمایا کہ میاں تمہارا بڑا حوصلہ ہے جو حضورؐ کے دیکھنے کی تمنا ہے ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ گنبد خضرا ہی کی طرف نظر کرلیں یہ نیازمندی کا غلبہ ہے اور عاشق کو نیازمند ہی ہونا چاہیئے اسی کو ایک عاشق اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روی

ہماری نگاہ اور محبوب کے چہرہ پر پڑے بڑی حیرت ہے کہاں ہماری ناپاک نگاہ اور کہاں

وہ پاک چہرہ اسی کو بوعلی قلندر فرماتے ہیں سے

غیرت از چشم برم روے تو دیدن ندہم　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

اپنی آنکھ اور کان سے بھی غیرت آتی ہے آخر یہ کیا بات ہے۔ وہی نیازمندی۔ جب نیاز کا غلبہ ہوتا ہے تو محبوب کو دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی یہ استطرادی مضمون تھا مقصود یہ ہے کہ نماز میں گو دیدار تو نہیں ہے مگر دیدار کے قریب ہی مشاہدہ ہے کیونکہ حدیث میں ہے اقرب ما یکون العبد وہو ساجد فی الصلوٰۃ (او کما قال) کہ بندہ کو سب سے زیادہ قرب نماز میں بحالت سجدہ ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے واسجد واقترب کہ سجدہ کرو اور ہم سے قریب ہو جاؤ اگر انسان میں موانع قرب یعنی معاصی و غفلت وغیرہ کم ہوں تو اس قرب کا بخوبی مشاہدہ ہوتا ہے جتنے موانع کم ہوں گے اسی قدر مشاہدہ قرب زیادہ ہوگا اور اگر نماز میں خاص مشاہدہ نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص رنج کے وقت نماز کا حکم نہ ہوتا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے اس قول سے سخت رنج پہونچا تھا ان اللہ استلقی علی العرش فی یوم السبت لکراحتہ (نعوذ باللہ منہا) کہ اللہ تعالیٰ چھ دن میں آسمان و زمین پیدا کرکے ساتویں دن یعنی سنیچر کو عرش پر لیٹ گئے تاکہ تھکن دور ہو اور آرام ملے نعوذ باللہ نعوذ باللہ اور اسپر یہود کے قول کے رد کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ولقد خلقنا السموات والارض وما بینہما فی ستۃ ایام وما مسنا من لغوب فاصبر علی ما یقولون۔ ہم نے بیشک آسمان زمین کو اور ان کے درمیانی اشیاء کو چھ دن میں پیدا کیا مگر ہم کو کچھ تھکن ذرا بھی نہیں ہوئی (کیونکہ یہ تو تاثر ہے جو ممکن کی شان سے ہے واجب کو تاثر نہیں ہوا کرتا) پس آپ ان (یہودیوں) کی باتوں پر صبر کیجئے (زیادہ رنج نہ کیجئے) اس کے بعد یہ بڑھایا وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب جس میں نماز کا حکم ہے اب دیکھنا چاہیے کہ اسکو تسلی میں کیا دخل ہے کیونکہ یہ قرآن ہے جس کا لفظ لفظ مربوط ہے کوئی بات بے ربط نہیں تو فاصبر علیٰ ما یقولون کے بعد تسبیح یعنی صلوٰۃ کا امر یہ بتلاتا ہے کہ صلوٰۃ معین صبر ہے اور یہ ایسی اعانت ہے جیسے عاشق کو کسی دشمن کی گستاخی سے جو اس نے محبوب کی شان میں کی ہو رنج ہوا ہو اور محبوب یہ کہے کہ تم ان باتوں سے رنج نہ کرو آؤ تم ہم سے باتیں کرو یہودیوں کی باتوں کو چھوڑو غرض جیسے محبوب

کی اس بات سے عاشق کو کسقدر تسلی ہوگی اسی طرح حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ان کی بیہودہ باتوں سے رنج نہ کیجئے آپ نماز میں ہم سے باتیں کیجئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج کا اندازہ دوسری آیت سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون فانہم لا یکذبونک ولکن الظلمین بایات اللہ یجحدون ہ ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کافروں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے۔ آگے مشہور تفسیر تو یہ ہے اور میں نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ فانہم لا یکذبونک علت ہے ایک جملہ محذوفہ کی تقدیر یوں ہے فلا تحزن وکل امرہم الی اللہ فانہم لا یکذبونک الخ یعنی آپ غم نہ کیجئے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجئے کیونکہ یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے (کیونکہ آپ کو تو محمد امین کہتے اور صادق مانتے تھے) بلکہ یہ ظالم تو خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (سو آپ کس لئے رنج کرتے ہیں وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہتے ہماری آیتوں سے گستاخی کرتے ہیں سو ہم خود نمٹ لیں گے) مگر ایک بار مجھے ذوقاً دوسری تفسیر سمجھ میں آئی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عشق مع اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس مشہور سے یہ ابہام ہوتا ہے کہ حضور کو آیات الٰہیہ کی تکذیب سے رنج نہ ہونا چاہیئے بلکہ اپنی ذات کے ساتھ جب کوئی خلاف بات ہو اسوقت رنج ہونا چاہیئے حالانکہ آپ کے عشق و محبت کا مقتضا یہ ہے کہ آپ کو کفار چاہے کتنا ہی کہہ لیتے اس سے آپ کو زیادہ رنج نہ ہوتا آپ کو تو بڑا رنج اسی کا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کی ساتھ گستاخی کرتے اور آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے تھے۔ پس خاص اس اعتبار سے اس کی تفسیر قریب یہ ہوسکتی ہے کہ فانہم لا یکذبونک علت ہے قد یحزنک الذی یقولون کی اور ترجمہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کو کفار کی باتوں سے بہت رنج ہوتا ہے کیوں اسلئے کہ وہ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اگر آپ ہی کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو آپ کو زیادہ غم نہ ہوتا مگر آپ کو تکذیب آیات الٰہیہ کا تحمل نہیں ہوسکتا اس صورت میں حذف و تقدیر کی بھی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر آپ کی شان عشق کے بھی موافق ہے اور اس حدیث کے بھی موافق ہے کان لا ینتقم لنفسہ فی شئ الا ان تنتہک حرمات اللہ فینتقم فیہا للہ او کما قال۔ کہ آپ اپنے واسطے اپنی ذات کیلئے کسی سے کسی بات میں انتقام نہ لیتے تھے

۹۰

ہاں اگر حرمات کی توہین ہوتی دیکھتے تو اسوقت اللہ تعالیٰ کیلئے انتقام لیتے تھے۔ اور گو ظاہراً
یہ تفسیر سیاق سے بعید ہے مگر ایک بار ذوقاً کچھ قریب معلوم ہوئی تھی اسی لئے اس مقام پر اپنے
دعوے کی تائید میں اسکو ذکر کر دیا گو وہ دعوے اسپر موقوف نہیں بلکہ ظاہر ہے کہ آپ کو کفار کی
ان گستاخیوں سے جو حضرت حق کی شان میں وہ کرتے تھے سخت رنج ہوتا تھا تو ایسے شدید حزن
کیلئے نہایت قوی تسلی کی ضرورت ہے اور یہاں تسبیح یعنی صلوٰۃ کو تسلی کے طور پر بیان کیا گیا ہے
اور عادۃً عاشق کو تسلی کسی چیز سے ایسی نہیں ہوتی جیسے محبوب کے قرب و مشاہدہ سے ہوتی ہے
پس معلوم ہوا کہ نماز میں ایسا قوی قرب و مشاہدہ ہوتا ہے جو کسی اور امر سے نہیں ہوتا ورنہ حق تعالیٰ
تسلی کے لئے اسی امر کی تعلیم کو اختیار فرماتے اسی لئے حدیث میں آتا ہے کان اذا حزبہ
امر فزع الی الصلوٰۃ کہ جب حضور کو کوئی بڑا فکر پیش آتا تو آپ جلدی سے نماز میں مشغول ہو جاتے
کیوں اسی لئے تا کہ حق تعالیٰ سے باتیں کر کے دل بہلائیں اور تسلی و سکون حاصل کریں اور واقعی
تجربہ و مشاہدہ ہے کہ رنج و فکر میں نماز میں مشغول ہو جانے سے رنج بہت کم ہو جاتا ہے اور اگر موانع
قرب کم ہوں تو بالکل رنج کا ازالہ ہو جاتا ہے تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے زیادہ کہنے کی کیا ضرورت
ہے۔ بہر حال نماز میں جو حق تعالیٰ کیساتھ ہمکلامی ہے اور ان کی تسبیح و تقدیس ہے یہی مشاہدہ کافی ہے
کہ بندہ حق تعالیٰ کی طرف بشراشرہ متوجہ ہو جائے اگر اس میں کمی ہو تو البتہ مشاہدہ میں کمی ہے اسکی تلافی کرنا
چاہیئے پھر جب یہ مرتبہ حاصل ہو جائیگا کہ نماز میں حق تعالیٰ کے سوا کسی کی طرف توجہ نہ رہے تو آپ کو خود ہی
اس کا لطف حاصل ہوگا اور اسوقت آپ سمجھیں گے کہ میں نے جو اس مشاہدہ کو کافی کہا ہے یہ صحیح تھا
دنیا میں بڑی کامیابی بندہ کی یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف یکسوئی کیساتھ نماز میں توجہ نصیب ہو جائے
اسی کیواسطے صوفیہ مجاہدے کرتے ہیں اور اسی کو مشاہدہ سے تعبیر کرتے ہیں پھر نماز میں تلاوت قرآن
بھی ہوتی ہے۔ اور قرآن ایسی چیز ہے جسمیں ایک مستقل شان مشاہدہ ہے کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ کلام میں
متکلم کا جلوہ ہوتا ہے اور کسی کے کلام کو دیکھ لینا گویا متکلم کو دیکھ لینا ہے کیونکہ اس سے متکلم کی طبیعت کا انداز
اور رنگ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اخباروں میں جو عورتوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں تو اہل
ادراک اسی سے ان کی طبیعت کی شوخی وغیرہ کا پتہ لگا لیتے ہیں یہ واقعی ویسا ہی ہے جیسے بیحجاب دیکھ لیا
اسی لئے بعض فقہاء نے صوت عورت کو عورت کہا ہے گو بدن مستور ہی ہو کیونکہ گفتگو اور کلام سے بھی

عشق و میلان ہو جاتا ہے اسی واسطے میں عورتوں کے مضامین کا اخبارات میں شائع ہونا پسند نہیں کرتا بلکہ ناجائز سمجھتا ہوں ہاں اگر یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ یہ مضمون عورت کا ہے تو مضائقہ نہیں مگر اس میں بھی یہ شرط ہے کہ عورت خود اڈیٹر سے خط وکتابت نہ کرے کیونکہ اڈیٹر خط سے بھی پہچان لیتے ہیں کہ کاتب مرد ہے یا عورت ایک جگہ اس مضمون نویسی سے بڑا فتنہ ہوگیا کہ عورت اخبار کے اڈیٹر سے اسی سلسلہ میں خط وکتابت کرتی تھی اڈیٹر کے خطوط بھی اس کے نام آتے تھے اول اول تو مضامین ہی کے متعلق خط وکتابت تھی پھر محبت آمیز خط آنے لگے اب اس عورت کا خاوند اڈیٹر سے خط کتابت کو منع کرتا ہے مگر عورت باز نہیں آتی ہم نے کہا کہ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ آپنے ابتدا میں خط وکتابت کو گوارا کیا پس اگر کسی کو ایسا ہی اپنی بیوی کے مضامین شائع کرانیکا شوق ہو تو اسکو بلا واسطہ خط لکھنے کی اجازت نہ دے بلکہ مرد اپنے آپ اپنے نام سے مضمون بھیجے اور میرے نزدیک تو یہ بھی پسند نہیں گو میں اسکی حرمت پر فتویٰ نہیں دیتا مقصود میرا یہ ہے کہ صرف کلام سے بھی متکلم کا بہت کچھ مشاہدہ ہو جاتا ہے اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی زیب النساء عالمگیر کی بہن بہت بڑی شاعرہ تھی جس کا تخلص مخفی تھا ایک دفعہ شاہ ایران کو خبط سوجھا کہ آپ نے ایک بے تکا مصرع موزوں کیا۔

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود ۔ پھر سارے شعراء کو جمع کیا کہ اس پر دوسرا مصرعہ لگاؤ تمام شعراء عاجز ہوگئے کہ ہم سے اسپر مصرع نہیں لگتا یہ تو کون کہتا کہ حضور کا مصرع ہی بیہودہ ہے مگر مطلب یہی تھا ۔ چونکہ اسوقت ہندوستان میں بھی فارسی کے شعرا ایسے ایسے تھے جو اہل زبان کی برابری کرتے تھے اسلئے شاہ ایران نے یہ مصرع شاہ دہلی کے پاس بھیجدیا کہ اپنے یہاں کے شعراء سے اسپر دوسرا مصرع لگوا کر بھیجدیجئے کیونکہ شعراء ایران سب عاجز ہوگئے بادشاہ نے تمام شعراء کو اسکی اطلاع کردی یہ خبر زیب النساء کو بھی پہونچی وہ بھی فکر میں ہوئی ۔ ایک دن صبح کے وقت زیب النساء نے جو سرمہ لگایا تو وہ کچھ آنکھ میں تیز لگا جس کی تیزی سے ایک آنسو گرا جو سرمہ کی سیاہی سے مل کر دُرِ ابلق کی مثال ہوگیا تھا فوراً شاہ ایران کے مصرع کی طرف ذہن منتقل ہوا اور دوسرا مصرع سمجھ میں آگیا ؎

دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود — مگر اشک بتان سرمہ آلود

محبوب کے آنسو کو موتی سے تشبیہ دیا ہی کرتے ہیں سرمہ کی آلودگی اسکو دُرِ ابلق کہنا بہت

ہی موزوں ہوگیا اور واقعی اس مصرع کے سوا اور کوئی مصرع اس پر لگ بھی نہ سکتا تھا اور
نہ در ابلق کی مثال اس سے بہتر کوئی بیان کرسکتا ہے اس نے فوراً شاہ دہلی کو اطلاع کی کہ
شاہ ایران کی درخواست پوری ہوگئی اور یہ مصرع لکھکر بھیجدیجئے اس سے شاہ دہلی
بھی خوش ہوئے کہ جس مصرع کے پورا کرنے سے شعراء ایران عاجز ہوگئے تھے ہندوستان
کی شاعرہ نے اسکو پورا کردیا اور بہت اچھا پورا کیا واقعی بادشاہوں کا دماغ بھی بادشاہ ہوتا
ہے غرض ایران خط پہونچا شاہ ایران کو بھی بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارا مصرع بیہودہ نہ رہا اور
تمام شعراء کو بلاکر جمع کیا اور کہا دیکھو ہندوستان کے ایک شاعر نے ہمارے مصرع پر مصرع
لگادیا۔ شعراء نے جب سنا ہے تو عش عش کرگئے کہ واقعی بہت اچھا جوڑ لگایا شاہ ایران سے
عرض کیا کہ اس شاعر کو یہاں بلائیے ہم اس کی شاگردی اختیار کریں گے شاہ ایران نے دہلی
خط لکھا کہ اس شاعر کو ایران بھیجدیا جائے ہم اس کی بہت تعظیم وتکریم کریں گے اور تمام
شعراء اس کی شاگردی اختیار کریں گے شاہ دہلی نے زیب النساء کو خط سنایا اور کہا لو اور
شاعری کرو اب جاؤ ایران تمہارا وہاں سے بلاوا آیا ہے۔ زیب النساء نے کہا کہ میرے جانیکی ضرورت
نہیں آپ شاہ ایران کو لکھدیجئے کہ میں نے شاعر سے آپ کی تحریر کا تذکرہ کیا تھا اس نے جواب
دیا اور جواب میں بھی شعر ہی لکھوایا ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل   ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اس جواب سے شاہ ایران سمجھ گئے کہ شاعر عورت ہے تو دیکھئے مخفی نے اپنے کلام کے دیکھنے کو خود
اپنے ہی دیکھنے کے قائم مقام بتلایا اور واقعی یہ مبالغہ نہیں کلام کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو متکلم کا
ہوتا ہے گو برابر نہ سہی مگر قریب قریب تو ہوتا ہی ہے اب حق تعالیٰ کا کلام قرآن آپ کے سامنے
ہے اسکو پڑھ لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کو دیکھ لیا یہ دوسرا مشاہدہ ہے جو نماز میں ہوتا ہے
پھر محبوب سے ہمکلام ہونیکے بعد جی چاہتا ہے کہ ان کا ذکر کریں ان کی ثنا وحمد کریں تو نماز
سرے سے اخیر تک ذکر ہی ذکر ہے اور یہ سب وہ امور ہیں جو عاشق کو خود مقصود بالذات
ہوتے ہیں تو یہ نماز کے اجزاء محض اعمال ہی نہیں بلکہ ثمرات بھی ہیں نیز نماز جب عین
ذکر ہے جیسا عنقریب آتا ہے تو اب اقم الصلوٰۃ لذکری ایسا ہے جیسا کہ یوں فرماتے

۹۴

اقم الصلوٰۃ للصلوٰۃ یا یوں فرماتے اذکرنی لذکری کیونکہ ذکر اور صلوٰۃ میں تغائر نہیں ہے
بلکہ حقیقۃً اتحاد ہے گو اعتباری تغائر تو ہے اور اسی لحاظ سے لذکری پر لام کا داخل ہونا
بھی صحیح ہوگیا مگر واقع میں تغائر نہیں گو عنوان دو ہیں بلکہ نماز عین ذکر ہے اور ابھی معلوم
ہو چکا کہ عاشق کو محبوب کا ذکر خود بالذات مقصود ہوتا ہے تو نماز کا مقصود بالذات ہونا
اس سے بھی ثابت ہوگیا اور یہ بات سوائے نماز کے کسی طاعت میں نہیں ہے
کہ وہ خود عمل بھی ہو اور ثمرہ بھی پس نماز کی یہ حقیقت ہونا پھر موسیٰ علیہ السلام کو
مقام قرب خاص میں اس کا امر ہونا یہ کتنا بڑا شرف ہے اب صلوٰۃ کا ذکر ہونا جس آیت
سے مستفاد ہوتا ہے اسکو ذکر کرتا ہوں مگر ایک تفسیر پر وہ آیت یہ ہے اتل ما اوحی الیک
من الکتاب واقم الصلوٰۃ ط ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر ط
اس کی دو تفسیریں ہیں ایک یہ کہ لذکر اللہ اکبر میں ذکر مستقل مامور بہ ہے مطلب
یہ ہوگا کہ جو کتاب آپ کی طرف نازل ہوئی ہے اسکی تلاوت کیجئے اور نماز کو قایم کیجئے
بیشک نماز بیحیائی اور گناہ سے روکتی ہے یہاں تک تو قرآن اور نماز کا ذکر تھا آگے ذکر اللہ
کا امر ہے کہ اللہ کی یاد بڑی چیز ہے اسی جگہ سے بعض جہلا صوفیہ کو غلطی ہوئی کہ وہ صرف ذکر کو
لیکر بیٹھ گئے اور نماز وغیرہ کے تارک ہوگئے حالانکہ اول تو یہ ضرور نہیں کہ اکبر کا مفضل
علیہ یہاں نماز و تلاوت ہو اور ذکر کی افضلیت ان کے اعتبار سے بیان کرنا مقصود
ہو ممکن ہے کہ مقصود یہ ہو کہ ذکر بھی فی نفسہ بہت بڑی چیز ہے یہ مطلب ہو کہ نماز
و قرآن سے بھی اکبر ہے دوسرے اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ نماز و تلاوت سے کسی خاص
وجہ سے اکبر ہے تو اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ نماز و تلاوت وغیرہ بیکار رہیں قابل ترک
ہیں اگر اکبر کے سامنے اصغر بیکار ہو تو چاہیے کہ ان ہی مستدل شاہ صاحب کے چھوٹے
بیٹوں کو بڑے کے ہوتے ہوئے ذبح کر دیا جائے اور اگر ان کے نزدیک بڑے بیٹے کے
ہوتے ہوئے بھی اصغر کے وجود کی ضرورت ہے اور وہ اسکے ذبح پر راضی نہیں ہیں تو
پھر یہاں کیوں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ذکر کے ہوتے نماز وغیرہ کی ضرورت نہیں خیر یہ تو
مشہور تفسیر تھی اور میں نے ثابت کر دیا کہ اس سے بھی جہلا صوفیہ کا مدعیٰ حاصل نہیں ہوتا مگر

۹۴

میرے نزدیک اس کی دوسری تفسیر ہے وہ یہ کہ اتل ما اوحی الیک میں تو تلاوت قرآن کا
امر ہے اور اسکی فضیلت بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جسکی
اصل ایک صفت ہے حق تعالیٰ کی اور اللہ تعالیٰ کی صفت فضیلت ظاہر ہے اس کے بعد
نماز کا امر ہے اور نماز چونکہ ہمارا عمل ہے اسلئے اس کی فضیلت بیان کرنے کی ضرورت تھی
تو اس کی یہ فضیلت بتلائی گئی کہ وہ فحشاء و منکر سے روکتی ہے آگے اس کی
علت کا بیان ہے کہ نماز فحشاء و منکر سے کیوں روکتی ہے لانہا ذکر اللہ
ولذکر اللہ اکبر وہ اسواسطے گناہوں اور بیحیائی سے روکتی ہے کہ وہ ذکر اللہ ہے اور
ذکر اللہ بڑی چیز ہے جو محبت و خشیت پیدا کرتا ہے پھر وہ فحشاء و منکر سے کیوں نہ روکے گا۔
جب اس آیت کی یہ تفسیر لی جاوے۔ اور یہ تفسیر قواعد کے بھی خلاف نہیں بلکہ غور کیا جاوے
تو اوفق بالسیاق ہے تو اب اگر میں اقم الصلوٰۃ لذکری میں ذکر سے صلوٰۃ ہی کو مراد لوں تو کیا
بعید ہے غرض میرا یہ دعوی بیغبار ہوگیا کہ نماز لذاتہ ہی مقصود ہے اور روزہ و حج و زکوٰۃ
وغیرہ میں مقصودیت لذاتہا کی اس درجہ کی شان نہیں بلکہ وہ مقصود لغیرہا ہیں بلکہ اگر غور
کیا جائے تو ان میں عبادت کی شان بھی ایک عارض کی وجہ سے ہے مثلاً ترک طعام
و شرب و جماع جو روزہ کا رکن ہے یہ خود فی نفسہ عبادت نہیں لیکن عارض کسر نفس کی
وجہ سے یہ عبادت ہوگیا بلکہ اگر اس میں تشبہ بالحق کی شان پر نظر کی جاوے تو اس میں تو
شان عبادت کی جگہ دوسری شان کا غلبہ نظر آویگا اسی طرح حج میں بھی جتنے افعال ہیں وہ
ایک عارض کی وجہ سے عبادت ہیں ورنہ دوڑنا بھاگنا گھومنا پتھر پھینکنا معمولی افعال ہیں مگر
عبادت اس لئے قرار دیے گئے کہ عشاق بندوں کو بیت اللہ کے منسوب الی اللہ ہونے سے
طواف بیت سے کسی درجہ میں تسلی ہو جیسا کہ محبوب کے تخت کے طواف سے تسلی ہوتی
ہے اسی طرح دوسرے افعال بھی عاشقانہ مقرر کئے گئے تاکہ اس میں داعیہ محبت کی ترقی
اور بندوں کی تسلی ہو اسلئے یہ عبادت ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی حاجت فقیر کے لحاظ سے
عبادت ہے اور جہاد و اضحیہ وغیرہ میں تو فقہاء نے خود کہا ہے کہ جہاد و اراقت دم حیوان
فی نفسہ عبادت نہیں بلکہ اتلاف نفوس ہے لیکن عارض اعلاء کلمۃ اللہ کی وجہ سے عبادت

۹۵

ہوگئی غرض اور سب عبادات میں عوارض کی وجہ سے عبادت کے معنی پیدا ہوگئے تو وہ مقصود لغیرہا ہیں اور نماز خود عبادت ہے جیسا مذکور ہوا۔ پس نماز ہی ایسی عبادت ہے جو مقصود بالذات ہے پھر حیرت ہی نہیں کہ اس عبادت سے عورتوں کو شوق نہیں اور نہ اس کا اہتمام ہے اور جو عبادتیں مقصود لغیرہا ہیں ان کا بڑا شوق ہے یہ تو بے نمازیوں کو سنانا تھا اب نمازیوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی نماز پر ناز نکریں کیونکہ حق تعالیٰ نے محض صل نہیں فرمایا کہ نماز پڑھا کرو بلکہ اقم الصلوٰۃ فرمایا ہے جس میں اقامت کا امر ہے اور اقامت صلوٰۃ یہ ہے کہ اس کے سب ارکان اعتدال وتسویہ کے ساتھ ادا کئے جائیں تو نماز پڑھکر بیفکر نہو جیے بلکہ اقامت کی کوشش کیجئے اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے حق تعالیٰ ہمکو نماز کا شوق عطا فرمائے اور اقامت

صلوٰۃ کی توفیق نصیب ہو

وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی

آلہ واصحابہ اجمعین ہ

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اشرف علی

۷/ ذی قعدہ ۱۳۵۰ھ

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

عُلُوّ العِبَاد مِن علوم الرّشاد

این	متٰی	کم	لم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیوں ہوا	کس طرح ہوا	کس مضمون میں	کس نے لکھا	کتنے سننے والے	متفرقات
[illegible]	۱۵ شعبان ۱۳۴۲ھ	تقریباً ۲ گھنٹے	×	کھڑے ہو کر	آداب مجالس اور فضیلت علم میں	[illegible]	تقریباً ۱۵۰۰ آدمی	[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۞ الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہٗ صلی اللہ علیہ وعلٰی آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم ۞

امّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا ایھا الذین اٰمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت واللہ بما تعملون خبیرہ

یہ سورۂ مجادلہ کی آیت ہے حق سبحانہٗ وتعالیٰ ان میں بعض آداب مجالس کے بیان فرماتے ہیں ہر چند آیت کا شان نزول

ع شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

خاص ہے مجلس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں اسلئے خصوصیت مورد کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ عموم الفاظ کے اعتبار سے حکم عام ہوگا پس خاص حضورؐ ہی کی مجلس کیساتھ یہ حکم مخصوص نہیں۔ بلکہ یہ حکم تمام مجالس کو عام ہے اور حق تعالیٰ شانہ نے اس جگہ اس حکم کے جو کہ دو حکموں پر مشتمل ہے امتثال پر اسکے ثمرہ کا بھی وعدہ فرمایا ہے چنانچہ پہلے حکم اور اسکے ثمرہ کیلئے ارشاد ہے اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم۔ یہ تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ ہے آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں و اذا قیل انشزوا فانشزوا یہ تو حکم ہے اور اسکا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت اور اس ثمرہ اور اس کے وعدہ میں اول تعمیم فرمائی اسکے بعد تخصیص کے طور پر بعض لوگوں کے واسطے یعنی اہل علم کیلئے ثمرہ جداگانہ بیان فرمایا اور تخصیص بعد تعمیم بقواعد علم بلاغۃ اہتمام کو مقتضی ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل علم کو چاہیئے کہ اسکو مہتم بالشان سمجھکر اسکا خاص طور پر اہتمام کریں اور اسوقت اسکو بیان کیلئے اسواسطے اختیار کیا گیا کہ یہ امر بظاہر شعائر وارکان دین سے نہیں بلکہ ایک معمولی سی عادت ہے جسکی ہر جلسہ میں ضرورت ہوتی ہے مگر عام طور پر لوگ اسکو ضروریات سے خیال نہیں کرتے اسلئے اسکو بیان کیلئے اسکو اختیار کیا گیا۔ اس اجمال کی تفصیل اسکے ترجمہ سے واضح ہوجائیگی اور ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانوں جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں فراخی کردو تو فراخی کردیا کرو اور جب تم سے کہا جاوے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو یعنی اگر اس جگہ سے اٹھنے کا امر ہو تو اس جگہ سے اٹھ جایا کرو پھر خواہ تمکو دوسری جگہ بیٹھنے کا حکم ہوجاوے خواہ چلدینے کا امر ہو تو اسی پر عمل کیا کرو اسکا انکار نکیا کرو) اور ظاہر ہے کہ یہ امر عقائد میں سے نہیں اعمال رکینہ سے نہیں مالی حقوق میں سے نہیں اسلئے ظاہراً معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر چونکہ واقع میں قابل اہتمام اور ضروری امر ہے

۹۸

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بہت سے صحابہ بھی حاضر تھے کہ اصحاب بدر آئے (وہ لوگ جو جنگ بدر میں شریک تھے۔ اس وقت مجلس میں کچھ تنگی تھی حضور نے حاضرین مجلس کو حکم فرمایا کہ ملکر بیٹھو اور ایک روایت میں ہے کہ حضور صلعم نے بعض کو حکم فرمایا کہ اٹھ جاؤ اپنے کسی دوسرے کام میں لگو یا اٹھا دوسری جگہ بیٹھ جاؤ صحابہ تو حضور کے لبوں کو تکتے تھے وہ اسپر نہایت خوشی سے عامل ہوگئے لیکن منافقین نے کہ وہ ایسے موقع کیلئے ادھار کھائے بیٹھے رہتے تھے اسپر اعتراض کیا۔ خدا تعالیٰ نے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض لغو ہے کیونکہ حضور کے وہ دونوں حکم مناسب اور مستحسن تھے اور مستحسن کو غیر مستحسن کہنا حماقت ہے ۱۲ (اشفاق الرحمٰن از خطبہ فضل العلم داخل حصہ (۸) دعوت عبدیت

لئے اسکو نہایت اہتمام کیساتھ بیان فرمایا۔ چنانچہ اول تو یاایہا الذین آمنوا سے خطاب ہے باوجودیکہ
قرآن سے مومنین ہی مخاطب ہیں اور اکثر قرآن میں مسلمانوں ہی کو خطاب ہوتا ہے پھر اس صریح خطاب سے
کیا فائدہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ اس سے مقصود رغبت دلانا ہے کہ یہ امر ہر چند شعائر دین سے نہیں اسلئے
عام طور سے ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کا اہتمام نہ ہو مگر ہمارے مخاطب وہ ہیں جو ہم پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ
ضرور اسکو قبول کرینگے اس طرز کلام سے اس مضمون کی سامعین کو رغبت دلائی اور دوسرا اہتمام اذا قیل لکم بصیغہ
مجہول سے ظاہر فرمایا باوجودیکہ واقعہ خاصہ میں اس قول کے قائل خاص حضور اقدس ہیں پھر بھی عنوان
عدم تعیین قائل سے تعبیر فرمایا (یعنی قیل مجہول کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا بجائے صیغہ معلوم (قال لکم
کے) اور یہ عدول اسوجہ سے فرمایا کہ اس مسئلہ میں حضور کے ارشاد کی تخصیص نہیں اسلئے حکم عام ہے
ہر صدر مجلس کے قول کو تیسرا اہتمام یہ کہ امر کے صیغہ کیساتھ بیان فرمایا یعنی فافسحوا اور فانشزوا اور
ظاہر ہے کہ امر حقیقۃً وجوب کیلئے ہوتا ہے جب تک کہ کوئی قرینہ صارفہ عن الحقیقۃ نہ ہو۔ گو واجبات کے
درجات مختلف ہوتے ہیں کہیں وجوب لعینہ ہوتا ہے کہیں وجوب لغیرہ مگر نفس وجوب میں شرکت ضرور
ہوتی ہے چوتھا اہتمام یہ ہے کہ تفسحوا کا امر اور اُسکا ثمرہ جدا بیان فرمایا اور انشزوا اور اس کا ثمرہ جدا بیان
فرمایا ورنہ اگر اختصار کے ساتھ مجلس میں حکم صدر کی اتباع کا مشترکہ امر فرما دیتے تو اسدرجہ اہتمام نہ ہوتا
جیسا کہ جدا جدا بیان کرنے میں ہوا۔ پانچواں اہتمام یہ ہے کہ لفظ فی المجالس بصیغہ جمع فرمایا باوجودیکہ
فی المجلس بھی کافی تھا اور وہ بھی جنس کی وجہ سے عام ہوتا مگر چونکہ اس میں یہ احتمال باقی تھا کہ اس عام
کو خاص پر محمول کر لیا جاتا اور مجلس سے خاص مجلس مراد لیلی جاتی (یعنی حضور کی مجلس) اسلئے فی المجالس
فرما کر اسکا احتمال بھی قطع فرما دیا کہ اب احتمال تخصیص کا ہو ہی نہیں سکتا لہذا حکم عام ہوگا تخصیص کا
احتمال ہی نہیں۔ چھٹا اہتمام یہ ہے کہ جس ثمرہ کو مرتب فرمایا اسکا بڑا ہونا ظاہر فرما دیا کیونکہ مقتضا علم
بلاغت کا یہ ہے کہ عادۃً چھوٹے ثمرہ کو ذکر نہیں کیا کرتے اور یہاں ثمرہ کا ذکر موجود ہے اور قرآن کا
فصیح و بلیغ ہونا مسلم ہے بس قرآن میں کس ثمرہ کا ذکر ہونا اسکو مقتضی ہے کہ یہ ثمرہ بہت بڑا ہے اور
جب ثمرہ بڑا ہوتا ہے تو عمل کا بڑا ہونا بھی ضروری ہے جس پر اسقدر بڑا ثمرہ مرتب ہوا ہے تو اس سے
عمل مذکور کی یعنی توسع اور قیام کی اہمیت و عظمت بھی معلوم ہوئی ساتواں اہتمام خاص اہل علم کی
فضیلت ظاہر کرنے کیلئے یہ کیا گیا کہ ثمرہ یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت میں

99

ایمان والوں کو اولاً و عموماً اور اہل علم کو ثانیاً و خصوصاً بیان فرمایا تا کہ اہل علم کی بالتخصیص فضیلت معلوم ہو جاوے پھر اس سب کے بعد خلاف پر وعید ہے واللہ بما تعملون خبیر۔ اس سے اور زیادہ اہتمام بڑھ گیا یعنی اگر تم اس پر عمل نہ کروگے تو جو کچھ تم کروگے حق تعالیٰ اس سے خبردار ہیں اسلئے تمہیں مخالفت سنبھل کر کرنی چاہئیے پس واللہ بما تعملون خبیر ظاہراً وعید ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ وعدہ ہو کہ اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب ضرور ہوگا کیونکہ تمہارے اعمال کی حق تعالیٰ کو خبر ہے اسلئے اس عمل کے کرنے پر ثمرہ کا ترتب فرما دیں گے۔ یا اعمال مذکورہ کے معتد بہ ہونیکی شرائط کی طرف اشارہ ہے یعنی تفسح فی المجالس یا نشوز مطلقاً معتبر و معتد بہ نہیں بلکہ اس میں خلوص بھی شرط ہے یعنی صرف صورۃً عمل پر ثمرہ مذکورہ مرتب نہ ہوگا بلکہ اخلاص بھی ضروری ہوگا اور اخلاص امر باطنی ہے اسلئے اپنے خبیر بمعنی عالم بباطن الامور ہونے پر تنبیہ فرما دی۔ غرض ان سب اہتماموں سے معلوم ہوا کہ یہ عمل نہایت مہتم بالشان ہے یہ تو آیت کا حل اجمالی ہے جس سے میرا مقصود علم و عمل کا اہتمام ثابت کرنا ہے عمل کا اہتمام تو ظاہر ہے کہ ایک معمولی عمل کیلئے یہاں اتنا اہتمام فرمایا گیا ہے پھر جو عمل ذاتاً بھی عظیم ہو اس کا اہتمام تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگا اس سے تمام اعمال کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہو گیا۔ اور علم کا اہتمام اس طرح ہوا کہ ثمرہ میں اہل علم کو عام مومنین سے جدا بیان کیا اور تخصیص بعد تعمیم کے مفید اہتمام کو ہوتی ہے۔ اب میں اس مضمون کے بعض اجزا اور متعلقات کی تفصیل مختصر عرض کرتا ہوں اور اس سے پہلے ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے وہ شبہ یہ ہے کہ آداب مجالس تو ایک معمولی اور چھوٹا سا عمل ہے اسکو اسقدر اہتمام سے کیوں بیان فرمایا کیونکہ یہ کوئی درجۂ عقائد سے نہیں فرائض سے نہیں ارکان و واجبات سے نہیں اسدرجہ کا اہتمام تو ان امور کا ہونا چاہئیے جو ذاتاً بڑے ہوں اور جو امر ذاتاً بڑا نہ ہو اسکے ایسے اہتمام کی کیا ضرورت ہے اور آداب مجالس کوئی ایسا امر نہیں جسکے اہتمام کی اسقدر ضرورت ہو یہ شبہ بہت سے لوگوں کے ذہن میں آیا ہوگا جسکی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگوں نے اس عمل کو معمولی سمجھ رکھا ہے اور اسی وجہ سے عام طور پر اس کا اہتمام نہیں کرتے تو منشا شبہ کا صرف یہ بات ہے کہ یہ ایک معمولی اور چھوٹا سا عمل ہے اور معمولی شئی قابل اہتمام نہیں ہوتی حالانکہ اول تو یہی مقدمہ غلط ہے کہ معمولی اور چھوٹی شئی قابل اہتمام نہیں ہوتی کیونکہ چھوٹا اور معمولی ہونیکے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ قابل اہتمام اور قابل قدر نہ ہو دیکھئے سب سے چھوٹا آسمان

سماء دنیا ہے۔ عرش کرسی وغیرہ سے بہت چھوٹا ہے مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ سماء دنیا کوئی چیز نہیں یا سماء دنیا قابل وقعت نہیں بلکہ باوجودیکہ عرش وغیرہ سے وہ بہت چھوٹا ہے مگر پھر بھی اپنی ذات میں اسی طرح بہت سی اور چیزوں کے مقابلہ میں قابل وقعت ضرور ہے عرش وکرسی سے چھوٹا ہوا تو کیا لیکن ٹیلوں کے مقابلہ میں تو بہت بڑا ہے ؎

آسمان نسبت بعرش آمد فرود — لیک بس عالی است پیش خاک تود

اور نظیر دیکھو آسمان کے سامنے ستارے کتنے چھوٹے ہیں مگر ان میں بعضے بعضے زمین سے بھی بہت بڑے ہیں تو ستاروں کا چھوٹا ہونا اسکو مقتضی نہیں کہ ستارہ قابل وقعت نہو یہ تو محسوسات میں گفتگو تھی اب اعمال میں دیکھو کہ ارکان بھی آپس میں متفاوت ہیں مثلاً نماز میں قیام سجدہ جلسہ مختلف ارکان ہیں مگر سب ایک درجے کے نہیں کیونکہ ان کے فضائل مختلف ہیں اور وہ آپس میں چھوٹے بڑے ہیں کوئی چھوٹا کوئی بڑا کیونکہ صغر وکبر امور اضافیہ میں سے ہے مگر ایک رکن کا دوسرے کے اعتبار سے چھوٹا ہونا اسکو ہرگز مقتضی نہیں کہ وہ رکن قابل وقعت نہیں ورنہ اسکی رکنیت ہی محل کلام ہو جائے گی پس یہ مقدمہ ہی غلط ہے کہ جو چیز کسی سے چھوٹی ہو وہ قابل اہتمام ہی نہو مگر اس غلطی میں آجکل بہت لوگ مبتلا ہیں چنانچہ بعض جہلاء صوفیہ نے ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر کے بعد ولذکر اللہ اکبر کو دیکھکر نماز ہی چھوڑ دی کیونکہ ان لوگوں نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے کہ نماز تو صرف فحشاء اور منکر ہی سے بچاتی ہے اس میں صرف یہ عارضی فضیلت ہے اور ذکر اللہ اپنی ذات میں بڑی چیز ہے تو جو لوگ ذکر اللہ میں مشغول ہوں ان کو نماز کی حاجت نہیں مگر اس شبہ کا منشاء صرف تفسیر کا بدلنا ہے ذرا صحیح تفسیر کیجئے تو یہ شبہ جاتا ہے۔ اس کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس آیت میں نماز کی فضیلت بیان فرماتے ہیں کہ نماز کی پابندی کرو کیونکہ نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے اور نماز فحشاء ومنکر سے اسلئے روکتی ہے کہ وہ ذکر اللہ پر مشتمل ہے اور ذکر اللہ بڑی چیز ہے اس میں ایسی ہی برکت اور خاصیت ہے اب اس تقریر کے بعد جواب دیکھئے سو دراصل ولذکر اللہ اکبر دلیل ہے ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر کی کہ نماز فحشاء وغیرہ سے اسلئے روکتی ہے کہ وہ مشتمل ہے ذکر اللہ پر اور ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے اسکی یہی خاصیت ہے تو اب بتلاؤ کہ اس تقریر سے نماز کا بڑا ہونا لازم آیا یا چھوٹا ہونا جب نماز بھی بڑی چیز ہے تو وہ قابل ترک کیسے ہوئی

۱۰۱

ہمکو یہ بھی مسلم نہیں کہ چھوٹی چیز قابل ترک ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر غور کیجئے ہم سوال کرتے ہیں کہ اگر کسی کے دو لڑکے ہوں ایک چھوٹا ایک بڑا کیا چھوٹے کو قتل کردینگے ہرگز نہیں پس یہ قاعدہ مسلم نہیں کہ چھوٹی چیز قابل ترک ہوا کرتی ہے اگر ذکر اللہ نماز سے بڑا بھی ہو تو نماز کو اس کے مقابلہ میں ترک نہیں کرسکتے چہ جائیکہ وہ ذکر اللہ کو بھی مشتمل ہو۔ یہ تفاوت تو دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز بڑی ہے اور کوئی چھوٹی مگر دنیا میں سینکڑوں ایسی مثالیں ہیں کہ بڑی شے کے موجود ہوتے ہوئے بھی چھوٹی شئی کی حاجت رہتی ہے اور چھوٹی شئے قابل ترک نہیں ہوتی۔ دیکھئے بادشاہ اپنے سب ماتحتوں اور چھوٹوں کو معزول نہیں کرسکتا اور اگر معزول کردے تو کام نہیں چل سکتا اور دیکھئے انگلیوں میں آپس میں کسقدر تفاوت ہے مگر سب کی حاجت ہے صرف بڑی پر اکتفا نہیں ہوسکتا چھوٹی کی بھی حاجت ہے بلکہ بڑے کی بڑائی چھوٹے کے وجود پر موقوف ہے اگر چھوٹے نہ ہوتے تو بڑے کا وجود بے قدر تھا اس بناء پر چھوٹے کا وجود بھی مہتم بالشان ہے۔ چنانچہ بادشاہ کو رعایا کی سخت حاجت ہے بلکہ بادشاہ کی بادشاہی رعایا پر موقوف ہے اگر رعایا نہ ہو تو بادشاہی ہی معرض خطرہ میں ہو جاوے اس مضمون کو شاعرانہ مضمون نہ خیال کیا جاوے بلکہ یہ بات واقعی ہے اور سچ یہ ہے کہ بڑے اعمال میں نورانیت چھوٹے ہی اعمال سے ہوتی ہے چنانچہ فرائض کی تکمیل نوافل سے ہوتی ہے اگر کوئی نوافل ادا نہ کرے اور بالکل ترک کرے تو اس کا فرض بھی غیر کامل ہوگا گو بمعنی ناقص نہیں مگر بمعنی غیر اکمل ہوگا اور اگر مع نوافل ادا کرے تو وہ فعل اکمل ہوگا تو دیکھئے تکمیل فرائض کی نوافل سے ہوئی۔ تو امثلہ سابقہ میں جیسے چھوٹوں سے بڑوں کی تکمیل دنیا میں ہوتی ہے ایسی ہی آخرت میں بھی نوافل سے تکمیل فرائض کی ہوگی یعنی فرائض میں جسقدر کمی ہوگی نوافل سے اسکی بھرتی کیجاویگی۔ اور یہ تکمیل فرائض کی نوافل سے کبھی تو ایک جنس کے اعمال میں ہوتی ہے (یعنی فرائض جس جنس کے ہیں وہ نوافل کما بھی اسی جنس کے ہوں) اور کبھی یہ تکمیل فرائض کی نوافل غیر جنس سے ہوتی ہے مثلاً نماز سے پہلے آپ کے پاس کوئی شخص آیا جو پراگندہ حال اور بدصورت وغیرہ تھا جسکی تعظیم کو جی نہ چاہتا تھا اٹھنے کو دل گوارا نہ کرتا تھا مگر آپ نے نفس کی مخالفت کی اور نفس کو مجبور کرکے اسکی تعظیم کی اور تواضع اختیار کی پھر سے جو نماز پڑھی تو اس نماز میں اس تواضع کی برکت سے نورانیت بڑھ جاویگی جسکا اہل باطن کو شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے اور راز اسکا یہ ہے

کہ اعمال میں سب میں باہم مناسبت ہے نیک اعمال کو نیک سے اور بد کو بد سے خواہ جنس میں اتحاد ہو یا نہ ہو تو ہر عمل خیر دوسرے عمل خیر کا مؤید و مقوی ہوتا ہے مثلاً آپکا ایک نوکر اور باورچی ہے آپ نے اسکو آواز دی آپکے پکارنے سے وہ فوراً حاضر ہوگیا سو ایک تو اس کا حاضر ہونا اسوقت ہے اور ایک اسوقت ہے کہ وہ کسی سے لڑ بیٹھا اتفاقاً اسی حالت میں آپ نے اسکو پکارا تو وہ حاضر تو ضرور ہوگا مگر اس حاضری اور پہلی حاضری میں فرق ضرور ہوگا باوجودیکہ نوکر کی آقا سے لڑائی نہیں ہوئی بلکہ دوسرے شخص سے ہوئی تھی مگر اس عمل منکر کا یہ اثر ہوگا کہ لہجہ کلام میں ادب و نیازمندی کی وہ شان نہ ہوگی جو پہلے تھی اسی طرح اگر نماز سے پہلے کوئی عمل تواضع کا کیا تو اس کا نماز میں یہ اثر ہوگا کہ نماز میں نورانیت بڑھ جاویگی اور اگر نماز سے پہلے کسی کے ساتھ تکبر کا معاملہ کیا تھا اگرچہ تکبر جنس صلوٰۃ سے نہیں مگر تکبر کا ظلمانی اثر نماز میں ضرور رہیگا اور نماز سے پیشتر وہ تکبر کرنا مانع نورانیت صلوٰۃ ضرور ہوگا یہی مطلب اور مقصود ہے اس حدیث کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الحسد تاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب حسد نیکیوں کو اس طرح کھا لیتا ہے جیسے لکڑی آگ کو اگرچہ اسپر علماء کا اتفاق ہے کہ باوجود حسد کے بھی حسنات باقی رہتی ہیں مگر معنی یہ ہیں کہ اعمال میں نورانیت نہیں رہتی اسی طرح صوم کے بارہ میں ارشاد ہے[1] اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابہ احد او قاتلہ فلیقل انی امرء صائم تو اس حدیث میں مقصود یہی ہے کہ عمل صوم میں ان افعال کے ارتکاب سے نورانیت نہیں رہتی گو روزہ باطل نہیں ہوتا پس ثابت ہوگیا کہ جو اعمال ہم جنس نہیں وہ بھی باہم ایک دوسرے کے مکمل ہیں لہذا چھوٹی شئے کو بے وقعت نہ سمجھنا چاہیے چھوٹی اشیاء بڑوں کی حفاظت کیلئے ہوتی ہیں یہ گفتگو تو اس بات کے تسلیم کرلینے پر تھی کہ یہاں اس آیت میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ چھوٹی اور معمولی بات ہے اور دوسرا جواب تحقیقی یہ ہے کہ یہ تعلیم درحقیقت معمولی نہیں بلکہ بہت بڑی ضروری تعلیم ہے آپنے اس کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے حقیقت پر نظر نہیں کی حقیقت میں یہاں حق تعالیٰ نے ہمکو تواضع کی اور ترک تکبر کی تعلیم دی ہے اور میں عنقریب واضح کرونگا کہ تکبر کتنی سخت چیز ہے مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کو

[1] رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث طویل الخ وایضاً رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصوم جنۃ فلا یرفث ولا یجہل فان امرء قاتلہ او شاتمہ فلیقل انی صائم ا ص ۲۵۴ و ص ۲۵۵
ترجمہ حدیث اور جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو پس نہ فحش باتیں کہے اور نہ لڑے تو کہدے کریں روزہ دار ہوں -

اس کا احساس نہیں بہرحال اس زمانہ یہ عام غلطی ہے کہ جو دیندار بھی ہیں وہ عقائد اور نماز روزہ وغیرہ
اوضاع لباس کا تو ضرور اہتمام کرتے ہیں مگر اخلاق و معاشرت اکثر کی نہایت گندی ہے بعضے آدمی تو اخلاق
و معاشرت کی طرح معاملات کو بھی دین سے خارج سمجھتے ہیں مگر خیر متقی لوگوں نے معاملات کا تو خیال کیا مگر
معاشرت و اخلاق کو تقریباً سب نے ہی بالکل بالائے طاق رکھدیا حالانکہ حسن معاشرت کا معاملات سے
بھی زیادہ خیال رکھنا لازمی ہے اسوجہ سے کہ معاملات کا اثر تو اکثر مال پر ہوتا ہے اور معاشرت کا اثر قلب
پر ہوتا ہے اور قلب پر جو اثر ہو وہ مال کے اثر سے زیادہ گراں اور موجب صدمہ ہوتا ہے مثلاً
ایک شخص آپ کے پاس آیا اور آپ نے اس کی طرف التفات نہ فرمایا اس کی بات کا جواب نہ دیا اس
سے اس کا دل دکھا تو اس اخلال معاشرت کا اثر اسکے قلب تک پہنچا یا ماں باپ کی نافرمانی کی انکا دل
دکھایا تو یہ آثار موذیہ اخلال معاشرت سے اور اسکو ضروری نہ سمجھنے سے پیدا ہوئے پس ثابت ہوا
کہ حسن معاشرت حسن معاملہ سے بھی زیادہ ضروری ہے عارف شیرازی کا قول ہے ؎

مباش در پئے آزار ہرچہ خواہی کن | کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

یعنی برابر اس گناہ نیست اور اس شعر میں جو ہرچہ خواہی کن کہا گیا ہے یہ تو مبالغہ پر محمول ہے
اگر اس میں عموم لیا جائے اور اسکو خاص کہا جاوے غیر معاصی کے ساتھ اور مباش در پئے آزار کو
تمام معاصی کیلئے عام لیا جاوے تو تقریر مقصود کی یہ ہوگی کہ جس طرح اخلال معاشرت سے دوسروں کو آزار
ہوتا ہے مثلاً باپ کو نافرمانی سے آزار ہوتا ہے اسی طرح جمیع معاصی سے مثلاً نماز
نہ پڑھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بوجہ شفقت کے آزار ہوتا اور تکلیف پہنچتی ہے چنانچہ ایک آیت کریمہ
سے یہ بات صاف ظاہر ہے فلعلک باخع نفسک علی آثارہم ان لم یومنوا بہذا الحدیث اسفا یعنی شاید آپ
ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون قرآنی پر ایمان نہ لائے غم سے اپنی جان دیدینگے یعنی اتنا غم نہ کیجئے
کہ قریب بہ ہلاکت ہو جائیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضور کو بوجہ شفقت کے مخلوق کی بدحالی
پر شدید رنج ہوتا تھا دیکھئے مدرس کو جب شفقت زیادہ ہوتی ہے اور مقصود مدرس کا یہ ہو کہ کسی
صورت سے یہ پڑھنے والے کتاب سمجھ جاویں تو اسکو ان کے نہ سمجھنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے اسی لئے
وہ تقریر کے بعد سوال کیا کرتا ہے کہ سمجھ بھی گئے اور اس کا منشا محض شفقت ہے اسی طرح جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد تبلیغ کے صحابہ سے فرمایا الا ھل بلغت الا ھل بلغت صحابہ فرماتے نعم

آپ نے فرمایا اللہم اشہد (رواہ البخاری) حضور کی شفقت کی یہ شان ہے کہ آپ نے تئیس برس میں اس قدر تبلیغ کی اور اسقدر جانفشانی برداشت کی کہ کوئی نہیں کر سکتا کلیات کی علیحدہ تبلیغ فرمائی اور جزئیات کی علیحدہ پھر جزئیات میں ایک ایک جزئی کی تبلیغ فرمادی یہ تو تبلیغ قولی تھی پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ تبلیغ عملی بھی فرماتے یہ سب حضور کی شفقت ہے نیز صحابہ کا خلوص بھی قابل نظر ہے کیونکہ اگر صحابہ کی طلب کامل نہ ہوتی اور ان میں خلوص نہ ہوتا وہ علوم محفوظ نہ رہتے مگر بحمد اللہ آج حضور کے تمام علوم محفوظ ہیں جنکو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے اس قلیل عرصہ میں اسقدر علوم کیونکر بیان فرمادیئے خصوص جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ محض تعلیم ہی کے کام کیلئے فارغ نہ تھے بلکہ اسکے ساتھ انتظام ملکی اور تدابیر غزوات کا کام بھی آپ کو بہت زیادہ کرنا پڑتا تھا حضور صلعم کی اس شفقت کا خیال تو کیجئے کہ باوجود اسقدر مشاغل کثیرہ کے آپنے کسقدر اور کس درجہ ہمکو معاشرت سکھلا اور کس درجہ آداب مجالس سکھلائے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہمکو ایک دوسرے کو اذیت دینے سے بچایا ایک دو نمونہ تبلاتا ہوں غور کیجئے کہ حضور فرماتے ہیں کہ جب کسی مجمع میں تین آدمی ہوں تو دو آدمی علیحدہ سرگوشی نکریں جب تک کہ چوتھا آدمی نہ ہو دیکھئے آداب مجالس کی کسقدر رعایت فرمائی۔ سلف صالحین کا معمول تھا کہ جب کسی مجلس میں چوتھا آدمی نہوتا اور دوسرے آدمی سے تنہائی میں بات کرنی منظور ہوتی تو چوتھے آدمی کے آنے کا انتظار کرتے تاکہ وہ اس سے ہمکلام رہے اور اسکو توحش نہو نہ تفرد سے اور نہ اس خیال سے کہ مجھسے ہی اخفاء راز مقصود ہے۔ اور دیکھئے حضور فرماتے ہیں کہ اگر کھانا کھاتے ہوئے لقمہ گر پڑے تو اسوقت یہ خلاف ادب ہے کہ اسکو چھوڑدے بلکہ فلیمط عنہ اذی اسکو صاف کر کے کھالیوے۔ دیکھئے کیسے چھوٹے چھوٹے اور دقیق دقیق امور پر آپ کی نظر تھی کسی بات کو چھوڑا نہیں اس تعلیم میں آپنے کھانے کا کسقدر ادب تعلیم فرمایا ہے جسکی نظیر نہیں مل سکتی اسپر مجھے ایک حکایت یاد آئی ایک مرتبہ مجھے سفر کا اتفاق ہوا ریل میں ایک صاحب رئیس ہمراہ تھے انہوں نے کھانا جو کھایا اتفاق سے ایک بوٹی گر پڑی انہوں نے جوتے سے تختہ کے نیچے سرکادی چونکہ میں تو ان سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا اسلئے میں نے عملاً حکم شرعی تبلانا چاہا تاکہ ان کو معلوم ہوجائے اسلئے میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ اس بوٹی کو دھوکر مجھے دیدو میں کھاؤنگا انہوں نے کہا اگر میں کھالوں میں نے کہا یہ آپکی ہمت ہے چنانچہ انہوں نے کھالی میرے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا اور دوسروں سے کہنے لگے کہ واقعی میری سمجھ میں آگیا

۱۰۵

اگر دس برس تک بھی اس کے متعلق نصیحت کی جاتی تو دل میں نہ گھستی اور اس طریق سے ایک مرتبہ کامل عمر کے لئے کارگر ہوگیا۔ صوفیہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ امر بالمعروف نہیں کرتے حالانکہ یہ اعتراض بالکل لغو ہے ان کی برابر کوئی بھی امر بالمعروف نہیں کرسکتا وہ تو امر بالمعروف ایسا کرتے ہیں کہ لپٹے اور چپکے ہیں یعنی وہ قولاً امر بالمعروف کم کرتے ہیں زیادہ تر عملی تعلیم کرتے ہیں کیونکہ عملی تعلیم قولی تعلیم سے زیادہ موثر ہوتی ہے اسی طرح حضورؐ نے بہت چھوٹے چھوٹے اعمال کا اہتمام کیا اور کوئی امر چھوڑا نہیں بلکہ ہر حکم کو عملاً دکھا دیا تاکہ سامع پر زیادہ اثر ہو تو اسقدر اہتمام محض شفقت پر مبنی ہے مگر ہماری ایسی بری حالت ہے کہ اگر صحابہؓ زندہ ہوکر ہمیں دیکھیں تو ہمیں حضورؐ کی امت میں خیال کرنا انکو دشوار ہوجاوے ہماری حالت تو اسقدر ابتری اور ردی ہوگئی کہ قابل بیان نہیں نہ ہمارے عقاید کامل ہیں نہ اعمال عبادات نہ معاملات نہ معاشرت نہ اخلاق نہ اقوال نہ احوال غرض ہر چیز ناقص اور مکدر ہے اور عوام نے تو ادب خداوندی تک کو بھی بالائے طاق رکھدیا حتٰی کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کی جناب میں گستاخی کرنا شروع کردی چنانچہ امسال بارش بکثرت ہونے کے باعث ایک صاحب نے کسی گانوں والے سے کہا کہ بھائی توبہ و استغفار کرو ہمارے گناہوں کی شامت ہے جو اسقدر بارش ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں تو اناج ہے جسکے گھر میں اناج نہ ہو وہ توبہ کرے۔ افسوس آجکل یہ مسلمان ہیں اگر حضورؐ کے سامنے ہمارے یہ اعمال پیش ہوں تو حضورؐ کو کسقدر اذیت ہو اور اگر کیا معنی بلکہ یقیناً پیش ہوتے ہیں کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ اعمال امت کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ہائے پھر آپ کو ہماری اس بدحالی پر کتنا رنج ہوتا ہوگا پس ؎ مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن الخ اگر مبالغہ پر بھی محمول نہ کیا جاوے تب بھی یہ کلام درست ہے اور اس سے کسی گناہ کی اجازت مفہوم نہیں ہوسکتی کیونکہ گناہوں سے اگر اور کسی کو بھی ایذا نہ ہو تو حضورؐ کو تو ایذا ہوتی ہے۔ اور حضورؐ سے زیادہ مسلمانوں کے لئے کون ہے جسکا دل خوش کرنا مطلوب ہو اسپر مجھے مرزا بیدل کی ایک حکایت یاد آئی

مرزا بیدل کا کلام صوفیہ کے طرز پر ہوتا تھا ایک ایرانی انکا کلام دیکھکر اور بزرگ سمجھکر ان سے ملنے کیلئے دہلی آیا یہ اسوقت ڈاڑھی تراشوا رہے تھے اس شخص نے یہ منظر دیکھکر کہا آغا ریش میتراشی انھوں نے ... صوفیہ نے جواب دیا ... تصوف تو بڑی سستی چیز ہوگئی ہے بس ایک دو نکتے یاد کرلئے اور صوفی بن گئے آجکل تصوف خوش نکتوں کا نام رہ گیا گویا وہ نکتے جادو منتر ہی ہوں جب

ایک صاحب نے والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ کا ترجمہ کیا تھا اے نفس تیری ہی سجاد (مرزا) [illegible]
صاحب سے کسی صوفی جاہل نے دریافت کیا تھا کہ بتاؤ رزق بڑا ہے یا محمد بتاؤ صاحب نے کہا اول تو
اس کی کوئی جزئی تعلیم نہیں دی گئی مگر پھر بھی قواعد کلیہ سے حضور ہی کا رتبہ بڑا معلوم ہوتا ہے نگاہ
تو یہ بڑا معلوم ہوتا ہے دیکھو اشہد ان محمدا رسول اللہ میں پہلے ان رزق کا نام آیا پیچھے حضرت کا
معلوم ہوا کہ ان بڑا ہے کیا واہیات ہے جبکہ کلمہ کے اندر ان حرف مشبہ بالفعل ہے یا ہندی کا ان ہے
اسی طرح مولوی فیض الحسن صاحب سے کسی فقیر نے دریافت کیا کہ بتاؤ چار میم کون سے ہیں تا ہم سوچ کر
مولوی صاحب اس مہمل سوال کا جواب کیا دیتے تو وہ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ دیکھو مکہ، مدینہ، مولیٰ،
محمد۔ کانپور میں ایک صوفی صاحب آئے طلبہ سے کہنے لگے کہ بتلاؤ آسمان پر کیا چیز نہیں زمین پر کیا
چیز نہیں قرآن میں کیا چیز نہیں۔ پھر خود ہی بولے کہ آسمان پر قبر نہیں زمین پر ستارہ نہیں قرآن میں
جھوٹ نہیں۔ یہ تصوف رہ گیا ہے آجکل۔ سو مرزا بیدل نے بھی ایسا ہی ایک نکتہ نکالا تھا یعنی شعر
دلے دل کسے نمی خراشم یعنی ع مباش در پے آزار ہر چہ خواہی کن۔ پر میرا عمل ہے۔ ایرانی نے [illegible]
اس نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ مرزا بیدل ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔ ایرانی نے کہا بلے دل رسول اللہ
اللہ میخراشی۔ یہ سنکر تو مرزا بیدل کی آنکھیں کھل گئیں اور ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور
بزبان حال یہ شعر پڑھنے لگے ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

اب وہ شبہ جاتا رہا کہ نماز روزہ کے چھوٹنے میں کسی کو تکلیف نہیں پہونچتی اسلئے نماز روزہ کے
ترک میں مضائقہ نہیں۔ صاحبو اس سے تو اس ذات کو تکلیف پہنچتی ہے جس سے زیادہ مسلمان کو
کوئی چیز بھی محبوب نہیں۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ معاملات سے زیادہ معاشرت کا اہتمام ضروری ہے،
کیونکہ معاملات کی اصلاح میں تو زیادہ تر لوگوں کے مال کی حفاظت ہے اور حسن معاشرت میں مسلمانوں
کے قلب کی حفاظت ہے اور ظاہر ہے کہ مال سے دل کا رتبہ بڑھا ہوا ہے۔ نیز معاشرت کی اصلاح
میں علاوہ قلوب کے لوگوں کی آبرو کی بھی حفاظت ہے اور ظاہر ہے کہ آبرو کی حفاظت بدن یا مال کے
ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے عرفاً بھی شریف آدمی مال بلکہ جان سے بھی زیادہ آبرو کو سمجھتا ہے چنانچہ
جان بچانے کیلئے تو شریف آدمی مال کو خرچ کرتا ہے اور آبرو بچانے کے لئے جان و مال دونوں کو [illegible]

اور حدیث حقوق میں بھی تینوں کی حفاظت مامور بہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ الا ان اللہ تعالےٰ
حرم علیکم دماءکم واموالکم واعراضکم کحرمۃ یومکم ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم ہذا۔ حضور نے حجۃ الوداع
میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہارے خون یعنی جان اور مال اور آبرو باہم ایک دوسرے پر قیامت
تک ویسے ہی حرام ہیں جیسے آج کے محترم دن میں محترم مہینے میں اور محترم بلد میں حرام
ہیں پس مسلمانوں کے مال کی بھی حفاظت کرو جان کی بھی حفاظت کرو آبرو کی بھی حفاظت کرو
اسلئے کہ حقوق العباد میں یہ سب داخل ہیں صرف مالی حقوق کا نام حقوق العباد نہیں اور یہ
معاشرت بعض حیثیات سے نماز روزہ سے بھی زیادہ قابل اہتمام ہے کیونکہ عبادات کی اخلال
سے صرف اپنا ضرر ہے اور معاشرت کے اخلال سے دوسروں کا ضرر اسی لئے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے معاشرت کا بہت اہتمام فرمایا ہے ایک ایک کرکے تمام امور کی تعلیم فرمادی ہے چنانچہ
ارشاد ہے اذا جاءکم کریم قوم فاکرموہ کہ جب تمہارے پاس کسی قوم کا سردار آوے اسکی تعظیم کرو تذلیل نہ کرو
خصومت نکرو حضور کے اصحاب پڑوسی یہودی تک کو ہدیہ دیا کرتے تھے اور بیماری میں اس کی
عیادت کرتے۔ اسی طرح ایک یہودی کا قرضہ حضور پر چاہتا تھا اس نے مسجد میں آکر مانگا [illegible] آپ کے
پاس موجود نہ تھا آپ نے فرمایا کہ پھر لینا یہودی نے کہا کہ میں تو لیکر جاؤں گا اللہ اکبر کس درجہ
حسن معاشرت تھی کہ رعیت کا ادنیٰ آدمی بھی جو چاہے کہے اور آپ باوجود ہر طرح اختیار وقدرت
انتقام نہیں لیتے صحابہؓ نے کچھ کہنا بھی چاہا حضور نے روک دیا اور فرمایا کہ ان لصاحب الحق
مقالاً کہ صاحب حق کو تقاضے کا حق ہے چنانچہ وہ بیٹھا رہا اور رات کو حضور کو گھر بھی نہ جانے دیا
تو آپ مسجد ہی میں رہے صبح کی نماز پڑھی یہ حال دیکھکر بعد نماز اس یہودی نے کہا کہ میں نے تورات
میں پڑھا تھا کہ نبی آخر الزماں کے یہ صفات ہیں میں نے اور تو سب صفات دیکھ لی تھیں صرف
صفت حلم کا امتحان باقی تھا سو آج اس کا بھی امتحان ہو گیا واقعی آپ سچے نبی ہیں اشہد ان لا الہ
الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ مسلمان ہو گیا۔ صاحبو! حضور نے جب غیر مسلم کی اسقدر رعایت
کی ہے تو مسلم کی تو کس قدر رعایت فرماتے ہوں گے۔ پھر غیر مسلم آدمی تو ہے حضور نے تو جانوروں
پر بھی رحم کا حکم فرمایا ہے اور ان کے بھی حقوق بیان فرمائے ہیں چنانچہ حکم ہے کہ جانوروں کو زیادہ
نہ مارو بھوکا نہ رکھو تحمل سے زیادہ کام نہ لو زیادہ بوجھ نہ لادو مجھے یاد آیا کہ ایک صاحب نے مجھے

۱۰۸

خط میں لکھا تھا کہ جانوروں کے حقوق میں ابتک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تو واقعی اسوقت تک کوئی
کتاب مستقل نہیں لکھی گئی تھی اور ضرورت تھی اسلئے میں نے ارشاد الہائم فی حقوق البہائم ایک
کتاب لکھی ہے جانور رکھنے والوں کو اس کتاب کے رکھنے کی ضرورت ہے اس سے معلوم
ہوگا کہ شریعت میں جانوروں کے کس درجہ کے حقوق ہیں حدیث شریف میں بنی اسرائیل کی
ایک عورت کا قصہ مذکور ہے کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا نہ تو چھوڑتی تھی اور نہ کچھ کھانے
کو دیتی تھی پھر حضورؐ نے دوزخ میں اسکا عذاب دیا جانا دیکھا دیکھئے ایک بلی کے ستانے پر اسے
عذاب ہوا اور جانور کی تکلیف پہونچانے پر وہ معذب تھی اور ہماری حالت یہ ہے کہ عام انسان
اور عام مسلمان کا تو کیا خیال کرتے ہم تو حقیقی بھائی کو اذیت پہونچانے پر کمربستہ ہیں جائداد دبالینے کو تیار
ہیں بلکہ ہم لوگوں کی معاشرت اعزواقارب کیساتھ زیادہ خراب ہے حالانکہ ہم جانوروں تک پر بھی
رحم کرنے کے لئے مامور ہیں۔ یاد رکھنا چاہئیے کہ ان افعال پر ضرور ہم سے سوال ہوگا۔ حاصل یہ ہے
کہ شریعت نے معاشرت کے بارہ میں بھی بہت زیادہ اہتمام کیا ہے اسلام بڑی چیز ہے۔ اسلام نے
ہمیں تمام ضروری امور سکھلائے ہیں تاکہ اسلام پر بالکل وہم نہ رہے کہ اسمیں فلاں بات کی کمی ہے
فلاں پہلو کی رعایت نہیں سو بحمد اللہ اسلام کامل مکمل شریعت ہے اور کیوں نہ ہو خدا کا بھیجا ہوا دین ہے
اور حق تعالیٰ تو ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں اور شفیق اپنے علم میں کسی ضروری بات کو نہیں چھوڑا
کرتا اسلئے حق تعالیٰ نے کسی ضروری بات کو اسلام میں نہیں چھوڑا۔ اور حق تعالیٰ کا علم کامل ہے اسلئے
واقع میں بھی کوئی ضروری بات نہیں رہی بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ بات کی بھی تعلیم رسول کے واسطہ سے
کردی ہے گو ہمکو بعض پابندیاں گراں ہوتی ہیں

مگر شفقت کا یہی مقتضا ہے کہ باوجود گرانی مخاطب کے پھر بھی اسکو نفع پہونچایا جائے چنانچہ
میرا ہی واقعہ ہے کہ بچپن میں مجھے کنکوے کا شوق تھا جہاں چھٹی ملی کنکوا لیکر باہر چلدیا اور سر پر بال
بھی رکھے ہوئے تھے اتفاق سے بالوں میں جوئیں پڑگئیں میری والدہ صاحبہ کا تو انتقال ہوگیا
تھا اپنی نانی صاحبہ کی پرورش میں تھا ان کو شفقت و محبت زیادہ تھی انہوں نے کئی بار سر منڈوانے
کی بابت مجھ سے کہا مگر میں حسب معمول کنکوا لیکر چلدیتا ایک روز انہوں نے پہلے سے کھلی گھول کر
رکھدی تھی میرے آتے ہی موقع پاکر فوراً سر میں لپیٹ دی بس اب میں مجبور ہوگیا بدون دھلوائے

کہاں جا سکتا تھا۔ دیکھئے اسوقت انکا یہ فعل ناگوار تھا مجھکو خبر ہی نہ تھی کہ میرے لئے کیا مفید ہے مریض کو کیا خبر کہ میرے لئے کیا نافع ہے مگر انکی یہ عنایت اور شفقت تھی کہ مجھے مجبور کر کے راحت پہونچائی تھیں یہی برتاؤ حق تعالی کا ہمارے ساتھ ہے کہ ہم بعض دفعہ احکام سے تنگ ہوتے ہیں مگر حق تعالی مجبور کرتے ہیں کہ تمکو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ شفقت کا ایک واقعہ اور یاد آیا ایک شخص ہمارے یہاں آنکھ بنانے والے تھے۔ ایک شخص آنکھ بنوانے آیا انھوں نے کام شروع کیا تو وہ تکلیف کے خوف سے انکو برا بھلا کہہ رہا تھا مگر وہ ہنس رہے تھے اور آنکھ بنا رہے تھے اگر شفقت نہوتی تو بیچ ہی میں کام چھوڑ دیتے مگر انہوں نے مریض کی ناگواری پر اصلاً نظر نہیں کی بلکہ غایت شفقت سے نشتر لگاتے رہے۔ ہمارے یہاں کے ایک رئیس نے جو اسوقت موجود تھے ان سے کہا بھی کہ دیکھئے یہ کیا بکتا ہے مگر انہوں نے جواب دیا کہ تھوڑی دیر میں دیکھنے جب نظر آنے لگے گا تو کیسی دعائیں دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت حق جلشانہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے کا نتیجہ آخرت میں ہم پر روشن وظاہر ہو جائیگا گو اسوقت ہمکو گرانی ہوتی ہے حق تعالی فرماتے ہیں فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید۔ غرض حضور نے تمام اعمال معاملات معاشرت تمام امور ہمکو سکھلائے تاکہ ہم اپنی اصلاح کرلیں۔ مگر اب ہماری حالت ایسی خراب ہے کہ دیگر اقوام کے لوگ ہماری حالت دیکھکر اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ افسوس ایک زمانہ وہ تھا کہ اہل اسلام کے کارناموں کو دیکھکر بہت سے لوگ مسلمان ہوتے تھے آج مسلمانوں کی حالت دیکھکر لوگ اسلام سے منحرف ہوتے جاتے ہیں چنانچہ مدراس کا قصہ سنا ہے کہ ایک انگریز اسلام کی خوبیاں دیکھکر مسلمان ہو گیا تھا اتفاقاً مسجد میں آیا تو مسجد میں دیکھا کہ نالی میں تھوک وغیرہ بہت پڑا ہے اور مسجد بھی صاف نہیں ہے اس نے صفائی کی نسبت لوگوں سے کہا سب لوگ اسکے پیچھے پڑ گئے کہ یہ تو ابھی تک عیسائی ہے کہ صفائی صفائی پکار رہا ہے اور اسکو مسجد سے نکال دیا بعض ذی فہم مسلمانوں کو اطلاع ہوئی انہوں نے ان صاحب سے معذرت کی کہ یہ لوگ ناواقف تھے آپ کچھ خیال نہ کریں اس نومسلم نے جواب دیا کہ میں اسلام کے محاسن اور کارنامے دیکھکر مسلمان ہوا ہوں مسلمانوں کی حالت دیکھکر اسلام نہیں لایا ہوں میں جانتا ہوں کہ محمد صاحب صلی اللہ علیہ وسلم صفائی کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ معلوم ہوا صفائی تو اصل میں ہمارے یہاں کی چیز ہے جو آجکل عیسائیوں نے [illegible]

مسلمانوں نے ایسی چھوڑدی ہے کہ اگر کوئی صفائی برتے تو عیسائی کے نام سے موسوم ہوتا ہے صفائی کے باب میں حدیث میں ہے ان اللہ نظیف یحب النظافۃ اور دوسری حدیث میں ہے نظفوا افنیتکم اسلام کی برابر تو طہارت ونظافت کسی مذہب میں نہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ استری اور کلف کا اہتمام کرو اور ہر وقت بنے ٹھنے رہو کیونکہ اس کا نام نظافت نہیں۔ بلکہ یہ تصنع اور تکلف ہے اور تن آرائی ہے اسکے متعلق تو حدیث میں ہے کہ البذاذۃ من الایمان کہ سادگی ایمان کا جزو ہے بذاذت کے معنی میلا کچیلا رہنے کے نہیں بلکہ سادگی سے رہنے کے ہیں پس نظافت اور طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ کپڑے اور بدن کو صاف پاک رکھو اگر میلا ہوجائے تو دھو ڈالو صاف ہوجاؤ اور پاک بنجاؤ شریعت اسلامیہ میں طہارت کی تو بہت ہی زیادہ تاکید ہے کہ بدون طہارت کے نماز نہیں ہوتی اور گو بدون نظافت کے ہوجاتی ہے مگر بدہیئت بنکر نماز پڑھنا مکروہ ہے فقہائے لکھا ہے کہ جس حالت سے مجمع احباب میں جانا انسان کو ناگوار ہو اس ہیئت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے نیز یہ بھی حکم ہے کہ جس شخص کے کپڑوں میں سے پسینہ کی سخت بدبو آرہی ہے اسکو جماعت میں شریک ہونا مکروہ وممنوع ہے مگر آجکل ہماری وہ حالت ہے کہ مولانا نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک کافر لڑکی اسلام کی طرف راغب تھی اتفاق سے اسکے گھر کے قریب مسجد میں ایک موذن بدآواز تھا اس نے جو اذان دی تو لڑکی نے باپ سے دریافت کیا کہ ابا یہ کیا ہو رہا ہے۔ باپ نے جواب دیا کہ بیٹی تو جس مذہب کی طرف راغب ہے یہ اس کی اذان ہے۔ لڑکی کا یہ سنکر اسلام سے دل پھر گیا تو اس کا باپ اس خوشی میں کچھ ہدیہ لیکر ان موذن صاحب کے پاس آیا کہ اس شخص کے سبب مجھکو یہ خوشی نصیب ہوئی موذن صاحب سمجھے کہ یہ مجھ سے بہت راضی اور خوش ہے اسلئے ہدیہ لایا ہے مگر جب واقعہ معلوم ہوا تب حقیقت حال منکشف ہوئی۔ یہی ہماری حالت آجکل ہے کہ ہمکو دیکھکر کفار اسلام سے ہٹنے لگے ہیں حالانکہ فی نفسہ اسلام کی یہ حالت ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

صاحبو! مسلمانوں کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہوگئی تھی آپ نے اسکو ایک یہودی کے پاس دیکھی اور اس سے مطالبہ کیا اس نے نہ دی اور یہ کہا کہ یہ تو میری ہے آپ باوجود خلیفہ وقت تھے مگر اسکو لیکر مدعی بنکر حضرت شریحؓ قاضی زمانہ کے یہاں پہنچے جب قاضی صاحب

گواہوں کو طلب کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے صاحبزادہ اور ایک آزاد شدہ غلام کو گواہی
میں پیش کیا۔ حضرت علیؓ کے نزدیک ولد عادل کی گواہی باپ کے موافق جائز تھی مگر قاضی شریح
کے نزدیک جائز نہ تھی اسلئے قاضی صاحب نے صاحبزادے کی گواہی رد کر دی اور ایک گواہ اثبات
دعوی کے لئے ناکافی تھا اسلئے زرہ یہودی کو دیدی۔ اللہ اکبر ایک بادشاہ وقت کی چیز چوری جائے
اور بادشاہ اسکو پہچان لے اور ایک ادنی آدمی رعیت کا جو کہ مسلمان بھی نہ ہو بے تکلف اپنی ظاہر
کرے پھر بادشاہ اپنے ہی ماتحت قاضی کے یہاں محاکمہ کے لئے جاویں اور صاحبزادہ کو گواہی
میں پیش کریں جو کہ اہل جنت کے سردار ہیں اور قاضی صاحب ان کی گواہی قبول نہ کریں اور
زرہ یہودی کو دلوادیں اور خلیفہ اسکو قبول کرلیں۔ آخر یہ حقانیت ان کو بجز تعلیم اسلام کے کس نے
دی ہے پس اسلام یقیناً حق ہے یہودی یہ حالت دیکھکر فوراً مسلمان ہو گیا اور حضرت علیؓ سے
بیعت ہو گیا اور جنگ صفین میں شہید ہوا صاحبو! مسلمانوں کے یہ اخلاق تھے مگر اب ہمارے
اخلاق دیکھکر مسلمانوں کو بھی دین سے نفرت ہو جاتی ہے غرض ہمیں نماز روزہ کا تو خیال ہے
مگر اخلاق کا بالکل خیال نہیں ظاہر میں اخلاق چھوٹی چیز ہے مگر واقع میں یہ بہت بڑی چیز ہے کیونکہ
تمام اعمال کی جڑ اخلاق ہی ہیں۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ ایک درجہ منشا کا ہوتا ہے اور ایک
ناشی کا یعنی ایک تو افعال ہوتے ہیں اور ایک ملکات۔ اور ملکات اصل ہیں اور افعال فرع
ملکات ہی سے اعمال ناشی ہوتے ہیں جنہیں جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی اس سے افعال سرزد
ہوتے ہیں مثلاً آپ نے کسی پر ظلم کیا یا سخت کلامی کی تو اسکا منشا تکبر ہے اگر آپ میں تکبر نہ ہوتا تو یہ
عمل سرزد نہ ہوتا اور یقیناً ظلم بری چیز ہے اور اسکی اصلاح واجب ہے تو پھر تکبر کی اصلاح کیوں
نہ واجب ہوگی جو کہ ظلم کا منشا ہے اور جسکی اصلاح کے بغیر ظلم کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی مگر ہماری غلطی
یہ ہے کہ افعال پر تو ہمکو نظر ہے ملکات پر نظر نہیں اور وجہ اسکی یہ ہے کہ ملکات کی اصلاح نفس کو
ناگوار ہے اعمال اسدرجہ گراں نہیں۔ اسلئے اخلاق کو بالکل چھوڑ دیا ہے جسکا منشا یہ ہے کہ ہم کو اسکی
ضرورت ہی کا احساس نہیں اگر انکو ضروری سمجھتے تو پھر گرانی کا خیال ہرگز نہ کرتے جیسے پھل توڑنے میں
کانٹوں کا لگنا ناگوار نہیں ہوتا چونکہ پھل توڑنا ضروری چیز ہے اسلئے کانٹوں کا خیال نہ کیا جاویگا اسی طرح
اگر اخلاق کی ضرورت کا احساس ہو جاوے تو پھر انکی اصلاح میں کتنی ہی مشقت ہو سب گوارا ہو جاوے

۱۱۲

صاحبو! اعمال سے پہلے ان کی جڑ یعنی اخلاق کی اصلاح کرو سو ایک فرق تو اعمال و اخلاق میں منشا اور ناشی ہونے کا ہے اور ایک فرق یہ ہے کہ ترک اخلاق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص سے عام نفرت ہو جاتی ہے بر خلاف نماز روزہ کے کہ اسکے تارک سے نفرت نہیں ہوتی۔ شاید کوئی کہے کہ صاحب متکبروں سے نفرت کہاں ہے ان کی تو تعظیم کیجاتی ہے سو یاد رکھو کر لوگ متکبر کی تعظیم خوف کی وجہ سے کرتے ہیں محبت کی وجہ سے نہیں کرتے۔ وہ تعظیم ایسی ہے جیسے اس مجلس میں اگر بھیڑیا آجاوے اور اسکی وجہ سے آدمی کھڑے ہو جاویں تو آپ خود انصاف کر لیں کہ یہ کھڑا ہونا کیسا ہوگا کیا تعظیم کیلئے ہوگا یا وحشت کے سبب ہوگا اسی طرح متکبر کی تعظیم کو سمجھو کہ دل سے نہیں بلکہ اسپر چونکہ قدرت نہیں اسلئے صورۃً اسکی تعظیم کیجاتی ہے چنانچہ ظالم اگر معزول ہو کر کسی مقدمہ میں گرفتار ہو کر جیلخانہ میں چلا جاوے تب دیکھیں اسکی کیسی تعظیم ہوتی ہے بلکہ وہاں تو موقع اور قدرت ملنے کی وجہ سے ہر شخص بدلہ لینے پر تیار ہو جاتا ہے اور اسکے مقابل ایک اللہ والا ہے اگر اسپر اتفاقاً صورۃً تکلیف بھی ہو جائے تو اسکی تکلیف کا سب آدمی تذکرہ کرتے اور افسوس کرتے ہیں اور حتی الوسع اسکو آرام پہونچانیکی کوشش کرتے ہیں چنانچہ ہمارے ایک بزرگ زمانہ غدر میں ماخوذ ہو کر جیلخانہ میں لیجائے جا رہے تھے اتفاق سے نماز کا وقت آگیا ان بزرگ نے پولیس کے افسر سے جو کہ ہندو سکھ تھا اجازت چاہی داروغہ نے کانسٹبلوں سے کہا کہ بھائی انہیں چھوڑ دو اور بیڑیاں کھولدو۔ یہ ایماندار آدمی معلوم ہوتے ہیں یقین ہے کہ یہ نہ ہوکیں گے۔ صاحبو! یہ اثر ہے اللہ والوں کے اخلاق کا اور تکبر کا یہ اثر ہے کہ اسکے مرتکب سے نفرت ہوتی ہے تو جسکے یہ آثار ہوں آپ ہی انصاف کیجئے کہ وہ چھوٹی چیز کیسے ہو سکتی ہے اور اخروی اثر یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ متکبر جنت میں نہ جائیگا اب اس حدیث کے جو بھی معنی ہوں مگر ہر اعتبار سے کیا یہ تھوڑی وعید ہے سو اگر اب بھی تکبر چھوٹی اور خفیف شئے ہے تو اسکی وہی مثال ہوگی جیسے ایک طبیب ناواقف نے کسی کو مسہل دیا تھا اس سے دست آنے شروع ہوئے طبیب صاحب سے ظاہر کیا گیا کہ دست بکثرت آرہے ہیں فرمایا آنے دو مادہ خارج ہو رہا ہے چند بار اسی صورت سے شکایت کی گئی مگر طبیب نے ہر بار میں وہی کہا کہ آنے دو مادہ نکل رہا ہے۔ غرض اسقدر دست آئے کہ مریض مرگیا اعزہ نے پھر اطلاع کی کہ صاحب وہ تو مرگیا فرمانے لگے اللہ اکبر کسدرجہ مادہ سخت تھا کہ خروج کے بعد بھی مار دیا اگر یہ مادہ باقی رہتا تو نہ معلوم کیا حالت ہوتی۔ جاہل! ارے اس سے زیادہ اور کیا ہوتا جسطرح دستوں کا

۱۱۴

آنا اس جاہل کے نزدیک معمولی اور خفیف بات تھی اسی طرح اگر تکبر بھی جس کا انجام دوزخ میں جانا ہے خفیف اور معمولی بات ہے تو جناب ہی فرمادیں کہ اس سے بڑی بات اور کیا ہے اس سخت مرض کے علاج میں جو میں خاص اہتمام کرتا ہوں اس کی بدولت بدنام ہوں کہ بہت تیز مزاج ہے اسکے یہاں ذرا ذرا سی باتوں پر گرفت ہوتی ہے اور بعض لوگ اس تیزی کو جو کہ تکبر کا علاج ہے تکبر کے محمول کرنے ہیں مگر میں دعوے سے نہیں کہتا خدا کی نعمت بیان کرتا ہوں کہ الحمدللہ میرے اندر تکبر نہیں ہے مگر لوگوں کو تکبر کی حقیقت کا علم نہیں اسلئے بدگمانی ہے صاحبو اگر طبیب شفقت کی بناء پر لوگوں سے مرض کا اظہار کرے اور مریض اسے سختی سمجھیں تو آپ ہی بتلائیے کہ علاج کی کیا سبیل ہوسکتی ہے اور امراض باطنہ کا علاج کس صورت سے ہوسکتا ہے افسوس اصلاح کے متعلق ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ اس معاملہ میں طبیب روحانی کی ذرا سی تدبیر کو بھی سختی سمجھتے ہیں اور سلف صالحین کی یہ حالت تھی کہ تکبر وعجب وغیرہ کی اصلاح میں مریدوں سے بڑے بڑے مجاہدے کرلیتے تھے اور وہ سختی نہیں سمجھی جاتی تھی چنانچہ ذوالنون مصری رح کی حکایت ہے کہ ایک مرید نے ایکدفعہ آکر شیخ سے عرض کیا کہ حضرت کے فلاں مرید نے شراب پی رکھی ہے اور شراب کے نشہ میں شراب خانہ کے دروازہ پر پڑا ہے حضرت نے فرمایا کہ تم شراب خانہ سے اسکو اٹھا لاؤ شیخ کا حکم تھا ہرچند کہ نفس پر ثقیل اور شاق گذرا مگر مجبور شراب خانہ کی طرف چلے اور اسکو کمر پر لاد کر واپس ہوئے لوگوں نے دیکھکر دونوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا کہ میاں دونوں شرابی ہیں مگر ایک پر نشہ کا اثر ہوگیا اور دوسرے پر ابھی نہیں ہوا افسوس یہ مقطع صورت اور تصوف کا دعویٰ اور یہ افعال استغفراللہ۔ یہ صاحب سمجھ گئے کہ میں نے جو حضرت سے اس شخص کی شکایت کی تھی اور اپنے کو ان شرابی سے اچھا سمجھا تھا اسلئے حضرت نے میرے نفس کو یہ سزا دی ہے کہ مجھے بھی ساتھ میں بدنام کرایا۔ تو پہلے بزرگ ان طریقوں سے تکبر وعجب کی اصلاح کرتے تھے کیونکہ جب تک یہ خناس دماغ سے نہیں نکلتا اسوقت تک وصول میسر نہیں ہوتا اسی طرح حضرت شبلیؒ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک مرید آیا اور ثمرات کے عدم ترتب کی شکایت کی شیخ نے جب طریق تزکیہ بدل کر دیکھا کہ کسی طریق سے نفع مرتب نہیں ہوتا تو سمجھ گئے کہ اس کے اندر عجب وکبر کا مرض ہے جو نفع سے مانع ہے تو شیخ نے ایک ٹوکرا اخروٹ سے بھرا ہوا دیکر حکم دیا کہ فلاں محلہ میں جہاں ان کے معتقدین زیادہ تھے جا بیٹھو اور اعلان کردو کہ ایک دھول کے

۱۱۴

بدلے ایک اخروٹ دونگا ایک دھول مارو اور ایک اخروٹ لیجاؤ اسی طرح یہ ٹوکرا ختم کردو یہ حالت تھی معالجہ کی۔ مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذرا سی بھی سختی ہوتی ہے تو ناگوار ہوتی ہے کہ ہم پر یہ سختی کیوں ہوتی ہے لا الیہ الا اللہ طلب کا دعویٰ اور بات بات پر ناگواری۔ صاحبو اطلب کا نام بھی کیوں بدنام کرتے ہو مولانا فرماتے ہیں ؎

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی	پس کجا بے صیقل آئینہ شوی
تو بیک زخمے گریزانی زعشق	تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

طالب کا تو یہ مذاق ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من	دل فدائے یار دل رنجان من
پس زبوں وسوسہ باشی دلا	گر ہوس را باز داری از بلا

اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہم سے شیخ کی سختیاں تو کیا برداشت ہوتیں اور ہم شیخ کے تو کیا ہوتے بعضے تو اللہ کے بھی نہیں چنانچہ ایک شخص نے روزہ رکھا اتفاق سے اسی دن اس کی بھینس مرگئی تو کم بخت نے فوراً منہ سے لوٹا لگا کر پانی پی لیا اور روزہ توڑ کر آسمان کی طرف منہ کر کے خدا تعالیٰ سے کیا کہتا ہے کہ لے روزہ رکھوالے۔ نعوذ باللہ خدا کے ساتھ یہ معاملہ اور اس شخص پر تعجب نہ کرنا ایسے لوگ آجکل بھی بکثرت ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ جاہل زبان سے بھی کہدیتا ہے اور مہذب زبان سے تو نہیں کہتا مگر دل میں حق تعالیٰ کے افعال پر اعتراض وہ بھی کرتا ہے پھر ایسے لوگوں کے ساتھ معالجین اگر اس قسم کے معاملات میں ظاہری سختی کرتے ہیں تو بدنام ہوتے ہیں کہ بد اخلاق ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اہل حقیقت منشا کو دیکھتے ہیں مثلاً کہ تکبر کو کفر کا باپ سمجھتے ہیں کیونکہ کفار کو حق خوب معلوم تھا اور حضور کی نبوت کو خوب پہچانتے تھے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم وان فریقا منہم لیکتمون الحق وہم یعلمون اور ام لم یعرفوا رسولہم فہم لہ منکرون اور وجحدوا بہا واستیقنتہا انفسہم ظلما وعلوا مگر باوجود پہچاننے کے اتباع سے عار کرتے تھے تو ان کے کفر کا منشا بھی تکبر تھا کیا اب بھی کسی کو شبہ ہے اخلاق کے مہتم بالشان ہونے میں کیا آجکل ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو کہ باوجود جاننے کے حکم الٰہی سے عار کرتے ہیں۔ تو کیا انکا علاج نہ کیا جاوے۔

خوب یاد رکھنا چاہیے کہ یہ معمولی چیز نہیں اکثر گناہوں کی جڑ یہی ہے حتی کہ کفر بھی اکثر تکبر ہی سے

۱۱۵

پیدا ہوتا ہے اس طرح اکثر معاصی بھی چنانچہ بہت لوگ بیدھڑک داڑھی منڈواتے اور ترشواتے ہیں اور جب نصیحت کیجاتی ہے تو نہایت بیباکی سے کہتے ہیں کہ میاں تمام عمر تو اس وضع سے رہے اب کیا توبہ کرینگے اور یہ شعر زبان زد ہوتا ہے۔ ؎

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بھائی تم آخری ہی وقت میں توبہ کرلو خدا تعالی معاف کردیں گے مگر تکبر قلب کو ایسا مسخ کر دیتا ہے کہ آخری وقت میں بھی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی حضور کے زمانہ میں کفار حضور کا پیغمبر ہونا جانتے تھے مگر تکبر کی وجہ سے قلوب مسخ ہو رہے تھے جیسا ابھی قریب بیان ہوا بعض اہل سیر نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے مسلمان ہونا چاہا تھا مگر کچھ تو اس کا تکبر اور کچھ ہاماں نے حضرت موسی علیہ السلام کی اتباع سے روکا کیونکہ ہاماں بھی متکبر تھا۔ غرض یہ تکبر بڑی بلا ہے نمعلوم کہاں جاکر دھکا دیگا چنانچہ مجلس میں کسی کو جگہ نہ دینا اور کسی کے کہنے سے نہ اٹھنا اسی طرح کھانا گرا ہوا نہ اٹھانا اور جھکنے سے عار کرنا اور کھانا جھک کر نہ کھانا جیسا آجکل میز کرسیوں پر کھانا کھایا جاتا ہے کہ جھکنے سے عار آتی ہے مسجد میں نہ جانا۔ ان سب کا سبب بھی تکبر ہے ایک صاحب میرے پاس مسجد میں تشریف لائے مگر کوٹ پتلون بوٹ جوتہ زیب تن تھا اکر فرش سے باہر کھڑے ہوگئے وہ اسکے منتظر رہے کہ میں اٹھکر ان کے پاس آکر ان سے گفتگو کروں۔ دیکھئے یہ کونسی تہذیب ہے کہ جاویں تو خود ملنے کیلئے اور اسکے منتظر ہیں کہ یہ خود اٹھکر ہمارے پاس آئے یہ بھی اسی تکبر کی فرع تھی۔ پھر لطف یہ کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے مواقع میں ان کیلئے نہ اٹھے تو بد دماغ کہلائے اور ان خر دماغوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔

ایک اور صاحب مدرسہ میں میرے پاس تشریف لائے جنکا تمام جسم متصل واحد تھا لکڑی کی طرح بندشوں سے کھینچا ہوا تھا وہ بھی تھوڑی دیر تو کھڑے رہے شاید کرسی کے منتظر ہوں گے مگر وہاں کرسی کہاں آخر مجبور ہو کر پھر بیٹھنا چاہا تو دھم سے گر پڑے اور اٹھنا اور بھی دشوار ہوا اس فرعونی وضع کا جس میں کوئی راحت بھی نہیں سبب بھی تکبر ہی ہے کہ جہاں جائیں وہاں ان کے لئے کرسی منگائی جائے اور تاکہ ہر وقت بالکل فرعون کہلاتے رہیں جھکنے کی بھی توفیق نہ ہو حتی کہ کھانے کے وقت بھی جھکنا نہ پڑے اسی واسطے میز کرسی پر کھانا کھاتے ہیں حالانکہ حضور اپنی ذات مقدس کے باب میں فرماتے ہیں کہ میں تو غلاموں کی طرح کھانا کھاتا ہوں میں اس کے متعلق آپ لوگوں سے سوال کرتا ہوں کہ اگر

جارج پنجم آپ کو ایک امرود دیکر اپنے سامنے کھانے کا حکم دیں تو میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسکے
تناول کیلئے آپ میز کرسی اور کانٹے چھری کے منتظر ہوں گے ہرگز نہیں اور اگر جارج کے اس دیئے
ہوئے امرود کی ایک قاش آپ کے ہاتھ سے گر جائے تو کیا اسکو زمین ہی پر پڑا رہنے دیں گے اور
بوٹ جوتہ سے آگے کو سرکا دیں گے یا فوراً اٹھا کر کھالیں گے شاید صاف بھی نہ کریں تبلائیے اسوقت
کس طرح عملدرآمد کرینگے یقینی امر ہے کہ آپ فوراً اٹھالیں گے اور کھالیں گے تو یہاں بھی اسی طریق
سے عمل کیوں نہیں کیا جاتا۔ کیا نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی عظمت جارج پنجم سے کم ہے کہ ان کی دی
ہوئی نعمت کی ساتھ اتنا بھی معاملہ نہیں کرتے۔ اور ایک سوال اسکے متعلق یہ ہے کہ اگر آپکو جارج
پنجم اپنے سامنے اس امرود کے کھانے کا امر کریں جیسا اوپر مذکور ہوا تو تبلائیں آپ اسکو رغبت کی
صورت سے کھاویں گے یا بلا رغبت کھاویں گے بالکل ظاہر ہے کہ غایت درجہ کی رغبت کا اظہار کر کے
کھائیں گے اور رغبت اور پسندیدگی کے اظہار کیلئے اسکو اور جلدی جلدی اور عجلت کیساتھ کھائیں گے

۱۱۷

بس یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاکل اکلا ذریعا اگر کوئی
جاہل کہے کہ یہ عجلت متانت کے خلاف ہے تو ہو مگر عشق کے خلاف تو نہیں حضور کو حق تعالیٰ کا مشاہدہ
تھا اسلئے ایسی صورت سے کھاتے تھے کہ بے رغبتی کی صورت ظاہر نہ ہو۔ حاصل یہ ہے کہ بڑے کے
مشاہدہ کیوقت تکبر نہیں رہتا اسلئے ایسے افعال ہی پیدا نہیں ہوتے جو تکبر پر دال ہوں چاہے کھانا
کھانے میں ہو یا مجلس میں جگہ دینے میں. بعض آدمیوں میں تکبر ایسا نمایاں ہوتا ہے کہ ذرا سی بات بھی
کسی کی نہیں سن سکتے چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں تو بالغ تھا نابالغ نہیں اور مجھے نماز پڑھانے
کا اتفاق ہوا تو داہنی طرف آدمی کم تھے. میں نے ایک صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ داہنی طرف
آدمی کم ہیں آپ اس طرف آجائیں تو وہ صاحب بائیں طرف اخیر میں کھڑے تھے اسی طرح کھڑے
رہے میں نے ان کے پاس والے سے کہا کہ بھائی ان کی تو شان گھٹتی ہے تم ہی اس طرف آجاؤ یہ
سنکر وہ بیحد غصہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم کبھی اس مسجد میں نہ آوینگے ہماری بےحرمتی ہوتی ہے اسوقت
میرا بچپن کا زمانہ تھا اور بچپنے میں تیزی ہوتی ہی ہے اسلئے یہ تیز جملہ منہ سے نکل گیا اب اسوقت تو ایسی
بات کبھی نہ کہوں) میں نے کہا مسجد بھی آپکی محتاج نہیں چنانچہ وہ حضرت فوراً جوتے اٹھا اور چلتے ہوئے
تو بعضے لوگوں کی یہاں تک حالت ہے کہ غصہ تو مجبر اور انکار و تکبر مسجد میں آنے سے اور بعضے دعا

میں خدا سے تکبر کرتے ہیں چنانچہ ہمارے یہاں کا واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک لڑکا ہے بہت نیک نماز روزہ کا پابند مگر اسکے اقارب کو شریعت کی طرف توجہ نہیں چنانچہ ایک مرتبہ اسی کا چچا کہتا ہے کہ یہ لڑکا جو نماز پڑھ کر ہاتھ پھیلا کر دعا مانگتا ہے اسکے گھر میں کیا گھاٹا ہے جو خدا تعالیٰ سے مانگتا ہے نعوذ باللہ عجب بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہ تو جگہ جگہ عبادت کا امر فرماویں۔ اور ہم لوگ عبادت کرنے سے جسمیں دعا بھی بڑی فرد ہے عار اور تکبر کریں غرض یہ تکبر بڑا مرض ہے ہمارے جو اندر گھسا ہوا ہے اس آیت میں اس کا بھی علاج کیا گیا ہے اور اس کی بھی اصلاح کی گئی ہے۔ ابتو آپ کا وہ شبہ زائل ہو گیا کہ یہ مضمون تو معمولی ہے نہ ارکان میں سے ہے نہ فرائض میں سے پھر اس کا اتنا اہتمام کیوں کیا گیا۔ پس ابتو واضح ہو گیا کہ اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس میں ایک بڑی ضروری تعلیم ہے کیونکہ بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص اہتمام سے تکبر کا علاج کیا گیا ہے جو منشا ہے آداب مجالس پر عمل نہ کرنے کا اور بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کرنے کا پھر جب اصل اور جڑ خرابی کی جاتی رہے گی یعنی تکبر کا علاج ہو جائے گا اور اسکے علاج سے گناہ متروک ہو جاوینگے تو اب اعمال کے کرنے سے ارتفاع موانع کے سبب ان کا اصلی ثمرہ ضرور مرتب ہو گا۔ یہ حقیقت ہے اس تعلیم کی اسکو معمولی نہ سمجھو۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ صدر مجلس کے کہنے پر عمل کرنے کو ازالۂ تکبر میں کیا دخل ہے ہم نے تو ایکبار ایسا کیا مگر کچھ بھی اثر نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ گو ایک بار عمل کرنا بھی بیکار نہیں مگر ایک بار میں معتد بہ اثر کا ظہور نہیں ہوتا لیکن اگر آپ بار بار اسپر عمل کریں گے تو خود ہی اثر معلوم ہو جائیگا دیکھو ایک جگہ پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے تو اسوقت تو اس سے کچھ محسوس نہیں ہوتا لیکن اگر اسی طرح ٹپکتا رہے تو دس برس میں اس پانی کے قطرہ ہی سے غار ہو جاویگا اور ظاہر ہے کہ اس اثر میں جس طرح مجموعہ من حیث المجموع کو دخل ہے اسی طرح ہر ہر قطرہ کا بھی دخل ہے اسی طرح ہر امر شرعی پر ایکمرتبہ عمل کرنا بھی ضرور تصفیہ باطن میں اثر رکھتا ہے گو کمال اثر کی علت تامہ نہ سہی اسکے لئے ضرورت ہے تکرار و دوام کی یہانتک ایک جزو کا بیان تمام ہو گیا جو آداب مجالس کے بارہ میں ہے اور اس جزو کیواسطے رسالۂ آداب المعاشرت کا مطالعہ کافی نافع ہے اب میں بقیہ اجزاء کو بیان کرنا چاہتا ہوں یہ تمہید میں مذکور ہوا ہے کہ آیت میں دو عمل اور دو ثمرے بیان کئے گئے ہیں عمل اول تفسح فی المجالس اور اسکا ثمرہ یفسح اللہ لکم اور یہ عمل مع ثمرہ کے بیان ہو چکا اور عمل ثانی انشزوا جسپر ثمرہ رفع درجات کو مرتب فرمایا ہے اور انشزوا کا امتثال

118

چونکہ واقع میں تفسح فی المجالس سے ارفع ہے کیونکہ اس میں انقیاد کا زیادہ اظہار ہے جو نفس کو زیادہ
شاق ہے اسلئے اس پر ثمرہ بھی ارفع یعنی رفع درجات کا مرتب فرمایا غالباً یہ امر بیان سے رہ گیا کہ
فافسحوا اور فانشزوا عام ہے خواہ جوارح سے ہو یا قلب سے یعنی جسوقت مجلس میں تفسح کا حکم ہو کشادگی
کردے اور جب مجلس سے اٹھایا جائے اٹھ جائے اور جب تک اس حکم کی نوبت نہ آوے تو اسکے لئے
دل سے آمادہ رہے اور اس آمادگی سے قلب میں زیادہ وسعت ہوگی اصلاح اخلاق کیلئے کیونکہ
حالت قلب کی زیادہ قابل اعتبار ہے مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

صورت رفعت بود افلاک را … معنی رفعت رواں پاک را

اور حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آسماں ہاست در ولایت جاں … کارفرمائے آسمان جہاں ،
در رہ روح پست و بالا ہاست … کوہہائے بلند و صحرا ہاست

119

صوفیہ کرام نے روح ہی کا زیادہ اعتبار کیا ہے اور یہ احکام حسیہ میں بھی امطرد ہے دیکھئے ایک
شخص تو روزمیہ کا مزدور ہے اور ایک شخص رئیس ہے مگر اسپر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو گیا اسوقت
اگر پوچھا جائے کہ ان دونوں میں کون آرام سے ہے تو کوئی نہ کہے گا کہ غنی اس مزدور سے زیادہ
آرام میں ہے بلکہ وہ غنی تمنا کریگا کہ کاش یہ مزدور میں ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس آرام
کا مدار روح پر ہے یا کہ جسم پر اگر جسم کی راحت کو راحت کہئے تو غنی سے مفلس کسی حال میں اچھا نہ ہوتا
پس یقیناً یہی امر متعین ہوا کہ آرام اور راحت روح کی معتبر ہے نہ کہ جسم کی اس حکمت کیلئے حق سبحانہ تعالیٰ شانہ
کا یہ ارشاد ہے یفسح اللہ لکم اور فانشزوا یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت ظاہر و باطن
سب کے لئے شامل رکھا گیا اب اس مضمون ضمنی کے بعد یرفع اللہ الذین آمنو کا بیان کرتا ہوں کہ یہاں
حکم رفع درجات اولاً عام مومنین کیلئے ثابت فرمایا پھر تخصیصاً اہل علم کیلئے اس کا حکم کیا اور صرف
یرفع اللہ الذین آمنو منکم پر اکتفا نہیں فرمایا گو وہ اہل علم کو بھی شامل ہو جاتا سو ایسا کرنے سے مقصود
اہل علم کی فضیلت کا ثابت کرنا ہے اور راز اسکا یہ ہے کہ ایک عمل تو عوام کا ہے کہ بوجہ بہت سے
حقائق نہ جاننے کے وہ اس عمل کے پورے حقوق ادا نہیں کر سکتے اور ایک عمل اہل علم کا ہے وہ
اسکے زیادہ حقوق ادا کر سکتے ہیں پس اس عارض کے وجہ سے ان دونوں عمل میں ضرور فرق ہوگا

ضعیف و قوی ہونے کا اور کامل و ناقص ہونے کا جب دونوں کے اعمال میں فرق ہوا اور اہل علم کا عمل قوی اور کامل اہل علم کو اہل علم پر ضرور فضیلت ہوگی اسی وجہ سے اہل علم کو جدا کر کے بیان کیا اور یہ ظاہر ہے کہ اہل علم اور عوام میں جو یہ فرق ہوا اسکا مدار بجز علم کے اور کوئی شے نہیں۔ لہذا علم ہی ایسی چیز ہوئی جس سے اہل علم کو فضیلت ہوئی پھر جب علم مقبول اور محبوب ہوا تو اہل علم بھی ضرور محبوب اور مقبول ہوں گے اور قاعدہ ہے کہ محبوب کو غیر محبوب سے زیادہ دیتے ہیں اسلئے اہل علم کو زیادہ اجر ملے گا اب میں اس راز کا بھی راز بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک ثمرہ تو نفس عمل پر مرتب ہوتا ہے اور ایک اس کی خصوصیت پر مثلاً دو شخصوں سے ایک مضمون لکھوایئے جن میں سے ایک تو محض مضمون لکھدے اور ایک منشی ذی فہم ہو کہ اسکو سمجھے بھی اور خوشنویسی سے زیب و زینت کے ساتھ لکھے بھی تو ظاہر ہے کہ جو ثمرہ لکھائی کا اس منشی کو ملیگا وہ ہرگز پہلے شخص کو نہیں ملیگا تو یہ زیادتی نفس عمل پر نہیں ہوئی بلکہ اسکے تحسین و تکمیل پر اسپر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک معمار تھا وہ تعمیر کرتے ہوئے نقش و نگار اور نزاکت و صفائی ستھرائی میں مستغرق تھا اسپر ہمارے ماموں صاحب نے کہا کہ میاں کیوں وقت ضائع کر رہے ہو بس چنائی کر دو وہ معمار بولا کہ منشی جی جب آپ لکھتے ہیں اس حالت پر قیاس کر لیں کہ اسوقت آپ کیسے مرکز اور باریک اور موٹے خطوط کے تناسب اور ہر حرف کی اور ہر شد و مد کی مقدار کا اہتمام کرتے ہیں آخر آپ اسمیں کیوں وقت ضائع کرتے ہیں نفس کتابت پر کیوں نہیں اکتفا کرتے۔ ماموں صاحب لاجواب ہو گئے۔ تو جب محسوسات میں یہ بات ظاہر ہے کہ تکمیل کے بعد جو قدر ہوتی ہے وہ قبل تکمیل نہیں ہوتی۔ اور تکمیل ہوتی ہے اسکے فن داں سے کیونکہ بدون فن دانی کے کام کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی بس تکمیل موقوف ہوئی علم پر اور جب کسی عمل میں تکمیل ہوگی تو وہ عمل افضل ہوگا اور اس عمل کے ثمرات بھی افضل ہوں گے بس اس وجہ سے اہل علم کے عمل پر ثمرات بھی عوام کے ثمرات سے زیادہ مرتب ہوں گے حضرت حاجی صاحب رحمۃ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ عارف کی نماز غیر عارف کی لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔ اسپر کہ تکمیل موقوف ہے علم پر مجھے ایک حکایت یاد آئی حضرت حاجی صاحبؒ کے ایک خلیفہ تھے ایکمرتبہ انہوں نے قصداً اہتمام کر کے نہایت خضوع و خشوع سے نماز پڑھی اور نماز پڑھکر مراقب ہو کر عالم مثال کی طرف اس کی صورت دیکھنے کیلئے متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ نہایت حسین جمیل صورت ہے جو سر سے پیر تک

۱۲۰

زیوروں میں لدی ہوئی تھی مگر آنکھوں سے اندھی یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب سے بیان کیا
حضرت نے معاً سنتے ہی فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی ہوگی عرض کیا
جی ہاں حضرت نے فرمایا یہی وجہ ہے کہ اندھی نظر پڑی حضرت کا فہم عجیب غریب تھا فرمانے لگے کہ
آنکھ کا بند کرنا خطرات سے بچنے کیلئے گو جائز ہے لیکن یہ زیادہ اچھا ہے کہ آنکھیں کھلی رہیں گو لاکھوں
خطرات آتے رہیں کیونکہ نماز میں آنکھیں کشادہ رہنا موافق سنت کے ہے اور بند کرنا خلاف سنت ہے
یہ فرق ہے عارف اور غیر عارف میں جسکا مدار وہی علم کا ہونا نہ ہونا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عارف کی ایک
رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے افضل ہے اتو معلوم ہوگیا کہ یہ وجہ ہے علم کی رفعت کی دوسری
ایک وجہ یہ ہے کہ اعمال کا ثمرہ علم ہی کی وجہ سے ملتا ہے کیونکہ وہ موقوف ہیں علم پر تو جو موقوف
پر ثمرہ ملتا ہے وہ بلحاظ موقوف علیہ کے ملتا ہے کیونکہ اس کے بدون موقوف کا وجود ہی نہیں
ہو سکتا پس عمل کا اجر بھی علم ہی پر موقوف ہوا پس عقلاً بھی علم کی فضیلت ثابت ہوگئی اور اسی سے
علماء کیلئے زیادت اجر کا ملنا عقلاً معلوم ہوگیا اب میں نو تعلیم یافتہ جماعت کی ایک غلطی پر متنبہ
کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شریعت میں جو علم کی فضیلت وارد ہے اس میں علم سائنس و علم معاش
وغیرہ داخل نہیں بلکہ علم احکام مراد ہے جو قرآن و حدیث و فقہ میں منحصر ہے اور بعض احادیث
و [illegible] میں جو علم کا لفظ مطلق وارد ہوا ہے تو اس مطلق سے یہ مقید ہی مراد ہے اس سے ایسا
[illegible] سمجھنا جس میں سائنس وغیرہ سب داخل ہو جائیں ایسا ہے جیسا کوئی شخص کہے کہ تعلیم
حاصل کرو اور اس کا یہ مطلب بیان کیا جائے کہ پاخانہ کمانا بھی سیکھو ہرچند کہ گوہ اٹھانا بھی واقع
میں [illegible] ایک شعبہ ہے مگر عرفاً تعلیم حاصل کرنے سے ہرگز ہرگز کوئی شخص یہ نہ سمجھیگا کہ گوہ اٹھانی
[illegible] مراد ہے پس اسی طرح قرآن و حدیث میں جو علم کی فضیلت مذکور ہوئی ہے اس علم میں سائنس
وغیرہ ہرگز داخل نہیں بلکہ یہ علم تو بمقابلہ علم احکام کے علم جہل ہے دیکھئے قرآن مجید میں حق تعالے نے
[illegible] تو [illegible] ہوا فرمایا اس سے انکا اہل علم ہونا ظاہر فرمایا ہے اور اس کے بعد
ولکن [illegible] فرمایا ہے جس میں انہیں سے علم کی نفی فرماتے ہیں تو یہاں نفی علم سے مراد علم مع العمل
[illegible] معلوم ہوا کہ شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے وہاں علم سے وہ علم مراد ہے جسکو
عمل [illegible] نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ عمل موجود بھی ہو پس بتلائیے کہ سائنس کو عمل شرعی میں کیا دخل ہے

۱۲۱

جواسکو اطلاقات شرع میں داخل کیا جائے۔ اس دعوے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے
ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درہما ولکن ورثوا العلم پس اس سے روز روشن کی طرح ظاہر
اور واضح ہوگیا کہ شریعت میں علم سے مراد علم دینار اور درہم نہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے بعض انبیاء
علیہم السلام کو علوم ذرائع کسب بھی عطا فرمائے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ انکو علم سے تعبیر
فرمایا اور نہ ان میں وراثت جاری ہوئی کہ جو کسب ایک نبی کو عطا فرمایا تھا وہ وراثۃً انکی اولاد میں چلا ہو
جب یہ امر منقح اور طے ہوگیا کہ علم سے مراد ایسے ذرائع وطرق کسب بھی نہیں جو بعض انبیاء کو عطا فرمائے
گئے تھے جیسا داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانا سکھلایا اور ان کے ہاتھ میں لوہے کو موم بنا دیا گیا والناله الحدید
ع در کف داؤد آہن یا موم شد۔ اور اس قسم کے کسب اور انبیاء علیہم السلام کو بھی عطا فرمائے گئے
تھے چنانچہ زکریا علیہم السلام نجار تھے نیز بعض انبیاء کے لئے ہوا کو مسخر فرما دیا مگر ان سب امور میں
سے انبیاء کسی امر کے لئے مبعوث نہیں ہوئے اور نہ انبیاء کی وراثت بجز علم شرعی کے اور
کسی چیز میں جاری ہوئی سو جب یہ مفید علوم بھی نصوص فضیلت میں داخل نہیں تو پھر سائنس
اور جغرافیہ جو طرق کسب میں سے بھی نہیں علوم انبیاء میں کیونکر داخل ہوسکتے ہیں پس معلوم ہوا کہ
انبیاء کے کلام میں علم سے مراد علم نبوت ہے نہ کہ علم کسب اور نہ علم طبعیات وغیرہ۔ الغرض اس ذی
فضیلت علم سے دین کا علم مراد ہے اور اہل علم کی فضیلت اسی علم کی وجہ سے ہے اب ان فضائل کے
بعد چونکہ یہاں علماء کے ناز کا موقع تھا کہ ہم اہل علم ہیں اور ہمارا عمل عوام سے بڑھا ہوا ہے تو ان لوگوں
کی تنبیہ کیلئے فرماتے ہیں واللہ بما تعملون خبیر ای علیم بہ باطن الامور یعنی خدا تعالیٰ کو عمل کے ساتھ باطن کی
بھی خبر ہے۔ وہ سب کے باطن کو بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس میں اخلاص ہے اور کس میں نہیں محض علم پر
ناز نہ کرنا کیونکہ یہ علم تو شیطان اور بلعم باعور کو بھی حاصل تھا شیطان بقول مشہور معلم ملائکہ بھی تھا اور
بلعم باعور اپنی قوم کا واعظ بھی تھا اور دونوں شخص علم کے ساتھ عمل ظاہر کے بھی جامع تھے بڑے عابد
اور جفاکش مجاہدہ کرنیوالے تھے مگر ان کے باطن میں اخلاص اور خدا تعالیٰ کی محبت ومعرفت پوری نہ تھی
اسلئے یہ علم وعمل سب بیکار ہوگیا پس عمل کیسا تھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوئی جسکا نام حال باطنی
ہے بدون حال کے علم وعمل قابل اعتبار نہیں اور یہ حال کتب بینی سے حاصل نہیں ہوتا یہ کسی صاحب
حال کی جوتیاں سیدھی کرنے سے نصیب ہوتا ہے۔ غرض اس جگہ آیت میں باختلاف وجوہ دلالت

۱۴۲

تین چیزیں مذکور ہوئیں علم و عمل و حال اور ان تینوں کی تحصیل ضروری ٹھہری اور اگر محض علم و عمل حاصل ہوگیا مگر حال نہ ہو تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے واللہ بما تعملون خبیر جیسا قریب ہی مذکور ہوا یعنی خدا باطن کو بھی دیکھتے ہیں۔ نرے ظاہری علم و عمل کو نہیں دیکھتے عارف رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را ما درون را بنگریم و حال را

اور فرماتے ہیں ؎

ناظر قلبیم اگر خاشع بود گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

حق سبحانہ تعالیٰ زیادہ دل کو دیکھتے ہیں۔ ہم لوگ ظاہر میں پارسا اور مقدس بنے ہوئے ہیں مگر باطن میں یہ حالت ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل واندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید وز دورنت ننگ میدارد یزید

اور محض علم کے ناکافی ہونے کو ایک دوسرے حکیم بیان فرماتے ہیں ؎

علم رسمی سر بسر قیل ست و قال نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

یعنی اگر اسپر اکتفا کیا تو سوائے قیل و قال کے کچھ نہیں محض اس سے حال حاصل نہیں ہوتا ہاں اگر اس کے بعد کسی صاحب حال کو لپٹ جائے تو پھر یہ علم رسمی بہت کارآمد ہے جاہل صوفی سے عالم صوفی افضل ہوتا ہے آگے علم حقیقی کو بتلاتے ہیں ؎

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت زنگ گمراہی ز دل بزدایدت

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند خوف و خشیت در دلت افزوں کند

تو ندانی جز یجوز و لا یجوز خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

اسی مضمون پر مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک نحوی کو دریا کا سفر پیش آیا علم نحو سے زیادہ دلچسپی تھی حاشیہ عبدالرحمٰن و عبدالغفور و عصام از بر تھا۔ جاہلوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ جب کشتی میں بیٹھے مطمئن ہو کر ملاح سے دریافت فرماتے ہیں کہ میاں تم نے نحو بھی پڑھی ہے اس نے کہا نہیں صاحب میں نے نحو نہیں پڑھی۔ فرمانے لگے کہ تو نے اپنی آدھی عمر

یونہی کھوئی وہ بیچارہ یہ سنکر غمزدہ ہوکر خاموش ہوگیا اتفاق سے کشتی بھنور میں پڑگئی اب اس ملاح کا موقع آیا دریافت کیا کہ مولوی صاحب آپ نے تیرنا بھی سیکھا ہے فرمانے لگے نہیں تو ملاح نے جواب دیا کہ جناب نے اپنی ساری ہی عمر کھوئی کیونکہ یہ کشتی اس بھنور میں ڈوبتی ہے ؎

محوی باید نہ نحوی اینجا بداں　　گر تو محوی بے خطر در آب راں۔

افسوس ہم نے قال ہی پر کفایت کی حال نہ حاصل کیا صاحبو! اگر ہم مرنے لگیں تو کیا یہی جی چاہیگا کہ اسی قال پر خاتمہ ہوجائے جس پر ہم اسوقت ہیں ہرگز نہیں مگر پھر بھی یہ حالت ہے کہ اگر آجکل کسی کے میر زاہد اور حدیث کے اسباق میں تعارض ہوجاوے تو حدیث کے سبق کو چھوڑ دیں گے مگر میر زاہد نہ چھوٹے گا لیکن مرتے ہوئے اس میر زاہد کی حقیقت معلوم ہوگی اسوقت بزبان حال یوں کہیں گے

ایہا القوم الذی فی المدرسہ　　کل ما حصلتموہ وسوسہ
علم نبود غیر علم عاشقی　　ما بقی تلبیس ابلیس شقی

میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ کا یہی دل چاہتا ہے کہ موت کے وقت صدرا کی ثناءۃ بالتکریر کی تقریر زبان سے نکلے ہرگز نہیں پس معلوم ہوا کہ یہ علم ضروری نہیں بلکہ زاید از ضرورت ہے لہذا قاعدہ مسلمہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ پر عمل فرماکر غیر مقصود میں اس قدر غلو نہ کیجئے۔ یہ مسلم کہ پاخانہ ایک ضروری شئے مگر آدمی بقدر ضرورت ہی پاخانہ میں رہتا ہے یہ نہیں کہ پاخانہ کے ساتھ دلبستگی اور شیفتگی ہوجائے اسی طرح جب فلسفہ وغیرہ محض آلات ہیں اور علوم دینیہ کے لئے مقدمات کے درجہ میں ان کی ضرورت ہے نہ مقصودیت کے درجہ میں تو بقدر ضرورت ہی ان کا اکتساب اور شغل کیجئے البتہ منطق بہت ضروری اور مفید ہے مگر رفع ضرورت کیلئے منطق میں قطبی ہی تک سمجھکر پڑھ لو تو بہت ہے ملا حسن اور حمد اللہ کی بھی کیا ضرورت ایک رسالہ بھی نطق کا کافی ہے جعل بسیط و مرکب منطق کا مسئلہ نہیں بلکہ فلسفہ کا مسئلہ ہے مگر اس کی بحث خواہ مخواہ علاوہ طور س[illegible] کتب منطقیہ میں موجود ہے اسی طرح اور بہت سے مسائل فلسفہ کے کتب منطقیہ میں [illegible] رکھے ہیں اہل کیف مدرسین اور طلبہ بہت سے رسالے پڑھتے پڑھاتے ہیں حالانکہ فلسفہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ آجکل اکثر طلبہ کے خطوط میرے پاس منطق و فلسفہ کے عدم فہم کی شکایت کے آتے ہیں [illegible] ان کو چھوڑ دو قرآن و حدیث پڑھو۔ مگر اس زمانہ میں حدیث و قرآن سے

بہت ہی کم تعلق ہے معقولات سے دلچسپی زیادہ ہے اسلئے وہ درسیات سے فارغ ہوکر ایسے مولوی بنتے ہیں کہ ؎

مولوی گشتی و آگہ نیستی خود کجا و از کجا و کیستی

غرض مکلفین میں تین قسم کے لوگ تھے حق تعالیٰ نے ہر ایک کو اسکے حالت کے مطابق اس آیت میں نصیحت فرمائی ہے ہر ایک کو اسکی حالت کے مطابق ضروری امر کی رغبت دلائی - جاہلوں کو علم کی رغبت دلائی ہے اور اہل علم کو عمل کی اور عالم باعمل کو حال کی جیسا کہ توضیحات سے واضح ہوچکا ہے اور حال وہ چیز ہے کہ بدون اسکے کوئی عمل کامل نہیں ہوسکتا بدون حال کے عمل کی ایسی مثال ہے جیسے ریل گاڑی کو آدمی ٹھیلتے ہوں آخرکب تک ٹھیلیں گے اور کیا اسی طرح منزل مقصود تک پہونچ سکتے ہیں بہت مشکل ہے اور ہر وقت خطرہ ہے کہ بیچ میں ہی تھک کر چھوڑ دیں ہمنے بہت لوگوں کو دیکھا ہے جو اعمال کے بہت پابند تھے مگر حال سے خالی تھے کہ انہوں نے مرض الموت میں نماز چھوڑدی جسکا سبب یہی تھا کہ حال سے محروم تھے اور حال کے ساتھ عمل کی ایسی مثال ہے جیسے انجن میں اسٹیم بھرا ہوا ہو کہ بہت جلد گاڑی کو منزل پر پہونچا دیتا ہے اور اس میں یہ خطرہ نادر ہے کہ بیچ ہی میں گاڑیوں کو چھوڑ دے اسی کو کہتے ہیں کہ ؎

تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت همت دریں عمل طلب از مے فروش کن

صاحبو عمل کی ہمت مستی حال سے ہی پیدا ہوتی ہے اسکو حاصل کرو بحمد اللہ اب بھی ایسے ساقی موجود ہیں جنکے یہاں شراب محبت فروخت ہوتی ہے جسکی قیمت صرف طلب ہے طلب کی پونجی لیجاؤ اور جتنی چاہو شراب خریدلو مگر طلب کے یہ معنی ہیں کہ تم اپنے کو اسکے سپرد کردو کہ وہ جو چاہے تمہارے اندر تصرف کرے اور جس طرح چاہے آزمائے کیونکہ اس شراب کے پینے کے لئے کچھ شرائط ہیں ان شرائط کے بعد ہی پلائی جاتی ہے بغیر ان کے ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا اور بدون شراب محبت پئے ہوئے حال پیدا نہیں ہوسکتا بعض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہمیں کچھ کرنا نہ پڑے بس ایک چھو سے مستی پیدا ہوجاوے یہ غلط خیال ہے کہ اگر کوئی شخص شراب خانہ میں جاکر خمار سے یوں کہے کہ ایک پھونک مارکر اور چھو کرکے مجھے اس طرح کی شراب دیدے جس سے بدون پئے ہی مجھے مستی پیدا ہوجائے اور کسی قسم کی تلخی بھی نہ معلوم ہو یقین ہے کہ ساقی یہی جواب دے گا کہ مستی پیدا کرنے کی صورت

۱۲۵

تو یہی ہے کہ دام خرچ کرو اور شراب پیؤ اور میری چھو ہی ہے کہ آسے پی جاؤ ۔ پھر حیرت ہے کہ ظاہری مستی تو جو ایک معمولی چیز ہے بدون کچھ خرچ کئے گرہ بغیر پئے حاصل نہ ہوسکے اور باطنی مستی جسکے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی گرد ہے ایک چھو سے حاصل ہو جاوے اور تمہیں کچھ نہ کرنا پڑے آجکل بعض لوگ شیوخ کاملین کے پاس جاتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہم کو کسی قسم کی محنت اور مشقت برداشت نہ کرنا پڑے بلا محنت و کلفت کے مقصود حاصل ہو جاوے ایسے لوگوں کو طلب کا نام لینے ہی کی کیا ضرورت ہے جب وہ تلخی شراب کا بھی تحمل نہیں کر سکتے ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　از چنیں شیر ژیاں پس دم مزن

مثنوی میں ایک حکایت پر مولانا نے یہ شعر فرمایا ہے کہ ایک شخص اپنا بدن گودوانے چلا اور گودنے والے سے جا کر کہا کہ میرے شانہ پر شیر کی تصویر بنا دے تاکہ لڑائیوں میں بہادر رہوں اور شجاعت کا مجھ میں اثر رہے ۔ اس نے اسکے کہنے کے مطابق ایک مقام پر سوئی چبھوئی تو آپ سے سوئی کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی شور و غل مچانا شروع کیا اور اس سے سوال کیا کہ میاں کیا عضو بناتے ہو اس نے جواب دیا کہ دم بنا رہا ہوں فرمانے لگے کہ بے دم کا بھی شیر ہوتا ہے دم کو چھوڑ دو یہ لنڈورا ہی سہی اس نے دوسری جگہ سے گودنا شروع کیا اس دفعہ آپ نے پہلی مرتبہ سے بھی زیادہ شور مچایا اور پوچھا کہ اب کونسا حصہ بنتا ہے اس نے جواب دیا کہ کان تو آپ فرمانے لگے کہ کانوں کو بھی جانے دو بوچا ہی سہی کیونکہ شیر کا وجود کانوں پر موقوف نہیں ۔ اس نے وہ جگہ چھوڑ کر تیسری جگہ سوئی چبوئی آپ نے بدستور سابق دریافت کیا کہ اب کیا بنا رہا ہے اس نے کہا پیٹ آپ فرماتے ہیں کہ تصویر کو پیٹ کی کیا حاجت ہے اسے کوئی کھانا پینا تو نہیں ہے اس نے جھلا کر سوئی زمین پر ٹپکدی اور کہنے لگا کہ ؎

شیر بے گوش و سر و اشکم کہ دید　　ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

کہ ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا ۔ میں کس طرح بناؤں پھر مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　از چنیں شیرے ژیاں پس دم مزن

حافظؒ فرماتے ہیں ؎

یا مکن با پیلبانان دوستی　　یا بنا کن خانہ بر انداز پیل

۱۲۶

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی
یا فروشو جامہ تقوی بہ نیل

میاں جس جماعت میں شامل ہونا چاہو پہلے اپنے کو اس جماعت جیسا بنالو پھر شرکت کا نام لینا کیونکہ ہر جماعت کی شان جدا ہے۔ مسخروں کی جماعت ڈھول دھپ کے لئے ہے اس میں شریک ہونا چاہو تو ڈھول کھانے کو تیار ہو جاؤ۔ اور مولویوں کی جماعت میں مسائل کی تحقیق ہوتی ہے اس میں شریک ہونا چاہو تو علمی باتوں کی قابلیت پیدا کرلو۔ اور اہل حال کی جماعت حالات اور واردات کے لئے ہے اس میں داخل ہونا چاہو تو نفس کو پامال کرنے کے لئے آمادہ رہو ؎

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی
پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

غرض اگر ایسے لوگوں کی مجالس میں جانے کا قصد ہو تو پہلے اپنے ارادہ کو بالکل چھوڑ دیجئے اور کالمیت فی ید الغسال ہو کر ان کی خدمات میں جائیے وہ لوگ طبیب ہیں اور طبیب کبھی مسہل بھی دیتا ہے گو تلخ ضرور ہوتا ہے مگر چونکہ وہ مواد فاسد کو دور کر دے گا اس لئے اس کا پینا عقلاً ثقیل اور دشوار نہیں معلوم ہوتا ایسے ہی یہ لوگ بھی طبیب روحانی ہیں جو شخص واقعی طالب صحت ہو کر ان کے پاس جائے گا وہ کبھی مسہل سے ناک منہ نہ چڑھائے گا خیال تو کرو اگر ایک شخص نے ایک مٹکے میں ڈھیلا گوبر لگا ہوا پھینک دیا تو اب اس میں یہی کرنا پڑے گا کہ گوبر مع پانی کے نکال دیا جاوے گا اور صاف کرکے پھر نیا پانی بھرا جاویگا اسی طرح اگر کوئی شخص رذائل نفس سے ملوث ہو کر شیوخ کے پاس جائے گا تو وہ بھی اس کو دھوئیں اور مانجیں گے اور اچھی طرح صاف کریں گے پھر اسکے بعد میٹھا پانی بھریں گے۔ مگر آجکل ناپاک پانی کے صاف کرنے کا تو لوگوں کو خیال نہیں اور پہلے ہی دن نیا پانی بھرنا چاہتے ہیں بس تسبیح وظیفہ وغیرہ پر نظر ہے حالانکہ نیا پانی اسی وقت صاف اور ستھرا رہے گا جبکہ نکما اور میلا پانی پہلے صاف کر دیا جاوے لہذا اخلاق ردیہ کو پیشتر صاف کرنے کی حاجت ہوگی اور اسکے ساتھ ہی ان مضر علوم کو بھی رخصت کرنا پڑے گا جو آپ کے دماغ میں مکدر پانی کی طرح بھر رہے ہیں اسکے بعد پھر صاف اور عمدہ پانی آوے گا۔ یہ ہے طریقہ کامیابی کا اس مجموعہ کے متعلق یہ ارشادات ہیں ؎

۱۲۷

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

تسبیح و خرقہ لذت مستی نہ بخشدت ہمت دریں عمل طلب از مے فروش کن

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

مگر ان سب تدبیروں کے بعد بڑی شرط یہ ہے کہ طالب ہو اور عاشق ہو اور اس طرح سے حزین ہو کر طلب میں اس کا یہ ورد ہو ؎

اے بادشہ خوباں داد از غم تنہائی دل بے تو بجاں آمد وقت است کہ باز آئی

اے درد توام درمان در بستر ناکامی وے یاد توام مونس در گوشۂ تنہائی

جب طلب میں اسقدر پریشانی ہوگی اسوقت مربی روحانی اور رطبیب باطنی یہ کہے گا کہ ؎

من غم تو میخورم تو غم مخور بر تو من مشفق ترم از صد پدر

اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے واللہ بما تعملون خبیر سے یعنی جب تمہاری یہ حالت ہو گی ہم کو بھی خبر ہوگی اور ہم پر لطف فرما دینگے ۔ غرض آیت مذکورۃ الصدر میں جیسا کہ تقریر کی گئی علم و عمل و حال تینوں کی طرف اشارہ ہے اور بقدر ضرورت بحمد اللہ تینوں کا بیان بھی ہو گیا جو عمل کے لئے کافی وافی ہے اور چونکہ میرے مواعظ اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں اسلئے مواعظ کے نام بھی رکھدئے جاتے ہیں تو اس وعظ کا بھی نام رکھنا مناسب ہے چنانچہ میں اس بیان کا نام علو العباد من علوم الرشاد رکھتا ہوں جس میں نام مبارک استادی جناب مولانا عبد العلی صاحب کی طرف بھی اشارہ ہے جو اصل آمر ہیں اس بیان کے اور نیز اس میں مضمون آیت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں بیان ہے علو درجات عبادت کا ۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو علم و عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور قال کے ساتھ حال بھی نصیب ہو ۔ آمین ۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین ۔

اشرف علی

آغاز ج سنہ ۱۳۵۵ھ

۱۲۸

التبلیغ کا وعظ

مسمّٰی بہ

شرط التذکر

الاشتات	المستمعون	من ضبط	کیف	کم	متی	این
متفرقات	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	شب جمعہ	[illegible]
قدیم وضع کے حضرات زیادہ تھے	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین - اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم - بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - انما یتذکر اولوا الالباب یہ سورۂ زمر کی ایک آیت کا حصہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے دو ضروری امر بیان فرمائے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ان کا طریقہ تحصیل بھی بتلا دیا تاکہ تحصیل میں سہولت ہو جائے۔ (اس طریق تحصیل کی تقریر وعظ ہذا کے تین ربع کے بعد آتی ہے جہاں اس آیت کی طرف عود کیا گیا ہے) اور منشاء اس کا شفقت ہے کیونکہ اصلاح کرنے والے کے ذمہ طریقہ تحصیل کا بتلانا ضروری نہیں ہے مثلاً حکیم کا منصب نسخہ لکھنا ہے اور یہ حکیم کے ذمہ نہیں کہ مریض کو نسخہ ملنے کی جگہ اور اس جگہ تک پہونچنے کا طریقہ بتلا دے۔ یہ مریض یا تیمار دار کا فرض ہے کہ اس کو تلاش کرے اور جس طرح ہو سکے دوا لاوے بس اگر حاکم ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ فقط حکم بیان فرما دیتے تو اس کا بجا لانا بندہ پر فرض ہونا چاہیے خواہ آسانی سے کرتا خواہ بدقت لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نہایت شفیق بھی ہیں اسلئے احکام بجا لانے کی آسان آسان تدبیریں بھی ارشاد فرما دیتے ہیں جس سے مخاطب کی ہمت بڑھ جاتی ہے جیسا کہ شفیق استاد بھی ایسا کرتے ہیں کہ طلبہ کو آسان آسان تدبیریں حفظ مضامین

۱۲۹

کی تبلادیتے ہیں، جلالین دو مصنفوں کی تصنیف ہے اور دونوں کا نام جلال الدین ہے اسلئے طلبہ کو یاد نہیں رہتا کہ نصف اول کس کا ہے اور دوسرا کسکا تو میں نے بعض طلبہ کو یہ ترکیب بتلائی کہ ایک نصف تو سیوطی کا ہے اور ایک محلی کا اور سیوطی کے اول میں سین ہے اور محلی کے اول میں میم ترتیب حروف میں سین مقدم ہے اور مقدم والے کا حصہ مقدم اور میم موخر والے کا حصہ موخر ہے پس مقدم مقدم کے لئے ہے اور موخر موخر کیلئے تو یہ سہیل ناشی شفقت سے ہے جب مخلوق میں یہ شفقت ہے حق تعالیٰ میں تو کس قدر شفقت ہوگی کیونکہ مخلوق جو شفقت کرتی ہے وہ اپنے ذاتی مصالح دنیویہ یا اخرویہ کی وجہ سے کرتی ہے اور حق تعالیٰ اس سے مستغنی ہے نہ مخلوق کی وجہ سے ان کی ذات پاک کو کوئی نفع پہونچ سکتا ہے نہ نقصان وہ لم یزل ولا یزال ہے فرماتے ہیں ؎

من نکردم خلق تا سودے کنم　　　بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

پس خدا تعالیٰ کی شفقت نہایت ہی کامل درجہ کی ہوگی مگر تعجب ہے کہ ہم لوگ مخلوق کا تو احسان مانتے ہیں جنہیں خود ان کی بھی غرض ہوتی ہے اور احسانات خداوندی کا خیال بھی نہیں کرتے نعوذ باللہ گویا یوں سمجھتے ہیں کہ وہ تو خدا کے ذمہ تھا کیونکہ احسان جب مانا جاتا ہے کہ کسی نے انعام دیا ہو اور جب قرض ادا کیا ہو تو احسان کی کیا بات ہے حالانکہ حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ جب کوئی تمہارا قرضہ بھی ادا کرے تو اسکو دعا دیا کرو اور راز اس میں یہ ہے کہ قرض کی خاصیت ہے کہ جب کوئی حاجت پیش آتی ہے تو اپنا دیا ہوا قرض یاد آتا ہے کہ ہائے وہ روپے ہوتے تو اسوقت کام آتے حتی کہ اگر پچاس مواقع پر روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے تو پچاس ہی مرتبہ ان روپیوں کا خیال آتا ہے حالانکہ وہ فقط ایک ہی جگہ کام آتے مگر طبعی بات ہے کہ قرض بار بار یاد آتا ہے اور ہر بار تکلیف ہوتی ہے اسیوجہ سے قرض دینے کا ثواب بھی زیادہ ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ صدقہ کا دس حصہ ثواب ملتا ہے اور قرضہ کا اٹھارہ حصہ کیونکہ قرض عادۃً وہی لیتا ہے جسکو ضرورت ہو اور خیرات تو بلا ضرورت بھی لے لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ ضرورت میں دینے کا زیادہ ثواب ہے تو اس شخص نے اس کی تکلیف تو رفع کی اور خود تکلیف اٹھائی اور دوسرے کو اس کی تکلیف رفع کرکے وہی شخص نفع پہونچا سکتا ہے جو خود تکلیف اٹھا دے اسلئے قرض کا ثواب صدقہ

زیادہ ہے اور گو صدقہ دینے میں بھی کچھ نہ کچھ نفس کو تکلیف ہوتی ہے مگر تھوڑی ہی دیر کیلئے یہ خیال کرکے کہ روپے جیب سے نکل گئے مگر پھر یکسوئی ہو گئی اور قرض میں تو بار بار یاد آنے کی سخت تکلیف ہوتی ہے بس قرضہ دینے میں زیادہ اجر ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ صدقہ خیرات بند کر دیا جاوے۔ کیونکہ حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں جیسا کہ ماں بہن کی محبت اور قسم کی ہے اور بیوی کی محبت اور طرح کی ہے پس اسی طرح صدقہ کا اجر ایک حیثیت سے زیادہ ہے اور قرض کی فضیلت دوسری حیثیت سے غرض جب قرضدار نے قرضہ ادا کیا تو قرض خواہ کو اس نے انتظار کی تکلیف سے نجات دیدی اسواسطے حدیث میں تعلیم دی گئی ہے کہ قرض ادا کرنے والیکو دعا دیا کرو چنانچہ طبعاً بھی ادا کرنے والے کا ممنون ہوتا ہے غرض مخلوق کا احسان تو ادائے قرض کیوقت بھی مانتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کو نعوذ باللہ ایسا قرضدار سمجھتے ہیں کہ گویا اس سے قرض وصول کرنے میں ہم نے خود احسان کیا کہ وصول کر لیا اگر کوئی کسی کو ایک وقت عمدہ کھانا کھلا دے تو یاد رہتا ہے کہ اس نے کھانا کھلایا تھا اور تعریف کرتے رہتے ہیں لیکن خدا کی کبھی ایسی یاد نہیں آتی جسکی بے شمار نعمتیں ہم کو رات دن ملتی رہتی ہیں بس یوں سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ ہم نے ہی یہ سب کچھ کمایا ہے خدا کا اس میں کیا دخل ہے یہ خیال نہیں کرتے کہ ہاتھ اسی نے دئے اور سب سامان وہی مہیا کرتا ہے درحقیقت ہر چیز، ملک تو خدا ہی کی ہے جیسا کہ ہل چلانے سے اناج پیدا ہوتا ہے لیکن اناج ہل کی ملکیت میں نہیں سمجھا جاتا بلکہ انسان کو مالک قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ہم درحقیقت اس قابل نہیں کہ ہماری طرف کوئی شئے بروئے ملک منسوب کی جاوے بلکہ اپنے کو ہل کی طرح سمجھنا چاہئیے یہ خدا کا انعام ہے کہ اسنے ہماری طرف محض نام کی ملک کو منسوب کرکے ہمیں مالک قرار دیدیا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ؎

فی الحقیقت مالک ہر شئے خداست   ایں امانت چند روزہ نزد ماست

دیکھو اگر کوئی ہمیں سامان دیدے تو ہم آیا سامان کا احسان مانتے ہیں یا کہ سامان دینے والے کا بس ہر شئے اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے وما بکم من نعمۃ فمن اللہ ہمارا فقط نام ہی نام ہے ورنہ حقیقت میں ہمارا دخل ہی کیا چنانچہ میں کہتا ہوں تم نے غلہ لینے میں کتنا کام کیا بس یہ کیا کہ جا کر جنگل میں غلہ بکھیر دیا گھر میں سے نکال کر باہر پھینک آئے پھر پانی دیکر اور بھی برباد ہونیکا کام کر دیا کہ جلدی گل گلا کر خراب ہو جاوے تم نے غلہ پیدا ہونیکا کونسا کافی انتظام کیا یہ شاخ کس نے نکالی اور ڈھیلوں

کے اندر سے اور پر لانیکی کیا کوشش کی کیا تم نے ڈھیلے میں سوراخ کیا تھا آفتاب کو حرکت کون دیتا ہے
بارش کس کے قبضہ میں ہے اور طرح طرح کی آفتوں سے کون محفوظ رکھتا ہے سب کچھ خدا ہی کرتا ہے
انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا اور جو کچھ تھوڑا بہت برائے نام کرتا بھی ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت
سے کرتا ہے اور اس مثال سے کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ کاشتکار ہی خدا کے محتاج ہیں جیساکہ
بیان کیا گیا اور نوکری پیشہ والے محتاج نہیں ہیں اسکو بھی سن لیجیے کہ اول تو ان کا وجود اور اعضا
سب خدا ہی کے عنایت کئے ہوئے ہیں اور نیز جسکے تم ملازم ہو اس سے وہی دلواتا ہے کیونکہ اسکے
دل میں تمہارے ملازم رکھ لینے کا خیال خدا ہی نے پیدا کیا بیسیوں آدمی ملازمت کی درخواست
کسی کسی سے کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جب تک دوسرے کے دل میں خیال نہیں ڈالتے تو کوئی درخواست
بھی منظور نہیں ہوتی پھر ہر مہینے تنخواہ دینے کا بھی حق تعالیٰ ہی نے پیدا کیا۔ اگر وہ نہ دیوے
تم کیا کرلو اور اگر نالش کرو تو سب میں نالش کی ہمت کہاں اور اگر حاکم تمہارے خلاف فیصلہ کردے
تو پھر کیا زور لگا سکتے ہو غرض ہماری کوشش پر نتیجہ کا مرتب ہونا اور خود ہمیں کوشش کی توفیق
ہونا نیز یہ سب خدا کے قبضہ قدرت میں ہے اسی طرح ایجادات میں سمجھ لو کہ تمہارا کام صرف دماغ
سے سوچنا تھا مگر دماغ میں بات کا آجانا یہ تو اختیاری نہیں اگر اختیاری ہے تو اتنی دیر تک کیوں
سوچتے رہے اگر قبضہ میں تھا تو فوراً ہی دماغ میں لے آتے پھر ایجاد میں اتنا عرصہ کیوں لگاتے
پھر ایجاد کی حقیقت ہے ترکیب و تحلیل اسکے سوا موجد کیا کرسکتا ہے اگر اس نے کئی چیزوں کو ملا ہی
دیا مگر آخر وہ مفردات کہاں سے آئے اور ان کی جداگانہ تاثیرات پھر مرکب ہونے کی بعد نئی تاثیر
کس نے پیدا کی بہرحال ہر کام میں خدا کی قدرت کا اقرار کرنا لازمی ہے بس ہمارا نام کرنیکو بندہ کی طرف
نسبت کی اجازت دی ہے مگر اس کی اجازت نہیں دی کہ خدا کو بالکل بھول ہی جاؤ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں | مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

ارشاد ہے افرأیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون - کیا پیدا وار تم کرتے ہو یا ہم لو نشاء
لجعلنہ حطاما اگر ہم چاہیں تو سب کو فنا کر ڈالیں بنا بنایا کھیت برباد کردیں اور تم جو دعویٰ کرتے ہو
آبپاشی کا کنوئیں سے اور نہروں سے ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون کیا بادل میں سے
تم پانی برساتے ہو یا ہم اور اگر دیا سلائی رگڑ کر آگ لگا دی تو یہ بتلاؤ کہ اس میں یہ خاصیت

کس نے رکھی - ایک ملحد کا قصہ ہے کہ اس نے تبارک الذی کی یہ آیت سنی قل ارأیتم ان اصبح
ماؤکم غوراً فمن یاتیکم بماء معین - اگر ہم پانی کو زمین کی گہرائی میں اتار دیں تو تم پانی کہاں سے
لاؤ اس مغرور نے کہا ناتی بہ المعول والمعین کہ ہم پھاوڑے اور مزدوروں کے ذریعہ سے
کھود کر نکال لیں گے آخر کہیں تو نکلیگا - حق تعالیٰ گو بہت رحیم ہیں اور اس حلم ہی سے بیہودہ
اور بے عقل لوگوں کی جرات بڑھ جاتی ہے ورنہ عقلمند تو اور زیادہ شرماتے ہیں لیکن جب
کوئی حد سے گذر جائے تو اسکو بھی فوراً سزا بھی دیدیتے ہیں ؎

حلم حق با تو مواسا ہا کند چونکہ از حد بگذری رسوا کند

اس گستاخ کو رات کو خواب میں آواز آئی ذھبنا بماء عینیک فات بہ بالمعول والمعین یعنی
ہم نے تیری آنکھوں کا پانی خشک کر دیا اب تو پھاوڑے اور مزدوروں کے ذریعہ سے ذرا
اسکو تو نکال لے صبح جو اٹھا تو اندھا تھا اگر وہ کمبخت اسوقت بھی استغفار کرتا تو خدا رحمت کرتا وہ
بڑے رحیم ہیں - چنانچہ جب قارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی - دراصل وہ زکوٰۃ
کی وجہ سے مخالف ہو گیا تھا کہنے لگا کہ یہ مال تو میں نے اپنی تدبیر سے جمع کیا ہے کسی کا اس میں کیا حق
بنا ر مخاصمت تو یہ تھی - لیکن کمبخت نے دشمنی میں یہ حرکت کی کہ ایک فاحشہ عورت کو کچھ روپیہ
دیکر آمادہ کیا کہ بھرے مجمع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگا دے ایک دفعہ حضرت موسیٰ
نے وعظ میں زنا سے ممانعت فرمائی اور توریت کا حکم سنایا کہ جو کوئی زنا کریگا ہم اسکو رجم کریں گے -
قارون نے کہا کہ یہ حکم عام ہے یا خاص جواب میں فرمایا عام ہے قارون نے کہا فلاں عورت سے
دریافت کیجئے کیا کہتی ہے آپ نے اسکو بلایا اس نے کہا اس کمبخت نے مجکو سکھایا تھا کہ تو حضرت
پر تہمت لگانا اب توبہ کرتی ہوں حضرت موسیٰ ع نے قارون پر بد دعا کی ارشاد ہوا کہ میں نے زمین
کو آپ کے قبضہ میں کر دیا آپ نے حکم دیا یا ارض خذیہ فوراً زمین نے پکڑ لیا اور وہ نیچے اترنے لگا
اور آپ بار بار یہی فرماتے تھے آخر غرق ہو گیا مخالفوں نے کہا کہ اس کا مال لینے کے واسطے غرق
کر دیا آپنے زمین کو حکم دیا کہ اس کا مال بھی لیلے تو ساتھ میں مال بھی غرق ہو گیا - اہل سیر نے لکھا ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ علیہ السلام قارون تم کو پکارتا رہا اگر وہ مجکو پکارتا تو اسپر رحم ہو جاتا -
صاحبو یہ اسکی عنایت ہے کہ ہم کو بدوں ہماری دعا ہی کے محفوظ کر رکھا ہے ورنہ ہم بھی ایسے ہی گناہ

کرتے ہیں جنکے باعث غرق ہونے کے قابل ہیں ہم بھی قارون کی طرح بدلالت قال نہیں مگر بدلالت حال یہی سمجھتے ہیں کہ یہ مال و دولت سب ہم نے خود جمع کیا ہے خدا کا اسمیں کیا دخل نعوذ باللہ حالانکہ سب کام وہی کرتا ہے ہر شے اسی کی ملک ہے انسان کا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور پیشتر یہ بھی عرض کرچکا ہوں کہ یہ شفقت ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ بلا اپنی کسی غرض کے ہمارا کام کردیتے ہیں پھر ہم جب مخلوق کا احسان مانتے ہیں جو کہ سب کاموں میں اپنے اغراض کا بھی محتاج ہے تو خدا کی عنایات علیحدہ میں غور کرکے تو اسپر جان قربان کردینی چاہیئے ان بیشمار عنایات میں سے ایک بڑی عنایت یہ ہے کہ حق تعالیٰ احکام کی بجاآوری کے آسان ہوجانیکا طریقہ بھی تعلیم فرمادیتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ اسی کی رعایت سے سورہ بقرہ کے پہلے موقع پر ارشاد فرمایا یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی الایۃ ان کو جب ایمان لانیکا حکم دیا تو ساتھ ہی اپنی نعمتیں یاد دلائیں تاکہ نعمت کو یاد کرکے توفیق ایمان ہو پھر بنی اسرائیل والے موقع پر اصلاح کی سہولت کے اور طریقے بھی بتلائے جسکی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ان بنی اسرائیل میں دو مرض تھے حب مال اور حب جاہ انکو جہلاء سے آمدنی بہت تھی وہ ڈرتے تھے کہ ایمان لے آویں گے تو یہ نذرانے ملنے بند ہوجاوینگے کیونکہ عوام کا اعتقاد تو جہالت ہی پر مبنی ہے ورنہ ان کا اعتقاد سب گاؤ خورد ہوجاتا ہے چنانچہ گنگوہ کے ایک پیر صاحب حج کو جارہے تھے انہوں نے بعض اہل علم کے اثر سے بدعات ترک کردی تھیں جب وہ بمبئی پہونچے تو وہاں کے سیٹھ جو ان کے مرید تھے پاؤں پر گرنے لگے انہوں نے منع کیا تو وہ لوگ کہنے لگے کہ پیری بگڑ گئے اب بھی یہ بات بکثرت دیکھی جاتی ہے کہ بہت لوگ بوجہ حب جاہ و مال کے حق کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ جس طرح میں تابعین سے نذرانے وصول ہوں وہی بات کہتے ہیں یہی بنی اسرائیل کے علماء خیال کرتے تھے کہ آج تو ہم سردار ہیں پھر غلام ہوجاوینگے اور غلام کو کون پوچھتا ہے۔ ارے تمکو خبر نہیں ہے یہ غلامی وہ ہے جس پر ہزار سلطنتیں قربان ہیں دیکھ لیجئے اب بھی جو غلام ہیں کیا وہ بھوکے یا ذلیل ہیں یہ ان کی بیوقوفی تھی حق تعالیٰ نے اس کا علاج فرمایا اور کیا عجیب علاج ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ مال یا جاہ کی محبت چھوڑ دو کیونکہ خلاف طبع ہونے کے سبب اول تو اس کا سننا ہی گراں تھا ابتداءً یہ دشوار بھی ہے بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ زکوٰۃ دیا کرو اور نماز پڑھا کرو زکوٰۃ سے مال کی محبت کم ہوجاویگی اور نماز سے عاجزی پیدا ہوجاویگی حب جاہ نہ رہے گی۔ دیکھئے کیسی سہل تدبیر

لم مسرا

بتلادی اور اسی تسہیل کی تکمیل کیلئے ارشاد ہوتا ہے یاایہا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصٰبرین یعنی اے مومنو صبر اور نماز کے ساتھ مدد چاہو۔ استعینوا خود بتلا رہا ہے کہ اس میں کسی کام کو آسان کرنے کی تعلیم ہے تب ہی تو استعانت کی حاجت ہوئی اور اس سہولت کی توجیہ یہ ہے کہ نماز سے خدا تعالیٰ کی عظمت بڑھ جاویگی اور اپنی عظمت یعنی حب جاہ نکل جاویگی آگے نماز میں خود ایک دشواری تھی اسلئے صبر کی تعلیم دی اس کا دخل نماز کی سہولت میں اس طرح سے ہے کہ نماز میں فعل ہے اور صبر میں ترک ہے یعنی کچھ کرنا نہیں پڑتا اور ترک آسان ہے فعل سے جیسا کہ روزہ رکھنا آسان ہے کیونکہ عادۃً ہر وقت بھوک کی طرف التفات نہیں رہتا کسی کام میں لگ کر بھوک کو بھول جاتے ہیں اور نماز میں افعال اور توجہ کا مقید ہونا پڑتا ہے تو وہ زیادہ گراں ہے اسکو آسان کرنے کیلئے صبر کی تعلیم دی جو سہل ہے اور صبر کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے قلب میں یکسوئی کی عادت پیدا ہوتی ہے اور یکسوئی سے نماز کی گرانی دفع ہو جاتی ہے کیونکہ قیود صلوٰۃ کی گرانی کا سبب قلب کی حرکت فکر یہ ہی ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی خیال کی طرف چلتا رہتا ہے اسکو مقید کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور جب یکسوئی کے رسوخ سے یہ حرکت منقطع ہو گئی تو نماز آسان ہو گئی پھر صبر گو بہ نسبت عبادات وجودیہ کے سہل تھا لیکن تاہم اپنی ذات میں کسی قدر دشواری سے خالی نہ تھا اسلئے ایک دوسرے مقام پر صبر کو آسان کرنے کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے جب انسان اسکو سوچیگا تو ناگوار امور میں صبر کرنا آسان ہو جاویگا ونیز صبر جس طرح بواسطہ نماز کے حب جاہ کا علاج ہے اسی طرح وہ حب مال کا بھی علاج ہے اس طرح سے کہ جب صبر کی عادت ہو جاویگی تو مال کی ضرورت بھی کم ہو جاویگی کیونکہ مال کی ضرورت تو لذات کیلئے زیادہ ہوتی ہے جب صبر سے لذات پر قابو ہو گا تو زیادہ مال کی بھی ضرورت نہ ہو گی۔ پھر نماز کی تسہیل کی ایک اور تدبیر فرمائی جسکی ساتھ مکلف کے جذبات کو کسی قدر تسلیم بھی کر لیا کیونکہ فطرۃً اس تسلیم سے بھی سہولت بڑھ جاتی ہے اسکی تقریر یہ ہے کہ نماز کو جو انسان دشوار سمجھتا ہے تو اللہ تعالےٰ نے اس کا رد نہیں فرمایا بلکہ انہا لکبیرۃ میں ارشاد فرمادیا کہ بیشک نماز مشکل ہے مگر اسکو سہل کرنے کیواسطے ایک استثنا بھی فرمایا الا علی الخاشعین یعنی سب کو مشکل نہیں جسکو خشوع کی صفت حاصل ہے اسکو دشوار نہیں خشوع کہتے ہیں قلب وجوارح کے سکون کو یعنی تمام حرکات کو بند کر دینا جب اس

سکون کی عادت ہوجاویگی تو نماز آسان ہوجاویگی اور یہ ترکیب تبلاکر پھر بھی شفقت سے کام لیا
ضابطہ سے کام نہیں لیا یعنی آگے الذین یظنون میں خشوع کو آسان کرنے کے لئے ایک مراقبہ بتایا
کہ خدا سے ملنے کا خیال رکھو اور اس مراقبہ کو دو وجہ سے حصول خشوع میں دخل ہے ایک تو یہ کہ
جب خدا سے ملنے کا اعتقاد تازہ ہوگا تو وعدہ وعید یاد آجاویں گے جیساکہ ملازم خیال کیا کرتا ہے
کہ اگر نوکری کا کام پورا کردیا تو تنخواہ ملیگی اور ریہ ایسا نہوا تو محرومی ہوگی یا سزا ملیگی یہ تو عاقلانہ حکمت ہے
اور دوسری وجہ عاشقانہ ہے وہ یہ کہ ہر شئے کو مرکز پر پہونچکر سکون ہوجاتا ہے چنانچہ ڈھیلا
پھینکو تو زمین پر آتا ہے اور توجہ الی المرکز کرتا ہے اور جب تک خاص نقطہ پر نہ پہونچے اسوقت
تک تقاضائے حرکت باقی رہتا ہے اور مرکز پر پہونچکر جنبش نہیں کرتا اب قلب کا مرکز دیکھنا چاہیے
کہ کیا ہے قاعدہ یہ ہے کہ ہر شئے کو اسکے مقصود کے حصول سے سکون ہوتا ہے۔ پھر مقاصد بھی
مختلف ہیں ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی۔ غیر حقیقی میں گو سکون ہوتا ہے مگر وہ عارضی ہوتا ہے
مثلاً بیٹے سے ملاقات ہوئی تو سکون و اطمینان حاصل ہوا اگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر سے
وہ سکون عارضی زائل ہوگیا اور سکون تام مقصود حقیقی پر پہونچکر ہوسکتا ہے اور مقصود حقیقی
حق تعالیٰ ہیں پس سکون کامل حق تعالیٰ تک پہونچنے ہی پر حاصل ہوسکتا ہے اب یہ سمجھو کہ یہاں
پہونچنے کے کیا معنی وہ جسم تو ہے نہیں کہ جسم چل کر جسم سے جا ملے اس کا طریق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ
کی طرف توجہ تام ہوجاوے پس یہ توجہ تام قلب کا مرکز پر پہونچ جانا ہے جب مرکز پہنچ جاوے
تو سکون تام حاصل ہوگا اور توجہ تام کا مبدا خدا کے ملنے کا اعتقاد ہے اس سے توجہ الی اللہ ہوگی
اور سیر الی اللہ یہی ہے پھر اس سے سیر فی اللہ کا سلسلہ شروع ہوجاویگا پس تمام مقصود کیسے آسانی سے
ختم ہوگیا اس سے زیادہ کوئی آسانی کا طریق نہیں غرض حق تعالیٰ ہمیشہ ہر حکم کے ساتھ طریق تحصیل و
تسہیل بھی تبلادیا کرتے ہیں۔ اسیطرح اس آیت انما یتذکر اولوا الالباب میں دو چیزوں کا امر
ہے اپنے عنوان سے کہ طریق عمل بھی ساتھ ساتھ مذکور ہے اور وہ دو چیزیں یہ ہیں علم اور عمل
اور اپنے قاعدہ میں ہر ایک کو دوسرے کی طرف احتیاج ہے چنانچہ علم عمل کیلئے شرط ہوتا ہے اور
بدون [illegible] کے علم بیکار ہوتا ہے تو دونوں چیزوں کی حاجت ہوئی اور یہ کوئی دین ہی کے ساتھ خاص نہیں
ہر مقصود میں ان ہی دونوں کا دخل ہے۔ مثلاً تجارت میں خسارہ ہوتا ہے یا بوجہ عدم علم کے

یا بوجہ عدم عمل کے مثلاً ہمارے وطن میں ایک نے تجارت کی تھی چاولوں کی اور گھر والوں کو حکم دیدیا
کہ خوب کھایا کرو یا گنگوہ میں ایک شخص نے کپڑے کی تجارت کی تھی اور جو عمدہ تھان آتا اس میں
گھر والوں کے جوڑے بنتے ایسے لوگوں کو ضرور خسارہ ہوگا کیونکہ یہ تجارت کے اصول کے
خلاف تھا بلکہ تجارت کے اصول کا تو حاصل یہ ہے کہ کوئی شئے گھر میں بھی بلاقیمت کے تجارت
خلاصہ یہ کہ کوئی کام بلا اصول کے نہیں ہوتا اور اصول کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے
ایک یہ کہ اصول کا علم ہو اور دوسرے یہ کہ اسپر عمل ہو اگر علم نہ ہوا تو عمل ہو نہیں سکتا اور عمل
نہ کیا تو علم کا نفع ہی نہیں ہوتا پس ہر مقصود کے لئے ان دو چیزوں کی ضرورت مسلم ہو گئی اب
جاننے کہ مقصود دو ہیں ایک دین ایک دنیا اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا اصل مقصود دین ہے۔
قرآن شریف دین ہی سکھلانے کو آیا ہے دنیا کی گو اجازت ہے مگر اس کی ترکیب تبلانا قرآن کا
منصب نہیں کیونکہ دنیا تو تجربہ سے بھی سمجھ میں آسکتی ہے لیکن یہ خدا کی عنایت ہے کہ اس کے
اصول بھی اللہ تعالیٰ ہی نے ابتدائے عمارت ارض میں تعلیم فرما دیئے تھے یہ ان کا احسان ہے
کیونکہ عقل گو اسکے لئے کافی تھی مگر آسانی سے کافی نہ ہوتی جیسا کہ قابیل اپنے بھائی ہابیل کی لاش
لئے پھرتا رہا کہ ابا جان دیکھکر خفا ہو جاویں گے خدا نے رحم کیا ایک کوا بھیجا اس نے سکھایا کہ اس
لاش کو زمین میں دفن کردے۔ غرض ایسے اصول بذریعہ الہام یا وحی کے بتلا دئے تھے بعض
انبیاء ابتداء میں اصول معاش ہی کی تعلیم کیلئے مبعوث ہوئے تھے مگر اب اس تعلیم کی ضرورت نہیں
رہی کیونکہ خوشنویس شاگرد کو کل دنیا بھر کے الفاظ نہیں سکھایا کرتا بلکہ چند الفاظ کی مشق کرانے سے
سب الفاظ آجاتے ہیں ایسا ہی دنیا کی ترکیبیں شریعت محمدیہ نے نہیں تبلائیں کیونکہ شریعت اسلامیہ
سے پہلے دوسرے انبیاء اسکی تعلیم اصولاً دے چکے ہیں بس وہ تعلیم فروع کے لئے کافی ہو گئی پس اب
جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں ہر شئی کی تدبیر تلاش کرنا چاہئیے یہ ان کی سخت غلطی ہے کیونکہ
قرآن طب روحانی ہے اور ظاہر ہے کہ طب اکبر میں موچی کا پیشہ نہیں ملیگا اور جو شخص اس میں اس قسم کی
ترکیبوں کو تلاش کرے اسکے دماغ میں خلل ہے علی ہذا سب جانتے ہیں کہ مرض افلاس کا نسخہ طب اکبر
میں نہیں ملیگا البتہ طب اکبر میں یہ ضرور ملیگا کہ جوتا پاؤں میں کاٹ لے تو فلاں مرہم مفید ہے۔ اسی طرح
حصول دنیا کی ترکیبیں قرآن میں نہ ملیں گی ہاں دنیا سے جو ضرر ہوتا ہے اس کا مرہم قرآن میں مذکور ہے ہم

اس میں احکام کی حیثیت سے دنیا کا ذکر ہے اصول دنیاوی ہونے کی حیثیت سے دنیا کی تعلیم نہیں البتہ باوجود اس میں دنیوی تعلیم نہ ہونیکے تجربہ سے ثابت ہے کہ ان دینی اصول پر عمل کرنیوالا دنیا میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔ بانسمنڈی کانپور میں ایک دکاندار تھا وہ اپنے بانسوں میں عیب ظاہر کردیا کرتا تھا اور اس کے مقابلہ میں دوسرے دوکاندار اپنے مال کی تعریف کیا کرتے تھے اسلئے اس غریب کا مال کم بکتا تھا لیکن تھوڑے ہی کچھ دنوں میں سب لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ سچ بولتا ہے اور دوسرے جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں اسلئے سب دوکانیں پھیکی پڑگئیں اور اس کی دوکان خوب چلنے لگی جس سے دنیا بھی حاصل ہوگئی اور دین بھی نہ بگڑا غرض دین پر چلنے سے تبعاً دنیا کا بھی فائدہ ہوتا ہے مگر قرآن و حدیث میں دین کی تعلیم اس دنیوی منفعت کی حیثیت سے نہیں مثلاً یہ تعلیم نہیں سفر حج میں بمبئی کی سیر ہوجاتی ہے اسلئے حج فرض کیا گیا ہے گو ہم کو اس کا موقع حاصل تھا کہ حج کی حکمت میں یہ بیان کرتے کہ اس سے تجربہ اور سیر بھی حاصل ہوتی ہے مگر ہم اس کو بے ادبی سمجھتے ہیں بلکہ یہ احکام اسواسطے بتلائے گئے ہیں کہ عذاب سے بچے جنت میں پہونچو گو قرآن پر عمل کرنے سے دنیا کی فلاح بھی خود بخود حاصل ہوجاتی ہے مگر مقصود نہیں اسی طرح دین کے خلاف کرنے سے دنیوی فلاح میں بھی کمی ہوجاتی ہے جس میں راز یہ ہے کہ کسی کو خزانہ حاصل کرنا ہو تو اسکو خزانہ والے سے موافقت کرنا لازم ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ صاحب خزانہ سے دشمنی کرکے خزانہ ملے گا ہرگز نہیں پس خزائن دنیا خدا کے ہاتھ میں ہیں یہ بھی ان کو راضی کرکے ہی مل سکتے ہیں مگر آجکل یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ شریعت پر عمل کرنے سے افلاس ہوتا ہے۔ صاحبو یہ تبلاؤ کہ جب سب چیزیں خدا کے قبضہ میں ہیں تو کیا اسکو ناراض کرکے کچھ مل سکتا ہے۔ کاکٹر یا منصف اپنے دوست کی پرورش کرے گا یا دشمن کی شاید کوئی کہے کہ دلائل تو صحیح ہیں مگر مشاہدہ اسکے خلاف ہے حضرات آپنے دنیا کی حقیقت نہیں سمجھی اور اپنے اس معشوق کو بھی نہیں پہچانا آپ کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص ایک عورت کا عمدہ لباس دیکھکر اسکے پیچھے ہو لیا جب پاس جاکر دیکھا تو بڑھیا تھی اور بدصورت بقول شخصے ؎

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد ۔ چوں باز کنی مادر مادر باشد

میں بقسم کہتا ہوں کہ طالبان دنیا کو دنیا کی حقیقت نہیں معلوم فقط نام سنکر فریفتہ ہیں اسکا خلاصہ کسی نے خوب کہا ہے ؎

۱۴۸

عارفے خواب رفت در فکرے — دید دنیا بصورت بکرے
کرد از وے سوال کاے دلبر — بکر چونی باین ہمہ شوہر
گفت یک حرف باتو گویم راست — کہ مرا ہرکہ بود مرد نہ خواست
وانکہ نامرد بود خواست مرا — زاں بکارت ہمیں بجاست مرا

خلاصہ یہ کہ جو لوگ دنیا حاصل کرتے ہیں انکو حاصل نہیں اور جنکو حاصل ہے وہ منہ بھی نہیں لگاتے اسلئے دنیا ابھی تک کنواری ہے جسکی بکارت زائل نہیں ہوئی دوسرے بزرگ نے اس کی حقیقت اجمالی اس طرح ظاہر کی ہے ؎

حال دنیا بپرسیدم من از فرزانہ — گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانہ
باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے ببست — گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانہ

لوگ دنیا اسکو سمجھتے ہیں کہ اسباب بہت ہو بیوی بچے ہوں اگر یہی بات ہے تو امراء کو کبھی تشویش نہ ہوتی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اوروں سے زیادہ پریشان ہیں تو یہ خاک دنیا ہے صاحبو! اگر کسی رئیس کو پھانسی کا حکم ہوجاوے اور احباب کو اسکی ملاقات کی اجازت مل گئی ہو اور سب اس کی ہمدردی کرتے ہوں اور ہر قسم کی راحت پہونچاتے ہوں خدمت و اطاعت کرتے ہوں تو یہاں ہر طرح کا سامان عیش کا موجود ہے مگر دل کو دیکھئے تو افسردہ ہے اگر اسوقت اسکے سامنے کوئی باجا بجانے لگے تو اسے کیا بھلا معلوم ہوگا پس اگر یہ اسباب فی الواقع اسباب نشاط ہیں تو پھر اسے نشاط کیوں نہیں پس معلوم ہوا کہ دنیا کی حقیقت یہ سامان نہیں بلکہ اس کی روح چین اور راحت ہے اور چین و راحت واللہ ایک چیز کے سوا کسی شئے میں نہیں اور یہ دعوی قرآن شریف سے تو ثابت ہے ہی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب تقدیم معمول عامل پر حصر کیلئے ہوتی ہے معنی یہ ہوئے سنو اللہ ہی کے ذکر سے قلوب اطمینان پاتے ہیں اس ترکیب سے صاف معلوم ہوا کہ اسکے سوا کوئی چین کی چیز نہیں مگر مشاہدہ سے بھی یہ دعوی ثابت ہے اور مشاہدہ سے زیادہ کون شئے قاطع نزاع ہوگی ایک شخص مینارہ پر کھڑا ہوا سورج کو غروب ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے اور لوگ نیچے کھڑے ہوئے گھڑیاں دیکھکر کہتے ہوں کہ ابھی غروب کا وقت نہیں ہوا آیا اسوقت یہ گھڑیوں کو صحیح کہے گا یا اپنے مشاہدہ کو ٹھیک سمجھے گا یقیناً یہی کہے گا کہ مجھکو گھڑی کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح جو لوگ مشاہدہ

ہر رہتے ہیں اہل اللہ کے چین کا انکو ضرورت نہیں دلائل قایم کرنے کی اور اگر ان کے خلاف دلائل سنیں گے تو ان کو ہنسی آویگی اور جسکو شک ہو وہ مشاہدہ کرلے اس طرح سے کہ جنکو وہ دنیا کا مالک اور ترقی یافتہ جانتے ہیں ان کے ہمراز بنکر ان کی اندرونی حالت دریافت کریں کہ ان کو کتنے غم ہیں اور اسی طرح اہل اللہ کی خدمت میں رہ کر دیکھیں کہ وہ کتنے خوش ہیں انکی اکل یہ حالت پاؤگے ؎

لنگکے زیر و لنگکے بالا ــــــــ نے غم دزد و نے غم کالا

دکانداروں کا ذکر نہیں سچے اور واقعی اہل اللہ کو تم دیکھوگے تو خدا کی قسم اور مکرر خدا کی قسم تم خود کہدوگے کہ چین میں وہی ہیں قسم کھا کر کہتا ہوں اور تم میرا اعتبار نکرو خود دیکھ لو اور وجہ اس راحت اور چین کی یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے کسی امر میں کچھ تجویز نہیں کرتے کہ فلاں کام اس طرح ہونا چاہیئے بلکہ جو کچھ بھی قضا و قدرت سے پیش آوے ہر حال میں اسپر خوش اور راضی رہتے ہیں اور کلفت کا راز یہی ہے کہ خلاف توقع کوئی بات واقع ہوا ور اس سے روح کو تکلیف ہو سو جہاں توقع ہوگی وہاں ہی خلاف کا احتمال ہے جہاں یہی نہو وہاں کلفت کا کیا کام سو دنیا دار تو ہمیشہ ادھیڑبن میں رہتے ہیں ان کی ہزاروں توقعات اور تجویزیں ہوتی ہیں اور جب ان کی شیخ چلی جیسی امیدوں کا بنا بنایا گھر گر جاتا ہے تو ان کو رنج ہوتا ہے۔ اسلئے وہ ہر وقت مصیبت اور رنج میں رہتے ہیں بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کا یہ مذہب ہوتا ہے ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

وہ اپنے لئے کوئی تجویز ہی پاس نہیں کرتے نہ آئندہ کیلئے امیدیں قائم کرتے ہیں اپنے کو خدا کے حوالہ کرکے ہر حال میں ہر واقعہ کو اپنے لئے اچھا سمجھتے ہیں اسلئے ہمیشہ خوش رہتے ہیں ان کو رنج کیسا جسکو یقین نہو وہ تجربہ کرے انشاء اللہ خود بول اٹھے گا پس ان کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ــــــــ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد ز کس ــــــــ ہمیں ست بنیاد توحید و بس

اور یہ حالت ہوتی ہے ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را ــــــــ تو دانی حساب کم و بیش را

حضرت بہلولؒ سے کسی عارف سے ان کا مزاج دریافت کیا انہوں نے فرمایا اس کے مزاج کا کیا پوچھنا

جس کی خواہش کے مطابق تمام دنیا کا کاروبار چلتا ہو بہلول نے دریافت کیا یہ کیسے فرمایا میں نے
اپنا ارادہ فنا کر دیا اور اللہ کی تقدیر پر راضی ہوگیا پس جسکا ارادہ ارادۂ خداوندی میں فنا ہوجاوے اور
ثابت ہے کہ ہر کام حق تعالےٰ کے ارادہ کے مطابق ہوتا ہے پس اسی طرح وہ اس شخص کے خواہش کے
موافق بھی ہوگا واقعی سچ ہے جو شخص دین پر پورا عمل کرتا ہے اسی کو دنیا کی چین بھی نصیب ہوتی
ہے میرے استاد علیہ الرحمتہ نے ایک حکایت بیان فرمائی تھی کہ کوئی شخص حضرت خضر کی ملاقات
کے لئے دعا کیا کرتا تھا ایک روز خضر تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا چاہتے ہو اس نے کہا ایسی
دعا کر دیجے کہ دنیا میں مجھے کوئی غم نہ ہو فرمایا یہ دعا تو کر نہیں سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تو دنیا میں
جس شخص کو سب سے زیادہ بے غم دیکھے اسی کی موافق تیری حالت ہونے کی دعا کر دوں تو ایسی
شخص کو منتخب کرے ۔ وہ پھرتا پھرتا حیران ہوگیا اور کوئی امیر و رئیس بے غم نہ ملا آخر ایک جوہری
کو دیکھا جو صبح کو دوکان پر آتا خوبصورت خوبصورت لڑکے اسکے ساتھ ہوتے بہت سے نوکر چاکر
بھی ہمراہ آتے صبح سے شام تک خرید و فروخت کرتا اور غربا کو بہت کچھ خیرات کرتا اس نے اس کی مجموعی
حالت سے خیال کیا یہ ضرور بے غم ہوگا میں ایسا ہونیکی دعا کرالوں پھر دل میں کہا کہ قبل دعا کرا لینے
کے اس سے تو حال دریافت کر لینا چاہئیے شاید کوئی مخفی حالت ہو چنانچہ اس سے تمام واقعہ
بیان کیا اور کہا کہ بھائی صاحب مجکو خضرؑ سے دعا کرانی ہے کہ تمہارا جیسا ہو جاؤں بتلاؤ
تو سہی تم کو تو کوئی غم نہیں ہے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا بھائی مجکو تو ایسا غم ہے کہ
کسی دشمن کو بھی نہ ہو اور قصہ سنایا کہ ایک بار میری بیوی جو میری بڑی ہی محبوبہ تھی سخت بیمار
ہوگئی تھی میں رونے لگا اس نے کہا روتے کیوں ہو میں مرجاؤنگی تم اور شادی کر لینا میں نے کہا
ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ وہ بولی ممکن ہے اب تو تیرا ایسا ہی خیال ہو مگر پھر نہیں رہ سکتا بہت
دیکھا یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں جب اسکو کسی طرح یقین نہ آیا میں نے شدت عشق میں اپنا عضو تناسل
اس کے سامنے کاٹ ڈالا کہ اب تو یقین آگیا ۔ اتفاق سے وہ مری نہیں اچھی ہوگئی اور میں بیکار ہوگیا
اب وہ کمبخت نوکروں سے سازش رکھتی ہے اور یہ سب بچے دوسروں ہی سے ہیں اب میں دیکھتا
ہوں اور گھلتا ہوں اس نے کہا بھائی تو تو بڑے ہی گندے غم میں مبتلا ہے اللہ بچائے آخر حضرت خضر کے
پاس گیا اور سارا حال سنایا پوچھا اب کیا خیال ہے اس نے کہا بس دین کی دعا کر دیجئے غرض اہل دنیا

کی تو یہ حالت ہے بے شک چین جسکا نام ہے نہ دنیا اور آخرت دونوں کا نہ بندا روں ہی کو میسر ہوتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیہم ولاہم یحزنون ہ الذین آمنوا وکانو یتقون ہ لہم البشریٰ فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ط لا تبدیل لکلمٰت اللہ ط ذالک ہوالفوز العظیم ۔ دیکھئے صاف ارشاد ہے کہ متقیوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں خوشخبری ہے اور پھر اس کی تاکید فرماتے ہیں لا تبدیل لکلمٰت اللہ یعنی اللہ کا کلام بدلتا نہیں ذالک ہوالفوز العظیم یعنی یہ بڑی کامیابی ہے سو یہ برکت ہے دین کی مگر پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ اس حیثیت سے ان اعمال کی تعلیم نہیں کی گئی کہ دنیا کی چین نصیب ہو بلکہ ان کی تعلیم محض دین کیلئے ہے اور عمل میں بھی خالص اطاعت خداوندی ہی کی نیت کرنا چاہیے غرض مسلمانوں کا اصلی مقصود آخرت ہے اور اس مقصود کیلئے مطابق قاعدہ عقلیہ ونقلیہ کے علم وعمل دونوں کی ضرورت ہے اور اسوقت ان دونوں میں کوتاہی ہو رہی ہے پس اس آیت میں ان ہی دونوں کا ذکر ہے اب ہر شخص دیکھ لے کہ علم وعمل دونوں میں اس سے کتنی کوتاہی ہوتی ہے اور اس سے لسانی بدنی کتنے گناہ دن رات میں ہوتے ہیں بلکہ کوتاہی علم سے بعض کا تو گناہ ہونا بھی معلوم نہیں ہوتا مثلاً متاع دنیا کی طرف نظر حرص کرنا گناہ ہے لاتمدن عینیک الیٰ ما متعنا بہ الآیۃ مگر اس کی کسی کو خبر بھی نہیں کہ یہ بھی گناہ ہے حرام تو کیا مکروہ بھی نہیں جانتے اسی طرح علمی کوتاہی کا یہ اثر ہے کہ نماز تک کے مسائل بھی معلوم نہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ تو یہ ہے کہ دین تو مختصر ہے راہ نجات کافی ہے۔ دنیا حاصل کرنا چاہیے اور حالت یہ تھی کہ ایک صاحب نے جو نوکری پر سے اپنے وطن آئے تھے اپنے وطن اصلی میں امام مقیم کے ساتھ ظہر کی دو رکعت پڑھیں کیونکہ ایک دو روز کیلئے ملازمت سے آئے تھے اور بزعم خود مسافر تھے۔ دین کے معاملہ میں ایسے جاہل اور دنیا کے لحاظ سے پانچسو روپے کے ملازم ایک بہت بڑے شخص رہبر قوم نے جو آجکل لیڈر بنے ہوئے ہیں ایک موقع پر تیمم کیا تو آپ نے مٹی منہ میں بھر کر تھوکدی گویا مٹی سے کلی کی۔ لوگ جلدی سے ہنسنے لگے ورنہ خدا جانے آگے کیا کیا کرتے شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ ڈھیلے وغیرہ پر بھی ہاتھ مار کر جھاڑ دے تاکہ مثلہ نہو اور ان حضرت نے مٹی سے کلی کی غرض اگر توجہ کی جاوے تو پتہ لگے کہ کن کن کوتاہیوں میں ہم مبتلا ہیں بعض بستیاں ایسی ہیں کہ وہاں ہزاروں کی آبادی ہے لیکن ایک شخص بھی مسائل سے واقف نہیں افسوس

ہر مسافر کو ضروری قانون ریلوے کا یاد ہوتا ہے اگر یاد نہو تو پاس رکھتے ہیں ورنہ دریافت کرتے ہیں اسی طرح اگر فکر ہو تو ضرور علم دین بھی حاصل کریں اور میں یہ نہیں کہتا کہ متبحر عالم بن جاؤ کیونکہ دیگر امور کو معطل کرنا مقصود نہیں ہے البتہ ضروریات سے تو واقف ہونا لازم ہے اسی واسطے بعض لوگ غیبت میں مبتلا ہیں اور اسکو برا بھی جانتے ہیں لیکن جب کوئی ٹوکتا ہے تو اسی ناواقفی کی بدولت کہتے ہیں کہ ہم تو اسکے منہ پر کہدیں کوئی کہتا ہے یہ تو سچی بات ہے پھر غیبت کہاں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جب عرض کیا گیا کہ کیا سچی بات بھی غیبت ہے تو جواب میں فرمایا کہ غیبت تو وہی ہے جو سچی بات کسی کے پیچھے کہی جاوے اور اسکو بری لگتی ہو ورنہ جھوٹ بات تو بہتان ہے اسی طرح بہت آدمی تجارت کرتے ہیں یا ضروریات خریدتے ہیں مگر ناواقفی کی وجہ سے یہ پتہ نہیں کہ کس معاملہ سے سود کا گناہ ہوگیا اور کونسا معاملہ ناجائز کر رہے ہیں غضب یہ کہ بعض معاصی میں لذت و منفعت تو نظر آتی ہے جیسے رشوت مگر بعض میں تو لذت ہے نہ منفعت مفت ہی میں عذاب سر پر لیا جیسا کہ چاندی ایک روپیہ کی عوض میں سوا تولہ خریدی تو گنہگار ہوگیا اور یہ سود ہوگیا جس کی سخت وعید آئی ہے کیونکہ مسئلہ ہے کہ چاندی سے چاندی کا تبادلہ ہو تو برابر سرابر ہونا چاہیئے اگر کوئی کہے کہ اس مسئلہ پر عمل کرنے میں تو بوجہ چاندی کے ارزاں ہونیکے ٹوٹا ہوگا یہ اعتراض بھی ناواقفیت سے پیدا ہوا کیونکہ غیر جنس سے تبادلہ کرنے میں کمی بیشی ناجائز ہے مثلاً نو روپے کی چاندی دس تولہ نو روپیہ سے تبادلہ مت کرو بلکہ غیر چاندی کا سکہ معاملہ میں شامل کردو مثلاً یوں معاملہ کرو کہ آٹھ روپیہ نقد اور ایک روپیہ کے پیسے دیدو پھر دس تولہ کیا چاہے بیس تولہ چاندی لیلو تو گناہ سے بھی بچ جاؤ گے اور نقصان بھی کچھ نہ ہوگا اور انشاء اللہ کسی جگہ گاڑی ہرگز نہ اٹکے گی اور سنار بھی اس سے نہ گھبرائے گا چنانچہ میں ایک سنار سے زیور بنوایا کرتا تھا اس نے کہا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ ہیر پھیر کیوں کیا کرتے ہو میں نے کہا مذہبی مسئلہ ہے اور تیرا کچھ نقصان نہیں یہ سنکر اس نے کہا اب تو اس سے زیادہ منفعت ہو تب بھی آنکھوں پر اسی طرح بھوپال میں ایک ہندو صراف سے کسی مسلمان نے کوئی زیور کا معاملہ کیا جو قاعدہ فقہیہ پر منطبق نہ تھا۔ ہندو نے کہا کہ یہ تو تمہارے مذہب میں جائز نہیں پھر اس نے طریقہ بتلایا حضرت اگر آپ شریعت پر عمل کرنے لگیں تو مخالفین خود آپ کو مدد دینے لگیں کہ یوں کردو یوں نہ کرو۔

۱۴۴

یک اہل علم نے سہارنپور میں زری دار ٹوپی خریدی پانچ روپے میں اور ادھار کرنا چاہا تو دوکاندار نے کہا مولوی صاحب چاندی کی مقدار میں تو ادھار جائز نہیں مولوی صاحب کو جب یاد آیا اور فرمایا اچھا پھر کسی وقت دام لاکر خرید لوں گا دوکاندار نے کہا کہ کیا آپ ادھار کی کوئی صورت جائز نہیں ہو سکتی انہوں نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں دوکاندار نے خود بتلایا کہ تم مجھے روپیہ قرض لیکر ٹوپی کی قیمت اسوقت ادا کر دو اور دوسرے وقت میرا قرض دیدینا تو بات یہ ہے کہ اس نے گو ہدایہ نہ پڑھا تھا مگر اسکی عادت تھی کہ علماء سے دریافت کرکے عمل کیا کرتا تھا بعض لوگ عذر کرتے ہیں کہ ہم پڑھ نہیں سکتے میں کہتا ہوں کہ پوچھنے میں کیا دقت ہے لوگوں کو وعظ کا تو شوق ہے کہ مزے مزے کی باتیں سن لیں اور مولویوں پر اعتراض بھی ہو سکتا ہے کہ علماء وعظ میں مسائل ضرور یہ بھی بیان کر دیا کریں تو کیا حرج ہے یہ خیال میرے دل میں بھی پیدا ہوا تھا اور اسی خیال سے ایک دفعہ میں نے سونے چاندی کے مبادلے کے مسائل وعظ میں مفصل بیان بھی کئے تھے اور میں خوش ہوا تھا کہ آج لوگوں کو یہ مسئلے خوب حل ہو گئے مگر تھوڑی دیر میں دو شخص جھگڑتے ہوئے میرے پاس آئے وجہ غلطی کی یہ ہوئی کہ کئی مسئلے انہوں نے ایکدم سے سنے تھے تو خلط ہو گیا تب میری سمجھ میں آیا کہ پہلے علماء اس مصلحت سے مسائل فقہیہ وعظ میں بیان نہیں کرتے تھے البتہ ایک شکایت اب بھی باقی ہے یعنی مسائل دریافت کرنیکی ضرورت تو ظاہر کرنا چاہیئے اب تو فقط ہنسانے رلانیکی حکایات کا نام وعظ ہے ویسے اگر اتفاقاً کوئی واقعہ ہنسی کا ذکر میں آجائے تو دوسری بات ہے مگر قصداً ایسا کرنا تو گویا مضحکہ ہے جیسا ایک بزرگ سے کسی نے ذکر کیا کہ فلاں جگہ شہادت نامہ پڑھا گیا ہے فرمایا سعادت نامہ پڑھتے تو اچھا تھا کیونکہ خود بخود درنج میں رونا آجاوے تو دوسری بات ہے مگر رونے کا اہتمام کرنا اور منہ بنا بنا کر رونا تو شرعاً جائز ہے نہ اہل عقل کے نزدیک کوئی مفید بات ہے سو وعظ کی غرض ہنسانا رلانا نہیں بلکہ اس کی غرض ترغیب و ترہیب ہے پس انہیں نیک کام کا شوق دلادیں اور غفلت دور کریں اسی کی فرع یہ ہے کہ وعظ میں مسائل دریافت کرنیکی ضرورت بیان کرنا لازم ہے ایک غلطی عوام کی اسکے متعلق یہ ہے کہ بعض لوگ مسائل اسلئے دریافت نہیں کرتے کہ یہ کام تو ہمکو ضرور ہی کرنا ہے اگر پوچھنے سے ناجائز ثابت ہوا اور پھر جان کر کیا تو پکڑ ہو گی اور ویسے تو معذور رہیں گے سو یہ بالکل غلط ہے جب اس کا خلاف شرع ہونا احتمالاً معلوم ہے تو یہ بھی ایک گونہ علم ہے اسلئے اہل علم ہی کے برابر

اوّل ہوا ہو [illegible] معلوم [illegible] شرط نہیں البتہ اگر فرصت ہی نہ ہو تو نہ پوچھنے کی گنجائش ہے غرض مسائل دریافت کرنا ہر حال میں ضروری ہیں گو عمل کی بھی توفیق سر دست نہ ہو کیونکہ جب ضرورت یا توفیق عمل کی نصیب ہوگی اس وقت [illegible] دریافت کرنا کام آوے گا ورنہ اگر اسوقت کوئی تبلانے والا نہ ملا تو بڑی دقت ہوگی اور ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بار بار کان میں بات پڑنے سے عمل کی ہمت ہو ہی جاتی ہے اور اگر بالفرض نہ ہو تو اعتقاد ہی درست ہو گیا جرم کی ایک دفعہ سے تو بچ جاؤ گے اگر فرضاً ایک شخص پر کئی دفعات جرم کے قائم ہیں تو ایک کا ٹل جانا کیا غنیمت نہیں اسی طرح بدعملی الگ گناہ ہے اور بے علمی مستقل گناہ اور سخت گناہ کیونکہ عقائد اعمال سے مقدم ہیں پس علم حاصل کرنے سے دفعہ شدید تو ٹلی ایک بدعملی کی دفعہ ہی میں سزا ہوگی دونوں تو قائم نہ ہوں گی اور مسائل معلوم کرنے کی آسان اور انفع تدبیر تو مدرسہ کا قائم کرنا ہے گو چھوٹا ہی ہو جس میں کوئی عالم کامل رکھا جاوے اور ہر شخص اپنی لیاقت اور فرصت کے مطابق ان سے پڑھا کرے چاہے اردو ہی میں سہی مگر بدون پڑھے بطور خود صرف کتاب دیکھنا کافی نہیں اس کی ایسی مثال ہوگی کہ ایک شخص نے اپنی گھر والی کو گلگلے پکاتے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے آٹا خود لے لیا تھا اور کہا یہ کام تو ہم بھی کر سکتے ہیں تو آپ نے اونچے ہی سے گھڑے آٹا کڑاہی میں ڈال دیا تمام تیل اوچٹ کر منہ پر آگیا اور منہ پھونک لیا جب اتنی موٹی بات کا صرف دیکھنا کافی نہ ہوا کسی کے تبلانے کی ضرورت تھی تو مسائل کا مطالعہ تو کیسے کافی ہو سکتا ہے البتہ اگر پڑھنے کا موقع نہ ہو تو پھر تحصیل مسائل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن مقرر کر کے باالتزام کسی عالم سے مسائل سن لیا کریں اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم ہر بات پوچھ کر تو کیا کریں یہ علم حاصل ہونے کا طریقہ ہے اور عمل کے متعلق یہ ہے کہ اول تو اکثر علم سے عمل بھی خود ہی ہونے لگتا ہے اور دوسری تدبیر یہ ہے بکثرت اہل اللہ کی صحبت میں رہا کرے جو کہ واقعی اہل اللہ ہوں اگر یہ نہ ہو سکے تو ان سے خط وکتابت ہی رکھے انکی صحبت اور مخالطت میں خاصیت ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے سے ارادہ میں قوت ہوتی ہے یہ ضروری بیان تھا علم و عمل کا ان ہی دونوں چیزوں کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں انما یتذکر اولو الالباب یتذکر میں عمل اولو الالباب میں علم مراد ہے اور ظاہری عنوان عمل کو تذکر سے اسلئے بدلدیا تاکہ اس کے حصول کا طریق بھی ساتھ ہی معلوم ہو جاوے یعنی یہ تبلا دیا کہ تذکر سے عمل کی توفیق ہو جاتی ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ جو چیزیں داعی الی العمل ہیں جیسے وعدہ وعید اور جیسے حق تعالیٰ کی نعمتیں اور انکا

تہر وغلبہ وغیرہ ان کے بار بار یاد کرنے سے طبعاً عمل کا تقاضا ہوتا ہے اسی طرح بجائے عنوان علم کے لفظ لب لایا گیا اس میں بھی اسی طرح اشارہ ہے طریق تحصیل علم کا صحیح طور پر استعمال کرنا اور لب ذریعہ ہے علم کا پس اس میں علم اور عمل دونوں کی تحصیل کا طریقہ بتلا دیا گیا اور اس دوسری تعبیر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر شخص ہر بات جاننے کی قابل نہیں بلکہ اسکے جاننے کیلئے عقل کی ضرورت ہے مگر آجکل باوجود عقل و فہم نہ ہونے کے ہر شخص کو علمی مضامین کے سمجھنے کا دعویٰ ہے اور ایسے ایسے سوالات علماء سے کرتے ہیں جن کا جواب بھی ہرگز انکی سمجھ میں نہیں آسکتا اور علماء بھی یہ غضب کرتے ہیں کہ ہر شخص کے سوال کا جواب دیدیتے ہیں۔ اور علماء کے اس حلم ہی سے لوگ بد اخلاق ہو گئے مگر جو عالم محقق ہوگا وہ ایسا کبھی نکرے گا چنانچہ مولانا حافظ محمد نعیم صاحب لکھنوی سے کسی نے دریافت کیا کہ فلاں حافظ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ و حضرت علیؓ کے واقعہ میں تحقیق کیا ہے مولانا نے فرمایا کہ وہ حافظ جی کیا کام کرتے ہیں جواب دیا کہ کپڑا بیچتے ہیں فرمایا اور تم کیا کرتے ہو کہا کپڑے رنگتا ہوں مولانا نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں اپنے کام میں لگو علی جانیں معاویہ جانیں نہ ان حضرات کے بارہ میں تم سے کچھ مواخذہ ہوگا اور نہ ان کا مقدمہ تمہارے سپرد ہوگا اور اگر ہوا تو میں سفارش کر کے تمہارے اجلاس سے اٹھوا دونگا میرٹھ میں ایک شخص نے ایک مولوی صاحب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین کی نسبت سوال کیا مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ تم کو نماز کے فرائض یاد ہیں جواب دیا کہ نہیں مولوی صاحب نے جواب دیا افسوس جس نماز کا سب سے اول سوال ہوگا اسکے تو فرائض بھی معلوم نہیں اور جس چیز کے متعلق نہ تم سے قبر میں سوال ہوگا نہ حشر میں۔ اس کی فکر میں پڑ گئے واقعی لوگوں کو جسکی ضرورت ہے اسکی فکر نہیں اور جواب دینے والے علماء کی یہ غلطی ہے کہ وہ لوگوں کی دلشکنی کا خیال کرتے ہیں اور جواب دینے بیٹھ جاتے ہیں مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ ایسی وسعت اخلاق میں لوگوں کی دین شکنی ہے جو دل شکنی سے اشد ہے بعض اہل علم خیال کرتے ہیں کہ انکار میں سبکی ہوگی سبحان اللہ بس تو پھر جہلا جو کچھ فرمائشیں کیا کریں وہی بجا لایا کرو ورنہ سبکی ہوگی کہ یہ کیسا مولوی ہے جس سے ایک چھوٹا سا کام بھی نہ ہو سکا جیسا ایک جاہل نے کسی مولوی سے نکاح پڑھانے کیلئے کہا تھا انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مرد و عورت میں باہم قرابت محرمیت ہے مولوی صاحب نے کہا نکاح نہیں ہو سکتا اس نے خوشامد کی مگر مولوی صاحب کیسے مانتے اس نے ایک موذن سے پڑھوا لیا اور صبح کو آکر مولوی

صاحب سے کہا کہ واہ تم تو بڑے عالم مشہور ہو تم سے ایک نکاح نہ ہو سکا دیکھو موذن نے
پڑھ دیا تو جو لوگ سبکی سے ڈرتے ہیں وہ ایسے ایسے نکاح بھی پڑھا دیا کریں کیا بیہودہ خیال ہے
سبکی کا یہ خیال اس کی تین دلیل ہے کہ آپ کے پاس کمال نہیں ورنہ کسی کی مذمت اور
سبکی کی پرواہی نہ ہوتی کیا اگر تو اس سے خوش ہوتا ہے کہ سب لوگ مجھکو جاہل سمجھتے رہیں اور چاہتا
ہے کہ میرا کمال مخفی رہے اور ہر اہل کمال کی یہی حالت ہے خدا اگر ظاہر کر دے تو دوسری بات ہے بڑی
خریداری تو خدا کی ہے بس تمہارے خریدار وہ کافی ہیں کوئی اور ہو یا نہ ہو بادشاہ جس کا سودا خریدے
اور چاہے نہ خریدے تو اسے کیا غم ہے بس علماء کو چاہئے کہ فضول سوال کا جواب ہرگز نہ دیا کریں چاہے
کیسی ہی سبکی ہو ایک شخص نے میرے پاس چند سوالات بھیجے جو محض فضول تھے اور اخیر میں دھمکانے کیلئے
حدیث من سئل عن علم فکتمہ الجم بلجام من نار بھی لکھدی میں نے کہدیا کہ تم کو جواب نہ ملیگا اور جب ایسا
ہوا اسوقت تم میری مدد نہ کرنا افسوس آجکل علماء پر تو الزام ہے بدخلقی کا اور لوگ خود خیال نہیں کرتے
کہ ہم کیسے کیسے بیہودہ امور دریافت کرتے ہیں ایک انسپکٹر نے مجھے خط لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں
حرام ہے میں نے لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے پھر ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے
اس سوال کا ذکر کیا اور میرے خشک جواب کی شکایت کی میں نے پوچھا کہ کیا آپ اپنے فرض منصبی میں
ہر شخص سے ایک طرح کا برتاؤ کرتے ہیں کہا نہیں میں نے کہا بس ہمارے محکمہ میں بھی یہی ہے کہ ہر شخص
سے جداگانہ معاملہ ہے جن سے خاص تعلق ہے ان سے اور معاملہ ہے اور اجنبیوں سے ضابطہ کا
برتاؤ ہے مگر اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے لہذا اب ایسا معاملہ نہ ہوگا لیکن اس ملاقات کا آپ
پر بھی یہ اثر ہوگا کہ آپ بھی ایسا بیہودہ سوال نہ کریں گے غرض علماء کو اس کا اہتمام چاہئے کہ بیہودہ
اور فضول امور کا جواب نہ دیا کریں اور جہلاء کو بھی لازم ہے کہ ایسے فضول سوال نہ کیا کریں مثلاً
قبر میں زندہ ہو کر دم گھٹنے کا اشکال کیا جاتا ہے اس کا جواب عامی کو نہ دو بلکہ اس سے کہدو کہ جو کام
کرنے کے ہیں ان کے متعلق سوال کرو یہ مسئلہ عمل کے متعلق نہیں ہے بس خلاصہ قاعدہ کا یہ ہوا کہ بعض
بات تو کرنے کی ہوتی ہے اسکے تو احکام دریافت کرلو اور بعض بات سمجھنے کی ہوتی ہے وہ اگر صاف ہے
تو سمجھ لو اگر دقیق ہے تو اسپر اجمالی اعتقاد رکھو اور تفصیلی کاوش میں نہ پڑو کیونکہ اگر عالم اسے بیان بھی کرے تب بھی
عامی کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور سمجھکر کوئی نفع بھی نہ ہوگا مثلاً اگر کوئی یہ سمجھ جاوے کہ پل صراط پر کیوں کر چلیں گے

تو کیا چلنے سے بچ جاویگا یا چلنا آسان ہو جاویگا ہرگز نہیں بلکہ پہلے مان کر وقت پر موجود ہو یہاں پہنچکر
چلنے کا طریقہ معلوم ہو جاویگا اور آسانی سے سمجھ جاوگے تم نے نہیں دیکھا کہ تم نے بہت سی باتیں بلا سمجھی
مان رکھی ہیں مثلاً زمین کا گول ہونا اور زمین کا سورج سے آباد ہونا بلکہ فلسفہ میں بعض باتیں ایسی ہیں
کہ عام لوگ ان کو سمجھ بھی نہیں کر سکتے اور فلاسفہ کے نزدیک وہ مسلم ہیں مثلاً یہ کہ ایک چیونٹی کی
حرکت سے ساری زمین ہلجاتی ہے کوئی اسکا یقین کر سکتا ہے ہرگز نہیں مگر پھر بھی فلاسفہ کے معتقدین کو
تقلیداً اس کو ماننا پڑتا ہے پھر کیا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی بھی عظمت نہیں کہ انکی باتیں تقلیداً
تسلیم کر لیں پس بہت سی باتیں تم نہیں سمجھ سکتے اور میں بھی فراخ دلی سے اقرار کرتا ہوں کہ بعضی باتیں
میں بھی نہیں سمجھ سکتا مگر میرا ایمان سب پر ہے اور بعض باتیں ہم جانتے ہیں مگر بیان نہیں کرتے کیونکہ
ان کا بیان کرنا مناسب نہیں نیز عوام کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتیں مثلاً پل صراط کا بال سے باریک
ہونا اور تلوار سے تیز ہونا ایک امر عقلی ہے جسکو میں عقلی طور پر ثابت کر سکتا ہوں وہ اس طرح کہ ہر شئے
کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک صورت پل صراط ایک صورت ہے اسکی حقیقت معلوم کرنا چاہیئے تو
کشف سے معلوم ہوا کہ وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے اور شریعت اس کی حقیقت ہے اور یہ کشف
اسلئے مقبول ہے کہ شریعت کے خلاف نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ اشارات نصوص سے اس کی تائید
پر استدلال بھی کیا جا سکے پس یہ صراط مستقیم یعنی شریعت قیامت میں بشکل پلصراط نظر آویگی اور شریعت
ہر چیز کے افراط و تفریط کے درمیان ایک وسط چیز ہے اور وسط حقیقی وہ ہے جو تقسیم نہ ہو سکے ورنہ
وسط وسط نہ رہیگا اس میں خود طرفین اور وسط نکلیگا اور بال منقسم ہے پس شریعت بال سے بھی
باریک ہوئی اور چونکہ اسپر چلنا دشوار ہے اسلئے تلوار سے تیز بھی ہوئی پس یہی باریک اور تیز چیز
صورت پلصراط میں ظاہر ہوگی تو دیکھئے ہم نے عقلی طور پر حقیقت پلصراط کی بتلا دی مگر اب بتلائیے ہم ایسی
باتیں اگر آپ کو بتلا دیں تو ان کو سمجھیگا کون چنانچہ اس جلسہ میں بھی بہت لوگ اس مضمون کو نہیں سمجھے
ہونگے بعض کہتے ہیں کہ بس بیان کر دیا جائے چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اول تو اس سے نفع کیا بلکہ بعض
کو غلط فہمی سے ضرر ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ اہل کمال کا تو یہ حکیمانہ مذاق ہوتا ہے کہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

خلاصہ یہ کہ علماء سے احکام پوچھو علل نہ پوچھو یعنی یہ مت پوچھو کہ یہ کیوں ہوا اور اگر ایسا ہی شوق ہے

تو با قاعدہ طالب علم بنو پھر پوچھو ہونا یہ چاہئے کہ ایک قاعدہ ہوتا سب سوالات علل کا یہی قاعدہ ہے اور اگر طالب علم نہیں بنتے تو پھر طالب درویش بنکر رہو جسکا نام تسلیم و تفویض محض ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے ہر طالب علمے کہ چون و چرا نکند دہر درویشے کہ چوں و چرا کند ہر دو را بچراگاہ باید فرستاد۔

درویش کا مذہب یہ ہوتا ہے کہ بلا چون و چرا تسلیم کرلے اور ہر مسلمان درویش ہے کیونکہ خدا کے طالب کو درویش کہتے ہیں یہ کبھی مت کہنا کہ ہم درویش نہیں ہیں اگر درویش ہونا سمجھ میں نہیں آتا تو اچھا طالب علاج تو ہو تو طالب علاج کو یہ اجازت نہیں کہ نسخہ کے اجزار کی تحقیق کرے اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

ہاں طالب علم کو چونکہ فن حاصل کرنا ہے اور اسکو دریافت کئے بغیر فن حاصل نہ ہوگا اسلئے اسکو دریافت علل کا حق بھی ہے و نیز اسکو دریافت کرنیکی تمیز و سلیقہ بھی ہے وہ بیہودہ و بیکار سوال کبھی نہ کریگا اور اگر کوئی طالب علم بھی بیہودہ بات پوچھے تو اسکو بھی روک دیا جائیگا امام ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس املا میں ایک شخص خاموش بیٹھا رہتا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا تم کیوں نہیں بولتے کہا اب بولا کروں گا۔ ایک روز تعجیل افطار کی حدیث کے سلسلہ میں بیان کیا گیا کہ جب آفتاب یقیناً غروب ہو جاوے پھر روزہ فوراً افطار کرلو وہ طالب علم بولا کہ اگر کسی دن آفتاب غروب نہ ہو تو کیا کریں امام صاحب نے فرمایا کہ بس تم خاموش ہی رہا کرو۔ ایک اور حکایت ہے کہ کوئی بہو چپ بیٹھی رہتی تھی اسکی ساس نے کہا کہ بات چیت کیا کرو بہو تو بولتی ہی اچھی لگتی ہے اس نے کہا میری اماں نے بولنے سے منع کر دیا تھا ساس نے کہا تیری ماں احمق ہے تو بولا کر کہنے لگی اچھا۔ ایک روز بولی کہ اماں اگر تمہارا بیٹا مر جاوے تو میرا نکاح کسی دوسرے سے کر دوگی یا یوں ہی بٹھلائے رکھو گی ساس نے کہا بہو تیری ماں نے ٹھیک کہا تھا تو خاموش ہی رہا کر۔ تو بعض آدمی بولنے کے قابل نہیں ہوتے کانپور میں ایک استفتا آیا مولوی محمد رشید صاحب کانپوری مرحوم کے پاس کہ گھوڑے کے جنازہ کی نماز پڑھنا کیسی ہے مولوی صاحب نے ظرافت کے پیرایہ میں تحقیقی جواب لکھا کہ اگر کسی نے اس گھوڑے کو کلمہ پڑھتے ہوئے سنا ہو تو جنازہ کی نماز پڑھنا چاہیئے ورنہ نہیں جواب کیسا مدلل دیا

کہ نماز جنازہ مسلمان کی ہوتی ہے اور جب تک کلمہ نہ پڑھے مسلمان نہیں ہوتا تو گو ذہانت سے ایسے جواب ہو سکتے ہیں۔ مگر اصل بات یہی ہے کہ جاہلوں کو فضول بات کا جواب ہی نہ دیا جاوے اور اس سے سب عوام رنجیدہ نہوں کہ ہم کو جاہل اور ناقابل قرار دیا کیونکہ صحبت علماء سے بعض عوام جاہل نہیں رہتے خواص ہو جاتے ہیں گو اکثر اخص الخواص نہوں پس جاہل وہ ہے جو خدا کا راستہ نہ جانتا ہو اور جو واقف ہو وہ عالم ہے گو لکھا پڑھا نہو البتہ ایسا شخص عالم لازم ہے عالم متعدی نہیں اسکو وعظ وغیرہ کی اجازت نہو گی یا یوں کہو کہ عالم ہے معلم نہیں جیسا کہ تندرست طبیب نہیں اسلئے علاج نہیں کر سکتا بلکہ علاج طبیب ہی کرتا ہے اسی طرح جو ناخواندہ صحبت علماء میں ضروریات دین سے واقف ہو گیا ہو وہ تندرست تو ہے چاہے دوسروں کو نفع نہ پہونچا سکے مگر اس کو جاہل نہیں کہہ سکتے کیونکہ علم لکھنے پڑھنے ہی پر موقوف نہیں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کثرت سے ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اسی شان کے متعلق فرماتے ہیں نحن امۃ امیۃ لانکتب ولانحسب اس ارشاد میں آپ نے سب فلسفہ اڑا دیا مگر باوجود اس کے کتنے بڑے عالم تھے بس عالم ہونیکے لئے تو درسیات کا پڑھنا شرط نہیں لیکن معلوم ہونے کے لئے اسوقت شرائط شدید ہیں غرض الوالالباب کے لفظ میں ان ہی علوم مقصود کی طرف اشارہ ہے اب میں ختم کرتا ہوں۔ خلاصۂ وعظ یہ ہے کہ علم وعمل کی ضرورت ہے اور علم کا طریق پڑھنا اور مسائل کا سننا اور پوچھنا ہے اور عورتوں کی تعلیم کا طریقہ شاید ذکر نہیں کیا گیا وہ بھی بطور تتمہ کے بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ گھر میں رہکر مسائل پڑھیں اور جب کسی نئے مسئلہ کے پوچھنے کی ضرورت ہو تو محرم مردوں کی معروفت علماء سے دریافت کرا دیں مگر کسی حال میں پردہ میں کوتاہی نہ کریں۔

والحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ

واصحابہ اجمعین

اشرف علی

(آغاز جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلسلہ التبلیغ کا وعظ

مسمّی بہ

نشر الرحمۃ

الاشتات	المستمعون	من ضبط	من ذا	ماذا	کم	کیف	کم	متی	این
متفرقات	سامعین کی تعداد تقریباً	کس نے ضبط کیا	کس غرض سے بیان ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کتنا ہوا	کب ہوا	کہاں ہوا
×	×	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	×	[illegible]	[illegible]	[illegible]

خطبہ ماثورہ ۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ ط وھو الولی الحمید ط اسوقت تھوڑا سا بیان ہوگا سب صاحب متوجہ ہو کر سن لیں ، یہ ایک آیت ہے جس میں حق جل شانہ وعم نوالہ کی وسعت رحمت کا ایسے عنوان سے بیان ہے کہ اس سے بڑھکر کوئی عنوان کسی کے ذہن میں آ نہیں سکتا تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر چیز کا حصول وجود شرائط اور ارتفاع موانع پر موقوف ہے چنانچہ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ ہر چیز کے لئے کچھ شرائط وجود اور کچھ اس کے روکنے والے موانع ہوتے ہیں مثلاً بادشاہ سے کچھ لینا ہو تو اس کی خوشامد اطاعت کرو یہ تو شرائط و اسباب ہیں اور اگر کسی نے اس کی شان میں گستاخی کی ۔ گالی دیدی سخت کلامی کی تو یہ موانع ہیں اسکے بعد سے انعام موقوف ہو جاتا ہے یا بادشاہ سے نوکری کی درخواست کی اور یہ شرط تھی اور وہ دینے کو

آمادہ ہوگیا اس کے بعد فوراً اس شخص نے یہ کہدیا کہ جب تو آپ سے امید نہیں ہے فضول ہے آپ سے مانگنا یہ مانع ہے اس صورت میں نوکری دینا تو درکنار مدد دینے کا قصد بھی نہ کریگا اور کہیگا کہ جا ایسے بیجا کو ہم نوکری نہ دینگے ہماری خوشامد کرتا اور ہم سے امید رکھتا تو ہم دیتے غرض کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ اس صورت میں بادشاہ اسکو نوکری دیگا۔ یقیناً تمام عقلاء کی رائے یہی ہوگی ایسے شخص کو نوکری دینا داب سلطنت کے خلاف ہے اخلاصہ یہ کہ موانع عطاء میں سب سے بڑھکر مانع یہ ہے کہ کھلے لفظوں میں ناامیدی ظاہر کردے اور یوں کہدے کہ آپ کیا دیں گے اس میں تو کوئی تاویل بھی نہیں ہوسکتی اول تو داب شاہی کا مقتضا یہ ہے کہ بشرہ سے بھی یہ بات ظاہر نہ ہونا چاہیے کہ ہم کو امید نہیں ہے چہ جائیکہ زبان پر لائی جاوے اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی عظمت اس کے قلب میں بالکل نہیں ہے ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لو دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جیسے حق سبحانہ تعالیٰ سے زبان کے کلمات مخفی نہیں ہیں اسی طرح دل کی باتیں اور خیالات بھی ان سے مخفی نہیں ہیں جیسے وہ علیم باللسان ہیں اسی طرح علیم بذات الصدور بھی ہیں پوشیدہ لفظوں میں کلام کرو یا ظاہر الفاظ میں ان کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں ان کے نزدیک پنہاں اور علانیہ یکساں ہے۔ کوئی بھی فرق نہیں۔ ان کی تو وہ شان ہے جیسا لقمان علیہ السلام نے فرمایا۔ یٰبنی انہا ان تک مثقال حبۃ من خردل فتکن فی صخرۃ او فی السموات اوفی الارض یات بہا اللہ ط ان اللہ لطیف خبیر۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز پوشیدہ ہو اور پھر سخت پتھر کے اندر ہو چاہے آسمان میں ہو یا زمین میں ہو اللہ تعالیٰ کو سب کا علم ہے۔ جب یہ دونوں مقدمے سمجھ میں آگئے تو اب آیت کا ترجمہ سنئے جس سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ موانع رحمت کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی رحمت کو نہیں روک سکتے فرماتے ہیں کہ اس کی وہ شان ہے کہ اتارتا ہے مینہ ناامیدی کے بعد اور پھیلاتا ہے رحمت اپنی۔ یہاں تنزل الغیث پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بنشر رحمتہ بھی لائے تاکہ محض نزول بارش کے سننے سے طوفان نوح کا شبہ نہ ہوسکے کیونکہ بارش کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ بارش ہو مگر اتنی کثرت سے ہو کہ سب غرق ہو جائیں پس

ف موانع عطا میں سب سے بڑا مانع اظہار ناامیدی ہے

۵۲ ف خدا تعالیٰ کے نزدیک کلمات زبان و خیالات قلب دونوں برابر ہیں۔

ترجمہ۔ اے بیٹے اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو پھر وہ کسی پتھر میں یا آسمانوں میں یا زمین میں ہو تب بھی اس کو اللہ تعالیٰ حاضر کر دیگا بیشک اللہ تعالیٰ بڑا باریک بین باخبر ہے ۱۲

بشرٌ رحمتہ سے بتلادیا کہ بارش بھی ایسی نہیں جو موجب ہلاکت ہو بلکہ اسکے ساتھ رحمت بھی شامل ہوتی ہے۔ اور یہاں ینزل کے مقابلہ میں بُشرًا اور غیث کے مقابلہ میں رحمت لائے ہیں اس سے اشارہ ہے اسطرف کہ بارش دور دراز تک ہوتی ہے یہ نہیں کہ ایک یا دو کھیت میں ہو کر رہجا ہو بلکہ وہ رحمت کی طرح پھیل جاتی ہے پس بشرٌ رحمتہ جملہ سابقہ ہی کی تفسیر ہے یہ تو آیت کا ترجمہ ہوا اس سے وسعت رحمت کیسی کچھ ثابت ہوتی ہے ان مقدمات میں غور کرکے دیکھئے جو ابھی بیان کئے گئے ہیں جن میں ایک مقدمہ تو یہ تھا کہ ناامیدی مانع عطا ہے مگر خدائے تعالےٰ کے یہاں وہ بھی مانع نہیں بلکہ ناامیدی کے بعد بھی فضل فرماتے ہیں۔ دوسرا مقدمہ یہ کہ حق تعالیٰ کو خفایا کی اطلاع مثل ظواہر کے ہے فالقلب عندہ کاللسان ان کے نزدیک دل کی بات ایسی ہی ہے جیسے زبان سے کہی ہوئی اس لئے قلب کی ناامیدی مانع ہونی چاہیئے تھی مگر خدا تعالیٰ کے یہاں بالکل مانع نہیں اور یہ واقعی ہے کہ معاملہ اللہ تعالیٰ کا بندوں کے ساتھ ایسا ہی ہے کہ وہ باوجود موانع کے بھی فضل فرماتے رہتے ہیں غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ نہ روزمرہ ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں کچھ بارش ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس سے بڑھکر نظیریں موجود ہیں خدا تعالیٰ کی رحمت ایسی وسیع ہے کہ ایک بزرگ کے الہاموں میں سے ایک الہام یہ بھی ہے کہ رزق میرا ایسا ہے کہ اگر کوئی شخص پانچوں وقت نماز کے بعد دعا کرے کہ اللھم لاترزقنی یعنی اے اللہ مجھے رزق مت دیجیو تب بھی میں رزق نہ بند کروں تو مانگنے پر تو کیوں نہ دوں گا اب خیال کیجئے کہ ہمارا یہ گمان کتنا غلط ہے کہ ہم خدا تعالیٰ سے ناامید ہوں غرض کہ جو کچھ کمی ہے ہماری طرف سے ہے ادھر سے کوئی دریغ نہیں ہے۔ ہاں کبھی توقف ہو جاتا ہے جس سے خفیف سی کلفت ہوتی ہے تاکہ تنبہ ہو کر بندے متوجہ ہو جائیں کیونکہ جس لڑکے کو استاد یہ چاہتا ہے کہ کل کو زیادہ نہ پٹے تو اسکے ایک دو کھپی آج ہی مار دیتا ہے تاکہ وہ اپنا سبق یاد کرلے اور کل کو نوبت زیادہ پٹنے کی نہ آئے اور جسے کل کو خوب پٹینا ہے اسے مہلت دیتا ہے جب کل ہوئی اور وہ سبق میں غوطے کھانے لگا تو اب اس کی خوب مرمت ہوگی مگر پہلے دن یہ دوسرا لڑکا استاد کی ظاہری مہربانی دیکھکر یہ سمجھتا تھا کہ میاں جی کو مجھ سے عشق ہے کہ مجھے کچھ نہیں کہتا اور اپنے دل میں خوش ہے مگر جو ہیں گھنٹہ کے بعد اس عشق کی حقیقت

معلوم ہوگئی اسی طرح آج بھی بعض لوگ اس دوسرے لڑکے کی طرح خدا تعالیٰ کی عطاؤں کو اپنے اوپر مستمر دیکھ کر اسکو خدا تعالیٰ کی رضا کی دلیل سمجھتے ہیں اور مغرور رہیں تھانہ بھون کے ایک متکبر رئیس کی حکایت ہے کہ ایک شخص حضرت حاجی صاحب کے مریدوں میں سے اللہ کا نام لینے والے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے مگر غریب قوم کے انکے سامنے کو نکلے۔ اللہ کا نام لینے سے طبیعت میں لطافت آہی جاتی ہے ان رئیس صاحب نے کہا کہ یہ کون ہے جو ہماری برابری کرتا ہے بڑا صاف ستھرا بنکر نکلتا ہے اور اٹھکر غریب کے پانچ جوتے مار دیے۔ اس نے یہ کہا کہ قیامت میں کسر نکلے گی ان رئیس صاحب نے مسخراپن سے جوتہ سامنے رکھدیا کہ تو میرے مار دے اس نے کہا کہ مجھ میں کیا مجال۔ تو آپ کیا کہتے ہیں اب بھی معلوم ہوا کہ ہم کو خدا ہی کا حکم ہے کہ تم کو مارا کریں کیونکہ دیکھ لے ہم نے تو بیشرت بلا کے جوتے مار لئے اور تو اجازت پر نہیں مار سکتا۔ کیا ٹھکانا ہے اس تکبر کا یہ استدراج ہے اگر نعمتیں دلیل ہوتیں تو سب سے زیادہ ولی فرعون ہوتا اور اگر مصائب علامت غضب ہوتیں تو انبیاء سب سے زیادہ (نعوذ باللہ) مغضوب ہونے چاہئیں کیونکہ سب سے زیادہ مصائب انہی کو پیش آئی ہیں چنانچہ حدیث میں ہے ان اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل کہ سب سے زیادہ بلا انبیاء پر آتی ہے پھر اس پر جو ان کے بعد افضل ہو چنانچہ حضرت زکریا آرہ سے چیرے گئے نوحؑ کی قوم نے نو سو سال تک ان کے پتھر مارے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا کیا تکالیف پیش آئیں تو کیا انبیاءؑ مقبول نہیں تھے۔ خوب سمجھ لو کہ نہ دنیا کا عیش علامت ہے قرب و مقبولیت کی اور نہ اس کی تکالیف دلیل ہیں مردودیت کی چنانچہ خود صریح نص اسکی ساتھ ناطق ہے۔ اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن ط واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اہانن ط کلا ترجمہ آدمی کا یہ حال ہے جب جانچے اسکو رب اس کا پھر اسکو عزت دے اور اس کو نعمت دے تو کہے میرے رب نے مجھے عزت دی اور جسوقت اسکو جانچے پھر تنگ کرے اسپر روزی کی تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا کوئی نہیں مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے یاد رکھو کہ مقبولیت و قرب کا مدار عیش پر اور مردودیت کا مدار تنگی پر نہیں بلکہ کبھی عیش و عشرت استدراج ہوتا ہے اور کبھی بلا مصیبت رحمت ہوتی ہے چنانچہ یہ بھی

ف خدا تعالیٰ کی عطاؤں کو مستمر دیکھکر رضا سمجھنا غلط ہے

۱۵۴

ف دنیا کا عیش علامت مقبولیت کی اور تنگی علامت مردودیت کی نہیں ہے

خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ہماری کوتاہی پر چرکہ لگا دیں۔ اس طرح سے امساک باراں بھی رحمت
ہے تاکہ کوتاہیوں سے باز آجائیں سرکشی کو چھوڑ دیں چنانچہ فرماتے ہیں لیذیقہم بعض الذی
عملوا۔ اگر اس کے بعد بھی تنبہ نہو اور متوجہ نہوں تو حقیقی غضب نازل ہوتا ہے چنانچہ
ارشاد ہے وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اہلہا بالباساء والضراء لعلہم یضرعون ۔ ثم بدلنا
مکان السیئۃ الحسنۃ حتی عفوا وقالوا قد مس اباءنا الضراء والسراء فاخذناہم بغتۃ وہم لایشعرون
ترجمہ۔ اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ پکڑا ہو وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف
میں شاید وہ گڑگڑائیں پھر بدل دی ہم نے برائی کی جگہ بھلائی (یعنی تکلیف کی جگہ آرام) یہانتک
کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ پہونچتی رہی ہمارے باپ داداؤں کو بھی تکلیف اور خوشی (یعنی
زمانہ کا انقلاب ہے اس میں طاعت و معصیت کا کیا دخل) پھر پکڑا ہم نے ان کو ناگہاں اور
وہ خبر نہ رکھتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ سختی اور تکلیف اس لئے بھیجتے ہیں تاکہ رجوع کریں جب
رجوع نہیں کرتے تو بجائے اسکے کہ اور تکالیف بھیجتے ان کے لئے راحت کا سامان کر دیتے
ہیں یہانتک کہ وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ سب مصیبت گناہ کے سبب نہ تھی کیونکہ دیکھو ہم
نے گناہ بھی کئے اور اب بھی کر رہے ہیں اور مصیبت خود ٹل گئی اور ہمارے باپ داداؤں
کے وقت میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ کبھی تکالیف ہوتی تھیں اور کبھی راحت یہی زمانہ کی
روش ہے ہم پر بھی گذر گئی دنیا کا یہی دور چلا آتا ہے اور کچھ بھی نہیں بس زمین سے تبخیر ہوئی
بارش ہوگئی تبخیر نہوئی بارش بند ہوگئی اگر گناہ پر مدار ہوتا تو اب بارش کیوں ہوگئی کیونکہ
ہم تو اب بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں پس یہ جو علماء کہتے ہیں کہ گناہوں سے مصیبت آتی
ہے غلط ہے اگر گناہوں سے مصیبت آتی تو ہمیں اب راحت کیوں پہونچتی۔ فاخذناہم بغتۃ
یعنی جب راحت کے سامان دیکھکر غافل ہوگئے تو ہم نے اچانک پکڑ لیا۔ یاد رکھو کہ مصیبت
بحیثیت متنبہ اور متوجہ کرنے کے نعمت ہے اور نعمت بحیثیت ڈھیل اور دہوکہ کے بھاری
مصیبت ہے اگر ایک دفعہ بارش ہوگئی تو نازمت کرو اور امساک ہوا تو اسکو سبب
مت خیال کرو بلکہ رحمت سمجھو کہ ایک تنبیہ لگی ہے سو ادہر سے سزا بھی رحمت ہے اور حق تعالیٰ کی
تو یہ شان ہے کہ ناامیدی پر بھی عطا فرماتے ہیں تو امید پر کیوں نہ عطا کرینگے اور آیت میں

من بعد ما قنطوا جو واقع ہے بظاہر سیاق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قنوط (نا امیدی) سبب ہے بارش کے لئے جیسے ایک دوسری آیت میں آیا ہے من بعد ما ہاجروا کہ وہاں ہجرت سبب ہے مغفرت کیلئے دونوں جگہ یکساں عنوان ہے سو سمجھ لیجئے کہ یہاں ایسا نہیں ہے کہ قنوط بارش کا سبب ہو بلکہ حقیقت میں تو وہ موانع میں سے ایک مانع ہے۔ اجابت میں اسکو کوئی دخل نہیں یہ جدا بات ہے کہ خدا تعالیٰ باوجود مانع ہونیکے پھر بھی نعمت کو نہیں روکتے صاحبو! اسوقت بھی بہت سے قلوب میں تردد ہے کہ دیکھئے نماز استسقاء سے بارش ہوگی یا نہیں اور یہ پہلے آچکا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک دل سے کہنا ایسا ہی ہے جیسے حاکم مجازی صرف الفاظ پر مطلع ہوتا ہے اور حاکم حقیقی ضمیر کو امید ہے معمولہ لکھو میرے استاذ ایک حکایت عالمگیر کے زمانہ کی بیان کرتے تھے کہ ایک راجہ کا انتقال ہوگیا تھا اس نے ایک لڑکا چھوٹا خوردسال اور راجہ کا ایک بھائی جوان تھا لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ عالمگیر بھائی کو راجہ بنا دینگے مگر وزیر اعظم کی رائے بیٹے ہی کو راجہ بنانے کی تھی اسلئے اس بچہ کو عالمگیر کے روبرو پیش کرنے کی رائے قائم کرکے شاید اسکو دیکھکر عالمگیر رحم کھا کر اسی کیلئے گدی تجویز کردیں اسکو اپنے ساتھ لے چلا اور تمام راستہ سکھاتا ہوا آیا کہ بادشاہ سلامت فلاں بات پوچھیں تو یوں کہنا اور اگر یہ دریافت کریں تو یوں جواب دینا جب قلعہ کے دروازہ پر پہونچے لڑکے نے کہا کہ ان باتوں کے علاوہ اگر اور کچھ پوچھا تو کیا کہونگا۔ وزیر اس سوال سے دنگ رہ گیا اور کہا کہ صاحبزادے جس خدا نے یہ سوال تجھے سکھلایا ہے ان باتوں کے جواب بھی وہی خدا سکھادے گا۔ غرض عالمگیر کو اطلاع ہوئی وہ حویلی میں تھے لڑکے کو بوجہ خوردسال ہونے کے اندر بلالیا اور اسوقت لنگی باندھے حوض کے کنارے پر غسل کیلئے کھڑے تھے لڑکے نے زنانہ میں جاکر عالمگیر کو سلام کیا بادشاہ نے مزاحاً اس لڑکے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر حوض کے مقابل کردیا اور کہا چھوڑدوں لڑکا قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا کہ آپ مجکو ڈوبنے سے کیا ڈراتے ہیں میں کیسے ڈوب سکتا ہوں آپ کی تو وہ شان ہے کہ کسی کی اگر انگلی بھی پکڑ لیں تو وہ ڈوب نہیں سکتا اور میرے تو دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھوں میں ہیں میں کیسے ڈوب سکتا ہوں عالمگیر اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور اسی کو راجہ بنا دیا اور بالغ ہونے تک وزیر

قنوط نہیں شرط بارش کیلئے جسطرح نہیں ہجرت شرط

قنوط ناامیدی بارش کیلئے سبب نہیں

۵۶ اکبر

کو مرپرست مقرر کر دیا۔ دیکھئے اس واقعہ میں تعلق اور وثوق و توکل ظاہر کرنے سے یہ اثر ہوا
حالانکہ یہ شاعرانہ نکتہ تھا اور حق تعالیٰ کے یہاں تو حقائق ہیں اور حقیقت میں وہ کیا عالمگیر تھے حقیقی
عالمگیر تو خدا تعالیٰ ہیں مگر اتنا معلوم ہوا کہ یہ عمل ہے کامیابی کا یعنی وثوق ظاہر کرنا بس تم بھی حسن ظن اور
قوت رجاء کو اپنا نقد وقت رکھو پھر ثمرہ دیکھو۔ بدوی خوب دعا مانگتے ہیں خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا
کرتے ہیں کہ مجکو بخشدے پھر کہتے ہیں ضرور بخشیگا کیوں نہیں بخشیگا جیسے کوئی لڑتا ہے یہ گمان نکرنا
چاہئے کہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں حدیث میں ہے ان اللہ یحب الملحین
فی الدعاء کہ اللہ میاں دعا میں الحاح کرنیوالوں کو دوست رکھتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ خود چاہتے
ہیں کہ ہم سے کوئی لے چنانچہ روزانہ شب کیوقت شہنشاہ حقیقی آسمان اول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں
اور فرماتے ہیں کہ کوئی ہے ایسا اور کوئی ہے ایسا جو ہم سے کچھ مانگے (کذا فی جمع الفوائد باب وقت الدعا
عن الستۃ الا النسائی) آسمان دنیا چھت ہے آپکے گھر کی شہنشاہ حقیقی گویا آپ کی گھر تشریف لاتے ہیں
اسوقت یہ کیفیت ہوتی ہے شعر امروز شاہ شاہان مہمان شدہ است مارا۔ جبریل با ملائک دربان
شدہ است مارا۔ کوئی کریم ایسا نہیں جو سائلوں کے گھر پر انکی حاجات کو دریافت کرنے آئے اگر
ایک دن ایسا کرے بھی تو ہر روز نہیں کر سکتا اور وہ ایسے کریم ہیں کہ ہر روز تشریف لاتے ہیں
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکا جی ہی چاہتا ہے کہ کوئی سوال کرے اور دے (جی میں نے مجازاً کہا
جیسے تعلیم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک میں ہے ورنہ خدا تعالیٰ جی سے پاک ہیں) مگر لینے کا بھی طریقہ
ہوتا ہے کریم کو ناراض کر کے نہیں لیا جاتا تو ان کو اپنی اطاعت سے راضی بھی رکھو اور ایک اور
کرم دیکھئے کہ جسقدر بھی نیک کام ہیں وہ سب ہمارے ہی کام ہیں ان کا نفع ہمارے ہی لئے ہے وہ خدا تعالیٰ
کے نفع کے کام نہیں اگر با ایں ہمہ پھر ان کو طلب کرتے ہیں اور نہ کرنے سے ناراض ہوتے ہیں جیسے
کوئی آقا باورچی سے ناراض ہو کر تو نے کھایا کیوں نہیں حالانکہ کھانا کام خود باورچی کا ہے اور
اس کا نفع بھی اسی کو ہے یہ غایت کرم کی دلیل ہے مثلاً نماز حقیقت میں ہمارا کام ہے اور اسکا
نفع ہمارے ہی لئے ہے خدا تعالیٰ کو کوئی نفع نہیں مگر پھر بھی ہمارے نکرنے پر ناراض ہوتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی یہ غایت کرم ہے اور اسکو حق اللہ یعنی خدا تعالیٰ کا کام
کہنا مجازاً ہے ہمارے اعمال نہ کرنے پر خدا تعالیٰ کا ناراض ہونا خود دلیل رحمت کی ہے مجھے بچپن میں

لگی اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا حالانکہ اسکے کھانے میں میرا ہی نفع تھا مگر پھر بھی میرے والد صاحب
اسمیں روٹی چور چور کر زبردستی مجھے کھلاتے یہی معاملہ اللہ میاں کا ہے کہ نماز مثلاً انکا کام نہیں
ہمارا کام ہے ہمارا ہی نفع ہے مگر پھر بھی حکم کرتے ہیں کہ کرو گویا زبردستی ہم کو نفع پہونچانا چاہتے ہیں
حالانکہ انکی کوئی غرض متعلق نہیں۔ زبردستی کھلانے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی وہ یہ کہ مراد آباد
میں ایک صاحب میری دعوت کرنا چاہتے تھے میں نے کسی عذر سے انکار کیا تو انہوں نے میرے
سامنے تفسیر کبیر رکھدی اور کہا کہ اس مقام پر مجھے کچھ پوچھنا ہے میں نے دیکھا تو اس جگہ دعوت
کے مسائل لکھے تھے میں نے کہا کہ آپ مجھپر حجت قائم کر کے دعوت کرتے ہیں یہ کیا تہذیب ہے
کہنے لگے کہ مجھے یہاں شبہ تھا اس لئے یہ موقع کھولا ہے ایک بزرگ مولوی روشن خاں صاحب
وہاں موجود تھے میں نے اس امر کی ان سے شکایت کی مجھسے کہنے لگے کہ خدا کا شکر کرو کہ لوگ
تفسیر دکھلا دکھلا کر اور حجت قائم کر کر کے دعوت کھلاتے ہیں میری کوئی دعوت کرے تو
جلدی سے منظور کر لوں۔ یہ حکایت بطور لطیفہ کے بیان کی خدا تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے کہ اگر
کوئی نہ لے تب بھی دیتے ہیں جیسے دوا پینے میں مریض ہی کا نفع ہے اگر نہ پئے اور ہلاک
ہو تو طبیب کا کچھ نہیں بگڑتا مگر کوئی طبیب اگر ایسا شفیق ہو کہ اس کے دوا نہ پینے پر ناراض
ہو اور کہے کہ تم نے دوا کیوں نہیں پی تو یہ غایت درجہ اس کا کرم ہے۔ یہی حال حق تعالیٰ کا ہے
کہ ہم اعمال کرنا نہیں چاہتے اور اپنے ہی حق میں کانٹے بوتے ہیں مگر وہ زبردستی کرانا چاہتے
ہیں اور ادھر سے روزانہ طلب ہے کہ بندے ہم سے مانگیں حدیث میں ہے لم یسئل اللہ یغضب
علیہ۔ کہ جو اللہ میاں سے سوال نہ کرے تو اللہ میاں اسپر غصہ کرتے ہیں مگر اب لوگوں نے یہ ذخیرہ
سیکھ لیا ہے کہ امساک باران تو ہو رہا ہے مگر نہ اعمال درست کرتے ہیں نہ موروثی زمین چھوڑتے ہیں
نہ پرائی زمین دبا لینے کا کچھ خیال کرتے ہیں نہ لڑکیوں کا حق دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ سب باتوں کو چھوڑ
کر بس ایک بات اختیار کر رکھی ہے کہ سیر سیر بھر اناج جمع کیا اور روٹی پکائی اور بانٹ دی اور لینے والے
کون آدھے کے تو مہتمم صاحب مالک اور باقی کے اپنے عزیز و اقارب وغیرہ مساکین کے نام کا کچھ بھی نہیں مثل
مشہور ہے اندھا بانٹے شیرنی اپنے اپنوں کو دے جھنجھانہ میں ایک شخص کے یہاں گیارھویں تھی دس آدمیوں کی
دعوت کی اور اسمیں بلائے گئے کون ڈپٹی تحصیلدار نائب تحصیلدار وغیرہ وغیرہ جب وہ کھانا کھا کر نکلے تو

۱۵

لوگوں کا عجیب ذخیرہ

ایک شخص نے کہا کہ جس نے مساکین نہ دیکھے ہوں وہ انکو دیکھ لے اول تو آجکل لنگر کی یہ حقیقت ہے دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ مستحقین ہی کو دیتے ہیں تو صرف اسی پر اکتفا کر نیسے کیا ہوتا ہے تاوقتیکہ پورا کام نہو اسکی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی کو دق کا مرض ہو کہ اس میں بخار تو ہوتا ہی ہے اسکے ساتھ سینہ میں جلن بھی ہو اور بھی ہو اور بھی عوارض لاحق ہوں کوئی شخص جملہ تدابیر کو نظر انداز کر کے صرف سینہ پر صندل کا لیپ کر دے تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ اسکو پورا فائدہ ہوگا ہاں سینہ کی سوزش کو نفع ہوگا کامل نفع کی صورت تو یہ ہے کہ سینہ پر صندل کا لیپ ہو اور پینے کیلئے ایک نسخہ ہو کوئی مناسب روغن دماغ کی مالش کیواسطے ہو اور کوئی چیز تقویت کی غرض سے ہو ہماری حالت تو یہ ہے جیسے مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت بیان کی ہے فرماتے ہیں کہ ہرچہ کردند از علاج و از دوا ؛ رنج افزوں گشت و حاجت ناروا ؛ ایک روحانی طبیب آیا اور اس نے کہا گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ؛ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند ؛ بے خبر بودند از حال دروں ؛ استعیذ اللہ مما یفترون ۔ یاد رکھو کہ نہ روٹی کھلانے سے کچھ ہوتا ہے نہ اناج بانٹنے سے ۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ عمل مبارک اور نیک نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کافی نہیں ہے سپاہی اور جرنیل فوج میں ہوتے ہیں مگر جرنیل اکیلا کچھ نہیں کر سکتا ۔ صدقہ کو بھی ضرور دخل ہے بارش میں مگر کافی نہیں ہے جب تک اسکے ساتھ دوسری چیزیں نہوں اصلی تدابیر امساک باراں کی اسکے سبب کا ازالہ ہے یعنی حق تعالیٰ کی ناراضی کا علاج کرنا وہ علاج کیا ہے ماضی سے استغفار اور توبہ اور آئندہ کیلئے اصلاح ۔ اسکے بعد وعدہ ہے وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ اور حق تعالیٰ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا اسیواسطے یہ مجمع ہوا ہے کہ نماز اور خطبہ ہو پھر استغفار و عزم اصلاح اور تضرع سے امید کے ساتھ دعا ہو اور دل سے پورا یقین ہو جانے کا ۔ عالم کا یہ کہنا کہ مانگو دلیل ہے اجابت کی یہ کیوں شبہ کیا جاوے کہ نہ معلوم حضور دینگے بھی یا نہ دینگے ۔ اگر دیر بھی ہو جاوے تو اس میں بھی حکمت سمجھیں اب دعا کیجیے کہ ہم لوگوں کے قلب میں اخلاص اور حضور قلب پیدا ہو اور اس کی توفیق ہو فقط ۔ اسکے بعد نماز اسکے بعد خطبہ اور دعا ہوئی بعد ازاں حضرت والا نے تھوڑا بیان اور بھی فرمایا جو ذیل میں منقول ہے ۔ ایک بات اور سن لیجیے سب صاحب وہ بات یہ ہے کہ اسوقت دعائیں مانگ کر بے فکر نہ ہونا چاہیے کہ ہم نے حق تعالیٰ کا پورا حق ادا کر دیا گویا انکے ذمہ قبول کرنا فرض ہو گیا اب کسی چیز کا انتظار نہیں یہ سخت غلطی ہے صاحبو دنیا میں اسکی مثال موجود ہے کہ حاکم کے یہاں ایک عرضی کافی نہیں سمجھی جاتی خواہ کتنی ہی خوشامد کی بھری ہوتی ہو بلکہ عادۃً انتظار کیا کرتا ہے کہ اسکی خواہش سچی بھی ہے یا ایک دن محض مضمون نگاری کی ہے اور اگر شوق اور ضرورت ہے

تو ایک عرضی پر بس نہیں کرتے بلکہ عرضی پر عرضی دیتے ہیں کبھی تھکتے نہیں۔ حدیث میں ہے ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے ان اللہ یستجیب ما لم یعجل قالوا وما العجلۃ قال ان یقول دعوت فلم یستجب لی او کما قال یعنی اللہ میاں
دعا کو قبول فرماتے ہیں جب تک جلدی نکرو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ جلدی کی حقیقت کیا ہے حضورؐ نے
فرمایا کہ جلدی یہ ہے کہ دعا کی مقبولیت میں دیر ہوئی تو اس نے خیال کر لیا کہ دعا تو قبول ہوتی نہیں اسلئے اس قصہ کو
جانے ہی دو دعا کرنا چھوڑ دی اسلئے معلوم ہوا کہ شرط عادی عطا کی یہ ہے جلدی نہ مچائیے مانگے جائیے اسلئے
پانچوں نمازوں کے بعد بھی اسی عجز و زاری کیساتھ مانگتے رہیے تنگ نہ ہوں اور اپنے ہر عمل کو شرع کی موافق درست
رکھیں۔ استعجال پر ایک قصہ یاد آیا ایک شخص کو جو میرے ملاقاتی تھے ایک بغدادی بزرگ نے فراخی رزق کا عمل
بتایا اور کہا کہ اسکے بعد ایک پری جبین آویگی اور کچھ بجاویگی وہ کہتے تھے کہ میں نے عمل پورا کیا اور اسکے آنیکا منتظر رہا جب
وہ نہ آئی اٹھکر تھیٹر میں چلا گیا میں نے مزاحاً کہا کہ وہ اسی وجہ سے نہ آئی کہ تم نے وظیفہ کے وقت نیکی اختیار
نہیں کی تھی۔ ہماری حالت بھی ایسی ہی ہے کہ یہاں تو تضرع و زاری کرتے ہیں اور وہاں جا کر معاصی میں
مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہمکو اس قسم کے قصوں پر تو ہنسی آتی ہے مگر اپنے حالات پر ہنسی نہیں آتی مثلاً ابھی جا کر
کھینگے کہ جیسے گئے تھے ویسے ہی آئے صاحبو! اس کا عقلی یا نقلی ثبوت کیا ہے کہ نماز استسقا سے فوراً اسیوقت
بارش ہو جاتی ہے۔ صاحب کلکٹر سے کوئی نہیں کہتا کہ ہم نے چار عرضیاں دیں کچھ جواب اب تک نہیں ملا آپ
دینگے یا نہیں۔ بس برابر نمازوں کے بعد دعا کرتے ہو یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ختم ہو جائے کیونکہ خدا تعالی
کا تعلق تو ساری عمر کا ہے چاہے ان کی طرف سے کچھ ظاہر نہ ہو تم اپنا انکسار مت چھوڑو تاخیر میں بھی
مصلحتیں ہوتی ہیں رہا یہ سوال کہ پھر وہ مصلحتیں کیا ہیں تو آپ کوئی پارلیمنٹ کے ممبر نہیں کہ آپکو وہ مصلحتیں
بتلائی جائیں یا آپ رائے دیں کہ ابھی بارش ہونی چاہیئے۔ چونکہ یہ اکثر ہوتا ہے کہ دعا مانگ کر بیٹھ گئے کہ مدان جب
اسکی بھی شنوائی نہیں تو جانے بھی دو اسلئے میں نے اس غلطی پر تنبیہ کر دیا یاد رکھو اسوقت زیادہ اندیشہ
ہوتا ہے حق تعالی کے غصہ کا کیونکہ پہلے تو یہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہماری خطا ہی ہے اب اس
طرف کی کوتاہی کا خیال ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ یہ حالت بہت اندیشہ ناک ہے کیونکہ خدا تعالی پر
یہ الزام ہے جو عبودیت کے قطعاً خلاف ہے اسلئے ضرور ہے کہ برابر مانگتے رہو۔ وہ اگر چاہیں بالمعنی العرفی
قبول کریں یا نہ قبول کریں تم اپنا منصبی کام پورا کرتے رہو کیونکہ بندہ کیلئے مناسب یہی ہے کہ ہمیشہ عجز و
انکسار ظاہر کرتا رہے اب دعا کرنا چاہیئے پس دعا ہوئی اور مجمع منتشر ہو گیا فقط۔

نوٹ:۔ اسکے بعد وعظ شکر العطاء کا ملاحظہ فرما لینا مناسب ہے فقط:۔ اشرف علی ۶ رشعبان سنہ ۱۳۵۱ھ

شرط عادی عطا کی جلدی نکرنا ہے اور ہماری حالت کی ایک خبر کا بیان

۱۶۰

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمی بہ

۱۶۱

شعبان فی شعبان

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

شعبان فی شعبان

این	متی	کم	کیف	ما	لم	من ضبط	من السامعون	المتفرقات
کس جگہ ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کیوں بیان ہوا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد تقریباً	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون بعد نماز جمعہ	۵ شعبان ۱۳۴۴ھ یوم جمعہ	[illegible]	بیٹھ کر			مولوی محمد یوسف صاحب بجنوری		

خطبہ ماثورہ اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا انتصف شعبان فلا تصوموا ۔ (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ والدارمی والترمذی کذا فی المشکوٰۃ) یہ ایک حدیث مختصر ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکم بیان فرمایا ہے ظاہراً تو اس کا تعلق شعبان سے ہے مگر واقع میں مقصود اس میں رمضان شریف کا ایک حکم ہے چونکہ شعبان کا وقت رمضان شریف کے متصل ہے اسلئے اس وقت بیان کے لئے اس حدیث کو اختیار کیا ہے آج کے وعظ میں بعض احکام شعبان کے متعلق اور بعض احکام رمضان کے متعلق مذکور رہیں گے ۔ لفظ کے اعتبار سے تو اس حدیث کا مضمون شعبان کے متعلق ہے اور معنی میں غور کیا جاوے تو یہ حدیث رمضان سے بھی تعلق رکھتی ہے ۔ آپ نے شائقین کیلئے

ایک نہایت کارآمد دستور العمل بیان ہوا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ طالب تمام مومنین ہیں
اسلئے وہ دستور العمل تمام مومنین کیلئے ہوگا کیونکہ ایمان کے حقوق میں سے یہ ہے کہ آدمی
ہمیشہ اللہ کی طلب میں لگا رہے اسلئے سب ہی مومنین طالب ہیں۔ سو جو حکم یہاں سے
مستنبط ہوتا ہے وہ باعتبار حکمت کے ایک دستور العمل ہے مومنین طالبین کا سو حاصل حدیث
کا دو مضمون ہیں ایک تو لفظوں کا مدلول ہے دوسرا معنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔
میں دونوں کو مختصراً عرض کرونگا بظاہری لفظوں کا مطلب تو یہ ہے کہ جب آدھا شعبان
ہو جایا کرے تو روزہ مت رکھا کرو یہ تو الفاظ سے اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے اور ترجمہ کا یہ حکم
تو متعلق شعبان کے ہے مطلب یہ ہے کہ نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنا مناسب نہیں اور
اس لا تصوموا میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ نہی تحریمی نہیں ہے بلکہ ارشادی ہے یعنی حضور صلی اللہ
علیہ وسلم مشورہ دیتے ہیں کہ نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنا مناسب نہیں اور ساتھ ہی
ساتھ غور سے دیکھا جاوے تو اسمیں نصف شعبان کے روزہ کے جواز کی طرف اشارہ ہے
کیونکہ یوں فرمارہے ہیں کہ اذا انتصف شعبان فلا تصوموا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب نصف شعبان
ہو چکے تو روزہ مت رکھو اور نصف شعبان ہو چکنے کا تحقق یوم وسط کے گذرنے سے
ہوتا ہے نہ کہ اس سے پہلے تو آگے کو روزہ رکھنے سے نہی ہوئی اور اس سے پہلے کی نہی نہیں
اور نصف سے پہلے میں خود یوم نصف شعبان بھی داخل ہے۔ تو اسمیں اشارہ ہوگیا عدم نہی
عن صوم یوم النصف کی طرف۔ رہا یہ کہ جب اس سے نہی نہیں ہے تو وہ جائز ہے یا مستحب سو
جواز اور استحباب فی نفسہ دونوں محتمل ہو سکتے ہیں اس کیلئے دوسری دلیل کی ضرورت ہے سو
دوسرے دلائل سے معلوم ہوا ہے کہ نصف شعبان کا روزہ مستحب ہے تو اب شعبان میں تین جزو ہیں
ایک خاص یوم نصف شعبان دوسرا اسکے قبل تیسرا اس کے بعد تینوں کا حکم جدا جدا ہے نصف
سے قبل کا روزہ تو جائز ہے یعنی بلا استحباب خاص اور بلا کراہت جیسے اور ایام کے روزے ہیں
ویسے ہی قبل نصف شعبان کے روزے ہیں ان میں تخصیص کوئی نہیں ہاں روزہ رکھنے سے ثواب
ملیگا اور نفس روزہ کی فضیلت حاصل ہوگی کیونکہ سوائے ایام منہیہ کے سب دنوں میں روزہ
رکھنا جائز ہے۔ دوسرا جزو خاص نصف شعبان جسکو پندرہ تاریخ کہتے ہیں اس کا روزہ

(۱۶۳)

ف
شعبان میں
تین جزو ہیں

مستحب ہے بس البعد النصف اس میں روزہ کی نہی ہے گو ارشادی سہی۔ حدیث میں نصف شعبان کے روزہ کی فضیلت کے ساتھ پندرھویں رات کی بھی فضیلت آئی ہے اور پندرھویں رات سے مراد وہ رات ہے جو چودہ تاریخ گذر کر رات آتی ہے اور وجہ اسکے پندرھویں ہونے کی یہ ہے کہ شریعت میں رات کو مقدم سمجھا گیا ہے دن پر اسلئے جب رویت ہلال شعبان ہو جاوے تو وہ رات شعبان ہی میں شمار ہوگی اسواسطے جو رات ۱۴ تاریخ کے ختم ہونے پر ہوگی وہ پندرھویں رات ہوگی راز اس کا یہ ہے کہ شریعت میں حساب مقرر ہے چاند سے اسلئے رات تاریخ کا جزء سابق ہے اب رہی یہ بات کہ حساب چاند سے کیوں لیا گیا ہے سورج سے کس واسطے نہیں رکھا گیا جیسا کہ اور لوگوں نے سورج سے حساب رکھا ہے تو راز اس کا یہ ہے کہ چاند سے حساب رکھنے میں سہولت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم شریعت سہلہ لیکر بھیجے گئے ہیں یہ تو ایک ظاہری حکمت ہے باقی اس شریعت میں جو برکات و اسرار ہیں وہ غامض بھی ایسے ہیں جو افلاطون کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتے اور ظاہری آثار سہل بھی ایسے ہیں کہ اتنی سہولت کسی اور طریق میں نہیں ہو سکتی دونوں پہلو پر نظر کرکے یہ شعر یاد آتا ہے ؎

سار عالم منش دل وجاں تازہ میدارند ٭ برنگ اصحاب صورت رابو ارباب معنی را

جیسے بعضے حسین کہ ان میں ظاہری آب و تاب اور دلکشی بھی ہوتی ہے گو سرسری نظر سے دیکھا جائے اور اگر تدقیق کیجائے تو باطنا بھی بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شریعت کی ایسی ہی مثال ہے کہ ظاہری حسن بھی ہے اور باطنی حسن بھی اور بعض وہ حسین ہیں کہ ظاہری آب و تاب تو ان میں ہے مگر تدقیق کی جائے تو ان میں حسن باطنی نہیں ہوتا نچنگی نہیں ہوتی ایک وہ ہیں کہ جوں جوں ان میں تدقیق کی نظر کیجائے دقائق حسن کے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں ظاہر بھی دلربا ہے اور باطن بھی ایسا جانفزا ہے کہ حد و حساب ہی نہیں شریعت غراء کے سارے احکام ایسے ہی ہیں چنانچہ میں جس کا ذکر کر رہا ہوں وہ بھی ایسا ہی ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شریعت میں جو چاند سے حساب رکھا ہے اسمیں یہ بھی راز ہے کہ اگر تمام لوگوں پر بھی سہو مسلط ہو جائے یعنی کسی کو بھی تاریخ یاد نہ رہے تو آفتاب سے کوئی ذریعہ تاریخ معلوم کرنیکا نہیں ہو سکتا اس سے عام شورش پھیل جائے اور چاند ایسی چیز ہے کہ اول تو

ف شعبان میں پندرھویں رات کی فضیلت ہے۔

ف شریعت میں چاند سے حساب رکھنے کا راز۔

۱۶۴

اس کی کمی اور زیادتی کو دیکھکر روزانہ تاریخ کا بھی اندازہ ممکن ہے اور اگر پریشانی بھی ہوگی تو ختم ماہ تک ہوگی چاند ہو جانے پر پھر حساب جاری ہو سکتا ہے بخلاف سورج کے کہ اسمیں یہ صورت نہیں ہو سکتی پس چاند کا حساب سہل ہے عامی تک حساب لگا سکتا ہے جو اس امت کے مناسب ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے نحن امۃ امیۃ لانکتب ولانحسب جو امر دوسروں کے نزدیک عیب ہے وہ اس امت کیلئے ہنر شمار کیا گیا ہے وہاں گھڑیاں جنتریاں آلات رسد کی ضرورت ہے یہاں ان بکھیڑوں کی حاجت نہیں یہاں افلاطون اور دیہاتی سب برابر ہیں یعنی سب آسانی سے حساب کر سکتے ہیں کوئی دقت ہی نہیں ایک اور دقیق حکمت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدائی احکام ہیں وہ یہ کہ اس میں تمام عالم کی رعایت ہے اور جس قانون میں رعایت تمام عالم کی ہو وہی خدائی قانون ہو سکتا ہے شریعت ہی ایسا قانون ہے جس میں تمام عالم کی رعایت ہے۔ مثلاً روزہ ہی ہے اگر اس کا حساب سورج سے ہوتا مثلاً مئی یا جون میں سے کوئی مہینہ اسکے لئے معین ہوتا تو جس موقعہ پر مئی جون میں گرمی ہوتی ہے اس جگہ روزے ہمیشہ گرمی میں رہا کرتے اور جہاں سردی ہوتی ہے وہاں سردی ہی میں ہمیشہ رہتے پس کسی جگہ کے باشندوں پر تو روزے ہمیشہ گرمی میں ہوتے اور کسی جگہ کے لوگوں کے لئے سردی ہی میں رہتے تمام عالم کے لئے سہولت تو اس میں ہے کہ جہاں اب گرمی میں تھے کبھی آئندہ ان کیلئے سردی میں ہو جائیں اور جس جگہ اب سردی میں تھے وہاں آئندہ گرمی میں ہو جائیں تاکہ ہر موسم کی حالت پیش نظر رہے اور یہ چاند کے حساب میں ہو سکتا ہے سورج کے حساب میں یہ صورت ممکن نہیں تمام عالم کے لئے سہولت ہونا یہ برکت باطنی ہے باقی تمام اسرار کا احاطہ کون کر سکتا ہے غرض پندرھویں شب وہ ہے جسکی صبح کو پندرہ تاریخ ہو اس رات کو قیام کرو اور دن کو روزہ رکھو حدیث میں اسکو تصریحاً بیان کیا گیا ہے اب رہی یہ بات کہ اس شب میں کونسی عبادت کرنا چاہیئے تو اسکی بابت حدیث میں کوئی عبادت خاص منقول نہیں کہ نوافل ہی پڑھے یا قرآن شریف ہی کی تلاوت کرے وغیرہ وغیرہ جونسی عبادت میں سہولت معلوم ہو اسکو جتنا کرے باقی بزرگوں سے جو کوئی خاص عبادت منقول ہے مثلاً بعض کا اپنے مریدین کو نوافل معین کر کے بتلانا تو یہ

ف: چاند کا حساب سہل ہے

ف: فرق بعض ہی

ف: ایسا قانون جس میں تمام عالم کی رعایت

ف: روزہ کا حساب چاند سے ہونے میں تمام عالم کیلئے سہولت ہے

۱۶۵

ف: پندرھویں شعبان میں کوئی عبادت خاص منقول نہیں اور بزرگوں سے جو منقول ہے

انہوں نے بعض کے اعتبار سے سہولت کا لحاظ رکھا ہے اور ان مریدین کے مناسب وہی عبادت ہوگی کیونکہ بعض اوقات اگر معین کرکے نہ بتلایا جاوے تو کام بسہولت نہیں ہوسکتا اس لئے بزرگوں نے ایک مناسب حال طریقہ تجویز کرکے بتلا دیا تعلیم تو اس بنا پر ہوئی تھی مگر مریدوں میں جاہل زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ عالم اول تو بہ نسبت جہلاء کے ہیں ہی بہت کم دوسرے وہ مرید بھی بہت کم ہوتے ہیں گو اب ہونے لگے ہیں اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ مولوی درویشی کے خلاف ہیں مولوی درویشی کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ کسی کو درویش کم سمجھتے ہیں اسلئے مرید بھی کم ہوتے ہیں۔

غرض جہلاء نے یہ سمجھ لیا کہ بس اس رات میں یہی عبادت متعین ہے دوسری نہیں سو یہ غلط ہے جو بات قرآن وحدیث سے ثابت نہ ہو وہ بدعت یا زندقہ ہے باقی بزرگوں کی طرف ہمیں حسن ظن ہے کہ انہوں نے قرآن وحدیث کے خلاف نہیں تبلایا بلکہ انہوں نے کسی خاص شخص کی مناسبت کے لحاظ سے اس کے لئے خاص طور پر اس طریق کو مناسب سمجھکر تبلا دیا ہوگا خوب سمجھ لو کہ اس رات میں کوئی عبادت خاص منقول نہیں خواہ وعظ سنو خواہ نوافل پڑھو خواہ تلاوت کرو اختیار ہے۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ صوموا نہارہا تو یہ امر بھی استحبابی ہے یعنی روزہ پندرہویں کا مستحب ہے فرض واجب نہیں غرض قوموا لیلہا سے اس رات کی فضیلت معلوم ہوگئی اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ میاں اس رات میں آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں (جس قسم کا نزول ان کی شان کے موافق ہو ہمارا جیسا نزول مراد نہیں) اور فرماتے ہیں ہل من داع فاستجیب لہ ہل من مستغفر فاغفر لہ صبح تک یہی کیفیت رہتی ہے اب ایک اور مدعا کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس کا ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ اس رات میں فضیلت ہے ایک دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس میں فضیلت ہوگی اس میں معصیت بہ نسبت دوسرے اوقات کے بہت بری ہوگی جیسے مکان کا حکم ہے اسی طرح زمان کا حکم ہے مثلاً ایک تو گناہ معمولی جگہ پر کرنا اور ایک مسجد میں کرنا مسجد میں گناہ کرنا زیادہ برا ہے اسی طرح ایک تو گناہ کرنا دوسرے اوقات میں اور ایک متبرک اوقات مثلاً رمضان شریف میں گناہ کرنا یہ بہ نسبت دیگر ایام کے بہت برا ہے اور یہ رات بھی متبرک ہے تو اس میں بھی گناہ اور اوقات سے اشد ہوگا اور جو گناہ اس رات میں کئے جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو کہ برنگ عبادت نہیں ہیں اس کا برا ہونا تو بالکل ظاہر ہے جیسے اس رات میں آتشبازی

۱۶۶

ف باری تعالیٰ کا نزول شعبان کی پندرہویں رات میں آسمان دنیا کی طرف

ف جو وقت بھی جتنا زیادہ فضیلت کا ہوگا اس میں معصیت بھی زیادہ قبیح ہوگی

ف جو گناہ اس شب میں کئے جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں

چھوڑی جاتی ہے جیسی وہی مثل ہے کہ گھر پھونک تماشہ دیکھ اس میں کبھی ہاتھ جل جاتے ہیں مال اور جان دونوں کا نقصان ہوتا ہے پس علاوہ معصیت ہونے کے اس میں دنیا کا بھی تو نقصان ہے دوسری قسم جو کہ معصیت برنگ عبادت ہے وہ کیا ہے بدعت چنانچہ اس رات میں ایک بدعت بھی عوام میں جاری ہے اگرچہ ہمارے یہاں نہیں ہے مگر بعض بڑھیاں اب بھی جاری کئے ہوئے ہیں جیسے حلوہ اور چونکہ بدعت میں مزہ بہت ہے اسلئے تاویلیں کر کر کے اسکو جائز کرنا چاہتے ہیں اور منع کرنے سے نہیں مانتے۔ غرض چونکہ اسکے اندر لطف ہے اور شیوع ہے اور چونکہ بدعت بھی ایک معصیت ہے اس شب بابرکت میں ان معاصی کا ارتکاب اشنع ہوگا۔

یہ اس ماہ کا دوسرا جزو ہے اور اس ماہ میں تیسرا جزو اور ہے یعنی نصف شعبان کے بعد کا جو زمانہ ہے جس کا ذکر اس حدیث میں ہوا ہے جسمیں روزہ کی ممانعت ہے جس کی وجہ معلوم کرنے کا شاید سامعین کو انتظار ہو کیونکہ آجکل اسرار کی تفتیش کا بہت زور ہے ہر حکم کے متعلق لوگ پوچھتے ہیں کہ اس حکم کی کیا وجہ ہے اور اس کی کیا علت ہے بعض لوگ تو یہانتک پوچھتے ہیں کہ سور کیوں حرام ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ غرض ہر چیز کی علت پوچھتے ہیں میں نے ایک شخص کو لطیفہ کا جواب دیا تھا اس نے لکھا تھا کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے میں نے جواب لکھا کہ آپ کے سوال عن الحکمۃ میں کیا حکمت ہے بتلایئے بس ختم ہو گئے تو میں ایسے سوالات کا جواب نہیں دیا کرتا اور علماء کو بھی اس سے منع کرتا ہوں بعض لوگوں کو ایسے سوالات کے جواب نہ ملنے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہم اگر علت دریافت کریں یا علماء خود ہی وجہ بیان کردیں تو کیا قباحت ہے آخر مجتہدین نے بھی تو احکام کی علتیں بیان کی ہیں تو بات یہ ہے کہ جب بندر آدمی کی نقل کریگا تو اسی کا کچلا ہو جاویگا چنانچہ ایک قصہ ہے کہ کسی جگہ بڑھئی لکڑی چیر رہے تھے قریب میں ایک بندر بیٹھا ہوا تھا وہ اتفاق سے کسی کام کو چلے گئے بندر کو نقل کی عادت ہوتی ہی ہے وہ اس لکڑی پر آکر بیٹھ گیا اور اس نے انکی نقل کرنی چاہی اس لکڑی میں لکڑی کی میخ ٹھکی ہوئی تھی تاکہ آرہ چلنے کی جگہ رہے اسکے بعض اعضاء (یعنی فوطے) اس لکڑی کے اندر آگئے اب جو بندر نے اسپر بیٹھکر زور کر کے میخ نکالی تو لکڑی کے دونوں پٹ آپس میں مل گئے اب یہ رہگئے تڑپتے ہوئے اتنے میں بڑھئی آگئے انہوں نے یہ حال دیکھکر خوب خبر لی سر کا کچلا ہو گیا کار بوزینہ نیست نجاری۔ تو صاحبو اسی طرح آپ مجتہدین کی نقل کرتے ہیں

یہ کیا ضرور ہے کہ جس نوع کا کام مجتہدین کرتے تھے وہ آپ سے بھی بن سکے۔ شعر

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر ۔ گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد ۔ کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد

ہمسری با انبیاء برداشتند ۔ اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

صاحبو اجمالاً اتنا سمجھ لو کہ بزرگوں کے اقوال کی تقلید کرنا چاہئے ان کے افعال کی نہیں کرنا چاہیئے باقی مولانا کے کلام میں جو یہ شعر ہے ؎

خلق را تقلید شان بر باد داد ۔ کہ دو صد لعنت بریں تقلید باد

جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تقلید بالکل ہوتی نہیں چاہیئے نہ قول میں نہ فعل میں چنانچہ بعضے غیر مقلدین اسکو استدلال میں پیش کیا کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا تقلید قولی پر لعنت نہیں کرتے بلکہ تقلید فعلی ہی پر کرتے ہیں چنانچہ اس قصہ میں تقلید فعلی ہی کا ذکر ہے اس کے بعد یہ شعر لائے ہیں تو لعنت بھی اسی پر ہے۔ اور کسی کا تو کیا ذکر ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی بھی تقلید علی الاطلاق نہیں ہے الا بعد تحقیق عدم الاختصاص تو اوروں کے فعل میں تو کہاں گنجائش ہوگی کیونکہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل آپکی ذات مبارک کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہو، اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک طبیب سنکھیا کھا رہا ہو اور ایک جاہل شخص اسکو دیکھکر سنکھیا کھانے لگے اگر کوئی اس سے کہے کہ تو سنکھیا کیوں کھاتا ہے وہ اس پر یہ جواب دے کہ فلاں طبیب کو میں نے سنکھیا کھاتے ہوئے دیکھا ہے اس لئے میں بھی کھاتا ہوں تو اسکو یوں کہا جائیگا کہ تجھکو اسکے فعل کی تقلید ہرگز درست نہیں کیونکہ طبیب سنکھیا کھائیگا تو اسکو ضرر نہ کریگا کیونکہ وہ اسکے کھانے کی تدبیر سے واقف ہے اور جاہل کھا کر تباہ ہوگا یہ مثال ہے تقلید فعلی کی۔ اب یہ کہنا غلط ہے کہ ہم تو بزرگوں کے فعل کی تقلید کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی احکام کی علل اور حکمتیں بیان کی ہیں اسی طرح ہم بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ تو اجمالی جواب ہے اور تفصیلی جواب یہ ہے کہ انہوں نے بضرورت تعدیہ حکم مسکوت عنہ کے حکم منطوق کی تعلیل کی ہے نہ کہ بلا ضرورت مصالح تراش کر ان کو احکام کی بنا قرار دیا ہے۔ پھر جو لوگ احکام کی علل اور حکمتوں کے درپے رہتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں جو علمارسی علل و حکمتیں

ف بزرگوں کے قول کی تقلید کرنا چاہئے فعل کی نہیں

۱۶۸

ف علل تلاش کرنے والے دو قسم کے ہیں

ف لطیفہ

دریافت کرتے ہیں دوسرے وہ ہیں کہ خود علل اور حکم بیان کرتے ہیں ان کی حالت ان سے
بھی زیادہ خطرناک ہے مجھے ایک لطیفہ یاد آیا وہ یہ کہ ایک صاحب نے سُوَر کی حرمت کی علت
بیان کی تھی کہ یہ اصل میں سوء ر ہے اور سوء کہتے ہیں برائی کو چونکہ اس میں برائی ہے اسلئے حرام
کیا گیا۔ آجکل ایسی علل بیان کی جاتی ہیں جسپر ہنسی آتی ہے ان صاحب سے پوچھئے کہ اس کا
یہ نام ہی کیوں رکھا گیا۔ اگر احکام تابع نام کے ہیں تو کوئی شراب کا نام شراب الصالحین رکھدے
تو کیا وہ حلال ہو جائیگی۔ اور تعجب یہ ہے کہ ایسی باتوں کی کتابیں جمع ہونے لگیں اور اول
تو زیادہ لوگوں کی یہی حالت ہے کہ خود علل و حکم بیان کرتے ہیں اور جو ان میں محتاط ہیں وہ
خیر پوچھ ہی لیتے ہیں اب رہا یہ اعتراض کہ فقہاء نے ایسا کیوں کیا تو اس کا جواب یہ ہے
کہ ان کو ضرورت پیش آئی تھی جیسا اوپر مذکور ہوا چنانچہ اسی حدیث میں جو حکم لاتصوموا ہے
اس کی علت فقہاء نے تلاش کر کے سمجھی کہ ضعف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے جو نصف اخیر شعبان میں روزہ سے نہیں فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسوقت روزہ
رکھنے سے کہیں ضعف نہ ہو جائے پھر اس سے رمضان کے روزہ میں خلل واقع ہو اسلئے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف شعبان کے بعد روزہ سے نہی فرمادی اب اس علت کے
معلوم ہو جانے سے اس کا درجہ بھی متعین ہو گیا وہ یہ کہ فی نفسہ روزہ حرام نہیں ایک
عارض کی وجہ سے ممانعت ہے اگر وہ عارض نہ پایا جاوے تو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہ ہوگا
مثلاً کسی کو ضعف نہ ہوتا ہو اور وہ عادی ہو ان ایام میں روزہ رکھنے کا اور روزہ رکھنے سے کوئی اثر
معتد بہ رمضان میں واقع نہ ہو تو اسکو رکھنا جائز ہوگا چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رمضان شریف سے
دو تین روز قبل روزہ نہ رکھے مگر جسکی عادت ہو حاصل یہ کہ ایک تو مجتہدین کو ضرورت تھی درجہ
معین کرنے کی اسلئے علل بیان کی ہیں اور ایک ضرورت حکم کے تعدیہ کرنے کی پیش آتی تھی
تعدیہ کی وجہ یہ ہوئی کہ قرآن و حدیث میں کلیات بیان ہوئے ہیں اور بہت سے جزئیات
کی تصریح نہیں ہے اب ان جزئیات کا حکم کس طرح معلوم ہو اسلئے فقہاء نے احکام کی علل
بیان کیں کہ جس جگہ وہ علل پائی جائیں گی حکم بھی پایا جاویگا اس طریقہ سے جزئیات کا حکم نکل
آئیگا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتہاد کی اجازت قرآن و حدیث سے ثابت ہے کیونکہ

ف فقہاء کے علل بیان کرنے کی وجہ

۱۶۹

ف اجتہاد کا ثبوت

اگر اجتہاد کی اجازت نہ ہوتی تو قرآن و حدیث میں کلیات مذکور نہ ہوتے بلکہ جزئیات مذکور
ہوتے پس کلیات کا مذکور ہونا اور جزئیات کا زیادہ مذکور نہ ہونا اجازت اجتہاد کی دلیل ہے ورنہ
بتلاؤ پھر اس صورت میں جزئیات کا حکم کیسے معلوم کیا جاویگا یہ دلیل منکرین پر بڑی حجت ہے تعجب
ہے کہ وہ ایسے صریح مقدمات کے نتیجہ سے انکار کرتے ہیں اور اس اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ غیر
منصوص پر منصوص کا حکم جاری کیا جاتا ہے بوجہ اس تشابہ کے جو دونوں میں پایا جاتا ہے جو اشتراک
ہوتا ہے کسی وصف میں جس غیر منصوص میں وہ وصف پایا جاویگا منصوص کا حکم وہاں بھی متعدی
کیا جاویگا۔ اس طرح سے جزئیات غیر منصوصہ کا حکم معلوم ہو جاویگا یہ صورت ہے تعدیہ کی
پس مجتہدین کو تو بیان علل کی یہ ضرورت پیش آئی ہمیں کیا ضرورت ہے کیونکہ انکو احکام مدون
ہو چکے ہیں ہاں ہم اب بھی ان جزئیات میں اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں جو مدون نہیں۔ مگر ان جزئیات
غیر مدونہ میں بھی ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ وہ اس کا محل نہ ہو۔ اسی
جزئی غیر مدون کی ایک مثال آجکل ہوائی جہاز ہے کہ پہلے یہ تھے ہی نہیں۔ اسکے بارہ میں
میرے قلب میں یہ خیال آیا تھا کہ اسکو پانی کے جہاز پر قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ آبی جہاز
مستقر ہے زمین پر اگرچہ بواسطہ ہی اس طرح کہ پانی جہاز کو اٹھائے ہوئے ہے اور پانی کو زمین
اٹھائے ہوئی ہے تو اس پر نماز گویا زمین پر پڑھنا ہے اور ہوائی جہاز کو ہوا پر استقرار نہیں ہے نہ ہوا کو
زمین پر استقرار ہے چنانچہ ظاہر ہے تو پھر اس پر نماز کیسے جائز ہوگی اب ضرورت ہوگی اجتہاد کی میں نے
ایک تحریر میں اس کا جواب لکھا ہے اور ہوائی سفر میں قصر کا مسئلہ بھی لکھا ہے یہ میں نے اسلئے کہا ہے کہ
علماء اس جانب توجہ کریں۔ آجکل تو یہ غضب ہے کہ احکام منصوصہ تعبدیہ کی بھی حکمت پوچھتے ہیں
اور بزعم خود بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں سو یہ اول تو تقلید نہیں دونوں کا فرق اوپر ظاہر کر چکا
ہوں اور اگر تقلید ہی فرض کیجاوے تو تقلید قولی چاہیے فعلی نہیں چاہیئے جو شخص کسی ضرورت سے
پلاؤ کا پکانا سیکھتا ہو اور پکانا نہ جانتا ہو اسکو ضرورت ہوگی ترکیب سیکھنے کی یہ ضرورت پیش
آتی ہے مجتہد کو باقی جسے کھانا ہی ہو اسکو پکانیکی ترکیب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے یہ حالت ہماری ہے سو
ہمیں عمل کیلئے احکام معلوم کرنیکی ضرورت ہے علت یا حکمت دریافت کرنے کی کوئی ضرورت
نہیں علاوہ اسکے اسمیں ایک ضرر بھی ہے وہ یہ کہ علت حکمت معلوم ہو جانے کے بعد طاعت کی عظمت

(حاشیہ) ۱۴۰ ن جزئی غیر مدون کی ایک مثال آجکل ہوائی جہاز ہے

جواب طلب امر ... [illegible]

کا وہ اثر قلب پر نہیں ہوتا جو بدون اسکے معلوم کئے عمل کرنے سے ہوتا ہے پس تم احکام کی حکمت معلوم کر کے اس عظمت کو کیوں کھوتے ہو اور اگر ایسا ہی علم اسرار کا شوق ہے تو اسکی بھی یہی صورت ہے کہ پہلے بدون معلوم کئے ہی عمل شروع کر دو کام کرتے کرتے برکات و اسرار خود ہی محسوس ہونے لگتے ہیں ابتداً تو کچھ بھی نہیں ہوتا اگر تم نماز اس طرح پڑھو جسکا نام نماز ہے تو اکثر اس کے اسرار بھی معلوم ہو جاتے ہیں گو مقصود نہیں مگر یہ ابتدا ہی سے نہیں ہو سکتا دیکھئے بنئے کا بچہ جسوقت ہوش سنبھالتا ہے تو بنئے اسی وقت سے اسکو کمانا سکھاتے ہیں مثلاً اس کو اول ہی سے حلوا وغیرہ بیچنا شروع کرا دیتے ہیں۔ مگر اس حالت میں اسکو کچھ بھی مزہ نہیں آتا بلکہ اسکو کلفت معلوم ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ اسی خیال سے کراتے ہیں کہ آئندہ اسکو مزہ آویگا پھر آہستہ آہستہ اور کام اسکے سپرد کرتے ہیں پھر ایک وقت اسپر ایسا آتا ہے کہ اسکو مزہ آنے لگتا ہے اور اس کام کے اسرار خود ہی کھلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس کام کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتا صاحبو! اسی طرح تم بھی کام کرتے رہو کام خود برکات کو نمایاں کر دے گا جس کام پر مداومت مع اسکی شرائط کے کی جاتی ہے خود وہ عمل ہی اپنی حقیقت بتلا دیتا ہے جب تم پر کام کرتے کرتے برکات منکشف ہونگے تو کام لینے والوں کو دعا دوگے چنانچہ میرے دل سے والد ماجد صاحب کیلئے دعا نکلتی ہے کہ وہ ہمیں دین پڑھا گئے تھے اب اسکے برکات محسوس ہوتے حالانکہ جسوقت ہم نے عربی شروع کی تھی اور فال فالا فالوا کی گردان کرتے تھے تو بڑی تنگی اور کلفت ہوتی تھی اب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے چنانچہ میری تائی صاحبہ کہ انہوں نے مجھکو پرورش کیا تھا ایک روز کہنے لگیں کہ تجھے یاد بھی ہے کہ تو یوں کہا کرتا تھا کہ تائی عربی نکلے چربی تو واقعی ایک وہ وقت بھی تھا اور اسوقت اس کی قدر و منزلت معلوم نہ تھی مگر والد صاحب کے حکم سے ہمیں لگے رہے تو خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب کتابوں کے پڑھنے کا نام ہو گیا۔ گو جسے علم کہتے ہیں وہ اب بھی حاصل نہیں ہوا مگر اس ناتمام ہی علم پر بے انتہا خوشی ہوتی ہے اور والد صاحب کیلئے دعا نکلتی ہے حضرت یہی حالت ہر عمل کی ہے کہ ابتدا میں تو تنگی پیش آتی ہے اسوقت نہ اسرار و برکات منکشف ہیں نہ معانی کی قدر دل میں ہوتی ہے پھر جب مداومت کیجاتی ہے اور اسرار و برکات کھلتے ہیں تو راہ پر لگانے والوں کے حق میں دعا نکلتی ہے بس کام کرنا حکمتوں کے معلوم ہونے پر موقوف

نہیں بلکہ حکمتیں معلوم کرنا عمل پر موقوف ہے حکمتیں تو مداومت سے خود معلوم ہوجاویں گی
اس کی ایسی مثال ہے جیسے نابالغ بچہ سے کہا جائے کہ شادی کرلے تو وہ اسکو مصیبت سمجھیگا اور کہیگا
کہ کون گلے میں طوق ڈالے اگر اسکی شادی کر بھی دیجائے تو بی بی کی صورت دیکھکر ہی گھبرائیگا
مگر جب قبلا جوانی کا سرسراہٹ اٹھے گا اور شادی کے اسرار معلوم ہونگے تو شادی کرنیوالوں کو دعا
دیگا حضرت نماز روزہ کرنیوالے بھی بالغ نہیں ہوئے ابھی تو یہ حالت ہے شعر

خلق اطفالند جز مستِ خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

بزرگوں نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ بالغ طبی وہ ہے کہ جسمیں سے منی نکلنے لگے اور طریق کا بالغ
وہ ہے جسمیں سے منی نکل جاوے (یعنی خودی) یہ معنی ہیں نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا کے پھر تو یہ
حالت ہوتی ہے کہ بی بی کے لئے محنت مشقت سے کمانا بھی لذت ہے حتی کہ اسکے لئے جہنم میں
بھی جانا لذت ہے اس طرح سے کہ اسکی خوشی کے واسطے خدا تعالی کو ناراض کرتے ہیں کہ بلا سے
فلاں کام سے خدا ناراض ہوگا بی بی تو خوش ہوگی اب بھی تو یہ وہی بی بی ہے جسکو یہ پہلے ڈائن
خیال کرتا تھا پس معلوم ہوا کہ آدمی ذہن کا کام کرتا رہے پھر لذت بھی آنے لگتی ہے پھر تو ایسی
دل چسپی ہوتی ہے کہ اسکے سامنے سلطنت کی بھی پروا نہیں کرتا یہاں ایک نکتہ قابل بیان ہے
وہ یہ کہ شاید اس مضمون کو سنکر حسرت ہوتی ہوگی کہ یہ درجہ ہمکو نصیب ہونے کی کیا امید ہے
سو میں بشارت دیتا ہوں کہ بحمداللہ یہ درجہ ہر مسلمان پابند نماز کو حاصل ہے خیر سلطنت تو
کون دیتا ہے کس کے قبضہ میں ہے جسکے ملنے نہ ملنے کے وقت اس درجہ کا موازنہ ہوسکے مگر یہ
صورت تو ممکن ہے کہ کوئی یوں کہے کہ تم ایک وقت کی نماز چھوڑ دو ہم تمہیں دس ہزار روپیہ دینگے
تو واللہ نمازی آدمی ان پر پیشاب کر دیگا جسکو نماز کی عادت ہے وہ کبھی اسپر راضی نہوگا پھر
بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو نماز میں مزہ نہیں آتا تو اس مثال نے تمہارے قول کو غلط کر دیا کیونکہ
اگر مزا نہیں آتا تو اس ہزار روپیہ پر اسکو کیوں ترجیح دی گئی کچھ تو مزا ہے جسنے اپنی طرف
کھینچ لیا اگر کہو کہ خدا کا خوف اس کا باعث ہوا ہے میں کہتا ہوں کہ اگر صرف خدا کا خوف ہی اس کا
باعث ہوتا تو ایسا نمازی زنا میں کیوں مبتلا ہوجاتا ہے غیبت کیوں کرتا ہے وہاں خوف

ایک جگہ منی عربی ہے دوسری جگہ فارسی ہے [illegible]

۱۷۲
ن
طاعت پر
مداومت کرنے
سے ایسی دلچسپی
ہوجاتی ہے
کہ اسکے روبرو
سلطنت ہیچ
معلوم ہوتی
ہے۔

کہاں چلا گیا معلوم ہوا کہ یہاں صرف لذت مانع ہوئی ہے نماز کے عدم ترک کی۔ یہ تو ہم جیسوں کی نماز کا حال ہے باقی حقیقی نماز کا تو کیا کہنا ہے اس کی تو یہ حالت ہے شعر

جُرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

حب ہی تو خدا تعالیٰ نے عام مومنین کیلئے یہ فتویٰ دیا ہے والذین آمنوا اشد حبا للہ شدت حب عشق ہے اس میں سب مومنین کو عاشق فرمایا ہے۔ ایک رئیس کی حکایت ہے کہ انہوں نے مولانا مظفر حسین صاحبؒ سے سوال کیا کہ مولانا حدیث میں ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ماں باپ اور سب سے زیادہ نہ ہو تو مومن نہیں ہوتا سو یہ درجہ تو محبت کا ہم اپنے دل میں نہیں پاتے۔ مولوی صاحب نے اس کا عملی جواب دیا وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا تذکرہ شروع کیا پھر اسکو بند کر کے یہ کہنے لگے کہ آپ کے والد صاحب بھی بہت اچھے آدمی تھے اور انکی خوبیوں کا ذکر شروع کر دیا۔ رئیس صاحب جھلا کے کہنے لگے کہ حضرت میرے والد کا ذکر کہاں داخل کر دیا مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں نے آپ کی بات کا جواب دیا ہے کہ اگر آپ کو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باپ سے زیادہ محبت نہیں تو حضورؐ کے کمالات کے درمیان میں باپ کا ذکر کیوں ناپسند ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی محبت باپ سے زیادہ ہے۔ رئیس صاحب کی آنکھیں کھل گئیں شبہ رفع ہو گیا میں کہتا ہوں کہ عاصی سے عاصی کو بھی محبت شدیدہ ہے اللہ و رسول کی مگر اس کا اظہار موقع پر ہوتا ہے۔ صاحبو! تمہارے اندر سب مادے موجود ہیں مگر ان کے صاف کرنے کی ضرورت ہے جیسے سونا زمین ہی سے نکلتا ہے مگر سونے کے ٹکڑے نہیں ہوتے بلکہ اسکے ذرے مٹی میں ملے ہوتے ہیں ان ذروں کو مٹی سے صاف کر کے اور پگھلا کر سونے کے ڈھیلے بناتے ہیں ایسے ہی اپنے کو صاف کر کندن نکل آویگا اپنے کو بے دولت مت سمجھو تم دولت مند ہو اسلئے تمہیں دریوزہ گری کی ضرورت نہیں تمہارے اندر سب کچھ موجود ہے اور تمہاری وہ حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر　　تو ہمی جوئی لب ناں دربدر

تمہاری اپنی مثال ہے جیسے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے ایک گھر خریدا اسکی

دیوار میں ایک گھڑا سونے کا گڑا ہوا تھا مگر اس شخص نے اسکو کھودا نہیں اسوجہ سے کہ دیوار میں گڑھا ہوجائیگا حالانکہ اسکو چاہیے تھا کہ گھڑے کو نکال لیتا کیونکہ اسکے مل جانے سے ویسے ویسے دس گھر بنجاتے اور گڑھا ہونے کا خیال لغو تھا اسی طرح یہ جسم ایک دیوار ہے اور اسکے اندر سونا ہے اسکو نکال کر پھر جسم کو ویسا ہی بنا لینا اور اسکی یہ صورت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں شعر

صحت این حس ز معموری تن　　　صحت آن حس ز تخریب بدن

پہلے اپنے جسم میں گڑھا کرو اسکو مجاہدات سے دبلا کرو اسکے بعد سونا نکلیگا مگر اس تخریب کی بھی ایک حد ہے جسکو جاننے والے بتا سکتے ہیں بہرحال انسان کے اندر سب خزانے موجود ہیں انکو ظاہر کرنے اور صاف کرنے کی ضرورت ہے بس یہی نماز اور یہی روزہ جسکو ہم بیکار سمجھتے ہیں بڑی دولت ہے بعض لوگ کہدیا کرتے کہ کیا ہماری نماز اور کیا ہمارا روزہ یہ کہنا واہیات بات ہے۔ بہت تواضع بھی اچھی نہیں ہوتی ناشکری ہوجاتی ہے۔ حد سے زیادہ تواضع پر ایک حکایت یاد آئی ہیں الہ آباد سے کانپور کا سفر کررہا تھا اسی درجہ میں چند جنٹلمین بیٹھے تھے ان میں بیچارے منصف بھی جو اس مجمع کے نخشے آبیٹھے چونکہ بہت سیدھے سادے تھے انہوں نے خواہ مخواہ ان لوگوں کی کمیٹی میں داخل ہونا چاہا چونکہ سیدھے تھے ان جنٹلمینوں نے انکو کمیٹی میں داخل کرکے ان کی خوب گت بنائی (خوب مذاق اڑایا) چنانچہ کھانا کھاتے میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ آئیے آپ بھی گوہ موت کھا لیجئے دوسرے جنٹلمین نے اسکو ٹوکا اور کہا کہ آپ کھانے کو گوہ موت سے تعبیر کرتے ہیں جنٹلمین صاحب بولے کہ حضرت ہمارا کھانا اس حیثیت سے کہ ہمارا ہے اسکو کھانا نہ کہنا چاہیئے یہ تکبر ہے بھلا ہم میں کہاں لیاقت ہے آپ کو کھانا کھلانے کی بس تواضعاً اسے گوہ موت ہی کہنا چاہیئے تو جیسی یہ تواضع تھی ایسی ہی ہماری تواضع ہے جو کہدیا کرتے ہیں کہ ہماری نماز اور روزہ کیا ہے کچھ نہیں۔ بات یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی تواضع بھی اچھی نہیں ہوتی پس اپنے نماز روزہ کو یہ خیال کرنا کہ ہمارا نماز روزہ کس قابل ہے گو تواضعاً ہی ہو اچھا نہیں۔

حضرت یہ نماز روزہ عطا ہے حق تعالیٰ کی۔ ہم میں تو قابلیت اتنی بھی نہیں کہ ایمان بھی نصیب ہو یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی نعمت ہیں خدا کے ذمہ آپکا چاہتا ہی کیا تھا کہ جو یہ عطا ہوئی یہ سب

ف نماز روزہ بڑی دولت ہے ۱۲۴
ف حد سے زیادہ تواضع اچھی نہیں اسکے متعلق ایک حکایت

حقیقت ناشناسی ہے بس یہ سب نعمتیں بھی ہیں اور واقعی ان چیزوں میں لذت بھی ہے کرکے دیکھو۔ حکمت معلوم ہونے کے درپے نہ ہونا چاہیئے وجہ اس کی وہی ہے جو ابھی مذکور ہوتی تھی کہ عام لوگوں کو حکمت معلوم نہ ہونے سے احکام کی عظمت زیادہ ہوتی ہے یعنی جو محض خدا کا حکم سمجھکر کرتا ہے اسکے قلب میں وقعت ہوتی ہے اعمال کی مولانا فرماتے ہیں شعر

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست لیک عشق بے زباں روشن ترست

وہی سچا عاشق ہے جو علل وحکم کے درپے نہ ہو باقی مجتہدین اس سے مستثنے ہیں کیونکہ وہ عمل شروع کرنے کی حکمت تلاش نہیں کرتے نہ علت پر عمل کو موقوف رکھتے ہیں بلکہ تعدیہ واستنباط احکام کیلئے علل دریافت کرتے ہیں بہرحال فرق معلوم ہو گیا مجتہدین میں اور ہم میں پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نہی فرمائی بعد نصف شعبان کے روزہ رکھنے سے گو اس کی حکمت معلوم کرنے کی ضرورت نہیں جیسا مفصلاً مذکور ہوا لیکن اگر تبرعاً بزرگوں کے قول کو نقل کردیا جاوے اس طرح سے کہ عمل کا موقوف علیہ نہ ہو تو مضائقہ بھی نہیں سو وہ حکمت یہ ہے کہ نصف شعبان کے بعد روزہ نہ رکھنے سے قوت حاصل ہوگی رمضان پر۔ اور اس حکمت سے اسکا درجہ بھی متعین ہوگیا کہ نہی ارشادی ہے۔ دوسرے اس حکمت پر نظر کرکے اس سے ایک عام مسئلہ مستنبط ہوگیا وہ یہ کہ رمضان کے لئے پہلے سے آمادہ ہوجانا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ تیاری عظیم الشان کی عظیم الشان ہی ہوتی ہے تو اسکے لئے بہت ہی اہتمام کرنا چاہیئے اور یہی مطلب تھا اس کا جو میں نے پہلے بیان کیا تھا کہ ظاہری تعلق حدیث مذکور الصدر کا شعبان سے ہے مگر حقیقت میں چونکہ اسکا تعلق رمضان سے بھی ہے اسلئے اسکو بھی بیان کروں گا سو اب میں اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں حاصل یہ ہے کہ حکمت بعد نصف شعبان کے روزہ نہ رکھنے میں تقویت ہے رمضان پر ذرا غور کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے احکام میں بہت ہی سہولت کی ہے مثلاً یہ کہ رمضان شریف کے روزوں میں صعوبت ہوتی تو فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے کھا پی لو تاکہ رمضان میں آسانی ہو اور اسکے لئے تیار رہو اور یہ آسانی اسی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام احکام میں سہولت کی رعایت کی گئی ہے دیکھئے خاص رمضان شریف میں بھی حکم ہے کہ افطار میں تعجیل کرو اور سحری تاخیر سے کھاؤ تاکہ بھوکا رہنے کا زمانہ کم ہو جاوے ظاہر ہے کہ جب افطار میں جلدی

ہوگی اور سحری دیر کرکے کھائی جائیگی تو ترک غذا کا زمانہ کم ہوگا بخلاف اس کے کہ افطار میں دیر کا حکم ہوتا اور سحری میں تعجیل ہوتی تو زمانہ بھوکے رہنے کا طویل ہو جاتا سو ایسا نہیں ہوا بلکہ سہولت کی رعایت فرمائی گئی اور دیکھئے کہ ہمارے لئے صوم وصال سے نہی فرمائی اسمیں بھی کتنی سہولت ہے ورنہ کیسی دقت پیش آتی تو دیکھئے سہولت کی کیسی دقیق رعایت کی ہے غرض شریعت میں ظاہری و باطنی دونوں حکمتیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے حفظ حدود کا بڑا ہی اہتمام کیا ہے اور تصوف کا حاصل بھی یہی حفظ حدود ہے ع گر حفظ مراتب نکنی زندیقی۔ چنانچہ گو روزہ ایک عبادت مقصودہ ہے اس میں جتنا امتداد ہوتا بعید نہ تھا مگر اس کی بھی ایک حد ہے میں اسکو کہاں تک بیان کروں شریعت کے ہر حکم میں حکمت ہی حکمت ہے دیکھئے حدیث میں ہے کہ اگر اوراد میں نیند آجائے تو سو رہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلیرقد ارشاد فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا کہ اگر نیند آجاوے تو آنکھوں میں مرچیں بھر لو تاکہ نیند جاتی رہے اور ایسی عبادت کس کام کی جسمیں نفس کو بیحد مشقت میں ڈالا جاوے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ وہاں دو ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت زینب نے باندہ رکھی ہے جب انکو عبادت کرتے کرتے نیند آنے لگتی ہے تو اس سے سہارا لگا لیتی ہیں آپ نے فرمایا کہ اسکو توڑ دو حضرت مولانا گنگوہی سے کسی نے پوچھا کہ ورد پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے تو کیا کرنا چاہئے فرمایا کہ تکیہ پر سر رکھکر سو رہو۔ جب طبیعت ہلکی ہو جاوے پھر پڑھنے لگو۔ اور اگر نیند کو زبردستی دفع بھی کیا جاوے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے صفرا میں اشتعال بڑھ جاتا ہے سودا میں ترقی ہو جاتی ہے خیالات فاسدہ آنے لگتے ہیں اور بعض اوقات وہ انکو الہام سمجھکر اپنے کو بزرگ جاننے لگتا ہے آخر یہ ہوتا ہے کہ جنون ہو جاتا ہے خود حضرت مولانا گنگوہی نے ایک ذاکر شخص کو تقلیل منام وطعام سے منع فرمایا تھا اور وہی اس کے لئے مصلحت تھا مگر اس نے کہنا نہ مانا آخر جنون ہوگیا ان ہی شخص کو اخلاط میں اشتعال ہونے سے سنہری حروف میں کچھ عبارتیں نظر آنے لگی تھیں اور وہ اسکو کمال خیال کرتا تھا مولانا نے فرمایا کہ انکو جنون ہونیوالا ہے آخر ایسا ہی ہوا۔ اس راہ میں بدون رفیق کے کام نہیں چلتا

ف سالک۔ تصوف کا حاصل۔

ف اوراد میں نیند آجاتے تو کیا کرنا چاہئے۔

ف نیند کو زبردستی دفع کرنیکا برا انجام۔

ف سلوک میں بے رفیق کام نہیں چلتا۔

شعر بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق — عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

یار باید راہ را تنہا مرو — بے قلاؤزاندریں صحرا مرو

ہر کہ تنہا نادر ایں راہ برید — ہم بہ عون ہمت مردان رسید

اکثر سونے کا انجام خشکی ہوتی ہے اور اس سے انسان کو ایسے امراض گھیر لیتے ہیں کہ آدمی پھر کسی کام کا نہیں رہتا جو شخص مجھ سے شکایت کرتا ہے کہ نیند بہت آتی ہے تو میں کہدیتا ہوں کہ سو رہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند کی بہت رعایت کی ہے ہاں قصداً غفلت نکرو باقی نیند کے بارہ میں تو ارشاد ہے لاتفریط فی النوم ہاں جاگنے کے بعد اٹھ کھڑا ہونا چاہیئے پھر اس میں بھی زیادہ مرو کھپو مت ورنہ یہ کیفیت ہو جائیگی کہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے یعنی چند دنوں ذکر و شغل کرکے عمر بھر کو بیٹھ جاؤ گے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ سبق اتنا یاد کرو کہ تھوڑا شوق باقی رہجائے مگر یہ مطلب نہیں کہ غافل ہو جاؤ حج میں دیکھو کیسی سہولت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا استطاعت کی قید لگادی یہ نہیں کہ استطاعت نہ ہو جب بھی حج فرض ہے غرض شریعت کے ہر حکم میں سہولت ہے میں دعویٰ کیسے کہتا ہوں کہ کسی نے اتنی سہولت نہیں کی جتنی اللہ و رسول نے کی ہے اور جہاں بظاہر دشواری معلوم ہوتی ہے اس کی غرض بھی سہولت ہی ہے غرض ہر حکم میں سہولت ہی کی رعایت ہے چنانچہ اسی اصل پر فرماتے ہیں اذا انتصف شعبان فلا تصوموا مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ میں سہولت کی رعایت رکھو تاکہ اس سے نفرت نہ ہونے لگے ایک شخص نماز پڑھتے تھے اور حضور قلب کا اہتمام کرتے تھے مگر اس کی حقیقت نہ سمجھتے تھے اسلئے اس میں بہت مشقت اٹھاتے تھے اسکا یہ نتیجہ تھا کہ بجائے اسکے کہ نماز کے وقت فرحت ہو انکو بڑی کلفت پیش آتی تھی کہ مصیبت آ ئی میں نے انکو حضور قلب کی حقیقت بتلائی جس سے اسکی سہولت ثابت ہوئی تب ان کی وہ حالت موقوف ہوئی میں اسوقت بھی فائدہ عامہ کیلئے اس کا اعادہ کرتا ہوں وہ کیا ہے ایک مثال سے سمجھ میں آجائیگی فرض کرو کہ دو شخص حافظ قرآن ہیں ایک کا قرآن شریف تو ایسا پکا ہے کہ اسکو متشابہ ہی نہیں لگتا بے سوچے فر فر پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے جیسے گھڑی میں کنجی لگا دی اور وہ

چل رہی ہے رکتی ہی نہیں یا جیسے اسپنگل چھوڑ دیا ایسے شخص کو خیال کرنے اور سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور دوسرا وہ ہے جو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اسکو خوب متشابہ لگتے ہیں ظاہر ہے کہ اس شخص کو سوچنے کی اور الفاظ قرآن پر نظر رکھنے کی خاص ضرورت ہوگی تو بحالت موجودہ اس کچے حافظ کی جسقدر توجہ الفاظ قرآن کی طرف ہے وہی حقیقت ہے حضور قلب کی جسقدر توجہ اسکو الفاظ قرآن کی طرف ہے نمازی کو اتنی توجہ نماز کی طرف ہونا کافی ہے یعنی رکعات کی طرف توجہ ہو کہ کتنی ہوئیں اور کیا ان میں کیا ہے کیونکہ رکعت مرکب ہے چند اعمال سے جب ہر عمل کو سوچ سوچ کر کیا اور الفاظ قرآن کو اس طرح پڑھا کہ اسکے بعد یہ لفظ ہے اور اسکے بعد یہ بس حضور قلب ہو گیا چاہے اسکے ساتھ بے اختیار وسوسے کتنے ہی آتے ہوں وہ حضور قلب کے منافی نہیں ہیں اب اس مشہور شعر کی حقیقت معلوم ہو گئی ہوگی ؎

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

یہ شعر مولانا رومیؒ کا نہیں ہے سو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون صحیح نہیں ہے بلکہ اس قسم کی تسبیح بھی نفع سے خالی نہیں میں نے اس شعر کا رد کیا ہے کہ ؎ ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر۔ البتہ اگر بقصد تصور گاؤ خر کا مراد ہو تو اصل شعر بھی صحیح ہے۔ صاحبو! حدیث میں ہے کہ الدین یسر کہ دین آسان ہے اور قرآن شریف میں ہے ماجعل علیکم فی الدین من حرج کہ دین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی اگر دین اسی کا نام ہے جیسا متشدد دین نے کیا ہے تو کیا ساری احادیث قرآن غلط ہو جائیگا۔ بات یہ ہے کہ نہ تو دین اتنا سہل ہے جیسا کہ بعض نے سمجھ لیا ہے کہ آسانی تو جب ہو جبکہ دین کو بالکل چھوڑ دے اور سانڈ کی طرح آزاد پھرے بطلان اس کا ظاہر ہے کیونکہ آسانی ایسی چیز کے ساتھ متعلق ہوتی ہے جسکا وجود بھی ہو اسواسطے کہ جب یوں کہتے ہیں کہ یہ چیز آسان ہے تو اسکا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس چیز کا وجود تو ہے اور باوجود موجود ہونے کے پھر اسمیں سہولت ہے اور جو شے معدوم ہو تو اسکو نہیں کہہ سکتے کہ یہ شے آسان ہے اس لئے جب دین ہی نہ رہیگا تو آسان کس کو کہیں گے اور بعض نے تشدد اتنا کیا کہ اسکو ڈراؤنا دیو بنا دیا دین کا تو جمال ہے جسپر بیساختہ شعر صادق آتا ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجاست

ف: محض زبان پر تسبیح کا ہونا نفع سے خالی نہیں ۱۷۸

ف: دین نہ تو بہت سہل ہے اور نہ بہت دشوار ہے

تشدد دین نے دین کو ایسا دشوار بنایا ہے جیسے شاعروں کا معشوق کہ پلکیں ایسی جیسی تیر ابرو ایسی جیسے کمان منہ ایسا جیسا نقطہ زلفیں سانپ جیسی اور کمر تھی ہی نہیں۔ یہ شاعروں کا معشوق ہے جسکا وجود ہی نہیں اور اگر اس شکل کا کوئی آدمی سامنے آجاوے سب سے اول بھاگنے والے یہی عاشق ہوں۔ صاحبو! دین میں نہایت سہولت ہے کام اس طرح کرو کہ نشاط رہے اگر نشاط نہو اسکی تدبیر کرو اگر خلاف نشاط عوارض خود پیش آجائیں تو عمل کو مت چھوڑو بلکہ عوارض کے دور کرنے کی تدبیر کرو۔ یہ حاصل ہے اس حدیث کا یہ تو عاملین کا علاج ہے نصف شعبان کے بعد پس ان کا علاج یہ بتایا کہ اذا انتصف شعبان فلا تصوموا کہ نصف شعبان کے بعد روزہ مت رکھو تاکہ نشاط باقی رہے نفس پر زیادہ تشدد مت کرو بلکہ رمضان سے پہلے اسکو راحت میں رکھو اور تشدد کے متعلق ایک دقیق اور مفید بات یہ ہے کہ جو عمل میں زیادہ کاوش کرتا ہے وہ خاص ثمرات کا منتظر رہتا ہے اگر اس میں دیر ہوتی ہے تو وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود ایسے مجاہدات کے مجھکو ابتک ثمرات کیوں نہ ملے حالانکہ میں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں گویا اپنی عبادت پر ناز ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں اور اپنے کو ثمرات کا مستحق سمجھنے لگتا ہے کہ میری عبادت پر ثمرات کا دینا گویا خدا کے ذمہ ہو گیا اور یہ عین کبر ہے اور جو شخص اعتدال سے کرتا ہے تو وہ یہ خیال ہی نہیں رکھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ میں کرتا ہی کیا ہوں جسپر ثمرات مرتب ہونے وہ تو ثمرات کا خیال کرتے ہوئے بھی شرماتا ہے ایسا شخص صرف فضل کا امیدوار رہتا ہی یہ تو کام کرنیوالوں کے متعلق علاج تھا۔ اور کاہلوں کیلئے یہ بیان نہیں تھا اب کاہلوں کا علاج بتاتا ہوں اور اسی حدیث سے بتاتا ہوں طب کامل وہ ہے جو ایک دوا سے دو متضاد مریضوں کا علاج کرے حدیث ایسی ہی طب کامل ہے سو جو لوگ بالکل غفلت میں ہیں کہ کام ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو اس وجہ سے کہ اگر نہ کروں گا تو لوگ یوں کہیں گے کہ کچھ کرتے ہی نہیں جسقدر فرض ہو چکا ہے اسی پر اکتفا کرتے ہیں اس سے زیادہ کرنا ان پر وبال ہوتا ہے ان کا علاج جو اسی حدیث میں مذکور ہے یہ ہے کہ وہ کام کرنیکی عادت ڈالیں عادت سے کام آسان ہو جاتا ہے وہ صرف رمضان شریف کے روزہ پر اکتفا نہ کریں بلکہ گاہ بگاہ نفل روزہ بھی رکھتے رہیں تاکہ رمضان شریف میں روزہ رکھنا ان پر آسان ہو کیونکہ اگر عادت نہو تو پھر دفعت پر سخت دشواری پیش آتی ہے کہیں تم کو کالتف ضا سے

کہیں دودھ کا انکی روزہ میں یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا ساری دنیا سے لڑ رہے ہیں انکا
روزہ ایسا ہوتا ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی ۔ چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

سو شریعت نے ایسوں کے لئے سہولت کا طریقہ بتلا دیا کہ کبھی نفل روزہ بھی رکھ لینا چاہیے
اور یہ بھی اسی حدیث سے معلوم ہوا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں نصف شعبان کے بعد صوم
سے منع کیا ہے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے روزے کا محل ہے اور محل میں روزہ کی فضیلت
پر دلیل قائم ہے پس اس اشارہ میں کاہلوں کا علاج بتلا دیا اور شریعت نے اس علاج میں اتنی
اور آسانی کی کہ ان نفل روزوں کے دن بھی بتلا دیے کہ رمضان کے علاوہ محرم کو روزہ رکھو تو اتنا
ثواب ہے ذی الحجہ میں استغفار ہے پھر سب روزوں کی سرحد شعبان میں ملگئی کہ ایک روزہ پندرہویں کا
بھی رکھ لو اس میں بتلا دیا کہ شعبان میں ایک دن روزہ رکھکر دیکھو تو سہی پھر رمضان کے روزہ سے
نہیں ڈرو گے کیونکہ پندرہویں شعبان کا زمانہ رمضان کے بالکل قریب ہے اسکے بعد رمضان تک متعلقہ
ایام اور کیفیت موسم میں زیادہ فرق نہیں ہوتا تو اس روزہ سے رمضان کا نمونہ معلوم ہو جائیگا
کہ بس رمضان کے روزے بھی ایسے ہی ہونگے جیسا یہ ہے پھر یہ بھی بتلا دیا کہ اس کے بعد پندرہ
دن کھاتے پیتے رہو تو یہیں بھی سہولت کا سامان بتلا دیا بتلایئے کہ اس روزہ کے رکھنے میں تشدد
ہوا یا سہولت جو لوگ کبھی روزہ نہیں رکھتے رمضان شریف میں انپر آفت آتی ہے جیسا جو حافظ
قرآن کبھی نہیں پڑھتے تراویح میں انکی عجیب کیفیت ہوتی ہے اور جو پڑھتے رہتے ہیں ان کو بالکل
دقت پیش نہیں آتی اس سے اس امر کی بھی حکمت معلوم ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ مروا صبیانکم بالصلوٰۃ اذا بلغوا سبع سنین واذا بلغوا عشرا فاضربوھم یعنی جب
بچے سات برس کو پہونچیں تو ان کو نماز کا حکم کرو اور جب دس برس کے ہوں اور نہ پڑھیں تو
انکو مارو حالانکہ بچے اس عمر میں مکلف نہیں ہوتے کیونکہ بالغ نہیں ہوتے ۔ بارہ برس سے کم میں
لڑکا بالغ نہیں ہوتا البتہ لڑکی نو کم میں بالغ ہو جاتی ہے تو یہ کیا بات ہے کہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے
اور حکم ہو رہا ہے نماز کا اور روزہ بھی عادۃً میں کہتا ہوں واللہ اعلم نہایت سہولت کی رعایت ہے
ہے کیونکہ بالغ ہونے پر اگر دفعۃً ہجوم ہو جاتا سب احکام کا تو ایکدم سے بیچارہ مصیبت میں

شریعت کی آسانی کی ۔ نفلی روزے کے بتلادیے ۔ ۱۸۰ ۔ بیان حکمت مروا صبیانکم بالصلوٰۃ

پڑجاتا تعجب نہیں تھا کہ ایک دم سے ہجوم ہونے پر خودکشی کرلیتا یا شریعت کو چھوڑ بیٹھتا اگر شریعت بھی نہ ہوتی تو میں پوچھتا ہوں کہ عقلاء اس بارہ میں کیا تجویز کرتے یہی تجویز کرتے کہ پہلے سے اسکو تھوڑا تھوڑا احکام کا عادی بنایا جاوے مگر شریعت نے تمکو یہ دولت مفت دیدی اس لئے تو قدر نہیں ہوتی شریعت کی خوبی مصیبت پڑنے کے بعد معلوم ہوتی ہے صحابہ رض کو شریعت کی قدر تھی کیونکہ بعد مشقت وتعب کے شریعت حاصل ہوئی تھی ہمیں قدر نہیں کیونکہ بلا مشقت کے ہمیں سب کچھ مل گیا ہے چنانچہ اسی حدیث کو دیکھ لیجئے اذا انتصف شعبان فلا تصوموا جسمیں سبحان اللہ روزہ رکھنے میں بھی سہولت کی رعایت کی ہے اور نہ رکھنے میں بھی دونوں حکموں میں سہولت ہے گویا دو متضادین کو جمع کردیا ایسا جمع تکوین میں ہوا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ بعض فرشتے حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایسے پیدا فرمائے کہ آدھا جسم ان کا برف کا ہے اور آدھا آگ کا اور تسبیح ان کی یہ ہے سبحان الذی جمع بین الثلج والنار اسی طرح یہاں متضادین کو جمع کردیا بڑا کمال یہی ہے کہ متضادین کو جمع کردے اور ساتھ ہی بینہما برزخ لا یبغیان مولانا فرماتے ہیں ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں ۔۔۔ درمیان شان برزخ لا یبغیان

اگر سہولت کا قصہ عقلاء کے سپرد کیا جاتا تو وہ یا تو اس پہلو پر نظر کرتے کہ اس طرح عادت پہلے سے ڈالیں کہ کبھی فرصت ہی نہیں دیتے اور یا بالکل آزاد چھوڑ دیتے اور دونوں میں دشواری تھی آسانی اسی میں ہے کہ عادت بھی رکھو اور ترک بھی کرو عادت پر یاد آیا کہ قاری عبداللہ صاحب مکی نے جو کہ فن تجوید میں میرے استاد ہیں جب میں ہندوستان آنے لگا تو مجھ سے فرمایا تھا کہ ہندوستان جاتے ہو مگر اتنا خیال رکھنا کہ جو کچھ سیکھا ہے وہ ضائع نہ ہوجائے جس کی صورت یہ ہے کہ پاؤ پارہ روزانہ اسی طرز سے پڑھ لیا کرنا اگر ایسا کرتے رہوگے تو فن سے مناسبت عملی باقی رہے گی ورنہ اجنبیت ہوجاویگی واقعی کیسی آسان تدبیر فرمائی جس میں مشقت بھی نہیں اسی طرح آدمی جس کام کو کبھی تھوڑا تھوڑا کرتا رہتا ہے تو سب کچھ ہوجاتا ہے اور نہیں تو سب عبادتوں کی عادت اور مشق کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی جامع عبادت مرحمت فرمادی ہے جس میں تھوڑی تھوڑی سب عبادتیں ہوجاتی ہیں وہ کیا ہے نماز کہ

اس میں ہر قسم کی عبادت موجود ہے اور پھر زیادہ مشقت نہیں دیکھئے تکبیر تحریمہ سے سلام تک
فاقہ کو لازم کر دیا یہ روزہ کا نمونہ ہے حج کے بھی معنی موجود ہیں کیونکہ حج میں احرام کے بعد
بہت سی چیزیں ممنوع ہو جاتی ہیں یہاں بھی بعد تکبیر تحریمہ بہت سی امور ناجائز ہو جاتے ہیں حج
میں تلبیہ ہے۔ یہاں بھی تکبیریں ہیں۔ حج میں بدن کو تعب ہوتا ہے یہاں بھی موجود ہے حج میں احرام
سے نکلنے کے لئے حلق ہے یہاں بھی نماز سے نکلنے کے لئے سلام ہے حج میں قصد بیت ہے یہاں
بھی توجہ الی البیت ہے وعلی ہذا القیاس۔ نماز میں زکوٰۃ کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ زکوٰۃ میں
مال خرچ ہوتا ہے یہاں جان بھی خرچ ہوتی ہے اور مال بھی کیونکہ نماز بدون لباس کے درست
نہیں اعتکاف کے معنی کا پایا جانا ظاہر ہی ہے۔ دیر تک انسان مسجد میں محبوس رہتا ہی محققین
نے کہا ہے کہ نماز میں قربانی بھی ہے وہ اس طرح کہ ذبح کے وقت اللہ اکبر کہتے ہو اور جانور کو
ذبح کرتے ہو یہاں اللہ اکبر کہہ کر اپنے نفس کو اللہ کے راستہ میں قربان کرتے ہو۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں

۱۸۲

معنی تکبیر ایں است اے امیم — کاے خدا پیش تو ما قرباں شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر میکنی — ہمچنیں در ذبح نفس کشتنی،
گوے اللہ اکبر و ایں شوم را — سر بہ بر تا وا رہد جاں از عنا
تن چوں اسمٰعیل و جاں ہمچوں خلیل — کرد جاں تکبیر بر جسم نبیل

غرض نماز میں خاص جامعیت ہے تمام عبادات کے نمونے اس میں موجود ہیں اس میں تھوڑی
عادت روزمرہ فاقہ کی بھی ڈالی گئی اور دیکھئے سہولت کہ حق تعالیٰ نے ہم کو زیادہ فاقہ بھی نہیں
دیا ہمارے فاقہ کا بھی لحاظ کیا ہے چنانچہ مسئلہ ہے اذا اجتمع العشاء والعشاء فابدءوا بالعشاء
یعنی جب کھانا اور عشاء کی نماز جمع ہو جاویں تو پہلے کھانا کھا لو تاکہ نماز میں طبیعت منتشر
نہ ہو امام ابو حنیفہ رحمۃ سے اس کی حکمت منقول ہے آپ نے فرمایا ہے لان یکون اکلی کلہ
صلوٰۃ احب الی من ان یکون صلاتی کلھا اکلا یعنی کہ میرا سارا کھانا نماز ہو جاوے
یہ اس سے اچھا ہے کہ ساری نماز کھانا ہو جاوے مطلب یہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے
جب نماز کا خیال رہیگا تو سارا وقت مراقبہ نماز میں گذریگا اور انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہی تو اس کا
کھانا نماز ہوگا پھر اس کے بعد نماز بھی فراغت سے پڑھیگا تو اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جو بھوکا رکھ کر نماز

اذا اجتمع العشاء والعشاء فابدءوا بالعشاء کی حکمت

ادا کرے گا تو نیت کھانے ہیں پڑی رہے گی تو وہ نماز بھی کھانا ہو جاوے گی غرض جو شخص کھانا کھا رہا ہے اور دل نماز میں ہے تو نماز ہی میں ہے بخلاف اس شخص کے جو بھوکا نماز پڑھ رہا ہے اور دل پڑا ہوا ہے کھانے میں تو اسکی نماز بھی کھانا ہو رہی ہے عارفین نے ہر موقعہ پر ان اصول کی رعایت کی ہے حضرت حاجی صاحبؒ سے جو شخص مکہ شریف میں قیام کی بابت عرض کرتا تو آپ فرماتے کہ دل رہے مکہ میں اور جسم ہندوستان میں وہ اس سے اچھا ہے کہ دل رہے ہندوستان میں اور دھڑ ہو مکہ میں کیونکہ مکہ میں رہکر کسی دوسری جگہ کا اشتیاق ہونا بیت اللہ سے اعراض کی صورت ہے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ مکہ میں مستقلاً مقیم تھے وہ بیمار ہوئے بیماری میں ان کے منہ سے بار بار یہ نکل رہا تھا کہ مجھکو ہندوستان لے چلو لوگ ان کا پلنگ اٹھا کر دوسری جگہ رکھدیتے اور کہتے کہ ہندوستان پہونچا دیا بس اسی میں انتقال ہو گیا اس لئے مکہ میں رہنا ہر شخص کا کام نہیں اس کیلئے بڑے دل کی ضرورت ہے اور وہاں کے بہت آداب ہیں آجکل تو لوگ مکہ بھی سیر و تفریح کیلئے جاتے ہیں چنانچہ ایک نواب سے نظر بندی کے بعد پوچھا گیا تھا کہ تم کہاں رہنا چاہتے ہو انہوں نے مکہ کو منتخب کیا چنانچہ وہاں پہونچا دیے گئے مگر وہاں انکی عادت یہ تھی کہ راستہ پر بیٹھ جاتے اور عورتوں کو تاکا کرتے تھے بھلا ایسے جانے سے کیا نتیجہ اس لئے بعض کو ہندوستان ہی رہنا اچھا ہے ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں حضرت مسعود بکؒ فرماتے ہیں کہ ؎

اے قوم بہ حج رفتہ کجا ئید کجا ئید معشوق دریں جاست بیائید بیائید

اس میں ایسے ہی لوگ مخاطب ہیں جنکے دلوں میں ہنوز بیت اللہ کی محبت و عظمت پیدا نہیں ہوئی چونکہ اہل اللہ کی نظر حقائق پر ہوتی ہے اسلئے اسکو یہ مشورہ دیا گیا غرض شریعت میں ہر ہر قدم پر سہولت ہے مقصود یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ کسی طرح کام ہو اس لئے قدم قدم پر سہولت کی رعایت ہے اور اس سہولت کی روح اور خلاصہ یہی ہے کہ کام ہو اور انسان سہولت سے کام کرتا رہے اسی لئے اذا انتصف شعبان فلا تصوموا دونوں قسموں کو محیط ہے عاملین کو بھی اور کاہلین کو بھی دونوں کو سہولت کا طریقہ تبلا دیا اور جب اس حد سے تعدی ہو گی تو کام نہ ہو سکیگا بعض لوگ تشدد کریں گے اور نصف شعبان سے رمضان تک روزے

رکھیں گے ان کو رمضان میں مصیبت نظر آئیگی اور بعض لوگ نصف شعبان کا روزہ بھی نہ رکھیں گے انکو بھی رمضان کے روزے آنے سے جاڑہ چڑھیگا غرض ہر صورت میں کام نہو سکیگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ کام ہو جائے مگر آجکل قال زیادہ ہے کام نہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

کار کن کار بگذر از گفتار — اندریں راہ کار باید کار

اور اگر کام کرنے کے اصول کا خود احاطہ نہ ہو سکے تو سب سے اچھی صورت کام کرنے کی یہ ہے کہ محققین میں سے کسی کو اپنا قائد بنالے وہ قاعدہ اتباع شریعت اور سہولت کیساتھ تدریجاً مقصود کی طرف لیجائیگا اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بیل سے آہستہ آہستہ روزانہ تدریجاً کام لیا جاتا ہے تو اسکو سو کوس بھی لیجا سکتے ہو اور ایک وہ بیل ہے کہ جسپر کبھی سواری نہیں ہوتی اور سال بھر اس سے کام لینا چاہو تو وہ کچھ بھی کرکے ندیگا اب اسکے لئے ایک ہوشیار گاڑیبان کی ضرورت ہے جو اسکو تھوڑا تھوڑا روز جوڑا کرے وہ زمین میل کا روزمرہ چکر دیا کرے اور شام کو راتب کھلایا کرے کچھ عرصہ میں وہ بیل خوب کام دیگا لہذا عادی بنانے کیلئے دو چیز کی ضرورت ہے کام لینا اور آرام دینا نفس کی بھی یہی کیفیت ہے کہ بدون کسی ایسے رہبر کے ٹھیک نہیں ہوتا جو کام بھی لے آرام بھی دے اور میں مرید ہونیکو نہیں کہتا ہوں کہ اس سے مرید ہو جاؤ میں کام کا طریقہ پوچھنے کو کہتا ہوں کہ کسی محقق سے پوچھ پوچھ کر کام کیا کرو اور بحمداللہ میں نے بہت آسان طریقہ حدیث سے آپ کو بتلا دیا ہے ان احکام کو یاد رکھئے اور رمضان شریف کیلئے شگفتہ ہو جائے بعض لوگ رمضان شریف میں بہت پژمردہ رہا کرتے ہیں اور بہت توڑے رہتے ہیں میں اسکے متعلق ایک تجربہ کی بات بتاتا ہوں جسمیں روزہ ایسا سہل ہو جاوے کہ نہ برف کی ضرورت رہے نہ شربت کی نہ بلائی کی وہ یہ کہ روزہ میں یہ کبھی مت کہو کہ آج گرمی ہے آج خشکی ہے آج تو دل گرا جاتا ہے بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے اس قسم کا تذکرہ اور خیال بھی مت کرو بلکہ کسی ایسے کام میں لگجاؤ جسمیں انہماک زیادہ ہو جیسے تلاوت قرآن یا کوئی کمائی کھانیکا وسیلہ تاکہ خیال بٹا رہے اور روزہ کی طرف دھیان ہی نہ جائے کیونکہ خیال کو بڑا دخل ہے اسکو کرکے دیکھو انشاءاللہ تعالیٰ روزہ معلوم بھی نہ ہوگا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرمائیں۔ فقط

اشرف علی ۸ار رمضان ۱۳۵۱ھ

ف بیل کی عجیب مثال

۱۸۴

ف نفس بدون رہبر کے درست نہیں ہوتا

ف روزہ معلوم نہ ہونے کی عمدہ تدبیر

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ

سلسلہ

التبلیغ

کا

۱۸۵

وعظ مسمّی بہ

مثلث رمضان

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمی بہ
مثلث رمضان

این	متی	کم	کیف	کم	ماذا	من السامعون	من ضبط	[illegible]	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کتنے آدمی تھے	کیا مضمون تھا	سامعین کون تھے	کس نے لکھا	[illegible]	متفرقات
تھانہ بھون جامع مسجد	الجمعۃ الثالث من رمضان ۱۳۳۳ھ	۱۲ گھنٹہ	×				مولوی محمد یوسف صاحب بجنوری		

تنبیہ از جامع وعظ حضرت مدظلہ نے اس مجموعی وعظ کے تین جزو قرار دئے اور ہر ایک کا نام جدا جدا تجویز فرمایا۔ پہلا الریان من رمضان۔ دوسرا القرآن فی رمضان۔ تیسرا الیقظان فی رمضان۔ اور مجموعہ کا نام مثلث رمضان تجویز فرمایا۔ اور وجہ تین جزو قرار دینے کی یہ ہوئی کہ حضرت والا کا قصد یہ تھا کہ اس رمضان شریف میں چار جمعہ واقع ہوں گے اور چاروں میں چار مضامین علیحدہ علیحدہ بیان کردے جاوینگے مگر اتفاق سے حضرت کی طبیعت ناساز ہوگئی حتی کہ چند روزے بھی قضا ہوئے اور ضعف اسقدر ہوگیا تھا کہ بیان پر قدرت ہونا مشکل تھی چنانچہ دو جمعہ میں وعظ نہیں ہوا اور تیسرے جمعہ میں وعظ فرمایا جس میں مختصراً پہلے جمعوں کے بھی مضامین آگئے (یعنی جن مضامین کا پہلے دو جمعوں میں بیان کیا جاتا) چنانچہ ایک

۱۸۶
۲
ق
تنبیہ از جامع وعظ

مضمون پہلے جمعہ کے متعلق ہے اور ایک دوسرے کے اور ایک تیسرے کے اور حضرت نے گذشتہ دو جمعہ میں وعظ نہ ہونے کے عذر کا اظہار بھی شروع وعظ میں فرمایا اور چوتھے کے متعلق وعدہ کر لیا گیا جیسا کہ معلوم ہو جائے گا۔

خطبہ ماثورہ معمولہ - قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کما رواہ الشیخان عن سہل بن سعد ان للجنۃ ثمانیۃ ابواب منہا باب یسمی باب الریان لا یدخلہ الا الصائمون - یہ ایک حدیث ہے جسکو شیخین یعنی امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے سہل بن سعد صحابی سے روایت کیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک دروازہ کا نام باب الریان ہے سوائے روزہ داروں کے اور کوئی اس میں سے داخل نہ ہوگا یہ تو ترجمہ ہے اس حدیث کا میرا مقصود بعض فضائل رمضان بلکہ بعض کا بیان کرنا ہے اور یہ مضمون منجملہ چند مضامین وقتیہ کے ایک مضمون ہے پہلے سو یہ خیال تھا کہ اس ماہ کے چار جمعہ ہوں گے اور ہر جمعہ میں ایک ایک مضمون ان مضامین میں سے بیان کردیا جاویگا مگر اسباب ایسے ہو گئے کہ میں اس سے پہلے جمعوں میں بیان پر قادر نہیں تھا چنانچہ اب تک ضعف باقی ہے اس لئے آج ایک ضروری مضمون بیان کر دیا جاویگا جس میں مختصراً پہلے جمعوں کے مضامین بھی آجائیں گے اور اخیر جمعہ باقی ہے چوتھا مضمون بشرط خیریت انشاءاللہ اسمیں بیان کردیا جاویگا اگر سب جمعوں میں قدرت ہوتی تو آج کے حصہ میں تیسرا مضمون آتا اتفاقی بات ہے کہ ایک بھی بیان نہیں ہوا اور یہ غیر اختیاری امر تھا اب بھی پوری قدرت نہیں مگر میں نے خیال کیا کہ اگر زیادہ بیان نہ ہوگا تو تھوڑا ہی سہی اس کے قبل تو اتنی بھی قدرت نہ تھی وہ چاروں مضمون ضروری اور قابل تفصیل تھے اگر عوارض پیش نہ آتے تو باستقلال ایک ایک جمعہ میں انکا بیان ہوتا اب اگر تینوں مضمون مفصلاً آج ہی بیان ہوں تو اسکے لئے وقت بہت چاہئے اسواسطے قصد یہ ہے کہ تینوں کا مختصراً بیان کردیا جائے اور زیادہ وقت تو اکثر توابع میں صرف ہوتا ہے اصل مضمون طویل نہیں ہوتا اس لئے توابع کا حذف کرنا مناسب معلوم ہوا ضروری انا دہ پر نظر کرکے آج تینوں کا بیان مختصر کردیا جائیگا سو ایک تقریر کا مضمون تو حدیث سے شروع کردیا ہے جس کا پھر ترجمہ کرتا ہوں کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک کا نام باب الریان ہے۔

۳
۱۸۷

سوائے روزہ داروں کے اسمیں سے اور کوئی داخل نہ ہوگا یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے رکھے ہیں اور جہنم کے سات لوگ اسکی حکمت سبقت رحمتی علی غضبی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت غضب پر سبقت لیگئی اسلئے جنت کے دروازوں کی تعداد جہنم سے زیادہ ہے گویا اجازت دی کہ اگر کثرت سے داخل ہونیوالے ہوں تو آسانی سے داخل ہوسکیں کیونکہ تعداد دروازوں کی زیادہ ہے اور اس میں ترغیب بھی ہے کہ جنت میں زیادہ جانیوالے ہونے چاہئیں اور جہنم میں جانیوالے کم ہوں اور کوشش کرنی چاہیئے کہ اسمیں نجائیں گو وقوع اسکے خلاف ہے یعنی جنت میں کم جائیں گے اور جہنم میں زیادہ اور یہ لوگونکی سوء تدبیر کی وجہ سے ہے ورنہ ان کے کرم میں کمی نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ دروازے اس مکان میں زیادہ رکھے جاتے ہیں جسمیں وسعت ہو اس سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں وسعت زیادہ ہے اگرچہ سوء تدبیر کیوجہ سے جہنم والوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور جہنم بھی کوئی چھوٹی سی چیز نہیں گو جنت سے وسعت میں کم ہے جنانچہ جہنم کی وسعت اس سے ثابت ہے کہ باوجود اس کے کہ جہنم میں جہنمی کثرت سے داخل ہوچکیں گے پھر بھی پکارے گی ہل من مزید کہ اور ہو تو دیدو جیسے بھوکے سے دریافت کرتے ہیں کہ اور کچھ چاہیئے تو وہ کہتا ہے کہ اور ہو تو دیدو اور یہی حال جنت کا ہوگا مگر اللہ میاں اتنے رحیم و کریم ہیں کہ دوزخ کو تو اپنے حکم سے شکم سیر کر دیں گے کسی کو بلا عمل داخل نکرینگے اور جنت کیلئے ایک نئی مخلوق پیدا کرینگے جنکو بلا عمل محض اپنے فضل سے جنت مرحمت فرمائیں گے غرض اسکو اتنی وسعت اسلئے دیدی ہے کہ اس کے دروازوں کی تعداد جہنم سے زیادہ رکھی ہے اور جہنم کے بھرنیکے لئے نئی مخلوق پیدا نہ ہوگی بلکہ اسی کے اجزا کو سمیٹ کر تنگ کر دیں گے۔ ورنہ حاکمیت کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اہل جنت کو دوزخ میں داخل فرما دیتے تو کسی کو بھی چون وچرا کی گنجائش نہ تھی

ہست سلطانی مسلم مر ورا نیست کس را زہرۂ چون وچرا

مگر وہ صرف حاکمیت سے کام نہیں لیتے بلکہ حکمت سے کام لیتے ہیں چنانچہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اسمیں حکمت ہی ہوتی ہے گو ہمیں معلوم نہو پھر ایک طریقہ تو دوزخ کے پر کرنیکا یہ تھا کہ اہل جنت کو دوزخ میں بھیجتے اور ان کو معذب فرماتے اور دوسرا یہ تھا کہ ان کو دوزخ میں بھیجتے اور معذب نہ فرماتے وہ اس پر بھی قادر ہیں اور ایسا واقع بھی ہے کہ کوئی دوزخ میں ہو اور معذب نہو چنانچہ حدیث میں ہے

ف جنت کے آٹھ دروازے اور دوزخ کے سات رکھنے کی حکمت۔

ف جنت میں وسعت زیادہ ہے گو دوزخ بھی کوئی چھوٹی چیز نہیں۔

جنت نفس کے بھی پر کرنیکا خدا کے ذمہ کوئی حق نہیں۔

ف دوزخ میں کوئی ہو اور اسکو عذاب نہو یہ واقع ہے۔

الوائدۃ والموؤدۃ کلتاہما فی النار کہ زندہ درگور کرنیوالی اور زندہ درگور کیگئی دونوں آگ میں ہیں۔
ہندوستان میں بھی لڑکیوں کے مارنے کی عادت تھی مگر سلطنت نے اس کا انتظام کر دیا عرب میں
یہاں سے زیادہ آفت تھی کہ لڑکی کو زندہ درگور کردیتے تھے کہ وہ خود ہی گھٹ کر مرجاتی تھی یہاں تو
مارکر دفن کردیتے تھے مگر عرب کا طریقہ یہاں سے اشد تھا شاید اس صورت سے مارنیمیں عرب کا
یہ خیال ہو کہ مارنے کے فعل کو اپنے ذمہ کیوں رکھیں یا معلوم نہیں کہ عرب کے نزدیک اس کا کوئی
اور اختراعی سبب تھا غرض کہ یہ رواج تھا اور یہ حدیث اس کے متعلق ہے الوائدۃ والموؤدۃ
کلتاہما فی النار اس میں ظاہرا یہ شبہ ہوتا ہے کہ بچی نے کیا خطا کی ہے جسکی وجہ سے وہ دوزخ
میں ڈالی گئی۔ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ
بچی دوزخ میں تو ہوگی مگر معذب نہ ہوگی جیسے جہنم میں فرشتے بھی ہونگے مگر معذب نہ ہونگے
چنانچہ خزنہ جہنم دوزخ ہی میں ہوں گے مگر وہاں بھی ویسے ہی مقرب ہیں جیسے جنت کے
فرشتے جنت میں کیونکہ اصل انعام تو بندہ پر یہ ہے کہ اسکو حق تعالی کی معیت نصیب ہو خواہ
دوزخ میں ہو یا جنت میں اگر دوزخ میں معیت ہے تو پھر تکلیف کا کیا ذکر ہے وہی جنت
ہے اور اگر جنت میں معیت نہو تی تو وہ دوزخ سے بدتر ہوتی سہ

بالو دوزخ جنت است اے جان فزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

خزنہ جہنم کے ساتھ خدا تعالی کی معیت ہوگی اس لئے وہ فرشتے آرام ہی میں ہونگے اس کی واضح
مثال دنیا میں موجود ہے دیکھئے جیلخانہ میں ایک تو مجرم ہوتے ہیں اور ایک وہ جو وہاں ملازم
ہیں مجرمین کو تکلیف ہوتی ہے کہ ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہوتا ہے اور ملازمین جیسے اور جگہ
خوش ہیں اسی طرح وہاں بھی وجہ یہی ہے کہ مجرمین کے ساتھ حکومت کی معیت نہیں ہوتی
بلکہ عتاب متعلق ہوتا ہے اور ملازمین کے ساتھ معیت ہوتی ہے البتہ ایک شبہ یہاں یہ واقع
ہوتا ہے کہ پھر موؤدہ کو جہنم میں رکھنے سے فائدہ کیا جبکہ وہ معذب نہیں کیا اس کے لئے
جہنم ہی میں ٹھکانا تھا جواب یہ ہے کہ اول تو ہمیں مصلحت دریافت کرنے کی مجال نہیں۔
خیر میں مصلحت بھی بتاتا ہوں وہ یہ کہ بچی جسکو زندہ درگور کیا تھا وہ ماں کے پیش نظر ہے
اس سے ماں کیلئے زیادتی عذاب کی مقصود ہے کہ اسکو دیکھ دیکھ کر اپنا فعل یاد کرکے خوب

ف حدیث الوائدۃ والموؤدۃ کلتاہما فی النار کا بیان
ف باوجود دوزخ میں رہنے کے بھی عذاب نہ ہونے کی دنیا میں بھی واضح مثال
ف موؤدہ کو جہنم میں رکھنے کا سبب

کڑھنے اور رنج ہو کہ ہائے میں کیسی سنگدل تھی کہ میں نے اپنی بچی کے ساتھ یہ حرکت کی جس کی وجہ آج عذاب بھگت رہی ہوں نیز ممکن ہے کہ اسپر حقیقت بھی منکشف ہو اور وہ یہی سمجھتی رہے کہ میری بچی پر بھی عذاب ہو رہا ہے حالانکہ وہ معذب نہیں اور حقیقت منکشف نہ ہونے سے اسکا حسرت اور رنج اور زیادہ ہو جاوے جو کہ باعث زیادتی عذاب کا ہے اور یہ ضرور نہیں کہ وہاں سب ہی کو ایسا انکشاف عام ہو جاوے کہ کوئی چیز مخفی ہی نہ رہے ہاں دنیا سے زیادہ وہاں انکشاف ہوگا وجہ یہ ہے کہ ممکنات کے علوم متناہی ہیں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ بعض علوم مخفی بھی ہوں بس ماں یہ سمجھے گی کہ مجھ پر عذاب ہے اور میری وجہ سے بچی پر بھی عذاب ہے اس سے عذاب میں زیادتی ہوگی اور اولاد سے تعلق فطری ہے وہاں بھی یہ تعلق بالکلیہ منقطع نہ ہوگا کیونکہ فطریات عادۃً بدلا نہیں کرتے تو جب ماں یہ سمجھے گی کہ میری وجہ سے یہ بھی عذاب میں ہے اس سے اسکی کلفت بڑھے گی اگر اس محل پر حدیث کو محمول کر لیا جاوے تو کیا قباحت ہے اس سے بھی اوضح واقرب الی الفہم ایک اور نظیر ہے وہ یہ کہ حدیث میں ہے الشمس والقمر مکوران فی النار یوم القیمۃ کہ آفتاب اور چاند بے نور کر کے جہنم میں ڈالے جاوینگے۔ یہاں بھی وہی شبہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کیا خطائی ہے کہ جس کی وجہ سے جہنم میں ہونگے جواب یہ ہے کہ خطا کی تحقیق کی ضرورت اسوقت ہے جبکہ وہ معذب بھی ہوں سو وہ معذب نہ ہونگے اور ان کو دوزخ میں ڈالنے سے مشرکین کو دکھانا ہوگا کہ یہ خود کو تو دوزخ سے بچا ہی نہ سکے تم کو تو کیا بچا سکتے۔ اس کو اقرب اس لئے کہا گیا کہ ذی روح کا معذب ہونا اتنا مستبعد نہیں جتنا غیر ذی روح کا معذب ہونا (اس موقعہ پر ذی روح وہ لڑکی ہے جسکو زندہ درگور کیا تھا اور غیر ذی روح شمس وقمر ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکی معذب تو نہ ہوگی مگر اسکا معذب ہونا اتنا بعید نہ تھا جتنا کہ شمس وقمر کا معذب ہونا بعید ہے کیونکہ لڑکی ذی حیات ہے اور ذی حیات کو عادۃً تکلیف ہونا بعید نہیں اور شمس وقمر غیر ذی حیات ہیں اور غیر ذی روح کو عادۃً تعذیب نہیں ہوتی چنانچہ لکڑیوں کو آگ میں جلاتے ہیں مگر بوجہ غیر ذی روح ہونے کے انکو تکلیف ہونا مستبعد ہے بخلاف اس کے کہ کسی جاندار کو آگ میں ڈالدیں کہ اس کو تکلیف ہونا کچھ بھی بعید نہیں اگرچہ حق تعالیٰ کو اسپر بھی قدرت ہے کہ غیر ذی روح کو بھی معذب فرماویں) پس شمس و قمر

ف دوسری نظیر کہ ایک چیز دوزخ میں ہو اور معذب نہ ہو

ف شمس و قمر دوزخ میں ہونگے مگر معذب نہ ہونگے

۱۹

ہونگے تو وہ دوزخ میں مگر معذب نہ ہونگے کیونکہ ذی روح نہیں اور اسی لئے مکلف نہیں بلکہ بعض ذی روح بھی مکلف نہیں جیسے حیوانات و بہائم بلکہ بعض ذوی العقول بھی بواسطہ انبیاء کے مکلف نہیں یعنی ان کی طرف انبیاء کی بعثت نہیں ہوئی گو بعض اہل لطائف اسکے بھی قائل ہوئے ہیں کہ ملائکہ بھی اس طرح مکلف ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت انکی طرف بھی ہے بلکہ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بعثت جمادات کی طرف بھی ہے اور وہ بھی مکلف ہیں اور بعثت الی کافۃ الخلق سے استدلال کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ ایک لطیفہ ہے اور اگر اسکو مان بھی لیا جاوے تو کہا جاویگا کہ یہ مکلف تو ہیں مگر ان چیزوں سے عصیان کا ظہور نہیں ہوا اسلئے معذب نہ ہونگے چنانچہ کلام اللہ سے ان کا مطیع ہونا ثابت ہوتا ہے الم تران اللہ یسجد لہ من فی السموات و من فی الارض والشمس والقمر والجبال والشجر والدواب وکثیر من الناس۔ اگر ان سے عصیان ہوتا تو وجہ اس کے کہ اس قول میں ان کی طرف بھی بعثت ہے اور یہ مکلف ہیں اسلئے ضرور تھا کہ یہ معذب بھی ہوں مگر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عصیان نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے سموت و ارض و شمس و قمر و دواب سب کے متعلق بلا استثناء کے یسجد لہ فرمایا ہے اور ناس کے لئے کثیر کی قید بڑھائی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ناس میں تو بعض مطیع اور بعض عاصی ہیں مگر اور مخلوقات میں سب مطیع ہیں اور آیت میں ناس سے مراد انس و جن دونوں ہیں کیونکہ ناس کا ترجمہ ہے لوگ اور لوگ جنکو بھی کہتے ہیں مگر ایک طالب علم تھے وہ جانوروں کو بھی لوگ کہا کرتے تھے ایک دفعہ کہنے لگے کہ بندر لوگ بڑے شریر ہیں مگر محاورہ میں لوگ صرف انس و جن کو کہتے ہیں غرض انس و جن میں تو دو قسمیں ہیں بعض فرمانبردار اور بعض نافرمان اور جو ان کے سوا ہیں وہ سب فرمانبردار ہیں لہذا شمس و قمر کا غیر معذب ہونا واضح ہو گیا اسکے خلاف کا احتمال ہی نہیں گو طالب علمی کے زمانہ میں ایک شخص مجھ سے جھگڑ رہے تھے کہ یہ بھی معذب ہوں گے اور سبب یہ بتلاتے تھے جو چیزیں سبب معصیت ہوتی ہیں وہ بھی معذب ہونے چاہئیں جواب اس کا یہ ہے کہ سبب معصیت ہونا جو بالاختیار ہو وہ معذب ہونے کو مستلزم ہے نہ وہ جو کہ سبب بلا اختیار ہو چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ تسبب بلا اختیار معصیت نہیں ہے فقہاء اور صوفیہ ہی شریعت کو خوب سمجھنے والے ہیں ان ہی دونوں گروہ نے شریعت کے

ف بعض اہل لطائف اس کے بھی قائل ہیں کہ بعثت جمادات کی طرف بھی ہے

ف سبب معصیت جو بلا اختیار ہو مستلزم عذاب نہیں

(۱۹۱)

اسرار کو خوب سمجھا ہے گو بعضے فقہاء اور صوفیہ میں لڑائی بھی رہی ہے مگر جو حضرات جامع شریعت وطریقت ہوئے ہیں وہ کبھی نہیں لڑے شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ محقق وہ ہے جسمیں تین وصف ہوں فقیہہ ہو محدث ہو۔ صوفی ہو محققین میں لڑائی نہیں ہوئی ہاں غیر محققین میں ہوئی ہے ع۔ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔

غرض فقہاء نے یہ مسئلہ سمجھا ہے کہ مطلق سبب بننا معصیت نہیں اس لئے جو چیزیں بلا اختیار سبب معصیت ہوئی ہیں وہ معذب نہونگی۔ البتہ اسمیں کلام ہے کہ شمش وقمر آیا اپنی جگہ رہکر جہنم میں ہونگے یا ان کو اپنی جگہ سے ہٹا کر جہنم میں ڈالا جائیگا جمہور کی رائے ہے کہ دونوں کو ہٹا کر جہنم میں ڈالا جاوے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم بھی بہت بڑی ہے اس لئے کہ یہ اجرام یعنی شمش وقمر کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہیں شمش زمین سے ہزاروں حصہ بڑا ہے ایسے ہی قمر کو سمجھنا چاہئے۔ باایں ہمہ مثل گولے کے جہنم میں پھینکدیے جاوینگے مگر شیخ اکبرؒ کا کشف ہے کہ شمش وقمر اپنی جگہ رہیں گے اور جہنم میں بھی ہوں گے اور وہ اس طرح کہ جہنم کو ان کی مستقر تک بلکہ اس سے بھی آگے بسط دیا جاویگا یعنی جہنم کی آگ میں بسط ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی ہانڈی ڈھکی ہوئی پک رہی ہو اور پھر اس کو کھول دیا جاوے تو اس کی گرمی پھیل جاتی ہے اسی طرح جب جہنم کو کھول دیا جاویگا تو اسکی حرارت پھیل جاوے گی جس سے سمندر رو ہوا سب آگ بنجاویں گے حتی کہ آسمان تک حرارت پہونچیگی جو آفتاب وقمر کو بھی محیط ہو جاوے گی اور آفتاب وقمر دونوں اسمیں داخل ہونگے یہ صورت ہوگی شمش وقمر کے اپنی جگہ رہنے کی اور جہنم میں بھی ہونے کی اور پھر جہنم کی آگ بنجاوے ہو کر ساتویں آسمان کے مقعر تک پہونچیگی اور وہاں بہت ہی لطیف ہو جائیگی کہ اس کی لطافت میں لذت ہوگی اور جنت کے میوے اسی لطیف گرمی سے پکیں گے اور جنت ساتویں آسمان کے محدب پر ہوگی اس کشف کی قرآن وحدیث نہ تائید ہی کرتے ہیں اور نہ تکذیب ہی کرتا ہے کشفیات میں ہم شیخ اکبرؒ کے تابع نہیں ہیں لیکن اگر کوئی اس کا قائل بھی ہو مگر جزما نہیں تو کچھ حرج بھی نہیں کیونکہ جیسے تائید نہیں ویسے تکذیب بھی نہیں یہ فائدہ تھا علاوہ یہ بیان کردیا۔ بہرحال یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کہ گرمی جہنم میں ہوا اور معذب نہ ہو۔ تو اس بنا پر ممکن تھا کہ اہل جنت دوزخ میں

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

محققین صوفیا اور علماء میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی

ف شمش وقمر اپنی جگہ رہکر جہنم میں ہونگے یا وہاں سے ہٹاکر ڈالے جاویں گے

۱۹۲

ف جنت کے میوے جہنم کی لطیف حرارت سے پکیں گے

(بقیہ حاشیہ صفحہ دال)

بھیجدیئے جاتے اور معذب نہ ہوتے مگر حق تعالیٰ کی رحمت کو دیکھئے یہ احادیث میں آتا ہے کہ جب جنت میں اہل جنت داخل ہوچکیں گے پھر اسمیں جگہ باقی رہجاویگی تو حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق کو پیدا کریں گے کہ وہ اسمیں رہا کرے گی اسی طرح جب جہنم باوجود اہل جہنم کے داخل ہونے کے ہل من مزید کہتی رہے گی اسکے لئے حق تعالیٰ یہ نہ کریں گے کہ کسی مخلوق کو پیدا کرکے اسمیں داخل کریں اور اس کا پیٹ بھر دیں گو وہ باوجود جہنم میں رہنے کے معذب بھی نہ ہوتے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ بلا وجہ عذاب کی صورت کو بھی گوارا نہیں فرماتے کہ کسی کو پیدا کرکے اسمیں صورۃً بھی داخل فرمائیں۔ یہ عین رحمت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دوزخ کے پکارتے رہنے پر حق تعالیٰ اپنا قدم اسپر رکھدیں گے تو وہ کہیگی بس بس۔ اس حدیث کے معنی تو واللہ اعلم کیا ہیں اور اگر کوئی بات بھی سمجھ میں آوے مگر وہ بات مجلس عام میں کہنے کے قابل نہیں اسلم طریق یہی ہے کہ زبان کو بند رکھا جاوے اہل ظاہر کو تو جہاں اطمینان ہوجاتا ہے تو بولتے بھی ہیں مگر صوفیہ تو بولتے بھی نہیں وہ تو ایسے اسرار کے ظاہر کرنے والوں سے ناراض ہیں۔ اسی کو مولانا رح فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند   وزسخنہا عالمے را سوختند

البتہ کبھی رمز میں کہہ بھی جاتے ہیں جیسے ؎

در بشر روپوش گشتہ آفتاب   دم مزن واللہ اعلم بالصواب

چنانچہ وحدۃ الوجود کے موقعہ پر کہہ بھی دیا اور پھر ان کا منع بھی کر دیا بات یہ ہے کہ ایسے اسرار کے ظاہر کرنے میں اشارہ اور الفاظ کافی نہیں ہیں۔ انکی تو یہ حالت ہے ؎

اے بروں از وہم وقال وقیل من   خاک بر فرق من و تمثیل من

پھر کبھی کسی مثال کے بیان کرنیکا عذر بھی ظاہر کرتے ہیں کہ بدون بولے صبر نہیں آتا ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت   ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

مستی کے غلبہ میں ایسے الفاظ نکلجاتے ہیں مگر پھر کہتے ہیں ع خاک بر فرق من و تمثیل من۔ مطلب یہ ہے کہ میں امثال میں اسرار بیان کر دیتا مگر وہ کافی نہیں مگر ان حضرات کو کبھی صحو ہوتا ہے اور کبھی سکر۔ سکر کی حالت میں کہہ جاتے ہیں یہ ان کی حالت ہے جن پر حال

ف: بھیجدیئے جاتے ... پیٹ

ف: اسرار علوم ... نہ بیان ... پر کرنا ... چاہیئے

ف: ... حالت ... ہے

غالب ہو جاتا ہے اور جو حال پر غالب ہیں ان کی زبان سے تو کبھی ایسی باتیں نکلتی ہی نہیں چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے کبھی ایسی باتیں نکلیں ہی نہیں کیونکہ وہ حال پر غالب ہوتے ہیں صحابہ میں بھی جو مغلوب الحال تھے وہ قلیل ہیں تاہم ان کی زبان سے ایسی باتیں تو نہیں نکلی ہیں مگر بعض حالات ظاہر ہو گئے اور جو حال پر غالب تھے جیسے ابوبکر و عمرؓ وغیرہ ان سے کبھی نہ ایسی باتیں صادر ہوئیں نہ ایسے حالات ظاہر ہوئے۔ بات یہ ہے کہ امت ایک باغ ہے اس میں ہر قسم کے درخت ہیں سرو بھی ہے جس پر مختلف ہواؤں کا اثر نہیں ہوتا اس میں چھوئی موئی کے درخت بھی ہیں کہ ہاتھ لگانے سے کمہلا جاتا ہے جس کو شرمندہ بھی کہتے ہیں باغ میں سب چیز کی ضرورت ہے پھر اس باغ میں بچے بھی ہیں بڑے بھی ہیں دیوانے بھی ہیں مجذوب بھی ہیں ہر طرح کے لوگ ہیں یہ باغ محمدی ہرا بھرا ہے اور ہرا بھرا رہیگا۔ سو یہ مغلوب الحال بھی ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو حال پر غالب ہیں۔ غرض حدیث میں ہے یضع قدمہ مگر میں اس کے متعلق زیادہ نقل نہیں کرتا یہ تو دوزخ کی حالت ہوئی اسی طرح جنت بھی پکار رہی کہ اے اللہ مجھکو بھر دیجئے فوراً حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا کر کے اس میں داخل فرما دینگے کہ وہ اس میں رہا کریں گے۔ میں نے اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم بھی انہی میں سے ہو جاتے تو کیا اچھا ہوتا فرمانے لگے کہ خدا نہ کرے وہ کیا جانیں جنت کا مزہ جنہوں نے کبھی تکلیف نہیں اٹھائی مزہ انکو تو آوے گا جو یوں کہیں کہ الحمد للہ الذی اذہب عنا الحزن۔ انہیں چین ہو گا انہیں کیا چین جس نے روزہ نہ رکھا ہو تو اس کو شام کے وقت کیا مزہ۔ استطراداً یاد آ گیا کہ بعض ایسے لوگ بھی ہیں کہ شام کے وقت روزہ داروں میں شریک ہو کر کہتے ہیں لاؤ ہم بھی روزہ افطار کر لیں مگر جب روزہ نہیں تو جانے کس چیز کا افطار کرتے ہیں یہ بھلے مانس روزہ دار تو ہوتے نہیں مگر افطاری میں سب سے پہلے آ موجود ہو جاتے ہیں مگر انہیں کیا مزہ۔ مزہ تو شام کے وقت روزہ دار کو ہوتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ پانی کا گھونٹ پینے سے ان کی جان آتی ہے استلذاذ کیلئے پوچھا کرتے ہیں کہ یہ پانی کہاں کا ہے ایک شخص تو کہنے لگے کہ میں تو رمضان شریف میں اسٹیشن پر رہتا تھا وہاں کے کنویں کا پانی عجیب تھا۔ اسی طرح جنت کا مزہ بھی اہل مصیبت کو ہوگا یہ ایک مضمون استطراداً اپنے اساتذہ سے سنا ہوا بیان کر دیا

۱۹۲

افطاری کا لطف

اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت ہمارے مشائخ کی کتنی ممتاز ہے۔ ان حضرات کی زبان سے کیسی محقق بات نکلتی ہے۔ اسی طرح ایک محققانہ مضمون اور لطیفہ حدیث میں ہے کہ اہل جنت کو ایک خاص غذا عطا ہوگی اور غذا اس زمین کی روٹی ہوگی اس میں اشکال یہ ہے کہ کیا ڈھیلے اور پتھر کھائیں گے کیونکہ زمین میں تو یہی چیزیں ہیں دوسرے اس میں حکمت کیا ہے کہ اس زمین کی روٹی ملے کیا کوئی دوسری چیز جنت کی نہ تھی۔

ف زمین کی روٹی جنت میں ملنے کی تحقیق

ہمارے اساتذہ نے اسکو حل کیا ہے جسکا حاصل یہ ہے اور بات بھی نہایت لطیف ہے گو درجہ ظن میں ہے۔ اشکال کا جواب تو یہ ہے کہ حدیث میں یہ کہاں ہے کہ ڈھیلے اور پتھر کھائیں گے وہاں تو روٹی کا ذکر ہے کہ حق تعالیٰ زمین کی روٹی دینگے اور سب ایسی سے کھائیں گے یہاں بھی تو ہم زمین ہی کے اجزاء کھاتے ہیں دیکھئے ایک من گیہوں بونے میں اور بیس من پیدا ہوتے ہیں جو ایک من سے زائد ہیں وہ زمین ہی کے تو اجزاء ہیں عناصر کا امتزاج ہو کر ایک خاص ترکیب دیکر مٹی کی شکل گیہوں کی بن گئی پس تم یہاں بھی تو زمین ہی کے اجزاء کھا رہے پھر جیسے یہاں چھننے کے بعد کھاتے ہو اسی طرح اللہ میاں وہاں بھی لطیف اجزاء کو چھانکر کھلائیں گے زمین سے جتنے پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں سب زمین ہی کے تو اجزاء ہیں اجزاء لطیف ان شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں تو ایک سوال تو اس سے حل ہوگیا۔ باقی رہا حکمت کا سوال تو میں اپنے اساتذہ ہی سے اسکو نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بہت سے اللہ کے بندے وہ ہیں جنہوں نے دنیا کی چیزوں کو چکھا تک نہیں خواہ اضطراراً کہ میسر نہیں ہوئی یا اختیاراً بمصلحت مجاہدہ و معالجہ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو پان کا مزہ نہیں جانتے تو بعضوں نے میوے نہ کھائے ہونگے بعض نے گوشت نہ کھایا ہوگا تو اگر ان کو صرف جنت ہی کی نعمتیں دیتے تو انکو دنیا اور جنت کی نعمتوں میں تفاوت نہ معلوم ہوتا اور بدون تفاوت کے پوری لذت اور قدر نہ ہوتی اسلئے انکو اس شکل میں دنیا کی نعمتیں بھی عطا فرمائیں گے اور وہ نعمت دیکھو کہ جیسی ہزار ہا قسم کے مزے ہونگے کیونکہ جتنے مزے دنیا میں ہیں زمین ہی سے نکلے ہوئے ہیں تاکہ موازنہ کر کے لذت زاید ہو پھر اصل میں تو صرف ان زاہدوں کو بحکمت مذکورہ کے سبب کھلانا منظور ہوگا مگر کرم کی عادت پر زاہدوں کے ساتھ ہم تم پر ندوں کو بھی

کھلا دیں گے پس جیسا اس موازنہ سے نعم جنت کا مزہ بڑھے گا اسی طرح ایسے ہی موازنہ سے جنت کا مزہ ایسے ہی لوگوں کو سے گا جو دنیا میں مشقتیں اور مصائب اٹھا کر راحت کے موقعہ پر پہنچیں گے بخلاف ان کے جنہوں نے دنیا دیکھی ہی نہیں پیدا ہوتے ہی جنت میں داخل کر دئے گئے۔

بہرحال اتنا معلوم ہوا کہ جنت اور دوزخ دونوں کے پر کرنے کے طریق میں رحمت کا ظہور ہوگا اسی ظہور کی فرع یہ بھی ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے مقرر فرمائے جنت کے متعلق ایک اور لطیف مضمون یاد آیا اسکو بھی بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض حضرات کو جنت کا جو نقشہ مکشوف ہوا ہے اس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جنت کے طبقات الگ الگ نہ ہوں گے کہ ایک پورب میں تو دوسرا دکھن میں ہو وعلیٰ ہذا۔ بلکہ اوپر نیچے ہونگے کہ نیچے مثلاً ادنیٰ درجہ ہو اس کے اوپر اعلیٰ پھر اس کے اوپر اور اعلیٰ ہذا چنانچہ فردوس سب سے بلند ہوگا۔ اسپر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس صورت میں سب سے اوپر کے درجہ کا چھوٹا ہونا لازم آتا ہے حالانکہ وہ سب سے بڑا ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اگر کوئی مکان نیچے سے چھوٹا ہو اور اوپر جا کر پھیلاؤ ہو جائے یہاں تک کہ تمام جنات سے باہر نکلجاوے تو اس میں کیا استبعاد ہے جیسے درخت کہ اس کا تنا عرض میں کتنا مختصر ہوتا ہے اور اوپر جا کر کتنا پھیلاؤ ہو جاتا ہے اسی طرح وہاں بھی ممکن ہے۔ ایک سوال حدیث کے متعلق اور ہے وہ یہ کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور جس شخص کا عمل جس دروازہ کے مناسب ہوگا اسی دروازہ سے پکارا جائیگا مثلاً کسی نے نماز زیادہ پڑھی ہوگی تو وہ باب الصلوٰۃ سے بلایا جاوے گا اور جس نے روزے زیادہ رکھے ہونگے تو وہ باب الریان سے بلایا جاویگا اب فرض کیجئے کہ کوئی شخص ایسا ہو کہ جس نے ہر قسم کے عمل بکثرت کئے ہوں تو وہ مستحق اس کا ہوگا کہ وہ شخص ہر دروازے سے بلایا جاوے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کیا کہ کوئی شخص ایسا بھی ہوگا کہ سب دروازوں سے بلایا جاویگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ارجوان تکون منہم کہ مجھکو امید ہے کہ ان لوگوں میں تم ہوگے۔ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ ایک شخص مختلف دروازوں کی طرف کھینچا کھینچا پھرے نیز مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی صورت کیا ہے کیونکہ ایک شخص ایک ہی دروازہ سے داخل ہو سکتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جو تقریر پہلے کی گئی کہ جنت کے طبقات الگ الگ نہ ہونگے اسپر یہ اعتراض

(حاشیہ) ف جنت کا نفع پہلے اہل آفت کو کچھ مصائب اٹھا کر جنت کو حاصل کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے

۱۹۶

ف ایک شبہ اور جواب

ف ایک اور شبہ مع جواب

پڑتا ہی نہیں۔ مثلاً فرض کیجئے کہ باب الصلوٰۃ پہلا دروازہ ہے اور کسی نے نمازیں زیادہ پڑھی ہیں وہ اس دروازہ سے بلایا گیا اور داخل ہو کر جنت میں پہونچ گیا اور وہیں رہ گیا ایک وہ شخص ہے جس نے نماز روزے دونوں عمل بکثرت کئے تو وہ باب الصلوٰۃ سے گذر کر دوسرے دروازہ باب الریان میں گیا اور جنت میں داخل ہو کر وہیں رہ پڑا اب ایک شخص وہ ہے کہ اس نے ہر قسم کے اعمال بکثرت کئے ہیں تو وہ باب الصلوٰۃ میں اول داخل ہوا بعدہ باب الریان میں پہونچا پھر تمام دروازوں کو طے کرتا ہوا اعلیٰ جنت میں پہونچ گیا ہاں اگر جنت کے طبقات الگ الگ ہوتے تو اعتراض بظاہر لازم آتا گو اس میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلایا جاوے سب دروازوں سے مگر داخل ہو ایک ہی سے اس طور سے بلانے میں اس کا اکرام زیادہ ہے لیکن تقریر مذکورہ کے بعد تو کوئی اعتراض ہی نہیں باقی جو امور کشف کے متعلق بیان ہوئے ہیں یہ تخمینیات اور مظنونات درجہ میں ہیں کوئی دلیل شرعی ان پر نہیں اور نہ انکی تکذیب پر کوئی نص ہے اگر چاہو اپنے دل کو سمجھا لو۔ غرض جنت کے آٹھ دروازوں میں سے ایک کا نام باب الریان ہے اس حدیث میں روزہ کی فضیلت بیان فرماتے ہیں کہ روزہ دار ہی اس دروازہ سے داخل ہونگے اور اطلاق لفظ سے روزہ سے مراد عام ہے نفل ہو یا فرض پھر جب نفل کی بھی اتنی فضیلت ہے تو فرض کی تو کیا کچھ فضیلت ہو گی اور روزہ کے فضائل تو بہت ہیں مگر یہ ایک فضیلت نہایت مزہ دار ہے کیونکہ پیاسے کو پانی کا نام سننے سے مزہ آتا ہے اسی واسطے نام بھی وہ لیا گیا کہ جسکے سننے سے فرحت ہو وہ کیا باب الریان یعنی تر و تازہ دروازہ جو پانی سے سیراب ہوا اور روزہ دار کو جیسی پانی سے فرحت ہوتی ہے اور کسی چیز سے کم ہوتی ہے اور پانی جیسا محبوب ہے دوسری چیز نہیں اور قاعدہ ہے کہ محبوب کا نام لینے سے بھی مزہ آتا ہے اگر مزہ نہ آتا تو ایک عاشق یہ شعر نہ کہتا اگرچہ وہ شراب ہی کو کہہ رہا ہے ؎

الا فاسقنی خمرا وقل لی ہی الخمر　　　ولا تسقنی سرا متی امکن الجہر

کہ شراب پلاتا جا اور اسکے ساتھ یوں کہتا جا کہ شراب ہے شراب ہے یہ محبوب کے نام سے لطف حاصل کر رہا ہے اور یہ چاہ رہا ہے کہ پلانیوالا زبان سے اس کا نام بھی لیتا جائے

۱۹۷

۱۳ ف

روزہ کی فضیلت

روزہ دار کی فضیلت

اس میں بھی مزہ ہے کوئی عاشق مزاج کبھی نہ کہیگا کہ محبوب کا نام لینا بے مزہ ہے غرض روزہ
میں سب سے زیادہ محبوب ہے پانی اسی واسطے میں نے ایسی حدیث چھانٹی جس میں پانی کا ذکر ہے
اور پانی بھی اللہ میاں کے یہاں کا جسکی یہ صفت ہے لا لغو فیہا و لا تاثیم ایک ہمارے
دوست ہیں اور ضابطہ سے ملازم وہ پانی پر بڑے ہی ولدادہ ہیں ایک روز انہوں نے
پانی بہت ہی پی رکھا تھا کسی نے کہا کہ کہیں تمہارا پیٹ نہ پھٹ جائے کہنے لگے کہ اگر محبوب
کے وصل میں جان بھی جاتی رہے تو کیا حرج ہے مجھے اسکے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا وہ کہ
انکے گاؤں میں قحط تھا ان بیچاروں کو روٹی پیٹ بھر نہیں ملتی تھی ایک روز انہوں نے دیکھا
کہ ایک دوسرے گانوں میں سے لوگ بھاگے جا رہے ہیں اس کا سبب دریافت کیا معلوم
ہوا کہ وہاں مرض ہیضہ کا پھیل رہا ہے اس لئے بھاگ رہے ہیں گانو والوں نے پوچھا کہ
یہ مرض کیسے ہوتا ہے کسی نے کہا کہ بہت سی روٹی کھا جانے سے ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ
مبارک مرض کبھی ہمیں نہ ہوا جب محبوب کے وصل میں مرنا قبول چاہے جان جاتی رہے مگر محبوب
مل جاوے پھر یہ حالت یہاں ہی کی غذاؤں کی ہے کہ زیادہ کھاؤ تو مرنے کی نوبت آجائے
اور حق تعالیٰ کے یہاں تو کتنا ہی کھالیں گے کچھ بھی نہ ہوگا اور پیٹ بھی نہ چلے گا البتہ پسینہ نکلیگا
جسمیں مشک کی خوشبو نکلے گی یہ خبر علانیہ ہماری تفریح کے بد دینوں کا منہ بند کرنے کو بھی
دیدی ہے کیونکہ بعض اہل سائنس اعتراض کرتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ غذا کھائیں
اور پیٹ بھی نہ چلے نہ اجابت کے ذریعہ سے فرضیت ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا منہ بند کرنے
کے لئے فرما دیا کہ جو فضلہ ہوگا بھی وہ پسینہ کے راستہ سے دفع ہوگا جسمیں خوشبو مشک کی سی
ہوگی اور غور کیا جاوے تو یہ اعتراض ہی فضول ہے جنت کی غذاؤں میں اتنا فضلہ ہی
نہیں جو اجابت کی حاجت ہو دنیا کے اندر اسکی نظائر بہت ہیں گی بعض غذائیں تو ایسی ہیں
کہ انکو کھا کر فضلہ بہت ہی خارج ہوتا ہے اور بہت سی ایسی غذائیں ہیں کہ ان کا فضلہ بہت
ہی کم نکلتا ہے جنت میں اللہ میاں نے اپنی قدرت کی مشین سے غذاؤں کو فضلات سے
ایسا صاف کیا ہے کہ ان میں رہا ہی نہیں اور کچھ غبار رہا بھی وہ اسیقدر رہے کہ صرف پسینہ
ہی سے نکل سکتا ہے اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہو مگر افسوس ہے کہ معترضین روزمرہ ایسی نظائر

ف ایک پیر جی کا لطیفہ

۱۹۸

۱۴

ف حق تعالیٰ کے یہاں کی غذائیں نہ ہضم ہونگی یعنی بد دینوں کو جواب

اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر تامل و فہم سے کام نہیں لیتے یہ کلام استطراداً آگیا تھا اب
مضمون سابق کی طرف عود کرتا ہوں جو باب الریان کے متعلق ہے یعنی دنیا میں ایسا پانی
کہاں باب ریان کے معنی ہیں وہ دروازہ پانی سے سیراب ہونیوالا دروازہ کا نام لیتے ہی سو
روتیں روئیں میں جان آگئی یہ دروازہ کا نام ہے جو انہیں کیلئے بہت ہی مناسب ہے
چنانچہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا افطار کی تعلیم فرمائی ہے اس میں بھی ایسی ہی مناسبت
ہے یعنی اس میں بھی پانی کا ذکر ہے جیسا کہ ایسے ہی ہوتے ہیں دعا یہ ہے ذہب الظماء وابتلت
العروق وثبت الاجر انشاء اللہ اور ایک یہ دعا بھی ہے اللھم لک صمت وبک آمنت
وعلیک توکلت وعلی رزقک افطرت۔ ذہب الظماء الخ کے معنی یہ ہیں کہ پیاس
جاتی رہی اور رگیں تر ہوگئیں اور خدا نے چاہا تو ثواب ثابت ہوگیا۔ رہا یہ شبہ کہ
سناتے کس کو ہیں بات یہ ہے کہ کسی کو نہیں سناتے بلکہ اللہ میاں کی نعمت کو یاد کرتے ہیں
زبان سے کہکر مزہ لے رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدہ بھی کرایا تو ایسا جیسے
لطف ہے دن بھر تو انتظار کا لطف اٹھایا اور شام کو روزہ افطار کرنے بیٹھے تو سیرابی
کی نعمت بھی حاصل ہوگئی زبان سے اس کا تذکرہ بھی ہوا واللہ عجیب لطف ہے معلوم رمضان
میں لوگ کیونکر بے روزہ رہتے ہیں میرے چار روزے بیماری کی وجہ سے قضا ہوئے تھے
دن میں کھاتے پیتے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے میں نے چوری کی ہے حالانکہ میں نے کوئی
کام برا نہیں کیا کیونکہ طبیب صاحب نے افطار کی اجازت دیدی تھی چار روزوں کے
بعد پھر افطار کو جی نہ چاہا اگرچہ ان ناغہ کے ایام میں کھانا پینا بوجہ خوف ضعف کے تھا کہ نہ کھانے
سے کہیں ضعف نہ بڑھ جائے مگر صاحب واللہ اس کھانے پینے میں ہرگز وہ لطف نہ تھا
جو افطار کر کے کھانے پینے میں آتا ہے پانچویں روز دماغ میں کچھ بے انتظامی ہوگئی میں نے
کہا کہ جاؤ اب میں پیتا ہی نہیں اور روزہ رکھ لیا میں تعجب کرتا ہوں ان لوگوں سے جو بلا عذر
روزہ نہیں رکھتے کیسے ان کا دل گوارا کرتا ہے بعض اسلامی ریاستوں میں سنا ہے کہ روزہ
نہ رکھنے پر جرمانہ تجویز ہوا ہے ان تو یہ حالت ہے کہ بعضے کھلم کھلا کھاتے پھرتے ہیں اور جان کر لوٹے
اس سے صاف کہدیتے ہیں کہ جب اللہ کی چوری نہیں تو بندوں کی کیا چوری میں کہتا ہوں کہ

ایسے لوگ بازار میں اپنی بی بی سے ہم بستر کیوں نہیں ہوتے کیونکہ جب اللہ میاں کی چوری نہیں تو بندوں کی کیا چوری اگر بازار والے دیکھ لیں گے تو کیا حرج ہے بلا عذر لوگوں کے سامنے کھاتے پیتے ہوئے پھرنا اس کا تو کیا ذکر ہے ادب یہ ہے کہ صاحب عذر بھی سب کے سامنے افطار نہ کرے غرض روزہ داروں کو کئی طرح کے لطف حاصل ہوتے ہیں روحانی لطف تو ہی ہم جیسے پیٹ کے کتوں کو بھی لطف ہے دیکھیا انتظار میں اس وقت کیسا لطف ہے کسی غیر محقق کا قول ہے،

ع جو مزہ انتظار میں دیکھا، پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا

غیر محقق اس لئے کہا کہ یہ کلام علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کیونکہ دنیا کے محبوبین کا لطف تو بیشک وصل ہونے پر ختم ہو جاتا ہے لیکن محبوب حقیقی کے قرب کا لطف غیر متناہی ہے کبھی ختم نہیں ہوتا وہاں تو یہ کیفیت ہے ے

دلارام در بر دلارام جو　　لب از تشنگی خشک و برطرف جو
نگویم کہ بر آب قادر نیند　　کہ بر ساحل نیل مستسقیند

ایک اور شعر ہے ے

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار　　گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دار

جن کی یہ شان ہے ان کی طلب بھی غیر متناہی ہے ایک شاعر طلب کے غیر متناہی ہونے کو بیان کرتا ہے ے

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش　　حسن ایں قصۂ عشق ست در دفتر نمی گنجد

عشق کا بھی کہیں پتہ نہیں حسن و جمال کا بھی کہیں پتہ نہیں مگر ہاں ہمہ جنت میں سیری بھی ہوگی اور لذت میں بھی ترقی ہوگی اور یہ جو بعض اہل حال کا مقولہ ہے کہ جنت میں ایک درجہ سے بعض عشاق ایسے ہونگے کہ وہ ہر وقت ارنی ارنی پکاریں گے اور یہ ان کا پکارنا ختم نہ ہوگا اور اس درجہ میں حور و قصور وغیرہ نہ ہوں گے تو یہ کشف مؤول ہے تاویل یہ ہے کہ شاید کسی ساعت قلیلہ کیلئے ایسا ہو مگر پھر سیری ہو جاوے گی اور اس حد کے بعد وہ چیزیں بھی ہونگی جیسے میدان حشر میں بعض تجلیات کی نسبت لوگ کہیں گے کہ آپ ہمارے رب نہیں ہیں ہم اپنے رب کو پہچانتے ہیں پھر دوسری صورت سے تجلی ہوگی اور یہ ہونگی دونوں تجلیاں

ف محبوب حقیقی کا لطف غیر متناہی

۲۰۰

۱۶ ف باوجود لطف کے غیر متناہی ہونے کے جنت میں سیری بھی ہوگی۔

ف بعض اہل کشف کے قول کی تاویل

حق تعالیٰ کی گو پہلی تجلی سے قناعت نہ ہوگی اس کے بعد جو تجلی ہوگی اس سے قناعت ہو جاویگی
چونکہ یہ کسی درویش کا قول ہے اس لئے میں نے تاویل کی ہے اگر اس تاویل کو کوئی نہ مانے
بلکہ ظاہر ہی پر محمول رکھے تو جانیئے ہم دوسرا جواب دینگے کہ ہم قرآن و حدیث کے خلاف
اس کشف کو نہیں مانتے کیونکہ جنت میں ایسا کوئی درجہ ہی نہیں کہ جہاں حور و قصور
نہ ہوں جنت میں سب کچھ ہوگا اور سیری بھی ہوگی سیری نہونا غلط ہے وہاں تو وہ
کیفیت ہوگی جسکو یاد کرکے اب یہ کہنا زیبا ہے کہ ؎

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم ۔ کہ شاید دست من بار دگر جانا من گیرد

یوں نہیں کہا کہ دست جاناں خود گیرم کیونکہ جاناں من گیرد میں اور ہی لطف ہے آپ کو
بشارت ہے کہ جنت میں آپ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوگا ان تجلی کی محیط کی لذت عشاق کو
اب بھی ہے وہاں اور بھی اتم ہوگی مزہ سے چین سے وہ آغوش میں لئے ہوئے ہیں ۔
پوری سیری اسی سے ہوتی ہے لہذا جنت میں پوری سیری ہوگی وہاں تجلی نام ہے
دور محیط ہے پھر احاطہ بھی بلا حجاب ۔ محب اور محبوب میں اگر کپڑا حائل ہو تو سیری نہیں ہوتی
اللہ میاں کپڑوں سے پاک ہیں البتہ حجابات درمیان میں ہیں جنت میں سارے حجابات
مرتفع ہو جاویں گے سوائے ردا کبریا کے کوئی حجاب نہوگا جسکی حقیقت ادراک کنہ کا
امتناع ہے نیز جنت میں سیری اسلئے بھی ہوگی کہ جنت لغب و بے کلی سے خالی ہے
وہاں انتظار و اشتیاق بعد کا نہوگا پس یہ کسی غیر محقق کا قول ہے کہ جو مزہ انتظار میں دیکھا
پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وصل یار میں اور زیادہ لطف ہے پیش رو زو
کا لطف کیا پوچھتے ہو پانی کے انتظار میں ایک لطف پھر پیتے وقت اس سے زیادہ لطف
پھر رگیں بھی تر ہوگئیں یہ تیسرا لطف پھر آخرت کے لطف کی خبر دی کہ باب ریان یعنی
وہ دروازہ تر بتر ہوگا جو اس میں داخل ہوگا وہ بھی تر بتر و سیراب ہو جائیگا اگر کسی کو خیال
ہو کہ ہم باب الریان کو کیا سمجھیں گے عربی تو جانتے ہی نہیں پھر یہ نام سنکر وہاں کیا مزہ آ دیگا
تو خوب سمجھئے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی وہاں سارے عربی داں ہو جاویں گے ۔
باب الریان کو بھی سمجھیں گے اندر اس کا نام بھی ریان ہوگا ۔ دیکھنے میں بھی ریان ہوگا یعنی

بعض نے کہا ہے کہ ریان کی اسناد باب کی طرف حقیقی ہے یعنی وہ دروازہ خود بھی تر و تازہ
ہوگا کہ اس میں نہریں ہونگی فوارے ہونگے وہ بھیگا ہوا ہوگا مگر یہ نہیں کہ اس میں کچھ ہوگی
بعض نے کہا ہے کہ اسناد مجازی ہے یعنی دروازہ کو ریان کہنا باعتبار ان لوگوں کے ہے
جو اس میں وارد ہونگے یعنی وہ تر و تازہ ہو کر جاویں گے اس کے بعد ایک گفتگو اس میں
ہے کہ جنت کی چیزیں جس حالت پر ہوں گی آیا وہ چیزیں خود بھی اس حالت کا ادراک کریں
یا نہیں بعض نے کہا ہے کہ انکو بھی ادراک ہوگا مثلاً دروازہ تر بتر ہوگا تو وہ اپنے تر بتر ہونیکا
ادراک بھی کریگا۔ اسی طرح اور چیزوں کا حال ہے و ان الدار الآخرۃ لهی الحیوان سے بظاہر یہی
مفہوم ہوتا ہے کہ آخرت سراپا حیوۃ ہے کیونکہ زیادہ مستعمل حیوان بمعنی مصدر ہے یہ ایسا
کہ جیسے زید عدل اور اگر صفت بھی ہو تو بمعنی ذی حیات ہوگی پس وہاں کی در و دیوار
میں بھی زندگی ہوگی نہ یہ ادبی گائیں گی نغمات پیدا ہوں گے درخت گائیں گے اور بظاہر
اس لیے کہا کہ کلام میں یہ بھی احتمال ہے کہ الدار کا مضاف مقدر ہو یعنی حیوۃ الدار الآخرۃ ہی الحیوۃ
باقی جنت کا بولنا خود حدیث میں آیا ہی ہے اور وہ بظاہر حقیقت پر محمول ہے یہی صوفیہ کا
مسلک ہے بعض اہل ظاہر خشک ہیں وہ کہتے ہیں کہ جنت مثل بولنے والے کی ہوگی جیسے
بیجان تصویر کو کہہ دیتے ہیں کہ ابھی جیسے اب بول پڑیگی یہ حیات کے قائل نہیں مگر یہ
محض تاویل ہے صوفیہ کا قول ظواہر نصوص سے مناید ہے ان کے نزدیک دوزخ بھی
ذی حیات ہوگی دلیل یہ ہے کہ ہل من مزید پکارے گی نیز اس میں اور بھی آثار حیات کے
پائے جاتے ہیں نیز بعض اہل کشف نے جہنم کی شکل کے بارہ میں کہا ہے کہ اس کی شکل
اژدھے کی سی ہے اس کے پیٹ میں سانپ بچھو علیٰ ہذا بھرے وغیرہ ہیں سارا جہنم اژدہے کی
صورت ہے اس تو ایک حدیث کے معنی بلا تاویل کے سمجھ میں آجاویں گے کہ حدیث میں
آتا ہے کہ جہنم میدان قیامت میں لائی جاویگی جسکی ستر ہزار باگیں ہونگی اور ہر باگ کو ستر ہزار
فرشتے پکڑے ہوئے ہونگے مگر پھر بھی قابو سے نکلی جاتی ہوگی اور کڑکتی ہوگی اور ہل من مزید
پکارتی ہوگی اس کے معنی صوفیہ کے قول پر اس طرح سمجھ میں آتے کہ چونکہ وہ ذی حیات ہے
اس لئے اس قسم کے آثار اس سے پائے جاویں گے بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو جس

ف

۲۰۲

۱۸

ف
دوزخ بھی ذی حیات ہے۔

یہ دلالت اہل باطن سمجھتے ہیں اور لوگ نہیں سمجھتے اور جاندار ہونے کی صورت میں اس کا اثر
فرحت میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اہل باطن کے مسلک پر سیرابی کی فرحت صائمین کو
بہت زیادہ حاصل ہوگی کیونکہ جب سنیں گے کہ باب الریان ذی حیات ہوگا تو یہ سمجھیں گے کہ
دروازہ میں داخل ہونے والے تو خوش ہوں ہی گے مگر وہ دروازہ بھی بوجہ ذی حیات
ہونے کے خوش ہوگا اور پھاٹک کے جاندار ہونے پر خلاف عادت ہونے کے خیال سے
تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ خلاف عادت بھی نہیں جیسے دنیا میں بچے کیلئے اماں جان
پھاٹک بنجاتی ہیں کہ لڑکا اس کے طریق خاص سے نکلتا ہے ایسی ہی وہ دروازہ ہوگا
اور یہ تعجب ایسا ہی ہے جیسے ایک ملحد نے اعتراض کیا تھا کہ جنت میں دودھ کی نہروں
کے واسطے اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جواب یہ ہے کہ دنیا میں دودھ تھن میں سے نکلتا
ہے اور خدا ہی پیدا کرتا ہے اگر وہاں وہ نہر ہی خاصیت میں ایک بڑا تھن ہو اور اس میں
دودھ پیدا کر دیا جاوے تو کیا تعجب کی بات ہے اسی طرح جیسے یہاں جاندار پھاٹک
پیدا کئے ہیں وہاں بھی پیدا کر دیں تو کیا محل تعجب ہے اور قرآن سے بھی روزہ دار کیلئے
دو نعمتیں ثابت ہوتی ہیں سیرابی کی بھی اشربوا سے اور سیری کی بھی کلوا سے چنانچہ ارشاد
ہے کلوا واشربوا ہنیئا بما اسلفتم فی الایام الخالیۃ پس روزہ دار ریان بھی بنائے
جائیں گے اور شبعان بھی اور حدیث میں گو شبعان صراحۃً مذکور نہیں مگر ریان خود شبعان پر
دلالت کرتا ہے کیونکہ پانی پینے کا لطف پیٹ بھرنے ہی پر آتا ہے دوسرے کریموں کی عادت
ہے کہ کھانا کھلا کر پانی پلایا کرتے ہیں۔ خالی پیٹ پر نہیں پلاتے ہاں بعض بخیلوں کی یہ عادت
ہوتی ہے کہ پانی سے مہمان کا پیٹ بھرنا چاہا کرتے ہیں تاکہ کھانا کم کھاوے کریموں کی عادت
یہ ہے کہ کھانے کے بعد پانی دیتے ہیں قبل نہیں دیتے تاکہ کھانا خوب کھایا جاوے پس ریان
عادۃً شبعان کو مستلزم ہے باقی ریان کے عنوان میں صرف پانی کی بشارت اس لئے دی
کہ صائم کو زیادہ مرغوب یہی ہے اسی کی بشارت میں ارشاد ہوا ہے کہ لا یدخلہ الا الصائمون
یعنی اس میں روزہ دار ہی جائیں گے اور میں نے جو اوپر جنت کے نقشہ کے ذکر میں ایک
مثال درخت کی بیان کی ہے کہ جڑ عرض میں کم ہوتی ہے اور شاخیں زیادہ

ہوتی ہیں اسپر جنت کے درختوں کے متعلق ایک مضمون یاد آگیا اس کو بھی عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جنت کے درخت کی جڑ اوپر اور شاخیں نیچی ہونگی مگر اس کا ظاہری مطلب مراد نہیں کہ جڑ تو آسمان کی طرف ہو اور شاخیں زمین کی طرف جیسے کوئی چھوٹے سے درخت کو الٹا جمادے کہ اسکی جڑ اوپر کو شاخیں نیچے کو ہوجادیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جڑ تو اونچی سطح پر ہوگی اور اسی سطح کے گرداگرد اس سے نشیب میں خلا ہوگا اس میں شاخیں جڑ سے بھی نیچے لٹکی ہونگی جیسے کوئی پھلواری گملہ میں رکھکر وہ گملہ کسی اونچے ستون پر رکھدیا جاوے اور اس کی شاخیں گملہ سے بھی نیچے پہنچ جاویں اور حکمت اس میں یہ ہوگی کہ اہل جنت لیٹ کر بیٹھکر ہر طرح پھل توڑ سکیں۔ مثلاً جڑ زمین سے دس فٹ اونچی ہو اور شاخیں زمین سے دو فٹ بلند ہوں۔ جیسے دنیا میں اونچے چبوترہ پر درخت ہوتے ہیں جنکی شاخیں زمین کے متصل ہوتی ہیں یہانتک منجملہ تین تقریروں کے ایک تقریر کہ جو بیان ہوئی اس تقریر کا نام الریان من رمضان مناسب ہے یعنی ریان کے حصول کی بشارت رمضان کی وجہ سے اور جو مضمون اس سے پہلے جمعہ میں بیان کرتا اگر طبیعت اچھی ہوتی وہ اس آیت کے متعلق ہونا جو آئندہ ذکر کرتا ہوں یعنی شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن هدی للناس وبینات من الهدی والفرقان هدی للناس میں تنوین تعظیم کی ہے یعنی بڑی ہدایت ہے لوگوں کیلئے اور دلائل واضحہ میں یہ عطف تفسیری ہے "من الہدی" میں من تبعیضیہ اور الف لام جنس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور دلائل واضحہ میں ان شرائع سماویہ میں سے جنکی شان ہدایت ہے یعنی شرائع سماویہ تو متعدد ہیں ان سے ایک قرآن بھی ہے اب "من" کا تبعیضیہ ہونا واضح ہوگیا اور یہ تخصیص بعد تعمیم ہے یوں تو تمام کتب سماویہ اور تمام شرائع کی شان ہدایت ہے مگر اس تخصیص سے قرآن کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے اور فرقان لوازم ہدی سے ہے کیونکہ وضوح حقیقت کے بعد امتیاز بین الحق والباطل لازم ہے۔ یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ موقع تو ہے رمضان کی فضیلت بیان کرنیکا چنانچہ اوپر سے صوم ہی کا ذکر چلا آرہا ہے اور بیان کی گئی قرآن کی فضیلت اسکی کیا وجہ ہے جواب یہ ہے کہ فضیلت بیان کرنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہے

ف
جنت کے درختوں کی جڑ اوپر اور شاخیں نیچے ہونیکا مطلب

۲۰
۲۰

ف
کریمہ شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن کی تفسیر

ف
اشکال اور اسکا جواب قابل دید

ایک تو یہ کہ خود اس چیز کی فضیلت بیان کریں اور ایک یہ کہ فضیلت تو بیان کریں دوسری شئے کی اور اس کی فضیلت اس سے لازم آجاوے اور یہ احسن طریق ہے کیونکہ اس میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی ہے اسی کو کہتے ہیں ؎ خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں۔ مثلاً ہمکو حضرت حاجی صاحبؒ کی فضیلت بیان کرنا ہو تو اس کا ایک طریق تو یہ ہے کہ خود ان کی فضیلت بیان کریں اور دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہیں کہ حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا گنگوہیؒ جیسے شخص ہیں اور یہ احسن طریق ہے پس اسی طریق سے رمضان کی فضیلت اس طرح لازم آگئی کہ ماہ رمضان وہ ہے جسمیں ایسا اور ایسا کلام نازل ہوا ہے جس ماہ کو اتنی بڑی چیز سے ملابست ہوگی تو وہ ماہ کتنی فضیلت رکھتا ہوگا ظاہر ہے کہ بڑی فضیلت والا ماہ ہوگا۔ اب ماہ رمضان میں نزول قرآن سے برکت ہونیکے دو معنی ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ برکت اسکو قرآن کے نازل ہوتے سے حاصل ہوئی ایک یہ کہ برکت اس ماہ میں پہلے سے تھی اور قرآن کے نازل ہونے سے یہ ماہ نور علی نور ہوگیا ہو۔ اسی کے مناسب نعت کا یہ شعر ہے ؎ نبی خود نور اور قرآن ملا نور۔ نہ ہو پھر ملکے کیوں نور علی نور۔ اسی طرح یہاں ہوگا کہ رمضان خود نور پھر قرآن دوسرا نور بس اس سے ملکر یہ نور علی نور ہوگیا اور اس کی فضیلت کے بیان میں قرآن شریف کا نازل ہونا ہی کافی ہے اور کسی فضیلت کے بیان کی حاجت نہیں اور چونکہ رمضان اور قرآن میں مناسبت ہے اس لئے اعلیٰ درجہ کی عبادت اس ماہ میں تلاوت قرآن تجویز کیجاتی ہے اور تلاوت قرآن کی طرف اس ماہ میں میلان بھی زیادہ ہوتا ہے اسی لئے میں اپنے احباب کو مشورہ دیا کرتا ہوں کہ قرآن کی تلاوت کو اس ماہ میں دوسری عبادات پر غالب رکھیں اور اسی لئے میں نے طالبین کو اس ماہ میں کچھ تعلیم[*] نہیں جی یوں چاہتا ہے کہ اس ماہ میں تلاوت کو غالب رکھیں اور اس تجویز کی اس سے تقویت ہوتی ہے چنانچہ جبرئیل علیہ السلام حضور کے ساتھ رمضان میں قرآن کا دور کرتے تھے اور وفات کے سال دو دفعہ دور ہوا ہے صحابہؓ کا اور امت کا یہی عمل رہا ہے

ف
رمضان میں برکت ہونیکے دو معنی ہیں

ف
رمضان میں اعلیٰ درجہ کی عبادت تلاوت قرآن ہے

۲۰۵

۲۱

---

[*] حضرت کی عادت شریفہ ہے کہ رمضان میں تعلیم و تلقین خاص کو بند کر دیتے ہیں ہاں افادات عامہ پہلے سے زیادہ ہو جاتے ہیں ۱۲ ظ پھر بعد میں اس میں بھی باقتضاء وقت کچھ ترمیمیں ہوتی رہیں ۱۲ منہ۔

کہ رمضان میں ختمات قرآن کا خاص اہتمام کیا ہے علماء کا بھی یہی قول ہے کہ اس ماہ میں
تراویح میں ایک دفعہ کلام اللہ کے ختم کو سنت موکدہ کہا ہے لیکن سنت اس وقت
ہے کہ اس میں کوئی مفسدہ نہ ہو ورنہ اگر مفسدہ ہو تو اسکو ترک کر دیں گے مثلاً ٹھیکہ دار
حافظ کے سوا اور کوئی نہیں ملتا ہو چونکہ بعض جگہ اس سنت پر عمل کرنے سے یہ خرابی پیدا
ہوتی ہے اسلئے وہاں سنت کو ترک کر دیں گے۔ آجکل حافظ دو قسم کے ہیں ایک تو بشرط شئ
کے مرتبہ میں یعنی کلام اللہ سنانے پر شرط کرلیں یہ صورت تو جائز نہیں کیونکہ سنانے پر اجرت لینا
حرام ہے اس موقع پر سنت پر عمل چھوڑ دیں گے اور دوسری شرط لاشئے کے مرتبہ میں یوں
کہیں کہ ہم جب پڑھیں گے کہ تم ہمیں کچھ نہ دو ۔ اور گو ایک احتمال لابشرط شئے کا بھی ہے لیکن
تتبع عرف سے اس کا مرجع بھی ان ہی دو قسم سے ایک قسم ہے اسلئے تقسیم واقعی ثنائی ہی رہی گو
عقلی ثلاثی ہے بہر حال اگر حافظ بشرط لاشئے ملجاوے۔ تو کلام اللہ سننے میں کاہلی نہ کرے
بلکہ سننے کے لئے مستعد ہونا چاہیے خیال کرنے کی بات ہے کہ لوگ دنیا کے واسطے کتنی محنت
کرتے ہیں اسکے مقابلہ میں یہاں تو کچھ بھی نہیں مگر بے رغبتی کی یہ حالت ہے کہ بعض کو تراویح
ہی میں نیند آتی ہے سو اس کا علاج کرنا چاہیئے آسان علاج ایک تو یہ ہے کہ سیاہ مرچ
کھالو اس سے نیند جاتی رہے گی اور سیاہ مرچ نافع بھی ہے البتہ لال مرچ مضر ہے
اس کے مضر ہونے پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بزرگ دماغ سے معذور تھے جب
ان کے سامنے مسلمانوں کی کسی قسم کی خرابیوں کا ذکر ہوتا تو یوں فرماتے کہ یہ سب فساد
مرچوں کا ہے جو بات بھی ہوتی یہی فرمادیتے ایک شخص کہنے لگے کہ کیا بے جوڑ بات ہے جی نے
ہنسکر کہا بڑی جوڑ دار ہے اس طرح سے کہ مرچوں سے کھانا مزہ دار ہو جاتا ہے اور بوجہ
مزہ دار ہونیکے کھایا بہت جاتا ہے اور زیادہ کھانے سے قوت بہیمیہ میں ترقی ہوتی ہے اور
اور وہ باعث ہوتی ہے فساد کا ہم تو بزرگوں کے قول کی تاویل کریں گے گو وہ بزرگ کیسے ہی
ہوں خیر یہ تو ہنسی کی بات تھی باقی نیند کا اصل علاج یہ ہے کہ پانی کم پیو شیوخ اہل مجاہدہ کا قول ہے کہ
نیند کا مادہ پانی سے ہے اسکو امام غزالی نے لکھا ہے پھر بھی اگر نیند زیادہ آوے تو سیاہ مرچ چبالو آخر خدا
تعالیٰ سے کچھ لینا بھی ہے یا نہیں حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ایطمع کل امرء منہم ان یدخل

ف: رمضان میں ایک ختم قرآن تراویح میں سنت موکدہ ہے

ف: آجکل زمانہ کے حافظ دو قسم کے ہیں

۲۰۶

۲۲ ف: نیند کا ایک آسان علاج

ف: شیوخ اہل مجاہدہ کا قول کہ نیند کا مادہ پانی سے ہے

جنۃ نعیم کلا کیا ہر شخص اس کی طمع رکھتا ہے کہ نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جاوے ایسا
ہر گز نہیں یعنی بدون کئے کچھ نہ ملیگا پہلے اعمال کے ذریعہ سے جنت کی قابل تو ہو بدون
اعمال کئے کیا منہ ہے جنت کے لینے کا پس رمضان میں ہمت کر کے ایک قرآن تو سن ہی لو
بہر حال سنت ہے۔ آثار سے۔ بزرگوں کے معمولات سے۔ ذوق سے ثابت ہوتا ہے اس ماہ
میں قرآن کی تلاوت خاص درجہ میں مطلوب ہے۔ یہ دوسری تقریر ہے اس کا نام القرآن
فی رمضان رکھنا مناسب ہے۔ دونوں تقریروں میں مناسبت بھی ہے کہ پہلی تقریر میں رمضان
کی فضیلت کا بیان تھا اور اس میں قرآن کا بیان ہے جسمیں ایک وجہ تو مناسبت کی یہ ہے
کہ قرآن کا نزول رمضان شریف میں ہوا ہے دوسرے نص حدیث قرآن شریف اور روزہ
دونوں قیامت کے دن شفاعت کریں گے رمضان کہیگا میں نے اسکو پیاسا رکھا تھا اسواسطے
اس شخص کو بخشدیجئے اور قرآن کہیگا کہ میں نے اسکو جگایا تھا اسلئے میری شفاعت قبول فرمائیے
پھر لفظ رمضان کو ان ایام صیام سے لفظی مناسبت بھی ہے کہ رمض سخت گرمی کو کہتے ہیں
اصل وجہ تو اس کی یہ ہوئی تھی کہ جب مہینوں کے نام تجویز ہوئے تھے تو ان ایام میں
سخت گرمی تھی اس لئے اسکا رمضان رکھا پھر خدا تعالے نے ان ایام میں عبادت ایسی
مقرر کی کہ اگرچہ سردی ہی ہو تب بھی بہ نسبت اور ایام کے اس میں کچھ تو تپش ہوتی ہی ہے
یعنی بھوک کی یا پیاس کی تپش یہاں دوسری تقریر ختم ہوئی۔

اب تیسری تقریر رہ گئی اس میں شب قدر کا بیان ہے اسکو تقریر بالا سے مناسبت
یہ ہے کہ جیسے رمضان شریف میں قرآن نازل ہوا اسی طرح لیلۃ القدر میں نازل ہوا ہے
چنانچہ ایک جگہ تو یہ ارشاد ہے شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن اور دوسری جگہ یہ
ارشاد ہے انا انزلناہ فی لیلۃ القدر اور لیلۃ القدر کا رمضان میں ہونا نصوص حدیث
سے ثابت ہے۔ لہذا پس دوسری اور تیسری تقریر میں بھی پوری مناسبت ہو گئی اب
شب قدر کے متعلق بعض ضروری باتیں بیان کرتا ہوں ایک یہ کہ آجکل اکثر لوگ یہ پوچھا کرتے
ہیں کہ شب قدر میں کیا عبادت کریں اس کا جواب یہ ہے کہ دن کو تو زیادہ تر تلاوت میں صرف
کرے تدبر سے تلاوت کرے اگر تجوید نہ آتی ہو تو کم از کم بقدر ضرورت اسکو سیکھے اور رات

ف ماہ رمضان کو ایام رمضان سے مناسبت ہونے کا بیان ۲۲ ۲۰۷

ف تیسری تقریر میں شب قدر کا بیان

ف شب قدر کی عبادت کا بیان

کو بھی حق تلاوت ادا کرے اور لیلۃ القدر میں زیادہ جاگے کچھ تلاوت کچھ نوافل میں مشغول رہے اور دس دن اعتکاف کی مشروعیت میں یہ بھی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ شب قدر کا جاگنا نصیب ہو کیونکہ اعتکاف مسجد میں ہوگا اور جب یہ مسجد میں پڑا رہیگا تو کوئی تو اٹھے ہی گا اسکو بھی توفیق ہوجاویگی۔ پھر یہ ایک لطیفہ رحمت دیکھئے کہ اللہ میاں نے اعتکاف کے دس دن معین کئے اور لیلۃ القدر کی پانچ راتیں جنمیں ایک ایک دن کا ہر دو رات کے بیچ میں فاصلہ بھی کردیا تاکہ آسانی ہوجائے گئے ہیں کہ جو تکان ایک رات کے جاگنے سے ہوگیا ہے وہ ایک دن آرام کرنے سے جاتا رہے آج اٹھارہ تاریخ ہے اور کوئی خبر اسکے خلاف ابتک نہیں ملی پس جس مسجد میں جماعت ہوتی ہو اسمیں بیس تاریخ یعنی پرسوں کو غروب آفتاب سے پہلے اعتکاف کی نیت کرکے جا بیٹھیے اور چاند رات کو نکل آوے اگر تیس کا چاند ہو تو دس دن پورے ہوجائیں گے اور اگر انتیس کا ہوا تو گو تعداد میں نو دن ہونگے مگر ثواب دس دن کا ملیگا اس اعتکاف میں علاوہ اور حکمتوں کے ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ ان دنوں میں شب قدر نصیب ہوجاتی ہے جسمیں عبادت کرنا ایک ہزار ماہ کی عبادت سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے جو اتنی سال سے بھی زیادہ ہوتا ہے اتنی تو عمر بھی شاذونادر ہوتی ہے پس اسی بنا پر ایک شب قدر میں جاگنا ایسا ہے گویا ساری عمر سے بھی زیادہ عبادت کی جسکا مطلب دوسرے عنوان سے یہ ہوا کہ ساری عمر بھی عبادت کی اور مرنے کے بعد بھی کچھ دنوں عبادت کی۔ اتنا ثواب ہے اس رات میں عبادت کا کہ ایک رات کی عبادت تمام عمر کی عبادت سے بڑھجاتی ہے تو ضرور اس کی کوشش کرے اگر ساری رات نہ جاگ سکے اور نیند کا غلبہ ہوا اور اکثر حصہ جاگ سکے تو بھی شب قدر کی فضیلت ملیگی پس سستی نکرے اور نیند نہ آنے کی تدابیر کرے مثلاً یہ کہ رات کو کھانے پینے میں قدرے کمی کرے اگر پھر بھی ضرورت ہو تو کالی مرچ چباوے اور جو بھی تدبیر یا نیند نہ آنے کی ہوں سب کرے اور اگر باوجود تدبیر کرنے کے پھر بھی نیند غالب ہو تو وہ نیند معتبر ہے یعنی پھر سو رہے لیکن یہ نہیں کہ ذرا سی نیند آئی اور پڑ کر سو رہے۔ اور نیند کے غلبہ کی صورت کو اسطرح سمجھو کہ ایک بڈھے کی حکایت ہے کہ وہ پڑھ رہے تھے "کریما بہ بخشائے برحال ما" اور نیند میں نکل رہا تھا اری حال جب

حاشیہ:

ن اعتکاف کی حکمت

۲۰۸ ن شب قدر کی عبادت کی فضیلت ۲۴

یہ نوبت آجاوے تو سویرے ہے کیا لطف و رحمت ہے کہ ایک رات کی عبادت کو ہزار ماہ کی برابر قرار دیدیا اور پھر نیند کے غلبہ کا بھی اعتبار فرمایا اور نیند کے غلبہ کی صورت میں اکثر حصہ رات کے جاگنے کو بھی فضیلت شب قدر کی مرحمت فرمائی ؎ طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا من لعنایۃ رکنا غیر منہدم۔ ہمارے لئے بڑی بشارت سنو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عنایت الٰہی کے رکن ہیں آپ نے فرمایا ہے کہ میں ایک رحمت ہوں کہ تحفہ بنا کر مجھکو بھیجا ہے "انا رحمۃ مہداۃ" مگر ہماری وہ حالت ہے کہ کھائیں اور غرائیں اور پھر کہیں کہ لاتبے ثواب الجنۃ جن کا مقام ناز کا ہو اگر وہ کچھ کہدیں تو زیبا ہے مگر ہر ایک کو ان کی نقل کرنے کا حق نہیں ؎ ناز را روے ببا ید ہمچو ورد۔ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد۔ اس مقام کو اصطلاح میں ادلال کہتے ہیں جو ہر ایک کا مقام نہیں جنکا مقام ادلال ہے ایسی باتیں کہنا ان مرتبہ ہے نہ کہ اہل اضلال کا حضرت رابعہ بصریہ جن کا مرتبہ ناز کا تھا وہ حج کو گئیں جب حج کر چکیں تو کہتے ہیں کہ میں ثواب کی ہر حالت میں مستحق ہو گئی اگر حج قبول ہوا ہے تب تو نتا ہر ہے اور جو قبول نہیں ہوا تب بھی ثواب کی مستحق ہوں کیونکہ یہ عاشق کے لئے بڑی سخت مصیبت ہے کہ وہ محبوب کی درگاہ میں آوے اور محروم واپس جائے ؎ از در دوست چہ گویم بعنوان رفتم۔ ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم۔ تو اس صورت میں تو میں مصیبت زدہ ہوں گی کہ میرا حج مردود ہو گیا اور آپ نے مصیبت پر بھی اجر کا وعدہ فرمایا ہے بہر حال ثواب دینا پڑے گا میں ٹلوں گی نہیں اور جو اہل ناز نہ ہو تو اسکو تنبیہ کرتے ہیں ؎ ناز را روئے ببا ید ہمچو ورد ؛ چوں نداری گرد بدخوئی مگرد ؛ پیش یوسف نازش و خوبی مکن ؛ جز نیاز و آہ یعقوبی مکن ؛ چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش ؛ ہمچو او باگریہ و آشوب باش۔ ایک درویش نے حضرت ابراہیم ابن ادہم کو دیکھکر ناز کیا تھا حالانکہ اس کا مرتبہ ایسا نہ تھا پھر دیکھئے اس کا کیا حشر ہوا قصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ابن ادہم سلطنت کو ترک کرکے ایک جنگل میں پہونچے وہاں ایک درویش رہتا تھا کہ اسکو غیب سے کھانا آتا تھا اس نے خیال کیا کہ اگر یہ شخص یہاں ٹھہر گیا تو میرے کھانے میں کمی ہوگی اس نے کہا کہ یہاں ٹھہرنے کا حکم نہیں ہے جیسے موذنین کی اکثر عادت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم جہاز میں عدن پہونچے سیر کو جی چاہا اس لئے وہاں اترے شب کو ہم ایک مسجد کے

حجرہ کی چھت پر جا کر پڑے۔ مؤذن صاحب آئے اور کہا کہ نکلو یہاں سے میں تو بولا نہیں اس خیال سے کہ بحث کی یہاں گنجائش نہیں اور یہ خیال کیا کہ جیسا بنے پڑے رہو کوئی نکالے گا نکل جائیں گے۔ ایک سندی سوداگر بھی ہمراہ تھے جو عرب میں تجارت کرتے تھے وہ بولے ہم عرب ہیں اور ہمیشہ یہاں ٹھہرتے ہیں۔ مؤذن ہمکو عرب ہی سمجھا پھر تو کہنے لگا کہ یہاں بیٹھے ہو مسجد کے اندر قالین بچھے ہیں ہوا سے حفاظت کا انتظام ہے وہاں چلو چنانچہ وہاں لے گیا اور خوب خاطر کی اسی طرح وہ درویش چھپری والا گھبرایا وہ بھی صاحب کرامت تھا اس کو غیب سے روٹی ملتی تھی مگر وہ حالت غربت سے فقیر ہوا تھا اس کا وہی حوصلہ تھا وہ بڑبڑایا اور کہا کہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ نے فرمایا کہ میں روٹی نہیں مانگتا تب اسکو تسلی ہوئی۔ مجکو روٹی سے تسلی ہونے پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک سچے بزرگ سے ایک گانوں کے لوگ مرید ہو گئے ان کے پہلے پیر جو آئے اور یہ قصہ معلوم ہوا تو ان بزرگ کی قوم کا نام لیکر کہنے لگے کہ فلانی قوم میں بھی کہیں بزرگ ہوئے ہیں ایک دانشمند دیہاتی بولا کہ یہ بات تو بزرگ جانتے ہوں گے کہ کس قوم کے بزرگ ہوتے ہیں کس قوم کے نہیں ہوتے مگر ایک بات تو وہ ہم سے فرما گئے ہیں کہ پہلے پیر کا بھی حق سمجھنا۔ اسپر پیر صاحب کہنے لگے کہ خیر وہ بھی بزرگ آدمی ہیں۔ مجکو ایک جگہ جانیکا اتفاق ہوا وہاں قریب مقام میں ان لوگوں کے ایک پیر تھے ان کو خیال ہوا کہ شاید واعظ یہ میری جڑ کاٹیں گے وہ خود بھی وہاں آئے اور ایک مولوی صاحب کو بھی اپنے ساتھ لائے کہ شاید بحث کی نوبت آئے تو ان کو مقابل بنا دینگے آخر وعظ ہوا تو میں نے بیان کیا کہ میں ایک کام کی بات بتاتا ہوں کہ دین کی باتیں تو اہل علم سے پوچھو اور ان کو کوئی نذرانہ وغیرہ مت دو اور مالی خدمت پیروں کی کرو مگر دین کی باتیں پوچھنے کی تکلیف ان بزرگوں کو مت دیا کرو بس مسائل کے لئے تو مولویوں کو رکھو اور خدمت کے لئے فقیروں کو۔ ان کو پریشان مت کرو ہاں ان کی خدمت کرو اور مولویوں کو ایک پیسہ مت دو پیر صاحب خوش ہو گئے اور میرے خوب ہاتھ چومے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ جتنے بدعتی ہیں اگر ہم لوگ ان کی تنخواہ مقرر کر دیں تو سب ہماری سی کہنے لگیں کیونکہ ان کی سب بدعات

۲۱۰

کھانے کے لئے ہیں ورنہ اگر اس طرف سے یکسوئی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائیں بطور
نمونہ کے ایک واقعہ لکھنؤ کا عرض کرتا ہوں وہاں دستور ہے کہ الگ الگ کھانا رکھکر
اور مردوں کے ساتھ نامزد کر کے جداجدا فاتحہ دلواتے ہیں کہ اس کا ثواب فلاں کو پہونچے
اور اس کا فلاں کو بعض نے مجھسے کہا کہ علماء نہ معلوم جدی جدی فاتحہ کو کیوں منع کرتے
ہیں۔ میں نے کہا نہیں تم الگ الگ ہی دلواؤ مگر فاتحہ دینے والے پیر جیون کو کچھ مت
دو جب دیکھیں گے کہ فاتحہ تو بس بار دینا پڑی اور ملا کچھ بھی نہیں انشاء اللہ پہلے ہی دن وہ
بھی کہنے لگیں گے کہ الگ الگ کی ضرورت نہیں کہنے لگیں گے کہ ان قیدوں کی ضرورت
نہیں یہ تو ساری روٹیوں کی باتیں ہیں۔ ایک مسجد کا قصہ ہے کہ وہاں ایک ملا رہتے تھے
ایک روز ایک بڑھیا عورت روٹی لائی وہ وہاں اسوقت نہ تھے ایک مسافر تھا وہ روٹی
اسکو دیدی ملاجی آئے اور ان کو قصہ معلوم ہوا انہوں نے سوچا کہ یہ تو برا راہ نکلا اسکی
بندش اگر نہ ہوگی تو آئندہ جانے کیا ہو سہ سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل؛ چو پر شد نشاید گذشتن
بہ پیل۔ بس لاٹھی لیکر مسجد میں دوڑ نا اور ادہر ادہر لاٹھیاں مارنا شروع کیا بڑھیا نے بھی
سنا اور تمام لوگ جمع ہوگئے یہانتک کہ اخیر میں ملاجی بیہوش ہوکر گر گئے۔ لوگ کہنے لگے
ملاجی کو کیا ہوگیا وہ بولے کہ میرے پاس مت آؤ میرا اس مسجد میں گذر نہیں ہوگا لوگوں
نے کہا آخر بات تو بتلاؤ کہنے لگے بات کیا بتلاؤں بات یہ ہے کہ میں تو یہاں کے سب
مردوں کو جانتا ہوں میرے پاس جو کچھ آتا تھا سب کو مناسب طور پر ثواب بانٹ کر
کھالیتا تھا وہ حصہ لیکر چلے جاتے تھے آج اجنبی شخص کو کھانا پہونچنے پر مردوں کو کچھ ملا نہیں وہ
سب مردے میرے سر ہوگئے میں ہٹاتے ہٹاتے تھک گیا تو ہر روز کہانتک ان کا مقابلہ کرونگا
لوگوں نے کہا کہ بھائی تجھکو ہی دیا کریں گے کہیں مت جائیں پڑا رہ صاحبو! لوگ ایسی استادیاں
کرتے ہیں مولویوں نے سب کی جڑ کاٹ دی ہے اسلئے سب ان سے ناخوش ہیں خیر تو وہ درویش یہ
سنکر کہ میری روٹیوں میں سے نہ بانٹیں گے خوش ہوگیا اور حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کو جگہ ٹھہرنے کی دیدی
کھانے کے وقت اس کے پاس معمولی روٹی سالن اور مٹی کے پیالہ میں پانی آیا اور ان کے پاس غیب
سے ایک خوان لگا ہوا آیا جسمیں رنگارنگ کے کھانے تھے تمام جنگل اس کی خوشبو سے

۲۱۱

۲۷

بہک گیا وہ درویش جانتا تھا کہ یہ ابراہیم ہیں جو اپنی سلطنت کو چھوڑ کر فقیر ہوئے ہیں تو وہ حق تعالیٰ سے کہنے لگا کہ کیا یہی انصاف ہے ہم تو اتنے دنوں کے خادم ہیں اتنی مدت مجاہدات میں گذری ہمیں تو معمولی روٹی اور سالن دیا جائے اور اس نے نہ ابھی زیادہ عبادت کی نہ مجاہدہ اور پھر یہ خاطرداری وہاں سے حکم ہوا کہ بکومت اپنی حیثیت یاد کر کہ تو کون تھا ایک گھس کھدا تھا اور اس کی حیثیت کو دیکھ کہ بادشاہت چھوڑ کر آیا ہے اگر منظور نہیں تو فلاں درخت کی جڑ میں کھرپا جالی رکھا ہوا ہے اسکو سنبھال وہ درویش جوتیاں لگ کر سیدھے ہو گئے۔

غرض یہ ہے کہ ہر ایک کا منہ نازکا نہیں حضرت رابعہؒ کا منہ نازکا تھا مگر جن کا منہ نازکا نہیں وہ بھی بزبان حال نازکر رہا ہے کہ سوئیں یا جاگیں اجر لینے کو تیار البتہ اگر نیت جاگنے کی ہو اور عذرت سو گئے تو پھر ہر حالت میں اجر ہے پھر تو وہی بات ہے جیسے بعض ہندوؤں کا مقولہ ہے کہ مسلمان سب طرح مزہ میں ہیں پڑھ جائیں تو امیر کھٹ جائیں تو فقیر مر گئے تو پیر مسلمان ہر حال میں اچھا ہے۔ جاگتے اجر سوتے اجر سو یہ نیت کی برکت ہے مگر ارادہ تو جاگنے کا کرو ایک تدبیر رات کے جاگنے کی اور یاد آئی کہ دن کو سو رہا کرو اگر باوجود ان تدابیر کرنے کے پھر سو گئے تو اجر ملیگا۔ غرض اپنی طرف سے کوشش کرو اور سمجھ لو کہ بدون کئے کچھ نہیں ملتا اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں یہ تینوں تقریریں ہیں اگر تینوں دفعہ بیان کرتا تو مبسوط ہوتیں۔ مگر مختصراً سب کچھ بیان کر دیا اللہ میاں عمل کی توفیق دیں اس اخیر تقریر کا نام نقصان فی رمضان مناسب معلوم ہوتا ہے اور مجموعہ کا نام مثلث رمضان۔ فقط

اشرف علی۔ ۱۸ شوال ۱۳۵۲ھ

۲۱۲

۲۸

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

٢١٣

کا

٢٩

وعظ مسمی بہ

العتق من النیران فی رمضان

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ١

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمی بہ

العتق من النیران فی رمضان

این	متی	کم	کیف	کم	من بین	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کیسے ہوا	کتنے آدمی تھے	کس نے بیان کیا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی کیفیت	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۲۵ رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ	۱ گھنٹہ ۲۰ منٹ					حکیم محمد مصطفی صاحب بجنوری		

خطبہ ماثورہ اما بعد فقد قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم ہو شہر اولہ رحمۃ و اوسطہ مغفرۃ واٰخرہ عتق من النیران۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ آج جس مضمون کا بیان ہے وہ ایک مضمون ہے ان چار مضامین میں سے جو چار جمعوں کے لئے تجویز ہوئے تھے جمعہ گذشتہ میں تین مضامین کا بیان مختصراً کیا گیا تھا اسوجہ سے کہ پہلے دو جمعوں میں بیان کا اتفاق نہیں ہوا جسکی وجہ اس سے پہلے جمعہ میں عرض کردی گئی تھی۔ آج چوتھے مضمون کا بیان مستقلاً ہوگا کیونکہ خیریت کی شرط متحقق ہوگئی اس لئے بیان کی بھی نوبت آئی (اسکے قبل کے جمعہ میں وعظ شلث رمضان میں بوجہ کسل طبع بشرط خیریت بیان کا وعدہ ہوا تھا) جو الفاظ حدیث اسوقت تلاوت کئے گئے ہیں ان میں ایک خاصیت ختم رمضان کی بھی بیان ہوئی ہے اور اب رمضان قریب ختم ہے اس لئے اس حدیث کو بیان

کے لئے اختیار کیا گیا۔ ہرچند کہ اس حدیث میں ایک خاصیت اوّل رمضان کی اور ایک اوسط رمضان کی بھی بیان ہوئی ہے مگر اسوقت بوجہ مناسبت وقت کے زیادہ مقصود اخیری کا مضمون ہے اس لئے اسکو اختیار کیا گیا سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسا مہینہ ہے جسکے تین حصے ہیں اور تینوں حصوں کی خاصیت جدا جدا ہے ایک اول۔ دوسرے اوسط۔ تیسرے آخر اول حصہ تو رحمت ہے یعنی ابتدا اس مہینہ کی رحمت سے ہے۔ دوسرا حصہ مغفرت ہے یعنی اسمیں بخشش ہوتی ہے اور اس کا آخر عتق من النار ہے یعنی رہائی ہے جہنم سے یہ حاصل ہے ترجمہ حدیث کا۔ اجمالاً سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس مہینہ کے تین خواص بیان ہوئے ہیں اور تینوں خواص مرغوب فیہ ہیں کہ ان کی طرف ہر مسلمان کو رغبت ہے۔ ایک رحمت ہے کونسا مسلمان ہوگا جسکو رحمت کی ضرورت نہ ہو اور دوسرا جزو مغفرت ہے کونسا مسلمان ہے جسکو مغفرت کی ضرورت نہیں اور تیسرا جزو عتق من النار ہے ایسا کون مسلمان ہے جو رہا ہونا نہ چاہتا ہو جہنم سے ان تینوں کی طرف سب ہی کو رغبت ہے۔ اور ان تین کی تخصیص کی وجہ یہی ہے کہ عام رغبت زیادہ تر ان ہی کی طرف ہوتی ہے اور امور مرغوبہ کو مناسب ترتیب سے بیان کرتے ہیں اور بھی رغبت کی زیادتی ہوجاتی ہے اس لئے ایک بخاص ترتیب سے بیان کیا گیا کہ اول رحمت کو لائے اسکے بعد مغفرت کو پھر عتق من النار کو جسکا مناسب ہونا عنقریب مذکور ہوگا اور ان ہی تین اجزاء پر رمضان کی تقسیم بھی ہوگئی کہ دس دن رحمت کے لئے ہیں اور دس مغفرت کیلئے اور دس عتق من النار کے واسطے۔ اسمیں بھی زیادہ رغبت ہے بیان مقصود سے پہلے ایک اور مضمون ذہن میں آگیا کہ شریعت نے اس ماہ کے لئے دو عبادتوں کو خاص کیا ہے ایک روزہ دوسرے تلاوت قرآن۔ اور ان کو پہلے جمعہ میں تفصیل سے بیان کرچکا ہوں اور اسوقت ماہ رمضان سے دونوں کی مناسبت بھی ذکر کردی گئی تھی۔ مگر صرف ایک مضمون اس کے متعلق رہ گیا تھا کہ باہم ان دونوں (یعنی روزہ تلاوت قرآن) میں کیا مناسبت اور ارتباط ہے تو اس کو پہلے بیان کردینا مناسب ہے کہ وہ ماقبل کا تتمہ ہے اس کو بیان کرکے پھر اس حدیث کے متعلق بیان ہوجاویگا سو وہ یہ

ف رمضان شریف کے تین حصے ہیں جن کی خاصیت جدا جدا ہے۔

۲۱۵

۳۱

ف رمضان کیلئے دو عبادتیں مخصوص ہیں۔

ارتباط یہ ہے کہ ایک خاصیت ان دونوں میں مشترک پائی جاتی ہے یعنی تلاوت قرآن میں اور روزہ میں اور وہ خاصیت قرب خاص ہے حق تعالیٰ کا تلاوت میں بھی خاص قرب ہوتا ہے ایسے ہی روزہ دار کو بھی خاص قرب حاصل ہوتا ہے حق تعالیٰ کا یہ دوسری بات ہے کہ تلاوت میں وجہ قرب اور ہو اور روزہ میں وجہ قرب اور مگر نفس قرب خاص میں دونوں شریک ہیں۔ تلاوت سے تو اس لئے قرب خاص ہوتا ہے کہ کلام کو خاص مناسبت ہوتی ہے متکلم سے اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس کی تلاوت کرے گا اس کو خاص تعلق ہوگا صاحب کلام سے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی دیوان وغیرہ تصنیف کیا ہو اور ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اسکے دیوان کو پڑھ رہا ہے تو مصنف کو اس کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا ہو جاوے گا خواہ وہ پڑھنے والا کلام سمجھتا بھی نہ ہو جب بھی اس کے ساتھ محبت خاص ہوگی اور اس کی طرف عنایت خاص مبذول ہوگی بلکہ ایک معنی کر اس شخص کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی جو بدون سمجھے ہوئے اسکے کلام کو پڑھ رہا ہو کیونکہ ممکن ہے کہ سمجھنے والے کو مضامین سے حظ حاصل ہوتا ہو اس وجہ سے اسکے کلام کی تلاوت کرتا ہو اور مصنف کی محبت تلاوت کا باعث نہ ہوئی ہو بخلاف اس شخص کے جو بدون سمجھے ہوئے تلاوت کرتا ہو کہ اس کا باعث سوائے محبت مصنف کے اور کچھ نہیں۔ اس بیان سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا جو بعض نئے خیال کے لوگ کیا کرتے ہیں کہ قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ اور مقصود ان کا اس سے سمجھ کر پڑھنے کی ترغیب دینا نہیں بلکہ یہ غرض ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ کا پڑھنا بھی بند ہو جاوے معانی کا پڑھنا تو بند ہو ہی گیا چنانچہ علوم عربیہ کو بجز چند غرباء کے اور کوئی نہیں پڑھتا چنانچہ یہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ بچوں کو شروع ہی سے انگریزی پڑھاؤ کلام اللہ کو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا نتیجہ اگر اس رائے کا نتیجہ نکالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ غرض انکی یہ ہے کہ قرآن بالکل مٹ جائے مگر یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ان حضرات کا مقصد تو یہی ہے یہ جدا بات ہے کہ یہ نور بجھ نہیں سکتا یہ تو کیسے بجھ سکتا ہے اولیاء اللہ کا نور جو اس سے بہت کم درجہ میں ہے وہ تو بجھتا ہی نہیں اولیاء کے نور کی یہ حالت ہے ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

ف تلاوت قرآن اور روزہ میں مناسبت کیا ہے

ف تلاوت سے قرب کیوں ہوتا ہے

۲۱۹

ف دفع اس شبہ کا کہ قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ

ف اللہ کا نور بجھ نہیں سکتا

اور رہا اسکا یہ سبب کہ وہ بھی حقیقت میں خدا ہی کا نور ہے گو قرآن کے درجہ کا نہ ہو مگر پھر بھی
کسی درجہ میں خدا کا نور ہے اور خدا کے نور کی وہ روشنی ہے کہ ہزاروں کافروں نے
اسکو بجھانا چاہا مگر بجھ نہ سکی۔ ایک ایک مقبول بندہ کے ہزاروں مخالف ہوئے ہیں اور
ہمیشہ چاہتے رہے کہ اس کے انوار کو مٹا دیں مگر وہ انوار اب تک باقی ہیں اور مٹانیوالوں کا
کہیں پتہ اور نشان بھی نہیں بلکہ بعضوں کی تو نسل بھی باقی نہیں جب تو مضمون کا نور نہیں
بجھتا اور دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہتی ہے تو قرآن جو خدا تعالیٰ کا خاص نور ہے کیسے
بجھ سکتا ہے خیال کیجئے کہ بچے تک قرآن حفظ پڑھ رہے ہیں خصوصاً رمضان شریف میں
تو برکات قرآن کا خوب ہی مشاہدہ ہوتا ہے پھر اسے کون مٹا سکتا ہے ایک ملحد نے قرآن
کو مٹانا چاہا تھا اور صورت اس کی یہ اختیار کی تھی کہ جس قیمت کو قرآن ملتا اس کو خرید کر
تلف کر دیتا ایک شخص نے اس سے کہا کہ تم یہ کیا کرتے ہو اس نے کہا کہ جب تک مسلمانوں
میں قرآن باقی ہے اسلام بھی باقی ہے ہم چاہتے ہیں کہ قرآن مٹے تو اسلام بھی مٹے وہ
شخص ہنسا اور کہا کہ تمہاری خیرخواہی تو مناسب نہیں مگر اسلام کی یہی خاصیت ہے کہ مخالف
کی خیرخواہی کرنے سے بھی نہیں رکتا اسلئے میں خیرخواہی سے کہے دیتا ہوں کہ تم خواہ
مخواہ اپنا روپیہ برباد کر رہے ہو اس طریقہ سے قرآن مٹ نہیں سکتا۔ مانا کہ قرآن کی جلدوں
کو تم خرید کر تلف کر دوگے مگر جن سینوں میں یہ کلام محفوظ ہے ان کا کیا کروگے اس کلام
کی تو یہ شان ہے بل ہو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم بچوں تک کو
یاد ہے اگر متعدد لوگوں یا بچوں کو سہو بھی ہوتا ہے تو سب کو ایک جگہ نہیں ہوتا کسی کو کہیں
ہوتا ہے اور کسی کو کہیں تو ایک دوسرے کو بتلا دیتا ہے حاصل اس کے ہر زمانہ میں بیشمار
ہیں غرض کہ قرآن کی جلدیں دنیا سے مفقود بھی ہو جاویں تو چند حافظ جمع ہو کر مکمل لکھوا
دیں گے۔ اس ملحد نے کہا کہ ہم آپ کے بہت شکرگزار ہیں کہ آپ نے ہم کو بہت بڑے مالی نقصان
اور مشقت سے بچایا۔ مظفر نگر میں ایک جلسہ تھا ایک مولوی صاحب نے قرآن کی حفاظت کے
متعلق کچھ بیان کیا اور پھر ایک آیت پڑھی جسمیں قصداً بھول گئے اور اہل جلسہ کی
طرف خطاب کیا کہ جو حفاظ یہاں موجود ہیں وہ کھڑے ہو جاویں اور مجھکو بتلا دیں

ف ایک ملحد نے قرآن کو مٹانا چاہا کیونکر مٹ سکتا

۲۱۷

ف مظفر نگر کا قصہ قرآن کے متعلق

ہزاروں حافظ کثرت ہوگئے مولوی صاحب نے کہا کہ مجھے یہ دکھلانا تھا کہ ظاہر ہے کہ
حفاظ اس جلسہ میں چھانٹ کر نہیں بلائے گئے محض اتفاق ہی سے جمع ہوگئے ہیں جب اتفاقی
مجمع محدود میں اتنی کثرت سے حفاظ موجود ہیں تو ایک ضلع میں کتنے ہوں گے اور ایک
کمشنری میں کتنے اسی طرح تمام دنیا میں ان کی کتنی تعداد ہوگی۔ ایک جلسہ میں
مختلف قوموں کے لوگ موجود ہیں آیا کوئی اس کی نظیر پیش کر سکتا ہے کہ کوئی وید کا یا انجیل
وغیرہ کا ایک ہی حافظ دکھا سکے تو دکھلائے مخالف لوگ بھی اس بات کو دیکھکر دنگ ہوگئے
اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی حفاظت وحقانیت قرآن کی اس کے علاوہ ایک بات
یہ ہے کہ مذاہب باطلہ کی اشاعت روپیہ خرچ کرنے سے ہوتی ہے اور جسقدر خرچ ہوتا ہے
اس کے حساب سے کچھ بھی اشاعت نہیں اور وہ لوگ دن رات اسی دھن میں لگے ہوئے
ہیں۔ اور اہل حق کچھ بھی خرچ نہیں کرتے جسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اہل حق کو اللہ تعالیٰ پر
اعتماد ہوتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دین تو اللہ میاں کا ہے وہ خود اس کی خبرگیری فرمائیں گے۔
مسلمانوں میں ایک سبب دین سے بے توجہی کا توکل بھی ہے اگرچہ ایسا توکل خوبی کی بات نہیں اسلئے
میں اس کی تعریف تو نہیں کرتا مگر واقع میں ہے یہ بھی ایک سبب اور باوجود خرچ نکرنے کے
اشاعت بحمداللہ خوب ہو رہی ہے۔ مجھے اسپر کہ دین تو اللہ میاں کا ہے ایک واقعہ یاد آیا وہ
یہ کہ ابرہہ بادشاہ نے خانہ کعبہ پر چڑھائی کی تھی اور اس کا قصد خانہ کعبہ کے شہید کردینے کا تھا عبدالمطلب
مکہ کے رئیس تھے گو ملک کے رئیس نہ تھے لیکن حکومت کے رئیس تھے اور یہ نور پاک محمدی کی برکت
تھی کہ آپ کے آباء واجداد ہمیشہ سردار رہے ہیں جب ابرہہ کی فوج مکہ کے قریب پہونچی تو ان کے
اونٹ ابرہہ کی فوج نے چھین لئے جب ان کو خبر ملی تو بادشاہ کے پاس پہونچے وہ تعظیم
کیلئے بیساختہ کھڑا ہوگیا تخت پر بٹھایا اسکو یہ یقین تھا کہ عبدالمطلب خانہ کعبہ کیلئے
سفارش کرینگے۔ ان سے پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے انہوں نے کہا کہ میرے اونٹ
آپ کی فوج نے پکڑ لئے ہیں انکو چھوڑ دیجئے اس نے اس بات کو سنکر فوراً حکم دیا
اور اونٹ چھوڑ دئے گئے پھر کہا کہ یہ بات آپکی ریاست سے بعید ہے کہ کیا حقیر شے کی
سفارش آنیکی۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ ضرور خانہ کعبہ کی سفارش کیلئے آئے ہیں اور

میں نے یہ قسم بھی کر لیا تھا کہ آپ کی سفارش پر چھوڑ نہیں دونگا۔ عبد المطلب نے کہا کہ میں پاگل نہیں ہوں جو ایسی سفارش کروں خانہ کعبہ میرا نہیں ہے۔ اگر میرے گھر کو آپ نے ضبط کیا ہوتا تو میں اس کی سفارش کرتا خانہ کعبہ تو خدا کا گھر ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت خود کرے گا۔ واقعی کیسی سمجھ کی بات کہی ابرہہ کو یہ سنکر جوش آیا اور حملہ کا حکم دیا پھر جو اس کی گت بنی ظاہر ہے تو دیکھئے عبد المطلب کو خدا پر کیسا بھروسہ اور اطمینان تھا۔ حق کی یہ بھی خاصیت ہے کہ جو حق سے متمسک ہوتا ہے بے فکر ہوتا ہے گو اسوقت بیفکری میں غلو ہو گیا ہے یہ ضرور ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ اپنے دین کے خود محافظ ہیں مگر سامان واسباب کا توسط بھی عادۃ اللہ ہے ہاں حق کی یہ خاصیت یقینی ہے کہ بے توجہی سے اسکو ضرر نہیں ہوتا۔ اہل باطل کو جتنی کوشش ہے کہ جان توڑ کر اپنے مذہب باطل کی اشاعت میں لگے رہتے ہیں اہل حق اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرتے اگرچہ اب تو یورپ کی دیکھا دیکھی انجمنیں قایم ہونے لگی ہیں اور کوشش ہے کہ بھی ہوا اور وہ بھی پہلے یہ بات کہاں تھی مگر جب سے مسلمانوں میں اس رنگ کا ضبط آ گیا ہے اسی وقت سے خبط بھی پیدا ہو گیا پہلے ضبط تو نہ تھا مگر ربط تھا بہر حال مسلمان کفار سے بہت کم کوشش کرتے ہیں اور مسلمانوں میں جو اہل حق ہیں وہ اہل باطل سے کم کوشش کرتے ہیں چنانچہ بعضے فرقے اہل بدعت کے ہیں میں ان کا نام نہیں لیتا خواہ مخواہ کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتا گو وہ تو ہمارے حضرات کا نام لے لیکر برا بھلا کہتے ہیں مگر ہمارا تو یہ طرز عمل ہے کہ اشخاص کا نام لینا تو در کنار ہم تو فرقہ کا بھی نام نہیں لیتے مگر یہ کہتا ہوں کہ ان کے مذہب کی اشاعت میں سنتا ہوں بیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے اور یہاں قاعدہ سے شاید بیس سو بھی خرچ نہ ہوتا ہوگا مگر پھر بحمد اللہ اہل حق کو ہی غلبہ ہے۔ باطل کی مثال ایسی ہے جیسے بیل گاڑی کہ جب تک اسکو بیل ٹھیلے رہتے ہیں چل رہی ہے جہاں ٹھیلنا موقوف کیا اور رک گئی۔ اور حق کی خاصیت ایسی ہے جیسے بجلی کی گاڑی کہ برابر رفتار سے چلی جا رہی ہے حق تو خود انجن ہے جس کی برق پورے انداز پر ہے کہ اس کی رفتار یکساں حالت پر رہتی ہے یہ خاصیت حق کی ہے ہر زمانہ میں حق کے حامی و مددگار ضرور رہتے ہیں گو قلیل سہی مگر ایک وہ بھی ہیں جو حق کو مٹانا چاہتے ہیں گو

نور حق ہونے کے سبب مٹ نہیں سکتا وہ کہتے ہیں کہ جب قرآن شریف کے معنی نہیں سمجھتے تو پڑھنے سے کیا فائدہ۔ صاحبو! کلام اللہ کا اصلی نفع دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا ہے اس سے دولت قرب تو ہوتی ہے اور وہ کلام اللہ کے سمجھنے پر موقوف نہیں گو سب کے لئے اس کی اجازت نہیں کہ سب کے سب بدون سمجھے ہوئے پڑھیں بلکہ مقصود ہے کہ لوگ ایسے بھی ضرور ہونے چاہئیں کہ خود بھی کلام اللہ کو سمجھتے ہوں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکیں اور فضل کلی اسی کو سمجھ کر پڑھنے میں ہے مگر ایک حیثیت سے اس شخص پر حق تعالیٰ کی زیادہ عنایت ہوگی جو بدون سمجھے ہوئے کلام اللہ کی تلاوت کرتا ہو کیونکہ صرف حق تعالیٰ کی محبت ہی اس کا باعث ہو سکتی ہے میں اس تقریر سے ان لوگوں کا دل تھامنا چاہتا ہوں جو کلام اللہ کے نہ سمجھنے پر افسوس کرتے ہیں۔ اب سنئے تلاوت قرآن پر کیا فضیلت حاصل ہوگی۔

ف تلاوت قرآن پاک کا عملی نفع

حدیث میں ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اس لئے جس نے الحمد کہا اسکو پچاس نیکیاں مل گئیں اس حساب سے پورے کلام اللہ کی تلاوت پر کتنی نیکیاں ہوں گی۔ امام احمد بن حنبلؒ نے حق سبحانہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ عرض کیا کہ اے اللہ وہ کونسا عمل ہے جو آپ سے زیادہ قریب کردے ارشاد ہوا وہ عمل تلاوت قرآن ہے آپ نے عرض کیا بفہم او بلا فہم کہ سمجھ کر یا بلا سمجھے۔ ارشاد ہوا بفہم او بلا بفہم سمجھ کر ہو یا بدون سمجھے ہو۔ راز اس میں یہ ہے کہ مصنف اپنے کلام کے پڑھنے سے خوش ہوا کرتا ہے پس جب بندہ اللہ میاں کے کلام کو پڑھیگا تو اللہ میاں خوش ہونگے ایک وجہ تلاوت کی فضیلت کی یہ ہے کہ جتنے بھی حق تعالیٰ کے افعال ہیں بندہ کے ویسے ہی افعال افعال حق کی نقل نہیں ہوتے صرف ایک یہی فعل ایسا ہے کہ بندہ کی تلاوت بالکل نقل ہوتی ہے کلام حق کی یعنی جیسے اللہ میاں کلام کر رہے ہیں یہ بھی کر رہا ہے مثلاً بندہ کا دیکھنا حق تعالیٰ کے دیکھنے کی نقل نہیں ہے اور اللہ کا کلام جو پڑھ رہا ہے وہ اسکے صیغوں کو ویسے ہی ادا کر رہا ہے جس طرح خدا تعالیٰ کلام فرماتے ہیں۔ مثلاً بندہ نے تلاوت کی۔ قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراہیم یا پڑھا قلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ یا اسکو ادا کیا۔ فجعلناہا نکالا لما بین یدیہا وما خلفہا وعلی ہذا القیاس ہر جزو کی تلاوت میں

۲۲۰ ف امام احمد بن حنبلؒ کا خواب

۳۷

تعالیٰ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نہیں کیا جاتا۔ تو جیسے حق تعالیٰ کلام فرماتے اسی طرح بندہ بھی کلام کر رہا ہے اور تلاوت کا طریق بھی اہل طریق نے اسی طرح تجویز کیا ہے کہ بندہ کے پڑھنے کے وقت یہ تصور کرے کہ گویا بندہ گراموفون ہے اور متکلم حق سبحانہ تعالیٰ ہیں کہ اپنے کلام کو حق تعالیٰ نے اس میں بند کر دیا ہے اور وہ اس میں سے بلا قصد نکل رہا ہے گویا یہ تجلی کلامی ایسی ہی ہو رہی ہے جیسے شجرہ طور پر ہوئی تھی درخت سے آواز آ رہی تھی کہ انی انا اللہ لا الہ الا انا وہ کلام حقیقت میں شجرہ کا نہ تھا شجرہ تو محض واسطہ تھا متکلم اللہ میاں تھے اسی طرح بندہ کی زبان سے اللہ میاں کلام فرما رہے ہیں جس طرح نے یعنی بانسلی میں سے آواز نکلتی ہے کہ وہ حقیقت میں نے کی آواز نہیں بلکہ بجانے والے کی آواز ہے کہ نے میں ہو کر نکل رہی ہے اسی کو مولانا بطور استعارہ کے فرما رہے ہیں

ع دو دہاں داریم گویا ہمچو نے یک دہاں پنہاں ست در لب ہائے وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہائے و ہوئے در فگندہ در سما

پس تلاوت ایسی چیز ہے کہ اس میں پورا تشبہ ہے بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ اور جسکو کسی سے تشبہ ہو وہ اس کا مقرب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب بادشاہ سواری پر نکلتے ہیں تو بعض مصالح سے مصاحبین کو اپنا جیسا لباس پہناتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تلاوت کرنے والے بندوں کو گویا اپنا خاص لباس کلام پہنایا ہے گویا بندے خاص مصاحب ہیں کہ ان کو لباس کلام سے آراستہ فرمایا۔ بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنکے سینوں میں کلام اللہ ہے مگر ہم نے اس کی ناقدری کر رکھی ہے کہ اجرت پر پڑھکر دس دس روپیہ کو بیچتے پھرتے ہیں اس کلام کی تو یہ شان ہے ع

قیمت خود ہر دو عالم گفتہٗ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حضرت جنہوں نے قدر کی ہے ان کی حالت یہ ہے کہ ایک حافظ صاحب جو قاری بھی تھے سفر میں رہزنوں کے ہاتھوں بالکل بے سر و سامان ہو گئے تھے ایک جگہ پہونچے وہاں کے رئیس کو معلوم ہوا کہ کلام اللہ اچھا پڑھتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حاجتمند بھی ہیں حاضر ہو کر درخواست کی کہ کچھ ایک دو آیت سنا دیجئے حافظ صاحب نے کہا کہ نماز کے وقت سن لیجیے گا

۲۲۱

۳۷

ف کلام الٰہی کی بے قدری کی ایک حافظ جی کا قصہ

اصرار کرنے پر حافظ صاحب نے سنا دیا بعد سننے کے رئیس صاحب نے کچھ پیش کیا حافظ صاحب نے کہا کہ اگر آپ کلام اللہ نہ سنتے تو میں لے لیتا اب تو نہیں لوں گا کیونکہ مجھکو یہ آیت یاد ہے لاتشتروا بآیات اللہ ثمنا قلیلا یہ کہکر حافظ صاحب اٹھ کر چلے گئے قدر کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

اے مسلمانوں اس نعمت کی قدر کرو۔ اگر تم قدر نہ کروگے تو کیا مخالفین قدر کرینگے وہ تو اپنے کلام اللہ کی بھی قدر نہیں کرتے جسکو وہ دعوے سے کلام اللہ کہتے ہیں چنانچہ ایک شخص نے بیان کیا کہ ایک عیسائی سائیکل پر سوار جا رہا تھا اور انجیل کو مقعد کے نیچے رکھ چھوڑا تھا۔ انہوں نے اپنی مذہبی کتاب کی یہ قدر کی ہے اسی طرح مسلمانوں میں بعضے فرقے اپنے حق پر ہونے کے مدعی ہیں مگر موقعہ پر انکا حال معلوم ہوجاتا ہے جب آرہ ایک مدرسہ میں گیا تھا وہاں ایک شخص مدعی اجتہاد سوتے ہوئے نکلے اور الماری میں سے موطا مالک نکال کر ایک شخص کو مخاطب کرکے کہنے لگے کہ میاں اس میں تو وہ حدیث نہیں ملی اور یہ کہکر موطا کو زمین پر زور سے دے مارا کسی نے ان سے کہا کہ حدیث کا تو ادب کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو گرد جھاڑی ہے اسکو گرد سے صاف کردیا کیا برا کیا ایک تو شرارت کی اور پھر اسکو تاویل سے بنایا بھی واقعی تاویل بھی بری چیز ہے اور یہ اپنی بات کی پچ کرنے کا مرض اکثر طالب علمی میں پیدا ہو جاتا ہے ادب بھی ایک شعبہ ہے دین کا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

از خدا خواہیم توفیق ادب | بے ادب محروم گشت از لطف رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد | بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

ادب کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک جگہ گئے وہاں انکے ایک شاگرد تھے وہ ان سے ملنے نہیں آئے یہ بے ادبی کی بات تھی ان بزرگ نے تحقیق جو کیا تو معلوم ہوا کہ آنے سے معذور رہیں اس وجہ سے کہ ان کی ماں سخت معذور ہے ان کے چلے آنے سے ماں کو تکلیف ہوتی خیر اس امر میں تو انہوں نے شریعت پر عمل کیا کیونکہ ماں کی خدمت واجب تھی مگر کوئی وقت تھوڑا سا نکالکر آجاتے تو ممکن تھا پس اس صورت میں انہوں نے ایک کوتاہی کی اور ایک عبادت استاد نے فرمایا کہ ان دونوں عملوں میں

۲۲۲

۳۸

ف
ادب بھی شعبہ ہے دین کا بے ادبی کے متعلق ایک قصہ

ایک ایک خاصیت ہے ماں کی خدمت سے تو ان کی عمر بڑھے گی اور استاد کی بے ادبی
کرنے سے کسی کو ان کے علم سے نفع نہیں ہوگا۔ یہ شاگرد بڑے عالم تھے ان دونوں عملوں
کا اثر یہ ہوا کہ عمران کی سو برس سے زیادہ ہوئی مگر ایسے سوانح پیش آئے کہ تمام عمر ایسے دیہات
میں قیام رہا کہ ان کے علم سے کسی کو نفع نہیں ہوا حالانکہ یہ بہت بے ادبی بھی نہ تھی مگر استاد کو
ان کا نہ ملنا ناگوار ہوا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کا علم نہ پھیلا ہر عمل کی جدا خاصیت ہے۔
اب یہ سمجھئے کہ کلام اللہ کا ادب ایک حسی ہے وہ یہ کہ اس کی تعظیم کرنا اس کو چومنا بلندی
پر رکھنا وغیرہ اور دوسرا ادب معنوی ہے وہ یہ کہ اس کو فروخت مت کرو اس پر اگر کوئی اعتراض
کرے کہ مطبع والے بڑے گنہگار ہیں کیونکہ وہ دن رات یہی کام کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے
کہ وہ نقوش کو فروخت کرتے ہیں نقوش کی بیع جائز ہے اور کلمات کی ناجائز نقوش مجازاً کلام
ہیں اور تلاوت واقع میں کلام اللہ ہے اور ہم کو اس فرق کی بھی حاجت نہ تھی جبکہ شریعت
نے لکھے ہوئے کی قیمت کی اجازت دی ہے اور پڑھنے پر اجازت نہیں دی بس ہمارے
لئے شریعت کا فیصلہ کافی وافی ہے اور اسی طرح شریعت نے تعلیم پر اجرت لینے کی اجازت
دی ہے اگر کوئی اعتراض کرے کہ اگر حفاظ کو نہ دیں تو تراویح نہ ہوں گی کیونکہ کوئی سنائیگا
نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ مشاہدہ اسکے خلاف ہے پڑھنے والے کثرت سے ہیں سننے
والے مل ہی جاتے ہیں پھر پیش برین نیست کہ اگر تراویح میں سننا سب چھوڑ دیں
تو اس سے دین ضائع نہ ہوگا اور اگر تعلیم کو سب چھوڑ دیں تو دین ضائع ہو جائیگا۔ سو اگر کسی
موقع پر کوئی حافظ جائز طریقہ سے سنانیوالا نہ ملے تو الم ترکیف سے تراویح پڑھ لیں۔ کلام اللہ
بڑی دولت ہے اسکی بے قدری نہ چاہیئے قدر کرو اور پڑھو خواہ سمجھکر یا بے سمجھے کیونکہ کلام
اللہ کی تلاوت خواہ سمجھکر ہو یا بے سمجھے ہو اس میں خاصیت تشبہ بالحق کی ہے اور یہی خاصیت ہے
روزہ کی کہ اس میں بھی حق تعالیٰ کے ساتھ تشبہ ہے کیونکہ خدا کی شان ہے نہ کھانا نہ پینا نہ بی بی
رکھنا اور روزہ میں بندہ کی یہی حالت ہوتی ہے روزہ میں ایک صمدیت کی شان ہے لہذا
دونوں عملوں میں تشبہ بالحق ہوا یعنی تلاوت قرآن میں اور روزہ میں اور یہ دونوں
عمل رمضان میں ہیں اسلئے دونوں عملوں کو رمضان سے مناسبت ہوئی۔ دوسری مناسبت

قرآن اور روزہ میں یہ ہے کہ کلام اللہ سے انوار پیدا ہوتے ہیں یہی خاصیت روزہ کی ہے کہ
اس سے بھی انوار پیدا ہوتی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ انوار پیدا ہونے کی وجہ علیحدہ علیحدہ
ہو یعنی تلاوت میں اور وجہ ہو اور روزہ میں اور۔ وہ یہ کہ تلاوت عبادت وجودی ہے
اور روزہ عبادت عدمی دونوں میں تفاوت ہے مگر نورانیت پیدا کرنے میں مشترک ہیں
رہی یہ بات کہ روزہ سے نور کیسے پیدا ہوتا ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ کھانے سے قوت
بہیمیہ میں ترقی ہوتی ہے اور نار شہوت بھڑکتی ہے جو کہ منافی ہے نور کے اور جب آدمی
کھانے پینے سے رکیگا تو نار شہوت میں کمی ہو گی اور جسقدر اس میں کمی ہو گی اسی قدر نور میں
ترقی ہو گی مگر یہ مطلب نہیں کہ بالکل نامرد ہو جاؤ بلکہ مادہ شہوت باقی رہنا چاہئیے ہاں
غلبہ نہ ہونا چاہئیے اور بقدر ضرورت شہوت رہنے میں بھی حکمت ہے کیونکہ نار شہوت گو ایک
درجہ میں منافی ہے نور کے مگر بدون اسکے نورانیت بھی حاصل نہیں ہوتی اس کی مثال ایسی
ہے جسکو مولانا فرماتے ہیں ؎

شہوت در بنا مثال گلخن است　که ازو حمام تقویٰ روشن است

یعنی شہوت کی مثال ایسی ہے جیسے حمام میں خس وخاشاک سے آگ جلتی ہو کہ وہ ایک درجہ
میں پانی کے لئے مضر کی چیز ہے مگر پانی کے اندر اس سے حرارت و نورانیت آگئی اگر آگ
نہ ہو تو حرارت و نورانیت کیسے آئے اور یہ نورانیت آئی کیسے یہ آڑ کی وجہ سے آئی کہ پانی اور
آگ میں ایک آڑ حائل ہے یہ آڑ ہی کی برکت ہے کہ پانی میں نورانیت آگئی۔ اسی طرح مادہ شہوت
گو ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ نار شیطانی کی طرف پہونچا دیتی ہے مگر نورانیت بھی اس کی
وجہ سے آتی ہے اگر شہوت نہ ہوتی تو اجر کیسے ملتا کیونکہ نامرد کا زنا سے رکنا کوئی کمال
نہیں اور نہ اسکو زنا سے بچنے پر کچھ ثواب ہے پس اجر کے لئے مادہ شہوت ہونا چاہئیے
مگر صرف ایک آڑ کی ضرورت ہے اور بڑی آڑ اسکے تقویٰ ہے جسکی بڑی معین بی بی ہے اسی
لئے بی بی کے پاس جانے سے ثواب حاصل ہوتا ہے جسکی تصریح حدیث میں موجود ہے اور
ساتھ ہی اسکی علت بھی مذکور ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جسکی شہوت بڑھے اور بی بی سے تعلق
نہیں ہوا اور برا تعلق ہو جاوے تو لامحالہ گنہگار ہو گا جب اس لئے برے تعلق کو چھوڑ کر نکاح کر لیا تو

(باقی آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ)

بی بی سے تعلق رکھا تو ضرور اجر ملیگا پی بی سے تعلق رکھنا تو نور کا معین ہے کیونکہ بی بی کی وجہ سے تقلیل ہوگی شہوت کی جب اس کی تقلیل ہوگی تو نور کی تکثیر ہوگی - ایک گھٹا تو دوسرا بڑھا - خلاصہ یہ ہے کہ روزہ میں ترک باعث ہوا نور کا اور تلاوت میں وجود سبب ہے نور کا اس صورت میں تسبیب للنور سے باہم مناسبت ہوگئی تو یہ دو عبادتیں ہیں جنکو خاص تعلق ہے رمضان سے ان کی خاصیت بھی تقریر کے ضمن میں بیان ہوگئی تو یہ اپنے خواص کے اعتبار سے عبادات فاضلہ ہونگے اور عبادات فاضلہ سے اجر ملتا ہے اور نور بڑھتا ہے اسی طرح گناہوں سے حفاظت رکھنے میں بھی نور کو ترقی ہوتی ہے اور نور میں خاصیت ہے کہ اس سے قرب ہوتا چلا جاتا ہے جس کی علامت یہ ہے اَلتَّجَافِیْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْمَیْلُ اِلٰی دَارِ السُّرُوْرِ - یہ نور کی خاصیت ہے اور یہ نور ان عبادات کے وقوع کے وقت بھی ہوتا ہے اور بعد میں بھی رہتا ہے اور وہی نور گناہوں سے بھی روکتا ہے جیسے نماز کی نسبت آیا ہے کہ برائیوں سے روکتی ہے چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ جس کی ایک سہل تفسیر یہ ہے کہ جب تک آدمی نماز میں مشغول ہے اسوقت تک برائیوں سے رکا رہتا ہے مثلاً اگر نماز نہ پڑھتا تو اس وقت غیبت وغیرہ میں مبتلا ہو سکتا تھا جب نماز پڑھنے لگا تو اسوقت اس سے حفاظت ہوگئی آیت مذکورہ کی اس تفسیر میں کوئی غبار نہیں یہاں تک بیان تھا بیان سابق کے تتمہ کا اب اس حدیث کے متعلق عرض کرتا ہوں جس کی تلاوت اس جلسہ میں کی سو اس کے اجزا میں ترتیب ہونا اور ترتیب کے مناسب ہونے کا دعوی آغاز میں بیان ہو چکا اب اس مناسبت کی وجہ عرض کرتا ہوں کہ یہ جو اس حدیث میں فرمایا ہے کہ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَّاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَّاٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ ان تینوں میں نہایت مناسب ترتیب ہے کیونکہ طاعت پر اول ترتب ہوتا ہے رحمت کا چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ اور چونکہ طاعت کی خاصیت ہے گناہوں سے روکنا جس کی طرف اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ میں اور اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ میں قریب بصراحت اشارہ ہے تو جب گناہوں سے روک ٹوک ہوگی تو اسپر مغفرت مرتب ہوگی اور چونکہ گناہ سبب ہے دوزخ کا اور اس سے مغفرت ہوگئی ہے اس لئے اب اسپر عتق من النار مرتب ہوگا - یعنی رمضان شریف ایسا مہینہ ہے

پارہ ۱۳ رکوع ۱۰ ؏ بیشک نیک کام برے کاموں کو مٹا دیتے ہیں -

کہ ان دونوں عمل یعنی صوم و قرآن کی برکت سے اس کے اول میں رحمت اور اوسط میں مغفرت اور آخر میں عتق من النار ہوتا ہے۔ یہ ترتیب عقل کے بھی موافق ہے عقل بھی اسی ترتیب کو چاہتی ہے چنانچہ دیکھئے مجرم کے حق میں یہی ترتیب ہوتی ہے کہ جب مجرم حاکم کی خوشامد اور اطاعت کرتا ہے تو اس پر حاکم کی مہربانی ہوتی ہے اس کے بعد اس کے قصور کو معاف کرتا ہے اس کے بعد رہائی ہوتی ہے معلوم ہوا حضور صلعم کا ارشاد سائنس کے موافق ہے ایک سائنس طبعی ہے اور دوسری شرعی یہاں طبعی سائنس موافق ہے شرعی سائنس کے پس رمضان شریف میں بھی رحمت اس مجرم پر ہوگی جو حق تعالیٰ کو خوشامد اور طاعت کر کے راضی کرنیکی کوشش کرے ورنہ بجائے رحمت کے زحمت ہوگی مگر بہت لوگ اس دھوکہ میں ہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو سمجھ لیتے ہیں کہ اب رحمت نازل ہوگی حالانکہ وہ رحمت کے کام کچھ بھی نہیں کرتے غیبت کرتے ہیں بری نگاہ کرتے ہیں علیٰ ہذا اور گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ غرض چونکہ رحمت و مغفرت میں یہ ترتیب عقلی ہے اور عقلاً ان کا ترتب اعمال پر ہوتا ہے تو اس ترتیب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے کہ ان چیزوں کا ترتب اعمال پر ہوتا ہے خواہ اعمال کو فاعل بالکیفیت کہو یا فاعل بالخاصہ۔ فاعل بالکیفیت ہونیکے معنی یہ ہیں کہ اعمال پر جو اثر مرتب ہوتا ہے اس اثر مرتب ہونیکی کوئی وجہ معقول ہے یعنی عقل میں آتی ہوئی ہے کہ یہ اثر فلاں وجہ سے مرتب ہوا اور فاعل بالخاصہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اعمال پر اثر مرتب ہونے کی کوئی وجہ عقل میں نہیں آتی بلکہ وہاں یوں کہنا پڑتا ہے کہ خدا نے اعمال میں فلاں اثر رکھدیا ہے جب وہ کئے جاتے ہیں تو یہ اثر ان پر مرتب ہوتا ہے اور کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جیسے دوا کی دو قسمیں ہیں ایک فاعل بالکیفیت دوسری فاعل بالخاصہ۔ فاعل بالکیفیت کی مثال یہ ہے جیسے کسی کو غلبہ صفراء سے بخار تھا حرارت بڑھی ہوئی تھی اسلئے پیاس بھی تھی اسکو بارد دوا مثلاً آلو بخارا پلائی گئی کہ اس نے حدت صفراء کو توڑ دیا حرارت و پیاس کو زائل کر دیا یہاں اس کی اثر کی وجہ عقل میں آتی ہے کہ صفراء حار ہے اور آلو بخارا میں برودت کی کیفیت ہے اور حرارت کا مقابلہ برودت سے ظاہر ہے اور فاعل بالخاصہ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کہربا کا قلب پر لٹکانا کہ اس سے قلب کو قوت

حاصل ہوتی ہے مگر اس اثر کی وجہ عقل میں نہیں آتی کہ کس وجہ سے قلب کو قوت حاصل ہوتی بس یہی کہیں گے کہ خدا تعالیٰ نے اس میں یہ اثر خاص رکھدیا ہے۔ پس اگر اعمال کو فاعل بالخاصہ کہو تو اس میں کسی تقریر کی ضرورت نہیں اور اگر فاعل بالکیفیۃ کہو تو اس کی تقریر مثلاً یہ ہوگی روزہ سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور اس کی بھی وجہ عقل میں آتی ہے وہ یہ کہ روزہ سے انکسار ہوتا ہے شہوات نفسانیہ کا اور جب انکسار ہوگا تو تقویٰ پایا جائے گا۔ چنانچہ کلام اللہ میں روزہ سے تقویٰ کا پایا جانا صراحۃً مذکور ہے فرماتے ہیں۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۰ (جامع وعظ کہتا ہے کہ اعمال کو جو دوا کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے دوا میں حرارت و برودت وغیرہ کیفیات ہیں اسی طرح اعمال میں حرارت و برودت وغیرہ ہوگی جیسے بعض عوام کا خیال ہے کہ بعض اوراد و اسماء جلالی ہیں اس سے مزاج میں حدت و حرارت پیدا ہوتی ہے اور بعض جمالی بلکہ صرف وجہ کے مدرک بالعقل ہونے نہ ہونے میں تشبیہ دی گئی ہے کہ اگر کسی دوا کے اثر کی وجہ عقل میں آتی ہے تو وہ فاعل بالکیفیۃ ہے ورنہ بالخاصہ چونکہ ابتداءً یہ شبہ خود مجھکو پیش آیا ممکن ہے کہ کسی اور کو بھی پیش آوے اسلئے شرح کردی ۱۲) اور اس کی جانچ ماہر ہی کرسکتا ہے کہ اس دوا کا اثر بالکیفیۃ ہے یا بالخاصہ ہر شخص کا کام نہیں اسی طرح اعمال میں ہر شخص نہیں کہہ سکتا کہ انکا جو اثر ہے وہ بالکیفیۃ ہے یا بالخاصہ۔ بہر حال اعمال کو خواہ فاعل بالخاصہ کہو یا بالکیفیۃ رمضان کی ان برکات کا ظہور اعمال ہی سے ہوگا بدون اعمال کے نہ رحمت ہوگی نہ مغفرت نہ جہنم سے آزادی الا ماشاء اللہ۔ خوب سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں عمل ہی کی قدر ہے اور جب تک عمل کر کے خدا تعالیٰ کو مہربان نہیں کیا تو کچھ بھی نہیں کیونکہ خدا کو کسی کے چہرے سے عشق نہیں۔ ایک بات استطراداً اس جگہ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کی طرف نسبت عشق کی (یعنی یوں کہنا کہ خدا فلاں کا عاشق ہے ٹھیک نہیں) بعض صوفیہ نے اور اکثر شاعروں نے خدا کیلئے لفظ عشق کا استعمال کیا ہے۔ سو شاعر تو کوئی چیز نہیں باقی صوفیہ سو وہ گو مغلوب الحال ہونے کے سبب معذور رہے مگر ان کی تقلید اس میں جائز نہیں کیونکہ بچہ اگر باپ کی ڈاڑھی نوچے اور وہ اسپر کچھ نہ کہے تو بچے کے فعل کو

اچھا نہ کہا جاویگا گو اس بچے سے گرفت بھی نہ کی جاوے گی اور نہ ہوشدار بیٹے کو اسکی تقلید جائز ہوگی اس لئے جو کلمہ مغلوب الحال کے منہ سے نکلے تو وہ قول فی نفسہ تو برا ہے مگر اسپر گرفت نہیں کیجاتی اور نہ اس کی تقلید کیجاتی ہے اس کی دوسری مثال ایسی ہے جیسے کسی گنوار نے کچہری میں جاکر عرضی بے ٹکٹ لگی ہوئی حاکم کے ہاتھ میں دیدی حاکم نے کہا کہ اسپر آٹھ آنہ کا ٹکٹ لگاؤ گنوار نے فوراً ایک روپیہ نکال کر کہا کہ لے آٹھ آنے کا ٹکٹ لگا دے اور آٹھ آنے تو رکھلے حاکم نے بیوقوف سمجھکر کہا کہ اس کی عرضی بلا ٹکٹ ہی لے لو۔ ذرا آپ تو کریئے دیکھئے کہ گت بنی ہے گنوار کو جو معافی دی ہے مقرب سمجھکر نہیں دی بلکہ بیوقوف سمجھکر یہی کیفیت مغلوب الحال کی ہے کہ اسکو معافی مقرب سمجھکر نہیں دیجاتی بلکہ بیوقوف خیال کرکے سہارنپور میں ایک دفعہ اس قدر زور سے بارش ہورہی تھی کہ اندیشہ تھا شہر کے غرق ہوجانیکا ایک مجذوب ڈنڈا ہاتھ میں لئے جھونپڑی سے باہر نکلا اور آسمان کی طرف منہ کرکے کہا کہ بس کر بس کر بہت ہولی بارش بند ہوگئی ظاہر میں یہ مقرب تھے درباریوں میں شمار تھے حالانکہ ان کو قرب سے علاقہ بھی نہیں مقرب وہ ہیں جو کمالات باطنی کے ساتھ طریق سنت پر قائم ہیں ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

بس عشق کا اطلاق حق تعالیٰ پر جائز نہیں اور مغلوب الحال معذور ہیں مقرب تو بڑے ترساں و لرزاں رہتے ہیں ان کی زبان سے کبھی ایسے کلمات صادر نہیں ہوسکتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون مقرب ہوگا آپ فرماتے ہیں اِنِّیْ اَخْشٰکُمْ لِلّٰہِ کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنیوالا ہوں غرض خدا تعالیٰ کو عاشق کہنا ادب کے خلاف ہے بعض لوگ حق تعالیٰ کو عاشق رسول کہدیتے ہیں یہ بڑی غلطی ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ میاں کا عاشق کہنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کی طرف اگر نسبت کرنا ہو تو محبت کا لفظ استعمال کریں یوں کہیں کہ خدا تعالیٰ کو محبت ہے کہ یہ نصوص کی موافق ہے۔ بہرحال، حق تعالیٰ کو اعمال سے محبت ہے کسی کی ذات سے عشق نہیں جب اعمال کا شرط ہونا معلوم ہوگیا اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ تم نے رمضان میں اللہ میاں کو راضی کرنے کے لئے کوئی عمل کیا

یا نہیں اسی واسطے حدیث میں ہے رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ رَغِمَ اَنْفُہٗ تین شخصوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا فرمائی ایک وہ جس کے سامنے میرا نام (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا) لیا گیا اور اس نے مجھ پر درود شریف نہ بھیجا دوسرا وہ کہ جس کے ماں باپ کو بڑھاپے کے سبب اس کی طرف احتیاج تھی باوجود وسعت ان کی خدمت نہ کی تیسرا وہ کہ جس پر رمضان کا مہینہ آیا اور قبل مغفرت گذر گیا یعنی جیسا قبل رمضان تھا ویسا ہی اب بھی رہا یعنی اپنے اعمال کی اصلاح نہ کی۔ بلکہ یہ حالت رہی ؎

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد

صاحبو! اب رمضان شریف قریب ختم کے ہے کچھ ہی دن باقی ہیں اگر حالت نہ بدلی ہو تو اب بدل لو اللہ میاں کی وہ شان ہے کہ ایک آن میں فضل فرما دیتے ہیں اگرچہ اس کی تکمیل تو اول سے ہوتی ہے۔ اب میں ایک سوال کا جواب دیکر بیان کو ختم کرتا ہوں سوال یہ ہے کہ حدیث اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَّاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَّاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ میں جو تین امر مذکور ہوئے ان کو رمضان کے مہینے پر منقسم کیا۔ کیا ایک ایک امر کے لئے دس دس دن ہونگے یعنی دس دن رحمت کیلئے اور دس دن مغفرت کے لئے اور دس عتق من النار کے لئے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ رحمت تھوڑی تھوڑی ہوتی ہوتی دس دن میں حاصل ہوگی اور اسی طرح مغفرت اور اسی طرح عتق۔ حالانکہ یہ سب باتیں جب ہوتی ہیں ایک آن میں ہو جاتی ہیں اس تدریج کے کیا معنی۔ جواب یہ ہے کہ رحمت و مغفرت و عتق کے درجات مختلف ہیں دس روز میں ان کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ تو اجمال ہے تفصیل اسکی یہ ہے کہ جب کوئی غلام اپنے آقا کی خدمت کرتا ہے تو مہربانی تو اول ہی سے شروع ہو جاتی ہے مگر پوری مہربانی اسوقت ہوتی ہے جبکہ وہ کوئی کارروائی دکھلاوے اور اسکو کچھ زمانہ خدمت کرتے ہوئے گذر جاوے اور آقا کو اسپر اطمینان ہو جاوے اسی طرح حق تعالیٰ کی طرف سے طاعت شروع کرنے پر رحمت کا نزول فوراً شروع ہو جاتا ہے مگر اس کی تکمیل دس روز میں ہوتی ہے اسی طرح مغفرت اور عتق من النار کو سمجھئے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے کچھ معتد بہ کام کر کے دکھلاو جب رحمت کی تکمیل ہوگی اور پھر مغفرت اور عتق من النار کی شارع نے ہر ایک کی

۲۲۹

تکمیل کے لئے دس دس دن مقرر کئے ہیں اگرچہ بندوں کے معاملات میں آہستگی کا راز اور ہے اور خدا تعالیٰ کے معاملات میں اور ہے یعنی بندے جو آہستگی کے ساتھ غلام پر مہربانی کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بندوں کو آئندہ کا حال معلوم نہیں کہ غلام کیسی خدمت کرے گا جب ان کو کچھ زمانہ گذرنے پر خدمت کا حال معلوم ہو جاتا ہے اسوقت انعام کی تکمیل کرتے ہیں یہاں یہ صورت نہیں ہو سکتی کیونکہ حق تعالیٰ عالم الغیب ہیں ان کو معلوم ہونے کا انتظار نہیں یہاں وہی راز ہے جو عالم کو آہستگی کے ساتھ پیدا کرنے میں ہے، حق تعالیٰ قادر تھے اسپر کہ آن واحد میں تمام عالم کو پیدا فرما دیتے مگر ایسا نہیں کیا بلکہ چھ دن میں بنایا اس میں تعلیم ہے اس کی کہ کام میں آہستگی چاہیئے یہی صورت یہاں بھی ہو سکتی ہے کہ جلدی کسی کی ساتھ اعتماد واختصاص کا معاملہ کرنے کا خلاف مصلحت ہونا بتلایا ہے دوسرے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ گناہ مادہ ظلمت کا ہے جیسے طاعت مادہ نور کا بتدریج نور بڑھتا ہے، اور گناہ چھوڑنے سے بتدریج ظلمت گھٹتی ہے اسلئے رحمت ومغفرت میں تدریج ہوتی ہے پھر طاعت کی کمی اور معصیت کی زیادتی ہی بعد کے اسباب تھے اور روزے سے بتدریج مضمحل ہونے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب پورا اضمحلال ہو گیا تو اب کہیں گے کہ عتق من النار اب کامل ہوا اور یہ اثر پورے مہینہ بھر گناہ چھوڑنے پر مرتب ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ تکمیل رحمت ومغفرت اور عتق من النار کا سبب ترک گناہ ہے پس رمضان میں گناہ بالکل ترک کر دینے چاہئیں اسی لئے حدیث میں رمضان کے زمانہ میں اس کی زیادہ تاکید ہے اور رمضان میں گناہ کرنا بہ نسبت اور ایام کے زیادہ اشد قرار دیا گیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ایک زمانہ نور رحمت کے کامل ہونے کے لئے ہے اور ایک مغفرت کی تکمیل کیلئے اور ایک عتق من النار کے مستحکم ہونے کے واسطے یہ تقریر جب ہے کہ جب اعمال کو فاعل بالکیفیۃ کہا جاوے گا مگر یہ شق یقینی نہیں ہے کہ اعمال فاعل بالکیفیۃ ہی ہیں بلکہ ان کو موثر بالخاصہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ان اعمال میں یہ خاصیت رکھدی ہے کہ ان کے کر لینے سے اثر خاص مرتب ہوتا ہے اور وہ اثر کسی کیفیت کے معلل نہیں مگر بالخاصہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ کسی شرط کے ساتھ بھی مقید نہیں بالخاصہ ہونیکے تو صرف یہ معنی ہیں کہ ہمیں کیفیت معلوم نہیں جیسے

۲۳۰

کہا مگر پھر بھی اسکے اثر کیلئے قرب قلب شرط ہے اگر کوئی بجائے قلب کے پاؤں پر باندھے
تو کچھ بھی اثر نہ ہوگا اسی طرح اگر ہم مان بھی لیں کہ خود رمضان شریف میں یہ خاصیت ہے
کہ اسمیں رحمت و مغفرت و عتق حاصل ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل تحقیق ہے کہ
آیا اسکی خاصیت مرتب ہونے کے لئے کوئی چیز شرط ہے یا نہیں ممکن ہے کہ شرط ہو۔ تو حدیث
سے معلوم ہوا ہے کہ ترک گناہ شرط ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے روزہ
میں برا عمل اور جھوٹی باتیں نہ چھوڑیں تو اللہ میاں کو اسکے بھوکے پیاسے رہنے کی کچھ پرواہ نہیں
ایک اور حدیث میں ہے کہ بہت سے روزدار روزہ رکھتے ہیں مگر ان کو روزہ سے بھوک پیاس
کے سوا کچھ فائدہ نہیں سو حدیث سے شرط معلوم ہوگئی کہ گناہ سے بچنا اور اعمال صالحہ کرنا رمضان
کے اثر یا خاصہ میں مشروط ہے اب رمضان شریف کا زیادہ حصہ تو گذر گیا اب وہ صورت تو
نہیں ہو سکتی کہ دس دن ایک خاص حالت ہو اور دس دن دوسری خاص حالت ہو اب اس
قدر ممکن ہے کہ جسقدر امکان میں ہو اسقدر کرے اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی جرم سے رہا
ہو کر تحصیلدار نہ ہو تو نائب تحصیلدار تو ہو جاوے۔ افسوس ہے اس شخص پر کہ اب بھی کچھ نہ کرے
اب آپ کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جو انعامات رمضان شریف کے مہینے کے اس حدیث شریف میں
مذکور ہوئے ان کے آپ مستحق ہوئے ہیں یا نہیں جو دن باقی ہیں غنیمت ہیں اور وہ بہت قلیل
ہیں کیونکہ آج جمعہ ہے اور منگل کو چاند دیکھیں گے اگر منگل کو نہ ہوا تو بدھ کو ضرور ہی ہے پس ایک
صورت میں بدھ کی عید ہوگی ورنہ جمعرات کی پس ایک صورت میں رمضان کے چار دن باقی
ہیں اور ایک صورت میں پانچ دن ان میں دو راتیں شب قدر کی باقی ہیں بہرحال چار دن تو یقیناً
رمضان کے باقی ہیں تو ابھی ہر قسم کے فضائل کا جمع باقی ہے ان میں کچھ کر لینا چاہیے پھر ایک سال
کے بعد یہ موقع میسر ہوگا پس اس کی کوشش کرو کہ استحقاق کامل ہو جاوے عتق من النار کا
اس استحقاق کی صورت یہی ہے کہ تلاوت وغیرہ عبادات کرو اور روزہ کو گناہ سے بچاؤ
خصوص پرائے مال پر قبضہ کرنے سے بچو۔ رمضان میں ترک گناہ سے ایک نفع تو یہی ہے کہ
گناہ کے وبال سے بچ گئے دوسرا نفع یہ ہے کہ گناہ معاف ہوں گے اہل اللہ کا تجربہ ہے کہ جو
شخص اس ماہ میں اچھے کاموں کی عادت ڈالتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے تو سال

بھر تک اس کا اثر رہتا ہے یعنی طاعت و ترک معصیت میں سہولت ہوتی ہے اب عید کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں حسی عید کو تو سب جانتے ہیں مگر ضرورت ہے حقیقی عید سمجھنے کی سو حقیقی عید اسی کی ہے جس نے یہ استحقاق حاصل کیا عید حقیقی اسی کی ہے جس نے جہنم سے عتق حاصل کیا۔ جیلخانہ والوں کی کیا عید ہے ان کے لئے تو وعید ہے۔ عید کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جیلخانہ سے رہائی پا کر جلسہ اور جشن کرتا ہے عید کی ہیئت ہی اسکو بتلا رہی ہے چنانچہ رہائی کے جلسہ میں چند کارروائیاں کی جاتی ہیں خوشی منائی جاتی ہے کچھ تقسیم بھی کرتے ہیں حاکم کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں عید میں کیا ہے یہی چیزیں تو ہیں اظہار بشاشت کا حکم ہے تقسیم مال کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے کا حکم ہے دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے جسکا حاصل شکریہ ہے اور اس دن میں صدقہ فطر خرچ کرنے کا بھی امر فرمادیا پھر خرچ کرنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں رکھا بلکہ اسکو واجب کر دیا اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو شاید خرچ ہی نہ کرتے اور اس کا تعین بھی کر دیا۔ اظہار بشاشت کی ہیئت بھی معین کر دی ورنہ تم رنڈیاں نچاتے باجے بجواتے اور دوسرے خرافات کرتے بلکہ اس کی صورت معین فرمادی کہ غسل کرو کپڑوں میں سے جو اچھا کپڑا ہو اسکو پہنو عطر لگاؤ صدقہ فطر دو نماز پڑھو اس سے ثابت ہوا کہ عید جشن ہے جب یہ ہے تو جشن کی خوشی اسی کو ہے جس نے حاکم کو راضی کر لیا ہے اور جس سے حاکم ناراض ہو اس کی کیا عید اور کیا خوشی۔

بہر حال رمضان اور عید کی یہ حقیقت ہے چونکہ رمضان کے بعد عید آنیوالی ہے اس لئے اسکو بھی مختصراً بیان کر دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ رمضان شریف قریب ختم ہے دوزخ سے آزادی کا اہتمام کرنا چاہیئے اس کے بعد عید حقیقی سے مشرف ہوگے اور اگر ایسا نہ کیا تو وہ صرف صورت اور نام کی عید ہوگی جس سے کیا فائدہ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ نیک عمل کے کرنے اور گناہوں سے بچنے کی توفیق دیں فقط

اشرف علی

۲۲ شوال المکرم ۱۳۵۱ھ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

وعظ مسمی بہ

اصل العبادۃ

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

۲۳۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمی بہ

اصل العبادۃ

این	کہاں ہوا	کیرانہ جامع مسجد
متی	کب ہوا	یوم جمعہ ۲ ربیع الاول سنہ ۳۶ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹہ
کیف	کس ہیئت سے ہوا	جالسا علی المنبر
لم	کیوں ہوا	احباب داعیہ کی درخواست پر
ماذا	کیا مضمون تھا	عبادت بدون علم کے نہیں ہوسکتی اور عبادت مقصود ہے اس لئے تحصیل علم ضروری ہے اس کے ضمن میں علم کی فضیلت بیان فرمائی
من المستفیدون	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	ہر طبقہ کو عموماً
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	مسودہ میں لکھی ہوئی نہیں
الاشتات	متفرقات	

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ۔ ہرچند کہ اسوقت طول سفر سے ایسا تکان ہے کہ بیان کی ہمت نہ ہوتی

تھی مگر احباب نے محبت سے درخواست کی میں نے عذر بھی کیا ادھر سے اصرار ہوا تو میں نے یہ خیال کیا کہ جتنی دیر احباب کے جواب و سوال میں لگے گی اتنی دیر بیان ہی کر دوں گا اسلئے میں نے درخواست منظور کر لی اور بیان کی ہمت ہو گئی مگر بیان مختصر ہو گا لیکن نہ ایسا مختصر کہ مقصود میں مخل ہو بلکہ مقصود کے لئے انشاء اللہ کافی شافی ہو گا اسوقت جو حدیث میں نے پڑھی ہے اسمیں ایک عام غلطی کی اصلاح ہے اول اس کا ترجمہ کرتا ہوں پھر تفصیل عرض کرونگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم سے ادنی آدمی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور شان تو یہ ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ جب آپ تمام انبیاء سے اور سب ملائکہ سے افضل ہیں تو اولیا کس پوچھ میں ہیں اور امت کے ادنی آدمی تو کس شمار میں ہیں حضور کی برابر تو کوئی بھی نہیں ہے نہ علم میں نہ حال میں نہ عمل میں نہ کمال میں نہ عبادت میں نہ درجات قرب میں خود ارشاد فرماتے ہیں آدَمُ وَمَنْ دُونَهُ تَحْتَ لِوَائِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ کہ آدم علیہ السلام اور ان کے سوا سب آدمی قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے ہوں گے۔ غرض حضور صلعم کی خصوصیات دیکھنے سے یہ بات واضح ہے کہ حضور صلعم کی برابر بھی کوئی نہیں زیادہ تو کیا ہوتا پھر امت بیاندار اس میں بھی ادنی امتی پر تو کسقدر فضیلت ہو گی حضور صلعم فرماتے ہیں کہ عالم کی فضیلت عابد پر اسدرجہ کی ہے جسدرجہ میری فضیلت ہے ایک ادنی امتی پر یہ تو حدیث کا ترجمہ ہوا اب میں اُس غلطی پر تنبیہ کرتا ہوں جس میں لوگ مبتلا ہیں اور اسی لئے اسکی اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ انسان سب کے سب عبادت کیلئے پیدا ہوئے ہیں اسلئے عبادت کی تو ضرورت ظاہر ہے اور علم کی ضرورت اسلئے ہے کہ عبادت کا طریقہ بدون اسکے معلوم نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ ہر کام کے لئے طریقہ کی ضرورت ہے مثلاً روٹی کھانا ضروری ہے مگر اسکے لئے طریقہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ روٹی کیونکر پکائی جاتی ہے آٹا کیونکر پیسا جاتا ہے غرض ہر کام میں علم و عمل دونوں کی ضرورت ہوتی ہے اب سمجھئے کہ لوگوں کی اس باب میں غلطی کیا ہے سب سے پہلی غلطی تو یہ ہے کہ لوگوں کو اول تو دین کی طرف توجہ ہی نہیں اگر ہوتی ہے تو وہ بھی دنیا کی غرض سے ہوتی ہے باستثناء غربا کہ ان بیچاروں کو

تو دین کی محبت ہے جو کام کرتے ہیں دین کے واسطے کرتے ہیں مگر یہ جو بڑے طبقہ کے لوگ ہیں ان کو جو دینی کام کی رغبت ہوتی ہے محض تفاخر اور جاہ کے لئے ہوتی ہے چنانچہ آجکل جو انجمنیں قائم ہیں اس کے عہدہ دار اپنے نام کے ساتھ سکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ اور گورنر وغیرہ لکھتے ہیں بس یہ جاہ اور عزت ان کو مطلوب ہے ورنہ خود اپنے قلم سے اپنے نام کیساتھ ان عہدوں کا ذکر نہ کرتے۔ بریلی سے میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا اس میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ گورنر یتیم خانہ لکھا تھا پھر تہذیب یہ کہ خط میں استفتاء تھا اور جواب کے لئے ٹکٹ ندارد۔ میں نے اتنی رعایت کی کہ جواب لکھکر بیرنگ روانہ کر دیا ان حضرت نے میری اس رعایت کی یہ قدر کی کہ بیرنگ خط کو واپس کر دیا اس واقعہ کے بعد میں نے بیرنگ خط بھیجنے سے توبہ کرلی بس جس خط میں ٹکٹ نہ ہو جواب کے لئے اس کو چند روز امانت رکھکر ردی میں ڈالدیتا ہوں پھر جلدی ہی میرا بریلی جانا ہو گیا تو میں نے وہ بیرنگ خط اپنے ساتھ لے لیا کہ اگر ان حضرات سے ملاقات ہوتی تو ان سے ایک آنہ وصول کروں گا چنانچہ وہاں پہونچکر میں نے ایک مجلس میں بھائی سے اس کا ذکر کیا کہ یہاں یتیم خانہ کے گورنر صاحب کون ہیں انہوں نے ایسی بدتہذیبی کی کہ میرے پاس استفتا بھیجا اور جواب کے لئے ٹکٹ بھی نہ رکھا قاعدہ کے موافق تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ میں خط کو ردی میں ڈال دیتا مگر میں نے رعایت کر کے ان کے خط کا جواب بیرنگ دیدیا تو انہوں نے میرے ساتھ یہ تہذیب برتی کہ بیرنگ خط واپس کر کے مجھے تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا میں ان حضرت سے اپنا ایک آنہ وصول کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ تاوان ناحق میرے ذمہ پڑا۔ بھائی نے یاد نہیں کیا کہا پھر مجلس برخواست ہونے کے بعد بھائی نے کہا کہ آپ نے غضب کیا یہ صاحب جو آپ کے سامنے بیٹھے تھے یہ گورنر صاحب کے صاحبزادہ تھے میں نے کہا اچھا ہوا گورنر صاحب کو اپنی حرکت کا علم تو ہو جائے گا تو بڑے طبقہ کے لوگ اکثر دین کے کام دین کی نیت سے نہیں کرتے بلکہ دنیا کی نیت سے کرتے ہیں چنانچہ ایک انجمن کے سکریٹری شراب پیتے تھے مگر اس کے ساتھ بھی وہ اسلامی انجمن کے سکرٹری تھے کہا ایسے لوگوں سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ دین کے واسطے انجمن کی خدمت

۲۳۴

کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ محض جاہ کے واسطے مجھے اس انجمن میں بلایا گیا تھا میں نے
انکار کر دیا کیونکہ جس انجمن کا سکرٹری نا اہل ہو اس میں شرکت کرنا سکرٹری کی جاہ
بڑھانا ہے اور نا اہل کی جاہ بڑھانا اور اس کے عہدہ کو تسلیم کرنا خود نا جائز ہے ہاں
کوئی اسواسطے شرکت کرے کہ ایسے نا اہلوں کے معزول کرنے میں سعی کرے تو جائز
ہے اور ایسے لوگوں کو سکرٹری وغیرہ صرف اسواسطے بنایا جاتا ہے کہ وہ چندہ خوب
وصول کرتے ہیں غربا کے اوپر ٹیکس کی طرح چندہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے دباؤ اور
اثر سے جبراً وصول کرتے ہیں۔ اس کام میں ان کی مدح کیجاتی ہے کہ فلاں صاحب
دین کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں سبحان اللہ! یہ بڑا دین کا کام کیا کہ غربا کے گلے پر
چھری رکھکر چندہ وصول کرلیا۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو کھلم کھلا ڈاکو ہیں کیونکہ وہ لوگوں
سے مال چھینکر اپنے بال بچوں کو تو کھلاتے ہیں جنکا نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے تو گوان کا ذریعۂ
معاش تو حرام ہے مگر مصرف ایسا ہے جسمیں خرچ کرنا ان کے ذمہ واجب تھا تو وہ حرام کا
ارتکاب کرکے ایک واجب سے تو سبکدوش ہوئے اور یہ سکرٹری صاحب حرام
طریقہ سے چندہ وصول کرکے ایسی جگہ صرف کرتے ہیں جسکی خدمت ان کے ذمہ
واجب بھی نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ انجمن کی خدمت ان کے ذمہ واجب نہیں اور ڈاکو
کی سزا معلوم ہے تو یہ لوگ اس کے واسطے تیار رہیں۔ افسوس آجکل چندہ میں اس کا
اصلا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ یہ مال خوشی سے دیا گیا ہے یا جبر سے۔ حق تعالیٰ شانہ نے
تو بیوی کے مال کے بارہ میں بھی یہ فرمایا ہے فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ
هَنِيئًا مَرِيئًا کہ اگر بیوی اپنے دل کی خوشی سے مرد کو اپنے مہر میں سے کچھ دیدے
تو اس کا کھانا جائز ہے۔ یہاں بھی طیب نفس کی قید ہے حالانکہ میاں بیوی کا تعلق
عاشقی معشوقی کا تعلق ہوتا ہے اور ایسے تعلق میں ناگواری بھی بہت ہی کم ہوتی ہے
تو پھر غربا کا روپیہ بدون طیب قلب کے کیونکر جائز ہوگا۔ بیوی کے معاملہ میں ایک
مقام پر اس سے بڑھکر ارشاد ہے وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ
لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ط

۴ پارہ ۴ رکوع ۱۲

۲ پارہ ۲ رکوع ۱۵

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو دخول سے پہلے طلاق دیدی ہو اور مہر مقرر ہو چکا ہو تو بیوی کے لئے نصف مہر ہے مگر یہ کہ وہ اپنا حق معاف کر دے (تو کچھ نہ رہے گا) یا جسکے ہاتھ میں نکاح کی ڈور رہے (یعنی شوہر وہ معاف کر دے (تو پورا مہر رہے گا) اور اے مرد تم معاف کر دو تو یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے یعنی مرد کے لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ عورت کی معافی کا منتظر نہ ہے بلکہ خود اپنا حق معاف کر دے۔ تو دیکھئے باوجودیکہ عورت اگر خوشی سے مہر معاف کر دے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے اور اس کی اجازت دیدی گئی تھی مگر اس مقام پر دوسرا ادب سکھلایا گیا ہے کہ غیرت کا مقتضا یہی ہے کہ عورت کی معافی کو قبول نہ کرو بلکہ تم اسکے ساتھ احسان کرو۔ جب بیوی کے ساتھ لین دین کرنے اور اس کا عطیہ قبول کرنے کے لئے یہ آداب ہیں تو بھلا چندہ کے لئے آداب نہوں گے؟ ضرور ہیں اور ان کا لحاظ کرنا واجب ہے۔ شریعت مقدسہ نے تو ہدیہ کیلئے بھی آداب مقرر کئے ہیں چنانچہ ایک ادب یہ ہے مَا اَتَاکَ مِنْ غَیْرِ اِشْرَافِ نَفْسٍ فَخُذْہُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْہُ نَفْسَکَ کہ جو چیز ہدیہ وغیرہ بدون انتظار کے آجائے لیلو اور جو انتظار سے آئے اپنے نفس کو اسکے پیچھے مت ڈالو۔ اسپر ایک واقعہ مجھے یاد آیا بلگرام میں ایک بزرگ عالم متوکل تھے ایک دن ان کے یہاں فاقہ تھا صبح کو جو وہ حسب معمول پڑھانے بیٹھے تو شاگرد نے چہرہ اور آواز سے پہچان لیا کہ شیخ کو فاقہ کا ضعف ہے اس نے دو چار سطریں پڑھکر کتاب بند کر دی اور یہ کہا کہ میری طبیعت آج اچھی نہیں آج سبق موقوف فرما دیجئے۔ استاد نے سبق کا ناغہ منظور فرما لیا اور شاگرد وہاں سے اٹھکر اپنے گھر گئے اور تھوڑی دیر میں ایک خوان سر پر رکھے ہوئے آئے جسمیں عمدہ عمدہ کھانے تھے وہ خوان استاد کے سامنے پیش کیا کہ یہ ہدیہ قبول فرمایئے استاد نے کہا کہ یہ ہدیہ ایسے وقت آیا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت تھی مگر ایک عذر اسکے قبول سے مانع ہے وہ یہ کہ تم جسوقت اٹھکر چلے ہو میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ تم کھانا لینے گئے ہو اور حدیث میں آیا ہے مَا اَتَاکَ مِنْ غَیْرِ اِشْرَافِ نَفْسٍ فَخُذْہُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْہُ نَفْسَکَ اور یہ ہدیہ اشراف نفس کے بعد آیا ہے اسلئے اس کا قبول

کرنا خلاف سنت ہے۔ وہ شاگرد بھی ان بزرگ کی صحبت کی برکت سے فہیم تھے اس لئے
شیخ پر اصرار نہیں کیا۔ اگر ہم جیسے ہوتے تو اصرار کرنے لگتے اور عاجزی کے ساتھ منہ بنا
بنا کر خوشامد کرتے کہ جس طرح بھی ہوا اب تو قبول ہی کر لیجئے اور اس سے بڑھکر یہ کہ
آجکل کھانا کھانے میں اصرار کیا جاتا ہے کہ اور کھائیے میری خاطر سے تھوڑا سا تو اور
کھا لیجئے اب اگر انکار کیا جائے تو ان کی دلشکنی ہوتی ہے اور کھایا جائے تو اپنی شکم شکنی ہوتی
ہے وہ تو اصرار کرکے زیادہ کھلا کر اپنے گھر آرام سے سو رہیں گے اور ہم کو زیادہ کھانے سے
رات بھر بے چینی رہے گی نہ نیند آئے گی نہ طبیعت صاف ہوگی اسلئے میں ایسے اصرار کو قبول
نہیں کرتا چنانچہ اس وقت اس سفر میں بھی مجھے ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک موقع پر ایک
بوڑھے میاں نے دعوت پر اصرار کیا میں نے معقول عذر کر دیا کہ آج فلاں صاحب کے
یہاں جانا ہے ان کے یہاں دعوت پہلے منظور ہو چکی ہے وہ کہنے لگے کہ چونکہ آپ نائب
رسولؐ ہیں اسلئے مجھے آپ کو کھلانیکا اشتیاق ہے میں نے کہا چونکہ میں آپ کے نزدیک نائب
رسول ہوں اسی لئے تو میں وعدہ خلافی سے رکتا ہوں کہ آج مجھے فلاں جگہ جانا ہے وہاں اطلاع
کر چکا ہوں اسلئے آپ کی دعوت قبول کرنے سے معذور ہوں کہنے لگے کہ کبھی وعدہ ملتوی بھی
تو ہو جاتا ہے میں نے کہا بہت اچھا میں سب سے پہلے آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں اور وہ
قبول کرکے ملتوی کرتا ہوں کیونکہ وعدہ کبھی ملتوی بھی تو ہو جاتا ہے اب تو وہ بڑے چپ ہوئے
میں نے اپنے دل میں کہا کہ واقعی یہ بڑے میاں پنشن پانے کے قابل ہیں۔ اسکے بعد انہوں نے
نقد ہدیہ پیش کیا کہ دعوت کے بجائے اسی کو قبول فرما لیجئے۔ میں نے کہا چونکہ آپ نے مباحثہ
کی صورت اختیار کی ہے جس سے مجھے تکدر ہوا اسلئے اب تو میں نقد بھی نہ لوں گا نہ آپ کی
سواری پر سوار ہوں گا۔ تو آجکل لوگوں کو اصرار کا بڑا مرض ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دوسرے کے
قاعدے اور ضابطے تو سب لغو ہیں اور ان کی ہر تجویز صحیح یہ بڑی بدتمیزی کی بات ہے۔ تو وہ
شاگرد ایسے بدتہذیب نہ تھے جب استاد کا معقول عذر سنا تو خوان اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور کہا
کہ میں خلاف سنت کام کرنے پر آپ کو مجبور نہیں کرتا بہت اچھا میں اسکو واپس لے جاتا ہوں
چنانچہ کھانا واپس لے گئے اور اتنی دور چلے گئے کہ شیخ کو یقین ہو گیا کہ واپس گئے اس کے بعد

تھوڑی دیر میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا حضرت اب تو اشراف نفس ختم ہو گیا اب قبول فرما لیجئے شیخ کو محبت کا جوش ہوا اور کھڑے ہو کر شاگرد کو سینہ سے لگا لیا۔ دیکھئے تہذیب اس کا نام ہے کہ شیخ کی بات کو بھی رد نہ کیا اور ہدیہ بھی ان کی اصول کے موافق پیش کر دیا واقعی جب انسان کو محبت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسکو آداب محبت خود سکھا دیتے ہیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ جسوقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی تو اسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پچیس سال کی عمر تھی اور حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی یہ بیوہ تھیں اور بہت مالدار چنانچہ اپنے تمول ہی کی وجہ سے ملک عرب مشہور تھیں اور یہاں سے مخالفین اسلام کو شرم کرنا چاہیئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے ہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں ہی کی فکر رہتی تھی اس واقعہ کو دیکھکر کون کہسکتا ہے کہ آپ کو عورتوں ہی کی فکر رہتی تھی حضور صلعم کو جوان کنواری لڑکی ملنا کیا دشوار تھا اگر آپ چاہتے تو بوجہ عالی خاندان ہونے کے کہ بنی ہاشم مکہ کے سردار تھے آپ کو کتنی ہی لڑکیاں مل سکتی تھیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی اس امر پر توجہ ہی نہیں کی پھر علاوہ عالی خاندان ہونے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت بھی بہت زیادہ تھی کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت عطا ہوئی تھی۔ وَفِي رِوَايَةٍ أَرْبَعِينَ وَتَمَامًا صِحًّا أُعْطِيَ قُوَّةَ أَرْبَعِينَ مِنْ رِجَالِ الْجَنَّةِ ۱۲) حدیث کو کوئی نہ مانے تو حضرت رکانہ کا واقعہ اس کے سامنے پیش کیا جائیگا کہ وہ عرب کے مشہور پہلوان تھے جن کی طاقت وقوت ہزار مردوں کی برابر شمار کی جاتی تھی ان کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کی تو انہوں نے کہا کہ کوئی بات دکھلاؤ تو میں ایمان لاؤں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بتلاؤ کیا چاہتے ہو کہنے لگے کہ مجھ سے زیادہ طاقتور عرب میں کوئی نہیں اگر آپ کشتی میں مجھے پچھاڑ دیں تو ایمان لے آؤں گا حضور نے فرمایا بہت اچھا چنانچہ کشتی

۲

عہ وفی المستدرک للحاکم عن ابن اسحٰق وکان لہا یوم تزوجہا ثمان وعشرون سنۃ وفیہ ایضا عن ہشام بن عروۃ قالت توفیت خدیجۃ بنت خویلد وہی بنت خمس وستین (قلت وعلی ہذا فیکون لہا عند تزوجہا بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم اربعون سنۃ ۱۲) ولکن قال ابن اسحٰق ہذا قول شاذ والذی عندی انہا لم تبلغ ستین سنۃ اھ ص ۱۸۲ ج ۳) ای بل تکون عند الوفاۃ بنت ثلث وخمسین واللہ اعلم۔

ہوئی اور حضور نے رکانہ کو پچھاڑ دیا وہ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے یہ اتفاقی بات ہے دوبارہ پھر کشتی ہو چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر رکانہ کو پچھاڑ دیا تو وہ اسلام لے آئے جب حضور صلعم کی قوت کی یہ حالت ہے تو حضور صلعم کیلئے نکاح میں امت سے زیادہ وسعت دیا جانا عین موافق عقل ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدیجہ کے نکاح کے وقت حضرت صدیقؓ کو خیال ہوا کہ اس موقع پر حضورؐ کی طرف سے بھی مہر وغیرہ میں زیادہ خرچ ہونا چاہیئے تاکہ سبکی نہ ہو مگر آپ کے پاس مال تھا نہیں اس لئے یہ تدبیر کی کہ ایک حیلہ سے آپ کو روپیہ دیا کیونکہ ویسے لینے کی امید نہ تھی وہ حیلہ یہ کیا کہ حضورؐ سے آکر عرض کیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے دادا صاحب نے کچھ رقم میرے دادا کے پاس امانت رکھی تھی مجھے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ حضورؐ کے سامنے وہ امانت پیش کردوں مگر موقعہ کا منتظر تھا کہ جب آپ کو ضرورت زیادہ ہوگی اسوقت پیش کرونگا چنانچہ اب موقع ہے اس لئے پیش کرتا ہوں اور یہ حیلہ حضرت صدیقؓ نے اسواسطے کیا تاکہ حضورؐ کو ہدیہ کے قبول کرنے سے گرانی نہو تو یہ آداب ہیں ہدیہ کے کہ اس طرح پیش کیا جائے جس سے دوسرے پر گرانی نہ ہو۔ دیکھئے حضرت صدیقؓ نے کس تدبیر سے حضورؐ کو راحت پہونچائی وہاں تو یہی مقصود تھا کہ حضورؐ کو مجھ سے راحت پہونچے حضرت صدیقؓ کو نبوت سے پہلے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت تھی غرض ہدیہ میں یہ ضروری ہے کہ کسی پر گرانی نہو نہ مہدی پر نہ مہدی الیہ پر یہی شرط ہے صدقہ میں چنانچہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص مجمع میں سوال کرنے پر ایک روپیہ دے اور تنہائی میں ایک روپیہ دیتا تو اس میں ایک روپیہ مال حلال ہے ایک حرام ہے یہی قاعدہ چندہ میں بھی ہے مگر چندہ میں تو قصداً یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ مجمع میں تحریک کی جائے تاکہ جو شخص ایک روپیہ دیتا وہ شرما شرمی میں پانچ تو دے گا یاد رکھو یہ صورت بالکل ناجائز ہے مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بتلاؤ مقصود بالذات کیا ہے۔ کام مقصود ہے یا دین؟ اگر صرف کام ہی مقصود ہے تو منافقین درک اسفل نار میں کیوں ہوں گے کیونکہ وہ بھی تو جہاد وصدقہ وغیرہ کرتے تھے معلوم ہوا کہ جس کام میں رضائے حق نہو وہ کام ہی نہیں مسلمان کا اس

۲۴۲

مقصود رضائے حق ہے چاہے کام تھوڑا ہو مگر رضائے حق کے موافق ہونا چاہئے۔ مثلاً اگر نیم زمانہ بہت بڑا ہو مگر رضائے حق نہ ہو تو اسکو لیکر کرنا کیا ہے۔ چنانچہ آجکل جو ایک بہت بڑی انجمن ہے میں اس کا نام بیان نہیں کرنا چاہتا اس کا ایک واقعہ عجیب سنا ہے جس سے حیرت ہوگئی وہ یہ کہ لکھنؤ میں ایک کسی نے اپنی بہت بڑی جائداد ایک متوکل عالم تنگدست کے سامنے پیش کی کہ اسکو قبول فرماکر اپنے تصرف میں لائیے انہوں نے انکار کردیا اس کے بعد اس نے انجمن والوں کے سامنے پیش کیا کہ میری طرف سے اسکو انجمن کے واسطے وقف کردو انہوں نے قبول کرلیا لکھنؤ کے عوام نے اسپر عجیب فقرہ کسا کہ میاں وہ بزرگ تو اکیلے تھے انکو گناہوں کے بار کا تحمل نہ تھا اور انجمن میں تو بہت سے موٹے موٹے ہیں وہ سب ملکر تھوڑا تھوڑا اٹھالیں گے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو صرف انجمن کا چلانا مقصود ہے[ع] رضائے حق مقصود نہیں ورنہ حلال و حرام کی ضرور رعایت کرتے اور یہ ساری خرابی حب جاہ کی ہے کہ ان لوگوں کو کام سے جاہ مطلوب ہے چنانچہ ڈیگ میں ایک انجمن کے سکریٹری مجھسے ملے اور انجمن سے لوگوں کی بے توجہی کی شکایت کرنے لگے میں نے کہا کہ دوسروں کو کام میں لگانے کی اور ان کی شکایت کی آپ کو کیا ضرورت ہے آپ پہلے خود کام کرنا شروع کردیں جتنا بھی آپ سے ہوسکے دوسروں کو آپ تنگ نہ کریں پھر کام میں خود کشش ہوتی ہے لوگوں کو خود بخود توجہ ہوجاویگی جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ان کے مرض کو خوب سمجھا

۲۴۳

ع احقر جامع عرض کرتا ہے کہ یہ آجکل ہم مسلمانوں کی بہت بڑی غلطی ہے کہ صرف کام کو مقصود سمجھتے ہیں رضائے حق کو مقصود نہیں سمجھتے چنانچہ بہت لوگ آزادی کی طلب میں وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو سراسر خلاف شریعت ہے مثلاً کافروں کو پیشوا بنانا ان کی بے پردہ عورتوں کے ساتھ جلوس وغیرہ میں شریک ہونا جس میں نگاہ بد سے حفاظت دشوار ہے جس کپڑے کی تجارت شرعاً مباح ہے اس سے جبراً تجار کو روکنا خریداروں کو روکنا کسی کی گرفتاری پر ہڑتال کرنا اور تجار کو دکانیں بند کرنے پر مجبور کرنا وغیرہ وغیرہ بہت سے افعال ایسے ہیں جو حدود شریعت سے متجاوز ہیں مگر وہ انکو دین سمجھتے ہیں ان کی غلطی کا منشا صرف یہ ہے کہ انہوں نے کام کو مقصود سمجھ لیا ہے رضائے حق کو مقصود نہیں سمجھا ورنہ اس کام کے ذرائع میں ضرور غور کرتے کہ یہ شریعت کے بھی موافق ہیں یا نہیں ۱۲ ظ۔

واقعی بات یہی ہے کہ یہ خود تو کچھ کام نہیں کرتے اور دوسروں سے چندہ وصول کرنا
اور کام لینا چاہتے ہیں خلاصہ یہ کہ سکریٹری بننے کا شوق ہے اور کام کے نام صفر ہے
غرض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو لوگ دین کی خدمت کرتے ہیں محض جاہ
کے لئے کرتے ہیں دین اور رضائے حق مطلوب نہیں چنانچہ اسی حالت کے متعلق میرے
ایک دوست کا خواب ہے کہ انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو محاسن اسلام
پر تقریر کرتے ہوئے دیکھا مگر خواب ہی میں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت صدیق قبل
از اسلام محاسن اسلام پر تقریر کر رہے ہیں میں نے اس کی یہی تعبیر دی کہ اس
خواب میں آجکل کے حامیان اسلام کی خدمت اسلام کی حقیقت بتلائی گئی ہے
کہ ان کی یہ حمایت اسلام ایسی ہے جیسے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو نبوت سے
پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و الفت تھی کہ وہ نصرت محض دوستانہ
تھی رضاء حق کیلئے نہ تھی اسی طرح آجکل جو لوگوں کو اسلامی درد ہے یا حمایت
اسلام کا ولولہ ہے وہ محض قوم پرستی اور ہمدردئی قومی سے ناشی ہے طلب رضائے
حق سے ناشی نہیں ورنہ اتباع احکام کا اہتمام ضرور ہوتا اب تو یہ حالت ہے کہ انجمنوں میں
ہزاروں روپیہ جمع ہے اور بنک میں داخل ہے جسکا سود لے رہے ہیں یہ کیا دین ہے
مگر ان کی بلا سے سود ہو یا سود سے بھی بدتر ان کی انجمن کا کام چلنا چاہئیے کیونکہ اس کی
بدولت یہ سکریٹری اور ممبر اور لیڈر بنے ہوئے ہیں اسی سے ان کی وقعت ہے
اور یہی ان کو مطلوب ہے اسلئے آجکل زیادہ کام قوم پرستی کرا رہی ہے خدا پرستی
نہیں کراتی۔ خدا پرستی تو یہ ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا
یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایک کافر معرکہ جہاد میں میرا ایک ہاتھ کاٹ دے پھر جب مجھے اس پر
قابو ملے اور میں اسکو مارنا چاہوں تو وہ کلمہ اسلام زبان سے پڑھ دے تو میں کیا کروں حضور
نے فرمایا ہاتھ روک لو صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں تو وہ محض
جان بچانے کو کلمہ پڑھتا ہے حضور نے فرمایا ہاتھ روک لو اگر تم نے اسکو کلمہ پڑھنے کے بعد
قتل کیا تو اس کی وہ حالت ہوگی جو کلمہ اسلام کے بعد تمہاری حالت ہوئی تھی اور تمہاری حالت وہ

۲۴۴

ہوگی جو کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی حالت تھی تم کو کسی کے دل کی کیا خبر ہے۔ یہ ہے خدا پرستی کہ تمام مصالح پر خاک ڈالدی اور حکم کا اتباع کیا چنانچہ حضرات صحابہ کے کارناموں سے معلوم ہوگا کہ انہوں نے ان احکام کی کسقدر پابندی کی۔ ایک واقعہ مجھے اسی قسم کا یاد آگیا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیش آیا تھا کہ ہرمزان فارسی سے جو شاہان فارس میں سے ایک بادشاہ تھا مسلمانوں کی صلح ہوگئی تھی مگر اس نے صلح کے بعد غدر کیا پھر مسلمانوں نے اس کے ملک پر حملہ کیا اور صلح کیلئے خوشامد کرنے لگا پھر غدر کیا صحابہ نے پھر اسکے ملک پر حملہ کیا تو پھر صلح کی درخواست کرنے لگا حضرات صحابہ نے اس مرتبہ صلح منظور نکی کیونکہ تجربہ ہوچکا تھا تو اس نے درخواست کی کہ اچھا مجکو حضرت عمرؓ کے پاس بھیجدیا جائے وہ جو فیصلہ میرے حق میں کردیں گے مجھے منظور ہے چنانچہ اسکو حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا اس کی صورت دیکھکر حضرت عمرؓ کو غصہ سے تاب نرہی کیونکہ اس نے صلح کرکے مسلمانوں کے بڑے بڑے بہادر اور جلیل القدر صحابہ کو قتل کیا تھا چنانچہ حضرت عمرؓ نے غصہ کے ساتھ اسکو ڈانٹ کر فرمایا کہ تیرے پاس اس غدر کا کیا جواب ہے بولو ہرمزان نے کہا زندوں کی طرح بولوں یا مردوں کی طرح کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہیں بات پورا کرنے سے پہلے ہی آپ مجکو قتل کردیں حضرت عمرؓ نے فرمایا تکلم لا بأس بولو ڈرو نہیں ؟ اس نے کہا اچھا ذرا مجھے پانی پلوادیجئے کہ پیاس سے بیتاب ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اس کے لئے پانی منگایا جو ایک بھدے سے پیالے میں لایا گیا ہرمزان نے کہا کہ میں مر بھی جاؤں گا تو ایسے پیالہ میں پانی نہ پیوں گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کے حق میں پیاس اور قتل کو جمع نہ کرو اچھے گلاس میں پانی لے آؤ چنانچہ لایا گیا تو ہرمزان نے گلاس منہ سے لگا کر ہٹا لیا کہ پینے کی ہمت نہیں ہوتی مجھے اندیشہ ہے کہیں گلاس منہ کو لگاتے ہی میرا سر گردن سے جدا کردیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا لا تخف حتی تشربہ کہ پانی پینے تک کچھ اندیشہ نہ کرو یہ سنتے ہی ہرمزان نے پانی پھینک دیا اور کہا مجھے پیاس نہیں ہے مجھے تو صرف امن لینا مقصود تھا سو وہ مقصد حاصل ہوگیا اب آپ مجکو قتل نہیں کرسکتے حضرت عمرؓ نے فرمایا بھلا میں ایسے شخص کو زندہ چھوڑ سکتا ہوں جس نے براء بن مالک اور فلاں فلاں جلیل القدر

صحابہ کو قتل کیا ہے ہرمزان نے کہا کہ میں نے کچھ ہی کیا ہو مگر آپ مجکو امن دے چکے ہیں اب قتل نہیں کر سکتے حضرت عمر نے فرمایا کہ میں نے تجکو امن نہیں دیا ہرمزان نے کہا آپ واقعی مجکو امن دے چکے ہیں اسپر دوسرے صحابہ نے بھی ہرمزان کی تائید کی واقعی آپ اس کو امن دے چکے ہیں کیونکہ آپ نے اس کو تَکَلَّمْ لَا بَاسَ اور لَا تَخَفْ حَتّٰی تُخْبِرَ فرمایا ہے اور یہ الفاظ موجب امان ہیں حضرت عمر رضی اللہ نے بھی اپنے کلام میں غور فرمایا تو سمجھ گئے واقعی میری زبان سے الفاظ امان نکل چکے ہیں تو ہرمزان کو رہا کر دیا اور فرمایا خَدَعْتَنِیْ وَلَا اَنْخَدِعُ اِلَّا لِمُسْلِمٍ کہ تم نے مجکو دہوکہ دیا مگر میں مسلمان کے دہوکہ میں آسکتا ہوں کافر کے دہوکہ میں نہیں آسکتا چنانچہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہرمزان مسلمان ہوگیا حضرت عمر نے پوچھا کہ تو نے جان بچانے کے لئے اتنی تدبیریں کیوں کی اول ہی میں اسلام لے آتا تو تیری جان بچ جاتی۔ کہا اس صورت میں آپ کو میرے اسلام کی قدر نہوتی یہ خیال ہوتا کہ جان بچانے کے لئے مسلمان ہوا ہے اسلئے میں نے دوسرے طریقے سے اپنی جان بچالی اور آپ کو اپنے قتل سے روکدیا اس کے بعد مطمئن ہو کر اسلام لایا اب کسی کو یہ کہنے کا موقعہ نہیں کہ جان بچانے کو اسلام لایا ہے۔ تو اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کسقدر شریعت کے پابند اور وقاف عند الحدود تھے۔ عبدیت اسی کا نام ہے بندہ کی شان تو یہ ہے کہ احکام کا اتباع کرے مصالح کی پروا نکرے۔ ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

انجن کو کیا حق ہے کہ راستہ میں ڈرائیور کے ٹھہرانے کے بعد نہ ٹھہرے بلکہ اسکو ڈرائیور کے ٹھہرانے کے بعد فوراً ٹھہر جانا چاہیے خواہ اس کے نزدیک ٹھہرنے کی جگہ ہو یا نہو سلطان صلاح الدین رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ فتوحات سے فراغت کر چکے تو وزراء نے ان سے کہا کہ عیسائی رعایا کے واسطے ایک قانون سخت بنانا چاہیے کیونکہ یہ لوگ بدون سختی کے مفسدہ سے باز نہیں آتے اور قانون اسلام بہت نرم ہے اس سے مفسد لوگ دب نہیں سکتے اور آپ نے فرمایا کہ قرآن و حدیث کافی ہے کسی نئے قانون کی ضرورت نہیں خدا تعالیٰ کو پہلے سے سب کچھ معلوم تھا کہ مفتوحات اسلامیہ کی رعایا کس قسم کی ہوگی انہوں نے اپنے

۲۴۵

علم سے یہ قانون نازل فرمایا ہے اسلئے ہمارے نزدیک قانون اسلام ہر قسم کی رعایا کے واسطے کافی ہے اور فرض کرلو کہ وہ کافی نہیں تو ہم کو تو رضائے حق مطلوب ہے بقائے سلطنت مطلوب نہیں اگر قانون اسلام رائج کرنے سے سلطنت جاتی رہے گی بلا سے جاتی رہے کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ تو ہم سے راضی رہیں گے اور دوسرا قانون رائج کرنے سے فرض کرلو سلطنت باقی رہے گی مگر خدا تعالیٰ ہم سے ناراض ہو جائیں گے اور ہم نے اسواسطے فتوحات نہیں کیں کہ خدا تعالیٰ کو ناراض کرکے سلطنت کریں ایسی سلطنت تو فرعون کو بھی حاصل تھی سہ

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

غرض بڑے طبقہ کے اکثر لوگ جو دین کا بڑا کام کرتے ہیں وہ محض دنیا کے واسطے کرتے ہیں دین کیلئے اور خدا کے لئے کم کرتے ہیں البتہ غرباء کی نیتیں دین کے کام میں درست ہوتی ہیں کیونکہ ان کی عزت ہی کچھ نہیں وہ دین کا کتنا ہی بڑا کام کریں ان کی کوئی وقعت دنیا والے نہیں کرتے ہاں خدا تعالیٰ ان کی وقعت فرماتے ہیں اور وہی وقعت کرنیوالے کافی ہیں پس غرباء کو تو دین پر کچھ توجہ ہے امراء کو نہیں ہے (اسی لئے حدیث میں آتا ہے هُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ کہ انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنیوالے غرباء زیادہ ہیں اول تو شمار میں بھی غرباء زیادہ ہیں دوسرے دین کی خدمت خدا کے لئے کرنے والے بھی زیادہ غرباہی ہیں امراء اول تو دین کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے اور ہوتے بھی ہیں تو دنیا ہی کے لئے ۱۲) یہانتک تو ان کی شکایت ہے جو کام ہی نہیں کرتے یا طریقے سے نہیں کرتے اب میں ان کی شکایت کرتا ہوں جو کام کرنے والے ہیں کہ ان کو عمل کا تو اہتمام ہے مگر علم کا اہتمام نہیں یہ لوگ نفلیں پڑھ لیں گے حج کرلیں گے روزے رکھ لیں گے باقی یہ کہیں نہیں دیکھا جاتا کہ دینداری اختیار کرنے کے بعد کسی نے دین کی کوئی کتاب پڑھنا بھی شروع کردی ہو مجھے مشائخ کی بھی شکایت ہے اور ان مشائخ کی بھی جو علماء ہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو وظائف و اوراد وغیرہ تو بتلاتے ہیں مگر مسائل و احکام کی کوئی کتاب پڑھنے سننے کو نہیں بتلاتے کہ فلاں کتاب دیکھنا یا کسی سے سن لینا ہاں اگر کوئی مولوی اپنی خوشی سے آجائے جیسے ایک نیم ملا کے

۲۴۰

پیالہ میں گوشت کی بوٹیاں اپنی خوشی سے آ گئی نخس نیم ٹر کا قصہ یہ ہے کہ اس کے
گھر میں کسی کا مرغا آ گیا تو اس نے تین دفعہ پکار کر کہا یہ کس کا مرغا مگر کس کا نوز ور
سے کہتا تھا اور مرغا آہستہ سے جب تین دفعہ ندا ہو چکی بیوی سے کہا یہ لقطہ ہے حلال ہے
اسکو ذبح کر لو جب پک کر تیار ہو گیا بیوی سے کہا کہ کھانا لے آ و مگر شوربا نکالو بوٹی میں
شبہ ہے وہ مت لانا وہ شوربا اتارنے بیٹھی اور چمچے سے بوٹیوں کو ہٹا کر شوربا نکالنے لگی
نیم ٹر بولے کہ چمچے سے نہ ہٹاؤ بلکہ کنارے سے شوربا نکال لو اس نے کہا اس طرح تو بوٹی بھی
آ رہی فرمایا جو اپنی خوشی سے آ جاوے اسے آنے دو تم خود مت لاؤ۔ تو اسی طرح کوئی مولوی خود
ان کے گھر اپنی خوشی سے آ جائے تو اب اس سے مسئلے پوچھتے ہیں کہ فلاں دن نماز میں یہ واقعہ
پیش آیا نماز ہوئی یا نہیں مولوی صاحب نے جواب دیا کہ نماز نہیں ہوئی اس کا اعادہ کرو
پھر بعض تو اعادہ کر لیتے ہیں اور بعض کہہ دیتے ہیں کہ میاں سب ہو گئی اللہ تعالیٰ ہم جاہلوں
کی ہر طرح قبول کر لیتے ہیں اس عدم اعادہ کا منشا ایک تو دین سے بے پروائی ہے یہ تو
امر مشترک ہے ایک منشا طبعی ہے وہ یہ کہ عمل کرنے کے بعد جو اس میں کچھ خرابی بتلائی
جاتی ہے وہ انسان کو گراں گذرتی ہے عمل سے پہلے جتنی بھی قیود لگا دی جائیں وہ زیادہ
گراں نہیں مگر جب کام ختم ہو چکے اب یہ کہنا کہ اس میں یہ خرابی ہے وہ خرابی ہے گراں
گذرتا ہے مجھے اس کا تجربہ یوں ہوا کہ ایک دفعہ میں نے ایک بڑے عہدہ دار کی دعوت
کر دی اور یہ کام میں نے اصول طریق کے خلاف کیا حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے
کہ مجھے ایک بزرگ نے وصیت فرمائی تھی کہ کسی کی دعوت نکرنا تو بزرگوں [illegible] سوال
ہے مگر چونکہ وہ عہدہ دار اکثر میرے پاس ملنے آتے تھے اس لئے میں نے شرم سے
ان کی دعوت کر دی جب کھانا تیار ہو کر سامنے لایا گیا اور وہ کھانے بیٹھے تو کہنے لگے
کہ میں مرچ بالکل نہیں کھاتا۔ اسوقت ان کا یہ کہنا مجھے بہت ہی گراں گذرا کہ بندۂ خدا پہلے
سے نہ کہہ دیا یہ بھی قلت علم کی خرابی ہے کہ لوگوں کو کھانے کے آداب معلوم نہیں کھانے
کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ جس کے یہاں مہمان ہو اسکو اپنے معمولات کی پہلے ہی اطلاع
کر دے دسترخوان پر بیٹھ کر اپنے معمولات بیان کرنا تہذیب کے خلاف ہے

کہ اس سے میزبان کو تکلیف ہوتی ہے چنانچہ اسوقت واقعی مجھے بہت تکلیف ہوئی وہ تو اتفاق سے ہمارے ہی ایک عزیزہ اس زمانہ میں آ گئیں جو اکر آئی تھیں اور ڈاکٹر نے ان کو مرچ کھانے سے منع کر رکھا تھا ان کے یہاں سے بے مرچ کا سالن منگایا گیا تب عہدہ دار صاحب نے کھانا کھایا۔ اسی طرح کھانے کے آداب میں سے یہ ہے کہ میزبان مہمان کے اوپر مسلط ہو کر نہ بیٹھے بلکہ اس کو آزاد چھوڑ دے کہ جس طرح چاہے کھائے بعض لوگ مہمان کے کھانے کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح کھلیا ہے کیا کھا رہا ہے اس سے مہمان کو تکلیف ہوتی ہے چنانچہ ایک صاحب نے میری دعوت کی اور میرے اوپر مسلط ہو کر دستر خوان پر بیٹھ گئے خود تو کھایا نہیں میرے کھانے کو دیکھنے لگے اور ایک ایک کھانا میرے آگے بڑھانے لگے میں نے ایک بار تو کہدیا کہ میں خود کھا لوں گا آپ تکلیف نہ کریں مگر وہ کب ماننے والے تھے پھر وہ کہنے لگے کہ آپ میرے باپ کے ملنے والوں میں سے ہیں اس لئے مجھے آپ سے خاص محبت ہے میں تو آپ کو باپ سمجھتا ہوں میں نے دل میں کہا مگر میں آپ کو باپ سمجھتا ہوں۔ حضرت معاویہ کا دستر خوان بہت وسیع تھا ہمیشہ آپ کے دستر خوان پر بہت بہت آدمی کھانے والے ہوتے تھے ایک مرتبہ ایک بدوی آپ کے دستر خوان پر تھا جو بڑے بڑے لقمے کھا رہا تھا اتفاق سے حضرت معاویہ کی نظر اس پر پڑ گئی تو آپ نے خیر خواہانہ طور سے نصیحت کی کہ لقمہ چھوٹا لو کہیں گلے میں نہ پھنس جائے بدوی یہ سنتے ہی کھڑا ہو گیا اور کہا آپ کو کھانا کھلانا نہیں آتا آپ مہمانوں کے لقمے دیکھتے ہیں پھر ہر چند حضرت معاویہ نے خوشامد کی مگر وہ نہ ٹھہرا تو کھانے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مہمانوں کے لقمے نہ دیکھے ہاں خفیہ طور سے کہ مہمان کو نہ معلوم ہو کہ یہ مجھے دیکھ رہا ہے اس بات کی خبر گیری رکھے کہ کس کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ اسی طرح آداب طعام میں سے یہ ہے کہ میزبان کے ہاتھ شروع میں پہلے دھلائے جائیں اور کھانا بھی اول میزبان کے سامنے رکھا جائے امام شافعی رحمۃ اللہ امام مالک کے مہمان ہوئے تو امام مالک نے اپنے خادم سے فرمایا کہ پہلے میرے ہاتھ دھلاؤ اور میرے سامنے کھانا پہلے رکھو کیونکہ مقصود تو مہمان کو راحت دینا ہے اور مہمان کو راحت

۲۴۸

اسی میں ہے کہ پہلے میزبان ہاتھ دھوئے اور کھانا شروع کرے اس سے مہمان بے تکلف ہوجاتا ہے مگر ان باتوں کو عوام تو عوام مشائخ بھی نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ ان کی تعلیم نہیں کرتے ؎

زاہد شدی و شیخ شدی دانشمند ۔ این جملہ شدی ولیکن انساں نشدی

مشائخ کو چاہیے کہ وظیفہ وغیرہ بتلانے سے پہلے دو کام بتلائیں ایک اخلاق کی درستی دوسرے بقدر ضرورت علم کی تحصیل پہلے زمانہ میں اسی پر عمل تھا مریدوں کی برسوں تک اصلاح اخلاق کرتے تھے اس کے بعد وظیفے تعلیم فرماتے تھے اور جو طالب علم دین سے کورا ہوتا اسکو تحصیل علم کی تاکید فرماتے تھے چنانچہ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شیخ عبدالقدوس حاضر ہوئے تو شیخ نے پوچھا کہ علم دین کہاں تک حاصل کیا ہے کہا کچھ نہیں فرمایا جاہل ولی نہیں ہوسکتا جاؤ پہلے علم دین بقدر ضرورت حاصل کرکے آؤ چنانچہ شیخ عبدالقدوس واپس ہوگئے اور کچھ عرصہ کے بعد پھر حاضر ہوئے تو حضرت شیخ عبدالحق رح کا وصال ہوچکا تھا تو آپ نے شیخ کے پوتے سے بیعت کی درخواست کی انہوں نے بھی وہی سوال کیا کہ کیا پڑھا ہے عرض کیا کافیہ تک پڑھا ہے فرمایا کافیہ کافی ست باقی دردسر۔ اور بیعت فرمالیا۔ پھر گو ظاہر میں پوتے سے بیعت ہوئے تھے مگر روحانی فیض آپ کو حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رح سے بہت زیادہ ہوا تو محققین مشائخ کی یہ عادت تھی کہ ہر شخص کو فوراً بیعت نہ کرتے تھے بلکہ اول اسکو مبادی کی تحصیل کا امر کرتے تھے اور اگر کوئی شخص مبادی کو حاصل کرکے آیا ہوا اسکو بھی جلدی بیعت نہ کرتے تھے بلکہ امتحان طلب کے بعد بیعت فرماتے تھے۔ چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب اور حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہما میں باہم یہ قول و قرار ہوچکا تھا کہ دونوں ایک ہی پیر سے بیعت ہوں گے کیونکہ دونوں میں محبت بہت تھی پھر حضرت حاجی صاحب تو ایک خواب کی وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اور کسی بزرگ نے خواب میں آپ کا ہاتھ میانجی صاحب کے ہاتھ میں دیکر فرمایا تھا کہ یہ تمہارے پیر ہیں مدت تک تو اس سوچ میں رہے کہ یہ بزرگ کون ہیں پھر کسی سے حضرت

۲۴۹

میاں جی صاحب کے کمالات سنکر لوہاری حاضر ہوئے تو دیکھا تو میاں جی صاحب کی بالکل وہی شکل وصورت تھی جو خواب میں دیکھی تھی حضرت میانجیو صاحب نے پوچھ کچھ کہنا ہے حاجی صاحب نے عرض کیا کیا آپ کو خبر نہیں۔ میانجی صاحب نے فرمایا کہ خواب وخیال کا کیا اعتبار انہوں حاجی صاحب کو اور زیادہ اعتقاد ہو گیا کہ آپ کو بھی خبر ہے کہ میں آپ کے حوالہ کیا گیا ہوں بس رونا شروع کردیا حضرت میانجی صاحب نے تسلی فرمائی اور بیعت فرمایا اور حاجی صاحب کچھ ایسے مغلوب الحال ہوئے کہ حافظ صاحب سے کہنا بھول گئے حافظ صاحب نے جو دیکھا کہ حاجی صاحب روز روز لوہاری جاتے ہیں ایک دن پوچھا کہ تم روز روز کہاں جایا کرتے ہو حاجی صاحب نے فرمایا کہ میں نے ایک بزرگ سے بیعت کرلی ہے حافظ صاحب نے فرمایا کہ ہمارا تمسے کیا عہد تھا فرمایا میں بالکل بھول گیا کہا اچھا اب ہمکو بھی لے چلو فرمایا بہت اچھا چنانچہ دونوں حضرات پہونچے تو میاں جی صاحب نے حافظ صاحب سے پوچھا کس ارادہ سے تشریف لائے عرض کیا بیعت ہونے کے ارادہ سے آیا ہوں فرمایا میں اس قابل نہیں مجھے اس سے معاف رکھئے کہا بہت اچھا میں اصرار نہیں کرتا کہ بزرگوں سے اصرار کرنا بے ادبی ہے مگر اس کے بعد حافظ صاحب برابر حاضر ہوتے رہتے یہاں تک کہ عرصہ کے بعد میاں جی صاحب نے فرمایا کہ کیا حافظ صاحب اب بھی وہی خیال ہے عرض کیا حضرت میں تو اپنی طرف سے اول ہی دن بیعت ہوچکا ہوں آپ کو اختیار ہے خواہ قبول فرمائیں یا نہ فرمائیں فرمایا بہت اچھا وضو کرکے آجائیے اور دونوں بزرگوں کے طرز بیعت مختلف ہونے کا یہ اثر ہوا کہ حضرت حاجی صاحب تو فوراً طالب کو بیعت فرمالیا کرتے تھے بشرطیکہ طالب ہو اور حضرت حافظ صاحب طالب کو بھی بڑی دیر میں بیعت کرتے تھے کہ عمر بھر میں شاید سات آٹھ مرید ہوئے ہونگے اور حاجی صاحب کے ہزاروں مرید ہیں۔ غرض مشائخ کا یہ طرز تھا کہ ہر شخص کے ساتھ اسکے مناسب برتاؤ کرتے تھے یہ نہیں کہ جو آیا فوراً مرید کرلیا اور مرید کرنے کے بعد بس کچھ وظیفے بتلادیئے چاہے اسکو نماز کے اور پاکی ناپاکی کے مسائل بھی معلوم نہوں بلکہ آجکل تو غضب یہ ہے کہ مریدوں کو علم کی ترغیب تو کیا دیتے الٹی

۱۲۰

یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اَلْعِلْمُ ھُوَ الْحِجَابُ الْاَکْبَرُ کہ علم بڑا حجاب ہے اور اسکے غلط معنی مشہور کئے ہیں کہ علم وصول الی اللہ سے مانع ہے خود اس کے معارض بزرگوں کا دوسرا ارشاد ہے مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلِیًّا جَاھِلاً کہ خدا تعالیٰ نے کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا ۱۱ اور جو اہل اللہ امی تھے وہ جاہل نہ تھے وہ حضرات صحابہ کی طرح صحبت کے ذریعہ سے ضروری مسائل و احکام معلوم کئے ہوئے تھے ۱۲) بلکہ حجاب اکبر شاہی صطلاح ہے شاہی محاورہ میں حجاب اکبر وہ پردہ ہے جو بالکل بادشاہ کے پاس ہوتا ہے کہ اس کے بعد اندر حجاب کوئی نہیں ہوتا۔ جس کا لقب دہلی کے قلعہ میں لال پردہ تھا پس مطلب اس کا یہ ہے کہ علم حاصل کرنے سے سب حجابات رفع ہوجاتے ہیں اور غایت قرب نصیب ہو جاتا ہے حجاب اکبر کے یہ معنی ہیں اور حضرت حاجی صاحب نے اس کے ایک دوسرے معنی بتلائے کہ اَلْعِلْمُ میں لام عہد ہے مراد علم غیر حق ہے وہ بیشک مانع عن المقصود ہے اور میں نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ علم سے مراد علم العلم ہے یعنی دعویٰ علم اپنے آپ کو عالم سمجھنا یہ بڑا حجاب ہے کیونکہ تکبر ہے اور تکبر کا حجاب اکبر ہونا ظاہر ہے مگر اس سے نفس علم کا حجاب ہونا لازم نہیں آتا۔ لہٰذا مشائخ پر لازم ہے کہ اپنے مریدین کو علماء سے نہ روکیں گو علماء دو قسم کے ہیں ایک علماء صوفیہ دوسرے علماء خشک اور شاید تم علماء خشک سے روکنا ضروری سمجھتے ہو مگر میں کہتا ہوں کہ عالم خشک پھر بھی جاہل صوفی سے افضل ہے۔ جاہل صوفی کی مثال اگرچہ وہ تر ہے جمنا کے بھنور کے مانند ہے کہ لوگوں کے ایمان کو غرق کرتا ہے اور عالم خشک کی مثال جمنا کے ریت کی مانند ہے کہ گو خشک ہے مگر اس میں کوئی غرق نہیں ہوتا اور عالم صوفی ہو تو اس کی تو یہ شان ہے سہ

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

مجھے مشائخ سے یہ شکایت ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو علماء سے روکتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں مشائخ کا یہ برتاؤ نہ تھا۔ چنانچہ شیخ عبد القدوس رحمہ اللہ کو حضرت شیخ جلال تھانیسری اول اول بچہ پیر کہتے تھے کیونکہ شیخ عبد القدوس صاحب وجد و سماع تھے مگر حضرت شیخ عبد القدوس اپنے خادم کو علماء کے پاس تحصیل علم کیلئے بھیجتے تھے علماء کے طعن و ملامت

۲۵۱

سے ان پر یہ اثر نہیں ہوا کہ علماء سے اپنے خدام کو روکدیتے۔ مگر آجکل درویشوں کو علم سے ایسی نفرت ہے کہ اس سے دور بھاگتے ہیں نفلیں تو خوب پڑھتے ہیں مگر مسائل کو نہیں سیکھتے نہ مشائخ ان کو سکھلاتے ہیں اسلئے ان کی نمازیں بھی درست نہیں ہوتیں اور جب بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ نماز نہیں ہوئی تو اعادہ گراں گذرتا ہے۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو بعد میں مسئلہ معلوم کر کے نماز کا اعادہ کرتے ہوں کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ عمل کے بعد اس میں خرابی معلوم ہونا طبعاً بہت گراں ہے اب محبت وعشق کا غلبہ ہو تو عمل کی اصلاح کا اہتمام ہوگا ورنہ نہیں پس آسان بات یہ ہے کہ پہلے ہی سے علم حاصل کر لیا جائے مجھے تو درویشوں میں صرف دو آدمی ایسے ملے جنکو مسائل شرعیہ کا اہتمام تھا ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ وجد میں اگر غشی کی حالت میں گر پڑوں تو وضو رہے گا یا نہیں میں اس سوال سے بہت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ عمر بھر میں آج تم نے یہ سوال کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا معلوم ہوتا ہے تمکو دین کی فکر ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں وضو کا اعادہ ضروری ہے۔ وہ کہنے لگا کہ درویشوں میں کوئی بھی وضو کا اعادہ نہیں کرتا اس صورت میں مرید تو کیا پیر کی بھی نماز درست نہیں ہوتی مگر نماز کا اہتمام اور اس کی قدر و وقعت ہو تو مسائل جاننے کی فکر ہو۔

دوسرے ایک بزرگ شاہجہاں پور میں تھے وہ بھی درویشوں میں ایسے ملے جنکو دین کا خیال تھا انہوں نے بھی ایسا مسئلہ دریافت کیا کہ ان سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیا انہوں نے لکھا کہ میرا ایک دشمن تھا میں نے اسکے لئے بددعا کی تو وہ ہلاک ہوگیا مجھے اس صورت میں قتل کا گناہ تو نہیں ہوا اگر ہوا ہے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟ کسی دوسرے شخص کو یہ واقعہ پیش آتا تو وہ اس کو اپنی کرامت و ولایت قرار دیتا مگر ان بزرگ کو دین کی فکر تھی ان کو گناہ کا اندیشہ ہوا۔ میں نے لکھا کہ آپ کے سوال سے بہت جی خوش ہوا مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ صاحب تصرف ہیں اور تصرف سے کام لیا ہے تو بیشک آپ قاتل شبہ عمد ہیں اب آگے تفصیل ہے کہ اگر وہ شخص شرعاً مباح الدم تھا تو گناہ نہیں ہوا ورنہ گناہ ہوا اور شبہ عمد کا کفارہ بھی واجب ہوا یعنی ایک غلام

۲۵۲

مؤمن آزاد کرنا یہ نہ ہو سکے تو دو مہینے پے در پے روزے رکھنا اور اللہ تعالےٰ سے توبہ استغفار کرنا۔

اور اگر آپ صاحب تصرف نہیں یا ہیں مگر تصرف سے کام نہیں لیا صرف دعا پر اکتفا کی ہے تو قتل لازم نہیں آیا۔ اب تو دیکھنا چاہیے کہ وہ شخص بددعا کا اہل تھا یا نہیں اگر بددعا کا اہل تھا تو آپ پر گناہ بھی کچھ نہیں ہوا اور اگر بددعا کا محل نہ تھا تو بددعا کا گناہ ہوا جس سے توبہ استغفار لازم ہے کفارہ قتل لازم نہیں۔ اور وہ شخص جو ہلاک ہو گیا ممکن ہے بے گستاخی کی سزا ہو جیسا حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد بر افتاد

اہل اللہ کو ستانا اچھا نہیں اس کا ثمرہ جلدی ہی مل جاتا ہے مگر ان بزرگ کا کمال دیکھیے کہ اس کو کرامت سمجھ کر بیفکر نہیں ہوئے بلکہ ڈر گئے کہ مجھے بددعائے ناحق کا یا قتل کا گناہ تو نہیں ہوا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ صدور کرامت کے بعد ولی کو بیفکر نہ ہونا چاہیے بلکہ حکم شرعی معلوم کر کے حکم شریعت کا اتباع کرنا چاہیے۔ ہمارے حاجی صاحبؒ کے یہاں ایک دفعہ عین وقت پر بہت سے مہمان آگئے جتنا آٹا گوندھا گیا تھا وہ کافی نہ تھا تو حضرت نے اپنا چادرہ یا رومال گھر میں بھیجدیا کہ اس کو آٹے پر ڈھک دو اور پکانا شروع کرو چنانچہ تھوڑے سے آٹے میں اتنی برکت ہوئی کہ سب مہمانوں نے کھا لیا اور بچ بھی گیا حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو حاجی صاحب کے پاس تشریف لائے اور فرمایا مبارک ہو کرامت ظاہر ہوئی بس آپ کا رومال سلامت چاہیے پھر دنیا میں قحط کیوں پڑنے لگا اور قحط میں جو حکمتیں ہیں ان کا ظہور کیوں ہونے لگا۔ یہ سنکر حضرت حاجی صاحب کا رنگ زرد ہو گیا اور فرمایا حافظ صاحب میں توبہ کرتا ہوں اور آئندہ کیلئے عہد کرتا ہوں کہ ایسی جرأت پھر نہ ہو گی۔ یہ تھے سچے لوگ اور آجکل تو حالت ہے کہ کسی کو تصرف کی قوت عطا ہو جاتی ہے تو وہ اس کی اس طرح مشق کرتے ہیں کہ اپنے پاس آنے والوں کے دل پر اثر ڈالتے ہیں تاکہ ان کے مدرسہ یا مسجد یا خانقاہ میں روپے دیئے جائیں۔ یاد رکھو ایسا تصرف جس سے دوسرے شخص کی آزادی سلب ہو جاوے حرام ہے

اور یہ بھی ایک قسم کی ڈکیتی ہے مگر یہ لوگ اسکو اپنی کرامت سمجھتے اور اس پر فخر کرتے ہیں یہ ساری خرابی جہل کی ہے اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ علم نہ ہونے سے کتنی خرابیاں ہو رہی ہیں پس بڑی کمی اسوقت یہ ہے کہ لوگ علم کی طرف توجہ نہیں کرتے اگر کسی کو دین کی طرف توجہ کی توفیق بھی ہوتی ہے تو وہ مسجد بنواتا اور مسجد میں رقم لگاتا ہے مدارس کی امداد نہیں کرتا چنانچہ لوگ مسجد میں تو تیل بہت دیتے ہیں مگر طلبہ کی خدمت نہیں کرتے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت ادنی امتی پر ہے اور اس فضیلت کا منشا یہ نہیں کہ علم کا نفع متعدی ہے اور عبادت کا نفع لازم ؟ کیونکہ علم کا نفع بھی متعدی نہیں لازم ہے نفع متعدی اگر ہے تو تعلیم کا ہے بلکہ فضیلت علم کا منشا یہی ہے کہ وہ شرط عمل ہے کیونکہ عبادت بدون علم کے نہیں ہو سکتی اور جو ہوتی ہے وہ عبادت کی محض صورت ہوتی ہے حقیقت نہیں ہوتی۔ہاں تعلیم کی فضیلت کا منشا یہی ہے کہ اس کا نفع متعدی ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔یہاں سے معلم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ وہ اس امر میں نائب رسول ہے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو وہاں دو جماعتیں تھیں ایک علماء کی جو مسائل شرعیہ کا تذکرہ کر رہے تھے دوسری عابدین کی جو ذکر اذکار کر رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم علماء میں بیٹھ گئے اور فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (ترجمہ۔میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) مگر آجکل قرآن کے معلموں کی تو ایسی بیقدری ہے کہ دو روپیہ ماہوار اور کھانا ان کو ملتا ہے اس سے زیادہ تنخواہ کسی کی ہوئی تو بس دس بارہ حد ہے۔اسی طرح مؤذنوں کی اور اماموں کی بڑی بیقدری ہے بلکہ جو لوگ امامت سے پہلے معزز تھے امام بنجانے کے بعد انکی بھی بیقدری کیجاتی ہے کیونکہ وہ بھی مسجد کے ملا ہی کہلاتے ہیں۔سو یاد رکھو کہ معلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے مگر حضور کا پیشہ معلمی نہ تھا کہ اس پیشہ سے آپنے گذر کیا ہو بلکہ آپ کا ذریعہ معاش جہاد اور توکل علی اللہ تھا آجکل جو معلمین کی بیقدری ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو معیشت بنا لیا ہے۔لیکن اگر مسلمانوں کو علم کی طرف توجہ ہوتی

اور شوق ہوتا تو معلموں کو اس کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ شکایت تو اسی کی ہے کہ مسلمانوں کو علم کی طرف بالکل توجہ نہیں اب میں اس حدیث کے متعلق ایک نکتہ بیان کرکے ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ اس حدیث میں عالم سے مراد عالم محض نہیں جو عمل سے خالی ہو کیونکہ ایسے عالم کی تو دوسری حدیثوں میں بیحد مذمت وارد ہے بلکہ مراد وہ عالم ہے جو باعمل ہے مگر غلبہ اسپر علم کا ہے ایسے ہی عابد سے مراد عابد محض نہیں جو علم سے بالکل کورا ہو کیونکہ ایسا شخص عبادت کر ہی نہیں سکتا بغیر علم کے تو عمل دشوار ہے اور اگر وہ عبادت کرے گا تو وہ محض نقل ہوگی حقیقت عبادت نہ ہوگی بلکہ مراد وہ عابد ہے جو علم و عبادت کا جامع ہے مگر اسپر شان علم غالب نہیں بلکہ شان عمل غالب ہے تو ایسے عابد سے عالم اسلئے افضل ہے کہ علم خود موقوف علیہ عمل کا ہے۔ اگر اسپر یہ شبہ کیا جائے کہ علم کا شرط عمل ہونا فضیلت کے لئے اس لئے کافی نہیں کہ عمل میں دوسری فضیلت موجود ہے وہ یہ کہ عمل مقصود ہے اور علم وسیلہ ہے اور مقصود وسیلہ سے افضل ہوتا ہے۔

پس علم بلا عمل طریق بلا مقصود ہے اور عمل بلا علم مقصود بلا طریق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علم ہمیشہ عمل کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض علوم محض علم ہی کے لئے موضوع ہیں جیسے اعتقادیات۔ اور عمل کوئی بھی بدون علم کے نہیں ہو سکتا پس علم تو ایک درجہ میں عمل سے مفارق و مستغنی ہو سکتا ہے۔ مگر عمل کسی درجہ میں بھی علم سے مستغنی نہیں۔ دوسرے یہ کہ علم کبھی عمل تک بھی پہونچا دیتا ہے اور عمل کبھی علم تک نہیں پہونچاتا اس لئے عابد سے تکمیل علم کی بھی امید نہیں اور عالم سے تکمیل عبادت کی امید ہے۔ تیسرے علم میں حظ نفس کچھ نہیں بھلا حیض و نفاس و رہن و شفعہ کے مسائل میں کیا حظ ہوتا اور عبادت و ذکر و اشغال میں لطف و حظ بھی بہت ہے اسلئے عالم زیادہ مجاہدہ کرتا ہے عابد اسکی برابر مجاہدہ نہیں کرتا۔ پس جس شخص کو عبادت کی توفیق ہو چکی ہو اس کو لازم ہے کہ مسائل شرعیہ کی تحصیل بھی شروع کر دے کہ بدون اسکے عبادت ناقص ہے۔ اور تحصیل علم کا طریقہ سب سے افضل تو یہ ہے کہ عربی میں حاصل کیا جائے اگر اس کی ہمت نہ ہو تو اردو رسائل بھی آجکل دینیات میں بکثرت ہیں ان کو پڑھا جائے بقدر

۲۵۵

ضرورت لو اسناد سے اسکے بعد اپنے مطالعہ سے اور مردوں کو چاہیئے کہ جتنا سبق پڑہیں اسکو گھر میں آکر مستورات کو سنائیں تاکہ ان کو بھی علم شریف حاصل ہو جائے اور جو یہ بھی نہ کر سکیں تو وہ ایک وقت فرصت کا مقرر کرکے کسی عالم سے مسائل کی کتاب سن لیا کریں مگر اسکے واسطے ہر بستی کے آدمیوں کو چندہ کرکے ایک عالم اپنے یہاں بلانا ہوگا اور یہ کچھ دشوار نہیں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم علماء سے ملتے جلتے ہی رہیں اور فرصت کے دنوں میں چند روز ان کے پاس رہ لیا کریں اور یہ ضرورت کی باتیں پوچھتے رہا کریں اس طرح بھی ان کو علم حاصل ہو جائے گا۔ اور ان شاء اللہ وہ اس فضیلت سے کچھ حصہ پالیں گے جو اس حدیث کے اندر مذکور ہے جسکو میں نے ابتداء بیان میں پڑھا تھا اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس بے پروائی کا کچھ علاج نہیں۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ شانہ ہمکو فہم سلیم اور توفیق عمل عطا فرمائیں۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اشرف علی

۲۵۶

ہیں کیونکہ جانوروں کو بھی بعض امور سے رغبت ہے اور بعض سے نفرت ہے خواہ اعیان ہوں یا اعراض پس جہاں ان کو مرغوب کے ملنے کی توقع ہو وہاں بھاگ کر جاتے ہیں اور جہاں ضرب وقتل کا اندیشہ ہو وہاں سے بھاگ جاتے ہیں ہاں جو مخلوق بیشعور سمجھی ہے جیسے جمادات و نباتات ان کو خیر کی طلب نہیں اگر واقع میں وہ بے شعور ہیں۔ اور اگر واقع میں ان کو شعور ہے مگر قلیل جیسا کہ بعض حکماء نباتات میں شعور کے قائل ہوئے ہیں مگر یوں کہتے ہیں کہ ان کو حیوانات سے کم شعور ہے تو اس قول پر ان کو خیر کی طلب تو ہوگی مگر قلیل ہوگی بعض حکماء کہتے ہیں کہ نباتات میں شعور ہے کیونکہ بعض درخت کی بیل کو کسی رسی یا سیڑھی پر لگا دو تو وہ سیدھی چلی جائیگی اسی طرح کوئی درخت سیدھا جا رہا ہو اور اس پر کوئی آڑ ہو تو درخت اس تک پہونچنے سے پہلے ہی رستہ میں سے مڑ جاتا ہے ان آثار کو دیکھ کر وہ نباتات میں شعور کے قائل ہوئے ہیں اور صوفیہ کے نزدیک تو جمادات بھی ذی شعور ہیں اب ڈھیلا جو نیچے آتا ہے حکماء تو اس کو حرکت قسریہ کہتے ہیں اور صوفیہ اسکو اپنے اصول پر حرکت ارادیہ کہہ سکتے ہیں گو اس کے معنی کر ان کے نزدیک بھی حرکت قسریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ پیدا کیا ہے۔ غرض جس مخلوق میں شعور ہے وہ خیر کا طالب ہے اب اگر تمام مخلوق ذی شعور ہے جیسا کہ صوفیہ قائل ہیں تو یوں کہنا چاہیئے کہ ساری مخلوق خیر کی طالب ہے۔ اور اگر بعض ذی شعور ہیں اور بعض غیر ذی شعور تو اکثر مخلوق خیر کی طالب ہے سارے تمام مخلوق سے ہم کو کیا مطلب اس تقریر سے یہ تو بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگیا کہ انسان میں تو ہر شخص خیر کا طالب ہے یہ اور بات ہے کہ خیر میں اختلاف ہو کہ ایک شخص ایک چیز کو خیر سمجھتا ہے۔ دوسرا اسکو خیر نہ سمجھے چنانچہ بعض لوگ دریا میں ڈوب کر مر جاتے ہیں وہ بھی خیر کے طالب ہیں کیونکہ وہ کسی سخت مصیبت یا پریشانی میں اس فعل کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے نزدیک اس مصیبت کی ساتھ زندہ رہنے سے حیات کو منقطع کر دینا سہل اور بہتر ہوتا ہے وہ اس کو خیر سمجھ کر ہی اختیار کرتے ہیں گو واقع میں شر ہی ہو خواہ حالاً یا مآلاً حالاً تو اس لئے کہ ممکن ہے خودکشی اور غرق میں تکلیف زیادہ ہوتی ہو ممکن ہے پانی کے اندر ڈوبتے ہوئے جان ایسی گھٹتی ہو کہ اس کی تکلیف اس مصیبت سے بھی زیادہ ہو جس سے وہ بھاگنا چاہتا تھا چنانچہ بعض لوگوں نے بیان

۲۵۸

کیا ہے کہ دونوں میں جان بہت دیر میں اور بڑی تکلیف سے نکلتی ہے۔ آجکل متمدن اقوام نے
قصاص بالسیف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے یہ بھی سخت موذی ہے کیونکہ اس میں زہوق روح
کے لئے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور حلق میں جان نکلنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے پھانسی میں تڑپنے کی
وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے اور صورت بگڑ جاتی ہے اور ان سے زیادہ متمدن اقوام
نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے جس پر بیٹھتے ہی ایک سکنڈ میں جان نکل جاتی ہے نہ معلوم اس میں
کیسی کشش ہوگی اور روح پر کیا گذرتی ہوگی مگر چونکہ دیکھنے والے کو اس تکلیف کا احساس
نہیں ہوتا اس لئے یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکلیف نہیں اور قتل میں لاش کے تڑپنے اور
سر کے کٹنے خون بہنے کا منظر سامنے ہوتا ہے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے
ہاں یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کرلی کہ تمہارے سامنے بھیانک منظر نہ ہو اور اس سے قیاس
کرلیا کہ جب ہمارے سامنے بھیانک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ زیادہ تکلیف نہیں مگر یہ
قیاس الغائب علی الشاہد ہے اور یہی اصل ہے تمام معاندین کے انکار کی کہ جو چیز نظر سے
غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے۔ انہوں نے عدم مشاہدہ کو عدم اصلی کی دلیل
بنا لیا ہے حالانکہ امریکہ کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا تو کیا اسوقت وہ بھی معدوم
اصلی تھا اور اس کا بطلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنی کہ جنت و دوزخ اگر کوئی
چیز ہے تو وہ ہمکو نظر کیوں نہیں آتی۔ ہمکو نظر نہ آنے سے یہ کیونکر لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں اسی طرح
تم اگر پھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نظر نہیں آتا تو اس سے یہ کیونکر لازم
آیا کہ مرنیوالے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوتی دلیل عقلی کا مقتضا یہ ہے کہ قتل میں مرنیوالے کو
کم تکلیف ہوتی ہے اور ان مہذب سزاؤں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے کیونکہ موت نام
ہے زہوق روح یعنی جان نکلنے کا اور جس طریق میں جان نکلنے کا راستہ پیدا کیا جائے
یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی اور جن صورتوں میں گھونٹ کر یا دبا کر جان نکالی جائیگی
اس میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی گو دیر کم لگے یہاں سے شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے
مجرم کے ساتھ بھی احسان کیا ہے اور اسکی آسانی کی رعایت کی ہے کہ تلوار سے قصاص کا امر کیا ہے رہا یہ کہ اس کے
دیکھنے والوں کو وحشت ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس غرض کیلئے قصاص شروع ہوا ہے یہ وحشت اس غرض کی

تحصیل میں معین ہے یعنی زجر و تنبیہ کہ اس منظر کو دیکھکر ہر شخص خائف ہو جائے اور جرائم پر اقدام کرنے سے رک جائے۔ اور جو صورتیں اہل تمدن نے تجویز کی ہیں ان سے دوسروں کو تو زجر و تنبیہ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وحشت ناک منظر سامنے نہیں آتا البتہ مجرم کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور یہ سخت بے رحمی ہے جب ایک شخص کو جان ہی سے مارنا ہے تو اس کو راحت دیکر مارنا چاہیے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم عام فرمایا ہے اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ[1] جس میں قصاص کی بھی تخصیص نہیں بلکہ قتل کفار کو اور ذبح حیوانات کو بھی عام ہے پس شریعت نے ظالموں کی بھی رعایت کی ہے کہ ان کو بے رحمی اور بیدردی سے نہ مارا جائے اور دوسروں کی بھی رعایت کی ہے دوسروں کی رعایت قصاص میں یہ ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّآ اُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ[2] ○ کہ قصاص میں لوگوں کو جرائم سے زجر کامل ہوتا ہے۔ میرا رسالہ ارشاد الہائم فی حقوق البہائم مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت نے حیوانات کے حقوق کی کس درجہ رعایت کی تو جس شریعت نے تمام مخلوق کی ساتھ سہولت کی رعایت کی ہو اسکو گاؤ منیا وغیرہ کا الزام دینا اور بے رحمی سے متہم کرنا کتنا صریح ظلم ہے واللہ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے اور ذبح حیوان رحم کے خلاف نہیں بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبوح ہوکر مرنا بہتر ہے کیونکہ خود مرنے میں قتل و ذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہے رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو بھی ذبح کر دیا جایا کرے تاکہ آسانی سے مر جایا کرے اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یاس سے پہلے ذبح کرنا تو دیدہ و دانستہ قتل کرنا ہے اور حالت یاس کا پتہ نہیں چل سکتا کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے پھر اچھے ہو گئے اور یہ شبہ اگر حیوانات میں کیا جاوے کہ ان کی تو یاس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا جواب یہ ہے کہ انسان اور بہائم میں فرق ہے وہ یہ کہ انسان کا تو ابقاء مقصود ہے کیونکہ خلق عالم سے مقصود وہی ہے اسی لیے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے اسکو پیدا کیا گیا بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اسکو پیدا کیا گیا کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہوا کرتا ہے اسلئے انسان کے قتل و ذبح کی اجازت نہیں دی گئی ورنہ بہت لوگ ایسی حالت میں ذبح کر دیے جائیں گے

[1] جب تم قتل کرو تو عمدگی کے ساتھ کرو اور جب ذبح کرو تو خوبی سے ذبح کرو۔

[2] اے عقلمند لوگو! قصاص میں تمہاری جانوں کا بچاؤ ہے (اور ہم ایسا کر دیتے ہیں) کہ تم لوگ [illegible]

جسکے بعد ان کے تندرست ہوجانے کی امید تھی اور ذبح کرنیوالوں کے نزدیک بھی اس کی حالت تھی اور جانور کا ابقاء مقصود نہیں اسلئے ان کے ذبح کی اجازت اس بناپر دیدی گئی کہ ذبح ہوجانے میں عاع اُن کو راحت ہے اور ذبح کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقاء انسان میں مفید ہے جسکا ابقاء مطلوب ہے، اگر اسکو ذبح نہ کیا جائے اور یوں ہی مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو مردہ ہوکر اسکے گوشت وغیرہ میں میتہ کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لئے مضر ہوگا تو ابقاء انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص و جہاد میں چونکہ افناء بعض افراد بغرض ابقاء جمیع افراد متعین ہے اسلئے وہاں قتل انسان کی اجازت دی گئی مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتی الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے یعنی قصاص میں جو کہ قتل اختیاری ہے تلوار سے اور جہاد میں خندق وغیرہ کی ممانعت سے، غرض خودکشی میں گو سخت تکلیف ہوتی ہو حالاً تو احتمالاً اور مآلاً یا قطعاً وعید مگر جو شخص اسپر اقدام کرتا ہے وہ خبری سمجھکر کرتا ہے اور وہ تکلیف مآلاً عذاب ہے جہنم کا جو کہ بہت ہی سخت ہے مگر لوگ جو بیباک ہیں اور خودکشی پر اقدام کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عذاب جہنم سے غافل ہیں اسکو سوچتے نہیں (اسوقت ایک صاحب حضرت مولانا کے چہرہ کو برابر تک رہے تھے اسپر ان کو تنبیہ فرمائی کہ یہ خلاف ادب وتہذیب ہے اس سے دوسرے شخص کا دل تنگ ہوتا ہے بس کبھی کبھی دیکھو اور کبھی نگاہ نیچی رکھو یہ کیا کہ باؤلوں کی طرح منہ تک رہے ہو معلوم ہوتا ہے کہ بیان بھی نہیں سمجھتے ورنہ یا تو حرکت اہتزازیہ ہوتی اور یا استغراق ہوتا پھر طرفہ یہ کہ یہ جو علماء نے لکھا ہے کہ عالم کے چہرہ کیطرف دیکھنا بھی عبادت ہے اس کا مطلب گھورنا اور تکنا نہیں ہے بلکہ یہی مراد ہے کہ کبھی کبھی اس کے چہرہ کی طرف دیکھ لیا جائے اور اس طرح دیکھا جائے کہ اس کو خبر بھی نہو کہ کوئی مجھے تک رہا ہے کیونکہ اس سے اسکو تکلیف ہوگی دل پر گرانی ہوگی مگر لوگوں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ دوسرے کو اس فعل سے گرانی کیونکر ہوتی ہے پھر ارشاد فرمایا کہ (۲) عذاب

عہ رہا یہ سوال کہ اس کو حاصل تو یہ ہوا کہ چونکہ انسان کا ابقاء مقصود ہے اسلئے اسکے حق میں راحت موت کی رعایت نہیں کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت مقدسہ نے انسان کی راحت موت کا دوسرا سامان بنایا (۱) شہادت جس میں زہوق روح کی شہید کو تکلیف نہیں ہوتی جو سوت کے وقت لا الہ الا اللہ کی تلقین اور سورہ یسین کی تلاوت تاکہ اس میں تاثیر آن تسہیل النزع ۱۲ (۳) تعلق مع اللہ کا غالب کرلینا اس حالت میں شدت نزع کی بھی الفت نہیں ہوتی ہے ۱۲ اشرف

جہنم کا تحمل کوئی نہیں کرسکتا۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ جہنم میں مکث طویل کا ادنی درجہ سات ہزار برس میں ہیا حضرت جہنم کے اندر تو سات دن بھی کوئی عذاب کا تحمل نہیں کرسکتا مگر میں مسلمانوں کو بشارت دیتا ہوں کہ ان کو عذاب جہنم کا احساس کفار سے بہت کم ہوگا جس کی حقیقت مسلم کی ایک حدیث میں ان لفظوں سے بیان کی گئی ہے اَمَاتَهُمُ اللّٰهُ فِيْهَا اَمَاتَةً کہ حق تعالیٰ ان کو جہنم میں ایک قسم کی موت دیدیں گے۔ حدیث میں تو اتنا ہی ہے۔ شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ مؤمنین کو جہنم میں ایک مدت کیلئے ہلکی سی نیند آجائے گی۔ حدیث النوم اخو الموت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ نیز اس سے بھی کہ اَمَاتَهُمُ اللّٰهُ فِيْهَا اَمَاتَةً کا سیاق کلام بتا رہا ہے کہ حقیقی موت تو مراد نہیں ورنہ اماتۃ بڑھانے کی ضرورت نہ ہوتی صرف اَمَاتَهُمْ کافی تھا یہ طرز کلام بتا رہا ہے کہ خاص قسم کی مراد ہے جو موت کے مشابہ ہے حقیقی موت مراد نہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ[ع] شیخ ابن عربی نے اسکے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ اس نیند کی حالت میں وہ یوں خواب دیکھیں گے کہ ہم جنت میں ہوں اور حوران کے پاس ہوں۔ یہ بات کہنے کی تو نہیں کہیں مسلمان بیفکر نہ ہو جائیں کہ بس جہنم میں جاکر مزے سے سوئیں گے اجی ہاں کبھی جاگو گے تو موسی نہیں اگر تھوڑی دیر کو بھی جاگ گئے تو نانی یاد آجائے گی۔ غرض کہ [illegible] ہے خودکشی کا مگر اسکو انسان سوچتا نہیں ہے اسلئے خودکشی کو حالت موجودہ سے بہتر سمجھ کر اختیار کرتا ہے پس ہر شخص اپنے نزدیک خیر ہی کا طالب ہے۔ اب اس میں اختلاف رہا کہ صحیح طریقہ اس خیر کے حاصل کرنے کا کیا ہے اور حقیقی خیر کیا ہے اور جو صحیح طریقہ ہوگا وہ یقیناً خیر حقیقی کی طرف موصل ہوگا ورنہ وہ طریق صحیح نہ ہوگا بلکہ غلط ہوگا سو حق تعالیٰ اس آیت میں طریق صحیح تحصیل خیر کا بتلاتے ہیں۔ اور اس کا ربط اوپر کی آیات سے یہ ہے کہ اوپر کفار کا ذکر ہے کہ وہ قیامت میں زمین کی برابر بھی سونا دیکر عذاب سے چھوٹنا چاہیں تو نہیں چھوٹ سکیں گے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ اس میں تو یہ بتلایا گیا ہے کہ کفار کو اس مال سے کچھ نفع نہ ہوگا اب اسکے مقابل مسلمانوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کو اپنے اموال سے نفع حاصل ہوگا وہ یہ کہ مسلمانوں کو انفاق مال سے خیر کامل حاصل ہوگی مگر اس سے پہلے کچھ شرائط ہیں جنکا ذکر اس آیت میں ہے مگر میں ان کو بعد میں بیان

۲۶۲ رابط تکثیر مضامین علا ساکار حصے دارین علیہ و الدنیا غمگی مثال عمدہ خلق بدل فی لاکھ روپ دیوان ہیں کر کے میں بالکل نہیں بتایا گیا، کرنے ہیں ضرور ہی کہ... پارہ نمبر ۴ رکوع ۱۷

ع: وہ شرط اس شیخ کی مجوزہ ہے جو لیٹ میں مذکور ہے ۱۲

کریں گا غرض حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار کے ذکر کے ساتھ مسلمانوں کا ذکر فرماتے ہیں اور بالعکس
اور اسی معاملہ کے متعلق ذکر ہوتا ہے جسکے متعلق کفار کا ذکر تھا اور ایک کے ساتھ قہر کا خطاب اور
عین اسی موقع پر دوسرے کے ساتھ لطف کا خطاب فرماتے ہیں اور یہ دلیل ہے اس بات کی
کہ یہ کلام حق تعالیٰ کا ہے کیونکہ عدم تغیر و عدم تاثر خاصہ واجب کا ہے واجب تعالیٰ کسی سے
متاثر نہیں ہوتا باقی سب مخلوق متاثر ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دشمن پر غصہ ہو رہا ہو تو اس
حالت غضب میں اگر دوست آجائے تو اسکی ساتھ بھی گفتگو میں غصہ کا اثر باقی رہتا ہے گو طرز میں کمی
ہو۔ اور حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ قرآن میں کفار پر لتاڑ ڈال رہے ہیں اور نہایت شدت
کے ساتھ اپنے غضب کا اظہار فرما رہے ہیں پھر اس کے ساتھ ہی مؤمنین کا ذکر ہے تو غایت لطف و
عنایت کے ساتھ ان کو خطاب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میں تغیر و تاثر اصلا نہیں ہے۔ اسی لئے
محققین نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ پر غضب و رحمت کا اطلاق باعتبار مبادی کے نہیں ہے
بلکہ غایات کے اعتبار سے ہے چنانچہ غضب کی غایت ہے نافرمان کو اپنے مقام قرب سے
دور کر دینا اسپر لعنت و نفرین کرنا اسکو سزا دینا اور رحمت کی غایت ہے مطیع کو مقرب بنا لینا
اس کی مدح و ثنا کرنا اعلیٰ خطابات سے مشرف و ممتاز کرنا اور اسپر انعام و فضل کرنا وغیرہ
وغیرہ تو ان غایات کے اعتبار سے حق تعالیٰ پر غضب و رحمت کا اطلاق کیا جاتا ہے نہ اس معنی کر
کہ حق تعالیٰ کو غصہ میں جوش ہوتا ہے یا رحمت کے وقت ان پر رقت ہوتی ہے ہرگز نہیں بلکہ
حق تعالیٰ کا غضب و رحم سب ارادی ہے اضطراری نہیں (یعنی تعلق فعل غضب و رحم
اختیاری ہے یہ مطلب نہیں کہ غضب و رحم بمرتبہ صفت بھی اختیاری ہے کیونکہ ہر صفت ذات
درجہ صفت میں غیر اختیاری ہے ۱۲) اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ شعراء نے جو حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کا محبوب بایں معنی بنایا ہے کہ نعوذ باللہ گویا حضور کو دلہن وغیرہ
کی طرح معشوق بنایا ہے۔ اور حق تعالیٰ کو عاشق قرار دیا ہے گویا اللہ تعالیٰ کو جوش محبت ہے
یہ محض غلطی اور گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جوش محبت نہیں ہوتا نہ جوش غضب ہوتا
ہے اللہ تعالیٰ کے لئے جوش ہونا نقص ہے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے لئے یہ کمال ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا جوش ہو غرض اللہ تعالیٰ کفار کے ذکر کے

ساتھ ہی مسلمانوں کو تسلی دیتے ہیں کہ تم اس وعید سے بے فکر رہو تمہارا انفاق مال بیکار نہیں بلکہ بہت کارآمد ہے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بعض وجہ دشمن اور مجرم پر عتاب ہوتا ہوا دیکھ کر دوستوں کو بھی خطرہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم پر عتاب نہ ہونے لگے اور اس کا زیادہ احساس حضرات صحابہ کو ہوتا تھا اور ان سے بڑھکر حضرات انبیاء علیہم السلام کو اور ہم کو اسکا احساس اسلئے کم ہوتا ہے کہ اول تو ہمکو اپنے اعمال پر ناز ہے کہ ہم تو مسلمان ہیں نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں تلاوت قرآن کرتے رہتے ہیں ذکر و شغل کرتے ہیں ہم پر عتاب کیوں ہونے لگا۔ دوسرے ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی شان استغناء سے غافل ہیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام باوجود معصوم ہونے کے لرزتے کانپتے رہتے تھے۔ اور شان استغناء کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کو رحم نہیں جیسا جوان موت کے موقعہ پر لوگ جمع ہو کر کہا کرتے ہیں کہ ہائے کیسا جوان تھا ابھی دنیا کو کچھ بھی نہ دیکھا تھا ابھی چار دن ہوئے شادی ہوئی تھی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے ہیں یہ سب باتیں سنکر ایک بوڑھا بجکر کہتے ہیں کہ میاں خدا کی شان بڑی بے پرواہ ہے اس موقعہ پر یہ کلمہ سخت گستاخی کا ہے جسکے صاف یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ کسی کی مصلحت کی ذرا پرواہ نہیں نہ کسی پر رحم ہے حالانکہ بجز احق تعالیٰ سے زیادہ بندہ کی مصالح کی رعایت کوئی نہیں کرسکتا تو دیندہ بھی اپنی مصالح کی اتنی رعایت نہیں کرسکتا جتنی اللہ تعالیٰ اس کی مصالح کی رعایت فرماتے ہیں مگر یہ کہ وہ تم کو بھی تبلادیں اس کی کیا ضرورت ہے اور اجمالاً تبلا بھی دیتے ہیں عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ یعنی ممکن ہے کہ تم کسی چیز سے کراہت کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز سے رغبت کرو اور وہ تمہارے لئے مضر ہو یہ حقیقت میں منع ہے جس میں احتمال کلی کافی ہے ہر ہر جزئی کے متعلق تعیین کے ساتھ مصالح و مضار کا تبلانا بالغ کے ذمہ نہیں اور نہ اس کی اللہ تعالیٰ کو ضرورت ہے کیونکہ وہاں شخصی حکومت ہے جمہوری حکومت نہیں ہے کہ بادشاہ کو دوسرے سے زیادہ کا اختیار نہیں ہوتا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شخصی حکومت میں تخلق باخلاق اللہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکومت بھی شخصی ہے ۔ صاحبو باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے اگر وہ باپ کی نصیحت میں شبہ

کرنے لگے تو وہ ایک دھول لگاتا ہے جواب ہیں نہ لائی سے اپنے توں کو مدلل نہیں کرنا تو کیا
خدا کو تناعق بھی نہو۔ ہاں کبھی خود چاہیں تو اپنے افعال کی حکمتیں کسی موقعہ پر بیان بھی فرما دیتے ہیں
اور کبھی خواص کو ان اسرار کا الہام ہو جاتا ہے مگر یہ کب ہوتا ہے جبکہ اسرار کی طلب نہو کیونکہ
طالب اسرار کو کشف اسرار میسر نہیں ہوتا جنت و نماز و روزہ کا طلب کرنا تو مطلوب ہے مگر اسرار
وحکم کا طلب کرنا ممنوع ہے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

حدیث مطرب ومی گو و راز دہر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

ہاں مجذوبین کچھ اسرار بیان کر دیتے ہیں مگر وہ اسرار ہی کیا ہیں صرف کونیہ ہوتے ہیں جو تکوین کے
متعلق ہوتے ہیں کہ فلاں دن بارش ہوگی فلاں سنہ میں جنگ ہوگی ایک بادشاہ معزول ہوگا فلاں
شخص مقدمہ میں کامیاب ہوگا وغیرہ وغیرہ باقی اسرار الٰہیہ کی ان کو کیا خبر کچھ نہیں لوگ خوا مخواہ
ان کے پیچھے پھرتے ہیں۔ یہ بھی ایک مطلب ہو سکتا ہے عارف کے اس شعر کا ؎

راز درون پردہ ز رندان مست پرس ۔۔۔ کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

کہ اسرار کونیہ کو مجذوبوں سے پوچھو صوفیان عالی مقام کو اس کی خبر نہیں اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ یہ
اسرار کچھ قیمتی نہیں ورنہ بڑے لوگوں کے پاس ضرور ہوتے۔ غرض طلب اسرار ممنوع ہے اور بلا طلب
بھی مقصود نہیں اسی لئے حق تعالیٰ نے بیان نہیں فرمایے ہاں اجمالاً اتنا فرما دیا ہے کہ عَسٰی
اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ بندہ کے مصالح کی رعایت کوئی نہیں
کر سکتا مگر ان کو بتلانے کی ضرورت نہیں پس حق تعالیٰ کے استغنا کے یہ معنی نہیں کہ ان میں رحم
نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج اور کسی سے عاجز نہیں اسی قدرت وعدم احتیاج
پر نظر کر کے انبیاء علیہم السلام ہر وقت لرزاں وترساں رہتے ہیں خصوصاً جس وقت کسی پر
عذاب ہوتا ہے۔ خواہ کفار ہی پر ہو اس وقت تجلی جلال کا مشاہدہ کر کے وہ بہت لرزنے لگتے
ہیں کہ خدا خیر کرے کہیں ہم پر بھی عذاب نہ ہونے لگے کیونکہ اول تو اس وقت تجلی جلال کا مشاہدہ
ایسا غالب ہوتا ہے کہ اپنی معصومیت ومقبولیت پر نظر نہیں رہتی ؎

چو سلطان عزت علم بر کشد ۔۔۔ جہاں سر بجیب عدم درکشد

اور نظر بھی ہو تو اس وقت شان استغناء ان کے پیش نظر ہوتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے

وعدہ کو منسوخ کر دیں اور اس پر یقیناً وہ قادر ہیں تو ان کو رد کرنے والا کون ہے دوسرے ان کو یہ احتمال بعید بھی ہو سکتا ہے کہ شاید یہ وعدۂ رحمت کسی خاص شرط کے ساتھ مشروط ہو جس کی ہم کو خبر نہ ہو۔ اگر اس سے بھی نہ سمجھے ہو تو یوں سمجھو کہ عظمت و ہیبتِ ذات کا اثر کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں بلکہ وہ بلا شرط ہوتی ہے جیسے شیر کی ہیبت طبائع میں فطری ہے پس اگرچہ شیر کٹہرے میں بند ہو اور عقلاً ہم جانتے ہوں کہ ہمارا کچھ نہیں کر سکتا لیکن اگر وہ اس حالت میں بھی گھور کر ہماری طرف دیکھے اور غرائے تو یقیناً ہیبت کا غلبہ ایسا ہو گا کہ تمام مقدمات عقلیہ ذہن سے غائب ہو جائیں گے جب ایک شیر کی ہیبت کی یہ حالت ہے تو خدا تعالیٰ کی ہیبت کی کیا شان ہونا چاہئے یہی حال امام غزالی پر ایک مدت طویلہ تک غالب رہا جس کی وجہ سے ایک نصرانی طبیب نے ان کا قارورہ دیکھ کر یہ کہا تھا کہ اس شخص پر خوف غالب ہے اور خوف بھی خالق کا یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب احیاء العلوم کی کتاب الخوف دیکھنے کا کسی کو تحمل نہیں بعض لوگ اس کو دیکھ کر مایوس ہو گئے اس لئے میں اس کے مطالعہ سے اکثر کو منع کر دیتا ہوں اس کا تحمل اہل اللہ ہی کو ہوتا ہے حق تعالیٰ اولیاء کو اول قوت دیتے ہیں پھر خوف دیتے ہیں اس لئے وہ اس کا تحمل کر لیتے ہیں اور دوسروں کو اس حالت کا تو کیا تحمل ہو گا اگر اولیاء ان کے سامنے اپنی حالت ظاہر کر دیں تو سننے والے کا جگر پھٹ جائے باقی اہل اللہ کو تو ہر دم موت ہی رہتی ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

یہی ہیں جو اس موت و حیات کا تحمل کرتے ہیں دوسروں کو ان کے حال کی کیا خبر ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حالِ شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

اسی کے متعلق عارف فرماتے ہیں ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

عوام کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا مگر جن پر گذرتی ہے وہ جانتے ہیں کہ واقعی اس کا بار تحمل نہ آسمان کر سکتا ہے نہ زمین۔ یہ مضمون طویل ہو گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ کفار کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی تسلی اسلئے فرماتے ہیں تاکہ عتاب کو سنکر اہل اللہ لرزنے نہ لگیں یہ تو ربط کا بیان تھا اس آیت میں اور آیات سابقہ میں۔ اب مقصود کو عرض کرتا ہوں۔ اور جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ

۲۶۶

بظاہر اس نص کے تحت میں داخل نہیں لیکن میں قیاس سے نص میں تعمیم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے بعد وہ حکم نص ہی سے ثابت ہوگا کیونکہ اصول میں یہ طے ہو چکا ہے اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَا مُثْبِتٌ کہ قیاس سے نص کی مراد ظاہر ہوتی ہے کوئی نیا حکم ابتداءً ثابت نہیں ہوتا۔ اب سمجھو کہ نص کا منطوق ظاہری کیا ہے اور مفہوم باطنی کیا ہے سو اس کے لئے اول ترجمہ سننا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خیر (کامل) کو ہرگز نہیں پا سکتے جبتک وہ چیز خرچ نہ کرو جس کو تم محبوب رکھتے ہو۔ ابرّ سے مراد یہاں پر خیر کامل ہے اوّلاً اس لئے مطلق کہ اِذَا اُطْلِقَ یُرَادُ بِهِ الْفَرْدُ الْکَامِلُ مسئلہ عقلیہ ہے دوسرے دیگر نصوص و قواعد شرعیہ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں خیر کامل مراد ہے۔ حَتّٰی تُنْفِقُوْا یہ غایت ہے اور عربی میں غایات افعال کو صیغۂ اثبات سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور اردو میں صیغۂ نفی سے تعبیر کیا جاتا ہے پس ترجمہ یہ ہوگا کہ جب تک خرچ نہ کرو گے یہ تو ترجمہ ہے۔ اور بظاہر لفظ انفاق خاص ہے انفاق مال کے ساتھ مگر میرے دل میں ایک بار یہ آیا تھا کہ یہ عام ہے انفاق مال و بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم وغیرہ سب کو اور شاید میں نے ایک بار یہ بیان بھی کیا تھا کہ اگر لغت مساعدت کرے تو اس کو عام لینا چاہیئے (جامع وعظ نے کہا کہ اسی آیت کا بیان ایک دفعہ ہو چکا ہے اور اس میں یہ مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ مجھے اس وقت یہ بات یاد نہ تھی کہ اس آیت کا بیان پہلے بھی ہو چکا ہے اچھا اب اسکو پہلے وعظ کا حصہ دوم سمجھنا چاہیئے ۱۲) پھر میں نے علامہ قسطلانیؒ کا ایک قول دیکھا جس سے میرے خیال کی تائید ہوئی اور قسطلانی کا قول اس طرح نظر سے گذرا کہ میں اس آیت کی تفسیر حدیث میں دیکھ رہا تھا کیونکہ حدیث میں اس کے متعلق حضرت ابوطلحہ کا قصہ مذکور ہے کہ وہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے سبحان اللہ حضرات صحابہ کا بھی کیا حال تھا کہ ہر آیت کے نزول کے بعد یہ مستعد تھے کہ ہم سے اس پر عمل ہوا ہے یا نہیں دوسرا کمال یہ تھا کہ عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کرتے تھے چنانچہ اس مشورہ کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تو کسی صحابی کی رائے کی تصویب فرماتے اور کبھی اس میں ترمیم فرما دیتے حضرت کعب بن مالکؓ نے اپنی توبہ قبول ہونے پر اپنا تمام مال صدقہ کرنا چاہا اور حضورؐ سے مشورہ لیا تو حضورؐ نے تمام مال کے صدقہ کر دینے سے منع فرمایا یہ قاعدہ ہے کاملین سے مشورہ لیتے ہیں۔

ع ۲
معنی کامل خیر
انفاق کا ہونا
دوسرے حصے
عام مراد لینا
چاہئے

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ طبعاً متبع سنت واقع ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے بھی ایک شخص کو تمام جائداد کے وقف کرنے سے منع فرمایا تھا جس میں ایک سنت نبویہ بلا قصد موافقت ہو گئی غرض حضرت ابو طلحہؓ حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ

إِنِّي أَرَى اللّٰهَ تَعَالَى يَقُولُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَإِنَّ أَحَبَّ أَمْوَالِي إِلَيَّ بَيْرُحَاءٍ فَهِيَ صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالَى فَضَعْهُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ حَيْثُ أَرَاكَ اللّٰهُ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ مَالٌ رَابِحٌ أَوْ رَائِحٌ وَأَرَى أَنْ تَضَعَهُ فِي عَشِيْرَتِكَ الْأَقْرَبِيْنَ۔

(او کما قال) یعنی یا رسول اللہ میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے نیل بِر کو انفاق محبوب پر موقوف فرمایا ہے اور میرے اموال میں سب سے زیادہ محبوب مجھے بیرحاء ہے (جو ایک باغ کا نام ہے) تو میں اسکو اللہ کے نام پر صدقہ کرتا ہوں آپ جہاں مناسب سمجھیں اسکو صرف کر دیں حضورؐ نے فرمایا شاباش یہ مال نفع دینے والا ہے یا ختم ہونے والا ہے (اسلئے کسی مصرف خیر میں صرف کر دینا اچھا ہے) مگر میری رائے یہ ہے کہ تم اسکو اپنے غریب قرابت داروں میں تقسیم کر دو حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہؓ نے حضورؐ کے ارشاد کے موافق اس باغ کو حضرت حسان ابی بن کعب کے درمیان تقسیم کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ان کے قریب تھے اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں ان دونوں سے زیادہ قریب تھا مگر مجھے اس میں سے کچھ نہیں دیا ان روایتوں میں بظاہر تعارض ہے مگر محدثین نے دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ حضرت انسؓ باعتبار خدمت و اختلاط کے قریب تھے کیونکہ ہر وقت ایک ہی گھر میں ان کے پاس رہتے تھے۔ اور حضرت حسان و ابی بن کعب باعتبار نسب کے قریب تھے۔ سبحان اللہ خوب تطبیق ہے۔ اور یہ بھی ایک عظیم الشان فن ہے جو اللہ تعالیٰ نے محدثین و فقہاء کی ساتھ مخصوص کیا ہے۔ جس کی بنیاد محض تخلیل و تاویل ہی پر نہیں جیسا بعض نادانوں کا خیال ہے بلکہ وہ واقعی طور پر تطبیق دیتے ہیں اور اس کی ضرورت ہے بدون اس کے چارہ نہیں کیونکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ صاد قین میں تعارض نہیں ہو سکتا تو جب دو حدیثیں سند صحیح کیساتھ مروی ہوں اور دونوں میں تعارض ہو تو رفع تعارض لازم ہے غرض میں حدیث میں حضرت ابو طلحہؓ کا یہ قصہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی علامہ قسطلانی کا یہ قول نظر سے گذرا انفاق محبوب میں

بذل جاہ و بذل نفس و بذل علم بھی داخل ہے اس سے میرا دل بہت خوش ہوا۔ لیکن اگر لغت سے اس کی تائید نہ ہوا ور انفاق ان سب کو عام نہ ہو تو علامہ قسطلانی پر پھر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عموم لفظ کی وجہ سے بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم کو اس آیت میں نہیں داخل کیا بلکہ دلالۃ النص کی وجہ سے داخل کیا ہے کیونکہ مال بمقابلہ جاہ و نفس و علم کے ادون ہے تو جب انفاق مال سے برکامل حاصل ہوتی ہے جو ادنیٰ ہے تو بذل اعلیٰ سے بدرجہ اولیٰ برکامل حاصل ہوگی۔ غالباً اسی بنا پر بیضاوی نے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کی تفسیر میں بعض صوفیہ کا قول نقل فرمایا ہے وَمِنْ اَنْوَارِ الْمَعْرِفَةِ يُفِيْضُوْنَ کہ انہوں نے افاضۂ انوار معرفت کو بھی انفاق میں داخل کیا ہے کیونکہ یہ انفاق مال سے اعلیٰ ہے تو جب ادنیٰ کا انفاق محمود ہے اعلیٰ کا انفاق کیوں محمود نہ ہوگا اور بیضاوی کی نقل اس بات کی کافی حجت ہے کہ یہ قول محتمل صحت ہے اب چاہے انفاق کو لغۃً عام کہا جائے یا دلالۃ النص کی وجہ سے عام کہا جائے بہر حال تعمیم غلط نہیں بلکہ اگلی آیت کے ربط کیلئے تعمیم ضروری ہے۔ بغیر اسکے چارہ نہیں کیونکہ اس کے بعد یہ آیت ہے۔ عـــه كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ۔ جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے اور وہ قصہ جیسا مفسرین نے عام طور پر بیان کیا ہے یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو ایک دفعہ مرض عرق النساء ہوا تھا جسکے علاج میں آپ کو اونٹ کے گوشت سے بہت نفع ہوا تھا تو آپ نے نذر کی تھی کہ اگر مجھے اس مرض سے شفا ہوگئی تو اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دونگا حالانکہ وہ آپ کو محبوب تھا کیونکہ مرض میں نافع ہوا تھا مگر آپنے ترک مرغوب کی اسلئے نذر کی کہ ترک مرغوب خدا کو محبوب ہے تو اس قصہ کا ربط سابق سے جبھی ہوگا کہ انفاق کو عام کیا جائے اور ترک مرغوب کو بھی انفاق میں داخل کیا جائے۔ اور اگر انفاق کو مال کیساتھ خاص کیا گیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس قصہ کو لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ سے ربط نہ ہوگا (یعنی ربط ظاہر نہ ہوگا ورنہ ربط خفی ممکن ہے ۱۲ ظ) غرض بیضاوی اور قسطلانی کا قول دیکھکر مجھے تعمیم انفاق کی ہمت ہوئی ورنہ اس سے پہلے اس خیال کے اظہار کی جرأت نہ ہوتی تھی اور یہی میں

عـــه انما قلت ذلک لما رایت الشیخ قد ربط الآیات فی تفسیرہ بیان القرآن بغیر ہذا الربط الذی ذکرہ مبنا فافہم ۱۲ ظ

علماء وطلبہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تفسیر قرآن کے متعلق جب کوئی بات اپنی سمجھ میں آیا کرے تو جب
تک سلف کے کلام میں اس کی تائید نہ مل جائے اس وقت تک اس پر اعتماد نہ کیا کریں کیونکہ تفسیر
بالرائے بہت سخت ہے۔ اب میں مقصود عرض کرتا ہوں جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں انفاق
عام ہے بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم و ترک مرغوب وغیرہ سب کو خواہ اس تعمیم کا منشا کچھ بھی
ہو دلالۃ النص ہو یا قیاس ہو تو اب سمجھئے کہ ترک مرغوب میں یہ بھی داخل ہے کہ احوال و کیفیات
کے درپے نہ ہو شوق و ذوق و جوش و خروش کا طالب نہ ہو۔ یہ چیزیں سالکین کو مرغوب ہیں مگر
ان مرغوبات کی طلب کو ترک کر دینا چاہیئے کیونکہ یہ بھی انفاق محبوب میں داخل ہے اور بدون
اس کے بر کامل حاصل نہ ہوگی۔ سالکین کو یاد رکھنا چاہیئے کہ محبت کی دو قسمیں ہیں (۱) محبت عقلیہ
(۲) محبت طبعیہ۔ اوران دونوں کے فرق کو اہل فن ہی سمجھتے ہیں جس کو معلوم نہ ہو اہل فن سے سمجھے
ان دونوں میں مقصود محبت عقلیہ ہے باقی طبعیہ سو وہ محمود تو ہے مگر مقصود نہیں گو ظاہر میں
یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت طبعیہ افضل ہے عقلیہ سے کیونکہ طبعی محبت میں ایک خاص جذب وکشش
ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس میں احتمال زوال یا انقلاب کم ہے اور عقلیہ میں جذب وکشش نہیں ہے
تو اس میں احتمال ہے کہ کسی وقت زائل ہو جائے مگر یہ محض خیال ہے جو محقق نہیں صحیح فیصلہ
اس باب میں یہ ہے کہ محبت عقلیہ ہی افضل ہے کیونکہ اس کا مدار اعتقاد پر ہے اور عادۃً
اعتقاد بہت کم بدلتا ہے۔ الا نادراً والنادر کالمعدوم اور محبت طبعیہ کا منشا ہیجان نفس ہے
اور جوش و خروش میں ہمیشہ تبدل ہوتا رہتا ہے تو اس میں خطرہ زیادہ ہے کیونکہ یہ شخص
جوش ہی سے کام کرنے کا عادی ہو جائے گا جب جوش نہ رہے گا تو کام چھوڑ بیٹھے گا چنانچہ
ہم نے ایسے لوگ بہت دیکھے ہیں جو طریق میں حالات و کیفیات ہی کے سہارے پر چلتے ہیں اور
جہاں احوال بند ہوئے کام بھی بند کر دیا کل ہی ایک صاحب کا خط آیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ
ذکر میں جی نہیں لگتا بعض دفعہ خیال ہوتا ہے کہ چھوڑ دوں یہ شخص اسی کا منتظر ہے کہ ذکر
میں جی لگے تو کروں تو یہ شخص لذت کو مطلوب بنائے ہوئے ہے خدا کو مطلوب نہیں سمجھتا ورنہ کسی
حال میں اس کی یاد کو ترک کرنے کا ارادہ نہ کرتا۔ اس غلطی میں عام طور پر سالکین مبتلا ہیں تو ان کو
سمجھ لینا چاہیئے کہ لذت و شوق مطلوب نہیں بلکہ مطلوب عمل ہے۔ اگر لذت مطلوب ہوتی تو حضور

۲۷

صلی اللہ علیہ وسلم اسباغ وضوء علی المکارہ کی فضیلت بیان نہ فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی حالت میں عمل کرنا زیادہ افضل ہے کہ عمل کو جی نہ چاہتا ہو دل پر گرانی ہو مگر بعض سالکین کی غلطی دیکھو کہ ایسی حالت میں عمل کو خیر باد ہی کہہ دیتے ہیں اس سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ عمل میں اگر جوش نہ ہو تو ایک حیثیت سے زیادہ افضل ہے تاکہ وہ عمل زیادہ خالص اللہ کیواسطے ہوگا لذت کے واسطے نہ ہوگا اسی لئے صوفیہ نے فرمایا ہے کہ قبض بسط سے افضل ہے ایک تو وہی وجہ جو میں نے ابھی بتلائی ہے دوسرے یہ وجہ ہے کہ قبض میں اپنی ذلت وعجز کا مشاہدہ زیادہ ہوتا ہے اسوقت سالک اپنے کو کافر سے بھی بدتر سمجھتا ہے فرعون سے بھی کمتر جانتا ہے حالانکہ اس کی ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کافر ہے میں مومن ہوں اور اس علم کا مقتضا یہ تھا کہ اپنے کو کافر سے افضل سمجھتا مگر اس طریق میں ہجے اور ہیں رواں اور جیسے کسی نے کہا تھا نے بے زبر نب بے تے زبر بت بطخ تو ہجے تھے نبت کے اور رواں پڑھی بطخ۔ یہی حال اس طریق میں ہے کہ ظاہراً تو کہ حقیقتہ مقدمات اور دلائل کا مقتضا کچھ اور ہے اور حالت دوسری ہے اسکو اہل حال ہی سمجھتے ہیں کہ قبض میں سالک اپنے کو باوجود مومن سمجھنے کے فرعون سے بھی بدتر کیونکر سمجھتا ہے۔ غرض قبض میں ذلت وعجز کا مشاہدہ زیادہ ہے جو بسط میں نہیں بلکہ بسط میں بعض اوقات عجب وغیرہ کا اندیشہ بھی ہوجاتا ہے اس لئے صوفیہ نے قبض کو بسط سے افضل کہا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں   تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو   آں صلاح تست آیس دل مشو

پس احوال وکیفیات اور شوق وذوق کے سہارے پر عمل نہ کرنا چاہیئے بلکہ عمل ہی کو مقصود سمجھنا چاہیئے عارف فرماتے ہیں ؎

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

یہ تو مزدوروں کی خصلت ہے کہ کام کرنے سے پہلے پوچھتے ہیں کہ کیا ملے گا اور جب تک مزدوری کا ماننا معلوم نہ ہو اسوقت تک کام ہی نہیں کرتے غلام کی یہ شان نہیں ہوتی غلام کو تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ میں تو سر سے پیر تک آقا کا ہوں میری ہر چیز اسی کی ہے پھر مزدوری کیسی ایک بے نمازی تھانہ دار کا

۲۷۱

قصہ ہے کہ اس کی بیوی نماز پڑھتی تھی اور وہ اس سے پوچھتا تھا کہ نماز پڑھنے سے تجھکو کیا ملا۔ افسوس خدا کی عبادت کے متعلق یہ سوال کہ تجکو کیا ملا۔ کیا کوئی بیٹے سے بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ تجکو باپ کی خدمت سے کیا ملا؟ ہرگز نہیں بہرحال اگر مجھسے پوچھتا تو میں جواب دیتا کہ ہمکو نماز ملی۔ ارے نماز خود مقصود ہے بندگی اور عبادت خود مطلوب ہے کسی عمل کے متعلق یہ سوال کہ اس سے کیا ملا اسوقت ہو سکتا ہے جبکہ عمل خود مقصود نہو باقی مقاصد میں یہ سوال نہیں ہو سکتا۔ ہمارے حاجی صاحب امام وقت تھے آپ سے جب کوئی کہتا کہ ذکر سے نفع نہیں ہوتا فرماتے یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم ذکر رہے ہو یعنی بندگی کا مقتضا یہ ہے کہ ذکر ہی کو خود مقصود سمجھے یہ کیا بندگی ہے کہ مزا آیا تو کر لیا ورنہ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہاں ذکر پر جس ثمرہ کے مرتب ہونیکا وعدہ ہے وہ ضرور ملے گا دنیا میں تو صرف یہ وعدہ عامہ ہے کہ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ احکم الحاکمین آپ کو یاد کریں اور آخرت میں مغفرت و جنت کا وعدہ ہے باقی ان احوال و کیفیات کا تو کہیں وعدہ بھی نہیں رہا جو ان احوال و کیفیات کی مثال ایسی ہے جیسے کھانے کی ساتھ سرکہ چٹنی۔ اب اگر کسی وقت دسترخوان پر سرکہ چٹنی نہو تو کیا آپ کو یہ کہنے کا حق ہے کہ میں تو کھانا بھی نہیں کھاتا۔ اگر چٹنی سرکہ ہی کھایا کروگے تو دماغ چٹنی ہو جائیگا کہ نہ مر کے رہوگے نہ پیرتے سے

ع ان لفظوں کیا تم مجھکو یاد کرو میں تمکو یاد رکھوں گا۔ پارہ ۲ رکوع ۲

بزرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش — کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

وہ طبیب بڑا کریم ہے جو ہر مریض کو اسکے مزاج کے موافق دوا و غذا دے پس حق تعالی جسکو جیسا مزاج کا دیکھتے ہیں وہی عطا فرماتے ہیں تمہارے لئے ممکن ہے کہ یہی مناسب ہو کہ احوال و کیفیات نہ دیں شوق و ذوق کا غلبہ نہو بس تم کو جو عطا ہو اسے لیلو۔ تم کو اگر احوال عطا ہو جاتے تو تمہارے لئے شاید یہ خطرہ ہوتا کہ اگر یہ انفعالات نہ رہتے تو تم افعال ہی سے رہ جاؤگے اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ بیان پہلے بیان کا تتمہ ہے اس میں یہ بیان تھا کہ انفعالات مطلوب نہیں بلکہ افعال مطلوب ہیں آج اس کا بیان ہے کہ ترک طلب انفعالات بھی انفاق محبوب میں داخل ہے اور انفاق محبوب پر حصول بر کامل موقوف ہے تو بدون ترک طلب انفعالات کے بر کامل حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ طلب انفعالات میں ایک تو وہی

خطرہ ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ اگر انہ حالات نہ ہے تو تم اعمال ہی سے رہ جاؤگے دوسرے یہ کہ شیخ سے بدظن ہو جاؤگے۔ اول اس سے شکایت کروگے کہ مجھے ذکر وغیرہ سے تاثر نہیں ہوتا حالات طاری نہیں ہوتے اور یہ بات شیخ کے اختیار سے باہر ہے شیخ کے قبضہ میں تو خود اپنے احوال بھی نہیں وہ تم کو حالات کہاں سے دیدے پھر جب تم کو حالات حاصل نہوں گے تو پھر شیخ کی شکایت کروگے اور اپنے دل میں کہوگے کہ شیخ بس یوں ہی سا ہے صاحب تصرف نہیں۔ ارے عقلمند! شیخ کو صاحب تصرف ہونا چاہیئے کہ اس کی صحبت سے تم کو معرفت حاصل ہو جائے تصرف کی کیا ضرورت ہے یہ تو جوگی بھی کر بیٹھتے ہیں انگریز بھی کرتے ہیں ایک انگریز نے کلکتہ میں ایک بچہ کو توجہ دی تو وہ اقلیدس کی شکلیں بیان کرنے لگا اور اکثر تصرفات ایسی توجہ سے ہوتے ہیں جس میں خدا کی طرف بھی توجہ نہیں رہتی کیونکہ اس میں کامل یکسوئی شرط ہے اسی لئے خواجہ عبید اللہ احرار کا مقولہ ہے کہ عارف را ہمت نباشد یعنی عارف توجہ نہیں کرسکتا کیونکہ اس کو غیر حق کی طرف اس قدر یکسوئی نہیں ہوسکتی کہ خدا کو بھی بھول جائے اس کو غیر حق پر ایسی توجہ کرتے ہوئے غیرت آتی ہے پس سالکین میں یہ بڑا مرض ہے کہ وہ احوال و انفعالات کے درپے ہو کر مشائخ سے بدظن ہونے لگتے ہیں۔ ایک مرض کی نوع یہ ہے کہ مشائخ کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ مرگیا ہے اس کی یاد دل سے نہیں جاتی ایسی توجہ کرو کہ اس کا خیال جاتا رہے یہ تو بڑے سے بڑے شیخ من حیث الشیخ کے قبضہ میں بھی نہیں ہاں کرامت سے ہو جائے تو ممکن ہے مگر کرامت خود غیر اختیاری ہے۔ کرامت پر ایک قصہ یاد آیا۔ ہمارے حضرت استاد علیہ الرحمۃ کو ایک شخص نے تسخیر کا عمل بتلایا تھا اور مولانا کو کمالات کا ایسا شوق تھا کہ ہر قسم کی چیز کو سیکھ لیا کرتے تھے اسی طرح یہ عمل بھی سیکھ لیا جس سے مقصود محض علم تھا عمل مقصود نہ تھا کیونکہ اہل اللہ مخلوق کو مسخر کرنے کی تدبیریں نہیں کیا کرتے جیسا بعض لوگوں کو بزرگوں پر شبہ ہو جاتا ہے کہ ان کو تسخیر کا عمل آتا ہے۔ اور انہوں نے کوئی عمل ایسا کیا ہے جسکی وجہ سے لوگ ان کی طرف جھکے چلے آتے ہیں میں اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ آپ کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں غور سے سنو کہ واقعی انہوں نے تسخیر کا عمل کیا ہے وہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہے جسکی خاصیت یہ ہے کہ اس سے بندہ خدا کا محبوب ہو جاتا ہے پھر مخلوق کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈالدی

باتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ہ
اور حدیث میں ہے اِذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عَبْدًا نَادٰی جِبْرَئِیْلَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّہٗ ثُمَّ یُنَادِیْ
جِبْرَئِیْلُ فِی السَّمٰوٰتِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْہُ ثُمَّ یُوْضَعُ لَہُ الْقَبُوْلُ
فِی الْاَرْضِ او کما قال، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام
کو ندا ہوتی ہے کہ میں فلاں کو چاہتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو پھر جبرئیل آسمانوں میں ندا کرتے
ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں تم بھی اس سے محبت کرو پھر زمین میں بھی اسکے
لئے قبول رکھدیا جاتا ہے یعنی اہل قلب کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے
اہل کلب کے دلوں میں نہیں۔ اس میں اعتبار ان لوگوں کا ہے جنکو کوئی غرض اس شخص سے
نہ وابستہ ہو نہ نفع کی نہ ضرر کی یعنی کسی دنیوی غرض سے نہ دوست ہوں نہ دشمن ہوں بلکہ
خالی الذہن ہوں کیونکہ جن لوگوں کو اس شخص سے کچھ دنیوی ضرر پہونچتا ہے مثلاً اس کی وجہ
سے ان کی شہرت میں کمی آگئی ہو وہ تو خواہ مخواہ اس کے دشمن ہوں گے اور جنکو اس سے کچھ
نفع پہونچ رہا ہے وہ خود بخود دوست ہوں گے ان دونوں کا اعتبار نہیں۔ بلکہ اعتبار ان کا
ہے جنکو نہ اس سے کچھ ضرر پہونچا ہو نہ نفع۔ کوئی غرض دنیوی اسکی ساتھ متعلق نہ ہو تو ایسے
لوگوں کے دلوں میں خلقی کی محبت ضرور ہوگی بشرطیکہ وہ اہل قلب ہوں اہل کلب نہ ہوں کیونکہ بعض
قلب کلب ہوتا ہے اسپر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ایک شخص نماز پڑھتے ہوئے اپنے آگے کتا باندھ لیا
کرتا تھا کسی نے اس سے وجہ پوچھی تو آپ نے کہا حدیث میں آیا ہے لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْکَلْبِ
ظالم نے قلب کو کلب بنا دیا اور یہ مطلب سمجھا کہ بدون کتے کے سامنے ہوئے نماز ہی نہیں ہوتی
اس نے قاف کو کاف سے بدلا جیسے بعض طلبہ نے جو قاف کو غلطی سے کاف پڑھتا تھا اور قال قال
کو کال کال کہتا تھا بخاری ختم کرکے استاد سے پوچھا تھا کہ بخاری تو سمجھ میں آگئی مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا
کہ یہ لکھا تو ہے قال قال اور پڑھا جاتا ہے کالا کالا۔ اصل اسکی یہ ہے کہ بعضے قلمی نسخوں میں قال قال کو
امتیاز کیلئے عربی میں لکھدیتے تھے اسکو ان عقلمندوں نے کالا کالا پڑھا اور یہ استعمال کیا
کہ لکھا تو جاتا ہے قال قال اور پڑھا جاتا ہے کالا کالا اسی طرح ان امام صاحب نے قلب کو کلب
پڑھا اور رسنے کو تبرو بنالیا یہ تو لطیفہ تھا میں کہہ رہا تھا کہ بعض مریدوں کو اپنے مشائخ پرست۔

ع
باشندوں
ایمان لائے
اور انہوں نے
اچھے کام کئے
اللہ تعالیٰ انکے
لئے محبت پیدا
کردیگا
پارہ ۱۶ رکوع ۹

۲۷۴

ہو جاتا ہے کہ ان کو تسخیر و حب کا عمل آتا ہے اور انہوں نے کوئی عمل کیا ہے جس سے لوگ ان کے مسخر ہو گئے چنانچہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب پر بھی بعض لوگوں کو ایسا گمان تھا مولانا صاحب کشف تھے ان کو اس خطرہ پر اطلاع ہو گئی فرمایا استغفر اللہ بعض لوگوں کو ایسا خیال ہے کہ اہل اللہ عملیات سے لوگوں کو مسخر کرتے ہیں۔ ارے یہ بھی خبر ہے کہ عمل سے نسبت باطنی سلب ہو جاتی ہے وہ ایسا کبھی نہیں کرتے تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے تسخیر و حب کا عمل محض اسلئے سیکھ لیا تھا کہ مولانا کو ہر چیز کے جاننے کا شوق تھا عمل کرنے کے واسطے نہیں سیکھا تھا چنانچہ جس شخص نے آپ کو یہ عمل بتلایا تھا اس نے اخفا کے اہتمام کے لئے جنگل میں لیجا کر تعلیم کیا تھا جب مولانا نے اس عمل کو محفوظ کر لیا تو اس شخص نے مولانا کو زیادہ معتقد بنانے کے لئے یہ کہا کہ حضرت یہ عمل بہت تیز ہے میں نے ایک ایسی امیرزادی پر اس عمل کا امتحان کیا تھا جس کی ہوا بھی پردہ سے باہر نہ نکلی تھی مگر اس عمل سے وہ فوراً میرے پاس حاضر ہو گئی۔ یہ سنکر مولانا اس عمل سے گھبرا گئے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ نفس کا کیا اعتبار ہے نہ معلوم کس وقت وہ بدل جائے اسلئے میں نے اس عمل کو ذہن سے بھلانے کی کوشش کی یہانتک کہ اب اس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں واقعی یہ بڑا کمال ہے کہ یاد کی ہوئی چیز کو اس طرح بھلا دیا جائے اسکو کرامت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے ایک حالت مولانا کی اس سے بڑھکر یاد آئی مجھسے خود فرمایا کہ ایک بار خط لکھکر دستخط کرنا چاہا تو اپنا نام یاد نہیں آیا۔ یہ واقعہ اگر میں خود حضرت سے نہ سنتا تو راوی کو کاذب سمجھتا تو ایسے حالات اور کرامات تو مسلّم ہیں لیکن عادۃً یہ امور اختیار سے باہر تھے۔ پس شیخ سے یہ درخواست کرنا کہ ہم بچہ کو بھول جائیں واقعہ ہی یاد نہ رہے فضول ہے کیونکہ یہ بات اختیار سے باہر ہے اور اگر کسی نے ایسا کیا بھی ہے تو وہ محض کرامت ہے اور کرامت بھی اختیار میں نہیں۔ دوسرے اگر ایسا ہو جائے تو صبر ہی کہاں رہا اور صبر کا ثواب کیونکر ملے گا کمال تو یہی ہے کہ واقعہ غم یاد ہو پھر صبر کرے یعنی اجر کو یاد کر کے دل کو سمجھائے اور ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے اسپر وعدہ ہے اطمینان کے مرتب ہونیکا اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ اور جس مرتبہ کا ذکر ہوگا اسی مرتبہ کا اطمینان عطا ہوگا اور اس اطمینان کا حاصل یہ نہ ہوگا کہ غم بالکل زائل

ہوجائیگا بلکہ یہ حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ ہوگا عقلاً اس پر راضی ہوجائیگا یہ سمجھے گا کہ جو ہوا عین حکمت ہوا اسی ذکر کے تکرار سے غم کا غلبہ کم ہوجائے گا جس سے تکلیف کا درجہ جاتا رہیگا تو کیا ٹھکانا ہے رحمت کا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا طریقہ بتایا کہ عذاب غم سے بھی بچ جاؤ اور ثواب سے بھی محروم نہ ہو مگر تم یہ چاہتے ہو کہ غم ہی نہ رہے جسکے معنی یہ ہیں کہ صبر کا ثواب تم لے بعض لوگ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ مال کی محبت دل میں نہ رہے۔ ارے اگر محبت مال نہ رہے گی تو انفاق میں کمال ہی کیا ہوا حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ میں محبت کی قید صاف بتلا رہی ہو کہ محبت مال ہی موجب فضیلت انفاق ہے۔ صوفیہ نے اسکو خوب سمجھا ہے مولانا فرماتے ہیں

شہوت دنیا مثال گلخن ست ۔۔۔ کہ ازو حمام تقویٰ روشن ست

فرماتے ہیں کہ تقویٰ کی گرم بازاری تو شہوت دنیا ہی سے ہے اگر شہوت دنیا نہ ہو تو پھر تقویٰ میں کمال ہی کیا رہا پھر اسکو کیسی اچھی مثال سے بیان کیا ہے کہ شہوت دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے حمام کا ایندھن۔ تو جس طرح حمام ایندھن سے روشن ہوتا ہے اسی طرح تقویٰ کا حمام دنیا کی شہوت سے روشن ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو حمام تقویٰ سرد پڑ جائے گا۔ اس مثال میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ شہوت دنیا کو دل میں جمع نہ کرنا چاہیے بلکہ حمام میں جھونک کر پھونک دینا چاہیے کیونکہ یہ خس و خاشاک گھر میں جمع کرنے کی چیز نہیں بلکہ پھونکنے اور جلانے ہی کے کام کی ہے۔ پس محبت مال مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اگر اس کو دین کے کام میں معین بنایا جائے تو مفید ہے چنانچہ حضرات صوفیہ نے اصلاح اعمال میں اس سے بہت کام لیا ہے انہوں نے اصلاح اعمال کا طریق جرمانہ مالی مقرر کیا ہے کہ جب غیبت ہو جائے یا تہجد ناغہ ہو جائے تو کچھ صدقہ مالیہ بطور جرمانہ کے ادا کیا جائے یہ طریقہ میں بھی تجویز کیا کرتا ہوں مگر جرمانہ اتنا ہو کہ نہ تو بہت گراں ہو جس کا دینا دشوار ہو نہ اتنا کم ہو کہ بالکل گراں نہ ہو ورنہ اثر ہی نہ ہوگا تو اس طریقہ سے جلد اصلاح اعمال ہو جاتی ہے کیونکہ مال کا خرچ کرنا نفس پر گراں ہے اور ظاہر ہے کہ اس گرانی کا منشا محبت مال ہی ہے تو دیکھئے صوفیہ نے اس محبت مال سے کتنا بڑا کام لیا۔ اور یہی طریقہ بخل کے علاج میں مفید ہے کہ نفس کو تھوڑا تھوڑا خرچ کر دینے کا عادی کیا جائے جس سے پہلے پہل تو نفس پر گرانی ہوگی لیکن اسی طرح عمل کرتے کرتے ایک دن دل

کھل جائیگا اور بخل کا مادہ ضعیف ہو جائیگا اسپر شاید یہ سوال ہو کہ کیا اب ثواب نہ ملے گا کیونکہ اب تو مزاحمت نفس باقی نہیں نہ گرانی باقی ہے جواب یہ ہے کہ ثواب ضرور ملیگا کیونکہ اس حالت پر پہونچا تو ہے مصیبت ہی جھیل کر اور گو اسوقت بلا مجاہدہ بلکہ بعض اوقات بلا ارادہ کے عمل کا صدور ہونے لگا مگر وہ پہلا مجاہدہ اور ارادہ اب بھی اسکے ساتھ متعلق ہے اس لئے شرط ثواب بھی پائی گئی۔ عادات کی طرح عبادات میں بھی یہی بات ہے کہ پہلا ارادہ اور مجاہدہ اخیر تک متعلق رہتا ہے جیسا مشی میں ارادہ تو دو چار قدم کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اسکے بعد پھر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی قدم خود بخود اٹھتا چلا جاتا ہے لیکن پھر بھی مشی کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے کیونکہ ابتدا میں اس کے ساتھ ارادہ اسی حیثیت سے متعلق ہوا تھا کہ آتی دو رچلوں گا یہی حال عبادات کا ہے کہ جس عمل کے ساتھ ابتدا میں ارادہ اور مجاہدہ متعلق ہوتا ہے وہ اسی حیثیت تکمیل سے متعلق ہوتا ہے اس لئے اخیر تک ان دونوں کا تعلق باقی رہتا ہے گو عامل کو احساس نہو اور وہ یہی سمجھتا ہو کہ میں بدون ارادہ کے عمل کر رہا ہوں اس سے وہ اشکال رفع ہو گیا۔ غرض تم یہ تمنا نہ کرو کہ مال کی محبت باقی نہ رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عجیب ارشاد ہے آپ کے زمانہ میں کسی غزوہ میں بیشمار مال و دولت آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ آپ کا ارشاد ہے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ کہ لوگوں کے لئے شہوتوں کی محبت مستحسن کر دی گئی یعنی عورتوں اور اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیروں کی محبت لوگوں کے قلوب میں آراستہ کر دی گئی ہے اور اے پروردگار جب آپ نے کسی مصلحت سے اس کی محبت کو مزین کیا ہے تو یہ درخواست کرنا کہ ہمارے دل میں اس کی محبت نہ رہے خلاف ادب ہے اسلئے ہم یہ درخواست نہیں کرتے بلکہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس محبت کو اپنی مرضیات کا ذریعہ بنا دیجئے تو دیکھئے حضرت عمر سے بڑھکر کون عارف ہوگا آپ نے زوال حب مال کی دعا نہیں کی کیونکہ حب مال میں بھی حکمتیں ہیں ایک حکمت تو یہی ہے کہ اس سے بقدر ضرورت مال جمع کرنا ضروری ہوتا ہے ان کا تقوی مال ہی تک رہتا ہے اگر مال ہے تو نماز روزہ بھی ہے ورنہ کچھ نہیں اسی لئے ہمارے حضرات بعض لوگوں کو ترک ملازمت سے منع فرماتے تھے بلکہ بعض کو ناجائز ملازمت کے ترک سے بھی منع فرمایا کہ جب تک حلال ملازمت

لئے اس وقت تک اسی کو لئے جاؤ اور استغفار و توبہ کرتے رہو کیونکہ گو یہ ملازمت حرام ہے مگر ایمان کا دفعیہ ہے تو ایسا نہ ہو کہ افلاس کی پریشانی سے ایمان ہی جاتا رہے ہم نے مسرف مفلس کو تو مرتد ہوتے ہوئے بکثرت دیکھا ہے کسی نے کسی جمعدار کو مرتد ہوتا ہوا دیکھا ہو بلا ہے وہاں ورکا المعدوم بخیل کو کبھی مرتد ہوتا ہوا نہیں سنا گیا وجہ یہ ہے کہ روپے کے ہاتھ سے جب مال نہیں نکلتا تو ایمان کیونکر نکلے گا ایمان تو احب الاشیاء ہے خیر یہ تو لطیفہ تھا باقی حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان سے پھرے ہیں وہ دنیوی تنگی سے پریشان ہو کر مرتد ہوتے ہیں غیر اسلام کو حق سمجھ کر کوئی مرتد نہیں ہوا اور نہ بخیل آدمی کو تنگی سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ تو خود مال سے مستغنی ہوتا ہے کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے۔ غرض دین کی حفاظت کیلئے آجکل یہ ضرور ہے کہ مسلمان اپنے پاس کچھ رقم جمع رکھے۔ امام سفیان ثوری (جو امام ابو حنیفہ کے معاصر ہیں) فرماتے ہیں کہ آجکل کسی کے پاس کچھ دراہم ہوں تو ان کی حفاظت کرے۔ کیونکہ ایک زمانہ میں تو مال کا جمع کرنا ہلاکت دین کا سبب تھا مگر آجکل مال کا نہ ہونا ہلاکت دین کا سبب ہے پھر فرمایا کہ اگر ہمارے پاس چند دینار ہوتے تو یہ امراء و حکام تو ہم کو اپنے ہاتھ پونچھنے کا رومال بنا لیتے واقعی آجکل جو امراء نے علماء کو حقیر سمجھ رکھا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ علماء اپنے پاس مال نہیں رکھتے اگر ان کے پاس مال جمع رہا کرے تو امراء بھی ان کی عزت کریں اور یہ خود بھی اپنی عزت کریں یعنی امراء کی خوشامد کر کے اپنے کو ذلیل نہ کریں مجھے ایک سفر میں خود یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ ایک بار میں نے علماء کے ایک وفد کے ساتھ ان کے اصرار سے ڈھاکہ کے ارادہ سے سفر کیا گو کلکتہ پہنچکر میری رائے بدل گئی تھی اور میں کلکتہ ہی سے واپس آگیا تھا واقعہ یہ ہوا کہ کلکتہ میں نواب صاحب کے ایک دولتمند مصاحب جو وفد کے استقبال پر مامور ہوئے تھے مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے آنے کی اسلئے بھی زیادہ مسرت ہوئی کہ نواب صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے آنے کی ایسی سخت شرط لگائی ہے جو ہو نہیں سکتی میں نے پوچھا آپ نے کیا شرط سنی ہے کہنے لگے یہ سنا تھا کہ آپ نے یہ شرط لگائی تھی کہ ہم کو کچھ نذرانہ نہ دیا جاوے میں نے کہا کہ یہ تو بہت آسان شرط ہے نذرانہ نہ دینا تو دینے سے آسان ہی ہے کہنے لگے آسان کہاں ہے اپنے محبوب کی خدمت کو تو دل چاہتا ہی ہے میں نے کہا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ محبوب کو بلا ہی کر خدمت کی جاوے محبوب کے پاس خود جا کر بھی تو خدمت ممکن ہے۔ اسپر آپ

۲۷۸

کہتے ہیں کہ حضرت گستاخی معاف۔ پیاسا کنوئیں کے پاس جایا کرتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا۔ مجھے اس بے تمیزی کے جواب پر بہت غصہ آیا اور میں نے کہا۔ اللہ آپ لوگ اسی خیال میں ہیں اور ہمارے دماغ میں تو یہ خناس سمایا ہوا ہے کہ ہم اپنے کو کنواں اور آپ لوگوں کو پیاسا سمجھتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ ہمارے پاس تو اس خیال کی دلیل بھی ہے اور آپ کے پاس اپنے کو کنواں اور ہم کو پیاسا سمجھنے کی کوئی دلیل نہیں اور وہ ہماری دلیل یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا میں دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک دین کی ایک مال کی اور آپ لوگوں کے پاس مال ہے اور ہمارے پاس دین ہے۔ مگر اتنا فرق ہے کہ جو چیز آپ کے پاس ہے وہ بقدر ضرورت ہمارے پاس بھی اتنی موجود ہے کہ اگر عمر بھر ہم آپ کے دروازہ پر نہ جائیں تو ہمارا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہ سکتا مگر جو چیز ہمارے پاس ہے یعنی دین وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں آپ اگر دین کو ضروری سمجھتے ہوں تو علماء سے ایک منٹ کیلئے بھی مستغنی نہیں ہو سکتے اب بتلایئے کنواں کون ہے اور پیاسا کون ہے۔ اس پر وہ خاموش تھے اور ان کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنی بدتمیزی پر نادم تھے اسوقت میں سوچتا تھا کہ میرے اس استغنا اور اپنے مروڑ کی کیا وجہ تھی تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے پاس چار سو یا پانسو روپے جمع رکھتا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب کا یہ بھی ارشاد تھا کہ اپنے پاس کچھ جمع رکھنا چاہئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہم جیسے ضعفاء کی رعایت سے سال بھر کا نفقہ اپنی ازواج کو ایک دم سے دیا ہے تاکہ ہم کو جواز کی ساتھ اتباع سنت کا بھی ثواب ملے یہ تو علماء کے مذاق پر حضور کے اس فعل کی توجیہ تھی ایک توجیہ صوفیہ کے مذاق پر بھی بتلا دوں کہ اس میں اظہار عبدیت تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غذا ناج کی احتیاج تھی ورنہ بعض اولیاء نے تو ایک دن کا خرچ بھی نہیں رکھا اور یقیناً وہ حضور سے زیادہ متوکل تھے مگر حضور نے اظہار عبدیت کیلئے سال بھر کا نفقہ جمع کیا تھا اور اسی اظہار عبدیت کیلئے دعاء کرنا ترک دعاء سے افضل ہے کیونکہ شکستگی اور اظہار عجز اسی میں ہے اور یہ حق تعالیٰ کو محبوب ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

۲۷۹

اور فرماتے ہیں سہ فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ ؛ جز شکستہ می نیابد فضل شاہ

ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پاس جو کوئی کچھ لاتا تا امرود وغیرہ تو ہر چیز میں سے کچھ کچھ کھا لیا کرتے تھے کہ اس میں اظہار ہے افتقار کا۔ یہ طریقہ نہیں تھا جیسا ایک صوفی نے کیا کہ ان کے پاس خربوزہ لایا گیا تو کہا کہ میں نے سترہ برس میں آج خربوزہ کھایا ہے۔ ہمارے حضرات کو یہ طریقہ پسند نہ تھا کیونکہ اس میں شہرت بھی ہے اور عبدیت کے بھی خلاف ہے اسی طرح ایک پیر صاحب کی نسبت مشہور تھا کہ وہ اناج نہیں کھاتے میرے ایک دوست نے ان کے مرید سے پوچھا کہ پھر کیا کھاتے ہیں تو اس نے جو بادام اور پھل اور بالائی اور چائے وغیرہ کا لازمہ بیان کیا تو وہ تین یا ڈھائی سیر سے زیادہ تھا اس عزیز نے کہا کہ تم مجھے اس کی آدھی غذا دیا کرو تو کون کمبخت ہے جو عمر بھر بھی اناج کا نام لے۔ غرض اظہار عبدیت اسی میں ہے کہ بقدر ضرورت مال جمع رکھے اسی لئے امام سفیان ثوری نے زمانہ سابق میں اور اخیر میں ہمارے حضرت حاجی صاحب نے بقدر ضرورت مال جمع رکھنے کی ہدایت کی ہے اور میں نے حضرت حاجی صاحب کا عطف امام سفیان ثوری پر اسلئے کیا کہ ہمارے حضرت بھی بزرگان سلف سے ہیں گو ہوا اس زمانہ میں ہو۔ یہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو میں نے قاری علی محمد صاحب جلال آبادی سے سنا ہے اور قاری صاحب ہمارے حضرت کے مرید بھی تھے اور بہت ثقہ متبع شخص تھے اور ظاہر ہے کہ جمع ہونا بدون کسیقدر محبت کے ہو نہیں سکتا پس اتنی محبت بری علامت ہے پس تم اس کی طلب نکرو مال کی محبت دل سے زائل ہو جائے کہ یہ تو ایک حال ہے اور حال مطلوب نہیں بلکہ اسکی طلب کرو کہ محبت مال اعمال صالحہ کا ذریعہ نجائے کہ اصل مقصود اعمال ہیں ظاہری بھی باطنی بھی مگر اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جن چیزوں کو خدا تعالیٰ نے مقصود نہیں بنایا یعنی احوال ان کو تو مطلوب بنا رکھا ہے اور جن کو مقصود بنایا ہے یعنی اعمال ان کی طلب نہیں مثلاً شکر و تواضع و اخلاص و محبت عقلیہ وغیرہ کی طلب نہیں ہاں طلب ہے تو حب طبعی کی ہے کہ دل میں عشق کی آگ سی لگ جائے حالانکہ مطلوب حب عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ جیسا اوپر بیان ہو چکا۔ اسی طرح خوف میں بھی مطلوب خوف عقلی ہے یعنی اعتقاداً یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ

کا عذاب سخت ہے اور ممکن ہے کہ مجھپر مواخذہ ہونے لگے - اور یہ درجہ خوف کا ہر مسلمان کو حاصل ہے گویا استحضار و ذہول کا فرق ہے اس کے آگے دوسرا درجہ ہے کہ وہ بھی درجہ اختیاری ہے یعنی استحضار عقوبت کا کہ عذاب کا ہر وقت تصور رہے یہ ہر دم فرض نہیں بلکہ میلان معصیت کے وقت فرض ہے ۔ سو خوف کے یہ معنی نہیں کہ گناہ کی طرف میلان ہی نہو بلکہ یہ معنی ہیں کہ جب میلان ہو تو فوراً عذاب کا تصور کر کے گناہ سے رکجائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا - فرمایا ہے ان الذین اتقوا اذا یمسہم طائف من الشیطان نہیں فرمایا سو یہ تو خوف عقلی تھا - اور ایک خوف ہے بمعنی دل دہڑ کنے کے سو یہ غیر اختیاری ہے یہ کسی درجہ میں بھی مطلوب نہیں گو محمود اور مفید ہے اور نہ بندہ اسکا مکلف ہے مگر لوگ آجکل اسی کو مطلوب سمجھتے ہیں اور یہ ساری خرابی واعظوں کی ہے انہوں نے عوام کا ناس کیا ہے چنانچہ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ تم لوگ تھانہ دار سے تو ڈرتے ہو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے - حالانکہ تھانہ دار سے جو خوف ہے وہ طبعی ہے جیسا سانپ بچھو سے خوف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے عقلی خوف ہے کیونکہ وہ نظر نہیں آتے بلکہ ان کی صفات کو یاد کر کے ان سے ڈرا جاتا ہے اور غائب سے خوف عقلی ہی ہو سکتا ہے پھر خدا تعالیٰ سے طبعی خوف کا مکلف انسان کو کیونکر کہا جا سکتا ہے - اسی طرح توکل کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد ہو کہ جو وہ چاہیں گے وہی ہوگا اور عمل یہ ہو کہ خلاف شرع تدبیر ترک کیجائے اور یہ عقلی ہے اور یہ وہ توکل ہے جس کا بندہ مکلف ہے اس سے زیادہ کا مکلف نہیں اور ایک توکل کا حال ہے کہ کسی وقت یہ خطرہ بھی نہ آئے کہ آج روٹی ملے گی یا نہیں یہ حال مطلوب و مامور بہ نہیں اگر عطا ہو جائے تو ملنا محمود ہے نہ عطا ہو تو نہ ملنا محمود ہے یہ تو محققین کا فیصلہ ہے باقی مغلوبین سو ان میں سے بعض نے جنکے نام ہیں من اور منصور ہے ان وزن میں بڑی مقدار ہے اور منصور ساحت میں بڑی چیز ہے ۱۲ یہ کہا ہے کہ مقام توکل کی اصلاح بھی پیٹ کا دہندا ہے - حضرت منصور نے ایک سالک سے پوچھا تھا کہ آجکل کیا شغل ہے کہا مقام توکل کی تصحیح کر رہا ہوں فرمایا ساری عمر پیٹ ہی کے دھندے میں رہو گے محبوب کے ساتھ دل لگانیکا وقت کب آویگا سو یہ آثار مغلوبیت کے ہیں عام نہیں ہیں - غرض توکل مطلوب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر اعتقاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ

۲۸۱

نہیں ہو سکتا اور تدبیر خلاف شرع نہ کرو بس واللہ تم متوکل ہو۔ واللہ تم متوکل ہو۔ واللہ تم متوکل ہو۔
مگر واعظوں نے اس میں بھی عوام کا ناس کیا ہے کہتے ہیں کہ تم کو خدا پر اتنا بھی بھروسہ نہیں
جتنا ایک مخلوق پر ہے کوئی شخص تمہاری دعوت کر جائے تو چولہا ٹھنڈا کر دیتے ہو اور خدا تعالیٰ
نے تمہاری دعوت کی ہے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا اسکو سنکر
تم چولہا ٹھنڈا نہیں کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قیاس کیلئے مماثلت وعدہ شرط ہے اور
یہاں مماثلت نہیں کیونکہ ما من دابۃ الخ میں شام کا وعدہ نہیں کہ تم کو شام کے وقت ضرور
کھانا ملیگا نہ طریق کی تعیین ہے کہ سوال کرکے ملیگا یا نوکری وغیرہ سے یا بطور دعوت کے ملیگا۔
غرض وقت بھی مبہم اور طریق بھی مبہم۔ اور داعی جو دعوت کرتا ہے وہ وقت بھی معین کر رہا
اور طریق کو بھی معین کر رہا ہے اگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ اس تعیین کیساتھ ہوتا تو کون مسلمان تھا جو
چولہا گرم کرتا پھر یہ قیاس اور اسپر ملامت کی بنا کب صحیح ہے۔ اور یہ ساری باتیں واعظوں
کو دوسروں ہی کے واسطے سوجھتی ہیں اپنے واسطے نہیں سوجھتیں ہم تو جب جانیں کہ وہ
روزانہ اپنے گھر کا چولہا بھی ٹھنڈا رکھیں ذرا کر کے دیکھیں نانی یاد آجائے گی مگر خود کون کرتا ہے
یہ تو دوسروں ہی کی گردن مارنے کو ہیں چنانچہ قصہ مشہور ہے کہ ایک واعظ نے وعظ میں
صدقہ کے فضائل بیان کئے ان کی بیوی بھی موجود تھیں اسپر وعظ کا اثر ہوا۔ اس نے سارا
زیور خیرات کر دیا واعظ صاحب جو گھر پر آئے اور بیوی کو ننگا دیکھا پوچھا زیور کیا ہوا کہا
خیرات کر دیا کہا کیوں کہا تم نے صدقہ کے فضائل بھی بیان کئے تھے تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے کیا
اسواسطے فضائل بیان کئے تھے کہ تم خیرات کر دو بلکہ اسواسطے بیان کئے تھے کہ دوسرے ہم کو
دیں۔ اسی طرح ایک مسافر واعظ نے سود خواروں کی ایک بستی میں آکر وعظ کہا اور سود خواروں
کی خوب مذمت بیان کی کسی نے واعظ صاحب کو روٹی بھی نہ دی انکو بڑی فکر ہوئی بعد نماز
کے اعلان کیا کہ عالم حقانی بھوکا پڑا ہے کسی نے کھانے کو بھی نہ پوچھا۔ لوگوں نے کہا صاحب ہم تو
سود خوار ہیں تو آپ کو ایسی ناپاک چیز کیونکر کھلائیں کہنے لگے میں نے مجملاً سنا تھا کہ سود لیتے ہو
ذرا تفصیل تو بتلاؤ کس کس طرح لیتے ہو انہوں نے بیان کیا کہنے لگے یہ تو سود نہیں ہے
ناحق لوگوں نے بدنام کیا ہے لاؤ روٹی لاؤ پھر تو خوب دعوتیں ہونے لگیں غرض پیٹ کے

زمین پر جو بھی جانور ہیں ان کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے
پارہ ۱۲ رکوع ۱

۲۸۲

واعظین نے ناس مار رکھا ہے چنانچہ ایک جہالت یہ کر رکھی ہے کہ مقصود کو غیر مقصود اور غیر مقصود کو مقصود بنا رکھا ہے اسی لئے عوام نے یہ سمجھ لیا کہ بس توکل اور اکل حلال محال ہے حالانکہ بالکل غلط ہے جس درجہ کا انسان کو مکلف کیا گیا ہے وہ ہر شخص کیلئے آسان ہے۔ یہ تو مامورات میں لوگوں کی کوتاہی تھی اب منہیات میں سنئے کہ شریعت میں مثلاً ریا سے ممانعت ہے تو لوگ اس کی حقیقت یہ سمجھے کہ وسوسہ غیر کا بالکل خطرہ بھی نہ آئے اور اگر اتفاقاً نماز یا ذکر میں غیر حق کا وسوسہ آگیا تو شیخ کے پاس پیٹ پکڑے ہوئے آتے ہیں پیٹ پکڑنے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم عبد [illegible] تھا جو بہت بھولا تھا ایک دن میں نے اس سے کہا کہ صراحی اٹھا لاؤ مگر پیٹ پکڑ کر لانا تاکہ ٹوٹ نہ جائے تو آپ ایک ہاتھ سے تو صراحی کا گلا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑے آرہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ میاں اپنا پیٹ کیوں پکڑا کہا تم ہی نے تو کہا تھا کہ پیٹ پکڑ کر لانا۔ غرض وسوسہ ریا اور خطرہ ریا بھی آگیا تو یہ لوگ شیخ کے پاس گھبرائے ہوئے آتے ہیں اب اگر شیخ غیر محقق ہوا تو اس نے ایک وظیفہ اور بتلا دیا پھر اس وظیفہ میں وسوسہ ریا ہوا تو ایک مراقبہ اور تعلیم کر دیا۔ اور اگر محقق ہے تو وہ پوچھے گا کہ بتلاؤ ریا اختیاری ہے یا غیر اختیاری بس آدھے سلوک کے اشکالات کا جواب تو اسی سوال سے حل ہو جائیگا۔ پہلے بیانوں کا بھی یہی مدار تھا کہ اختیاریات کے درپے ہونا چاہیئے غیر اختیاریات کے درپے نہ ہونا چاہیئے اس بیان میں بھی یہ مسئلہ آگیا کیونکہ تمام اشکالات کا جواب دراصل یہی مسئلہ ہے کہ شریعت نے اختیاریات کا مکلف کیا ہے اسلئے ہر اشکال کے جواب میں یہ مسئلہ آجاتا ہے اب اگر اس سوال کے جواب میں یہ کہا گیا کہ ریا اختیاری ہے تو اس سے کہا جائیگا کہ اپنے اختیار سے کام لو اور قصداً خیال غیر کو نہ لاؤ اور اگر یہ کہا گیا کہ غیر اختیاری ہے تو شیخ کہے گا کہ نہ یہ ریا مضر ہے نہ تم مضر ہے بس بیفکر رہو اور اس ریا کو مثل ریاح کے سمجھو وہ ریا نہیں بلکہ وسوسہ ریا ہے جو اصلاً مضر نہیں۔ ریائے مذموم یہ ہے کہ قصداً مخلوق کیلئے عمل کیا جائے اگر قصداً مخلوق کیلئے عمل نہ کیا گیا بلکہ بلا قصداً مخلوق کا خیال آگیا تو یہ ریا نہیں بلکہ اخلاص ہی ہے اور یہ بات سہولت سے حاصل ہو سکتی ہے کہ اپنے قصد و اختیار سے دوسرے کا خیال و ارادہ نہ لاؤ۔ رہا یہ کہ پھر مجاہدہ کی ضرورت کیوں ہو اس کا جواب یہ ہے مجاہدہ اسواسطے کیا جاتا ہے تاکہ ریا اختیاری کی مدافعت سہل ہو جائے

کیونکہ اس کا بار بار دفع کرنا نفس کو دشوار ضرور ہے مجاہدہ سے یہ مشقت دفع ہو جاتی ہے نیز وسوسہ رہا جو کہ مضر نہیں بعض دفعہ اعمال کیساتھ مزاحمت کرتا ہے اور اس کے ساتھ عمل دشوار ہو جاتا ہے مجاہدہ سے وسوسہ رہا بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔ بہر حال تم جن احوال غیر اختیاریہ کے طالب ہو ان کو چھوڑو ان کی طلب کو قطع کرو یہ بھی لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ میں داخل ہے کہ ان ہوسوں کو قطع کرو۔ لیکن مِمَّا تُحِبُّوۡنَ کی ما اسقدر عام نہیں کہ سارے بچے اس کے اندر آ جائیں کہیں تم یہ کہنے لگو کہ ہم کو جنت کی بھی ہوس ہے ہم کو رضائے حق بھی مطلوب ہے تو کیا اس کو بھی قطع کر دیں۔ اس کا جواب میں قرآن ہی سے دیتا ہوں وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے مما تحبون فرمایا ہے مِمَّا اَحَبَّ نہیں فرمایا اور جنت اور رضائے حق تو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اس کا قطع کرنا مقصود نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ جو حالت تم کو محبوب ہو اور اللہ تعالیٰ کو من حیث الذات محبوب نہ ہو اس کی طلب قطع کرو اب اشکال نہ رہا دوسری قید یہ بھی ضروری ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ ہو مطلق انفاق کافی نہیں یعنی احوال وکیفیات وہوسات کی ترک طلب رضائے الٰہی کے واسطے ہو راحت نفس کے واسطے نہ ہو یعنی اپنے محبوب کو خدا کے محبوب پر فدا کرنا یہ ہے اِنۡفَاق مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ایک بات یہ بھی سمجھو کہ آیت سے اسقدر مفہوم ہوتا ہے جو چیز خرچ کرو اس کا محبوب ہونا تو ضروری ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ سب اشیاء میں احب ہو مگر حدیث ابو طلحہؓ سے ظاہراً شرط احبیت بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا تھا ان الله تعالیٰ یقول لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ وَاِنَّ اَحَبَّ الۡاَمۡوَالِ اِلَیَّ بَیۡرُحَاءَ الخ جس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تک محبوب چیز خرچ نہ کرو گے اسوقت تک بر کامل حاصل نہ کر سکو گے اور مجھے سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیرحاء ہے تو گویا ان کی فہم میں بر کامل کا حصول احب الاشیاء کے انفاق پر موقوف تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی فہم کی تقریر فرمائی اس سے احب الاشیاء کے انفاق پر حصول بر کا توقف نکلتا ہو گیا اس غلطی میں بہت روز تک میں بھی رہا ہوں مگر پھر خدا نے ہدایت کی اور یہ سمجھ میں آیا کہ حب الاشیاء کے انفاق پر حصول بر موقوف نہیں کیونکہ نص مطلق ہے نص میں تو مما تحبون ہے احبیت کی قید نہیں اور یہ حدیث میں جو حضرت ابو طلحہ کا قول وَاِنَّ اَحَبَّ الۡاَمۡوَالِ اِلَیَّ بَیۡرُحَاءَ وارد ہے تو کسی دلیل سے اس کا مما تحبون کی تفسیر ہونا ثابت نہیں بلکہ حضرت ابو طلحہ نے از خود یہ ظاہر کرنا چاہا کہ گو حصول بر نفس محبوبیت شے سے بھی

۲۸۴

حاصل ہو سکتی ہے مگر میں احب الاشیاء کا انفاق کرنا چاہتا ہوں۔ غرض تم مطلق محبوب کے انفاق سے بھی بر حاصل کر لوگے خواہ احب ہو یا نہ ہو ہاں رذل خدل نہ ہو کہ موئی بھیڑ خواجہ خضر کے نام جیسے ایک بنئے کا قصہ ہے کہ وہ اتفاقاً درخت پر چڑھ گیا تھا وہاں سے اترتے ہوئے ڈر لگا تو کہنے لگا ارے رام اگر میں سلامتی سے نیچے اتر گیا تو ایک گائے پن کروں گا پھر کچھ نیچے اترا اور بچنے کی امید ہو گئی تو کہا ایک بکری دوں گا پھر کچھ نیچے آیا تو کہا ایک مرغی دوں گا پھر بالکل نیچے اتر آیا تو ایک جوں سر میں سے پکڑ کر مار دی کہ جان کا بدلہ جان بس یہی کافی ہے اس نذر ماننے پر ایک تحقیق نذر کے متعلق ذہن میں آگئی وہ یہ کہ نذر کے بارے میں حدیث میں آیا ہے لَا يَرُدُّ مِنَ الْقَدَرِ شَيْئًا وَاِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ کہ منت سے تقدیر پر تو ٹلتی نہیں ہوتا وہی ہے جو مقدر ہے منت سے اسکے خلاف تو نہیں ہو سکتا ہاں اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے بخیل کا کچھ مال نکال دیتے ہیں کیونکہ بخیل مصیبت کے ہی موقعہ پر کچھ نذر وغیرہ کی صورت میں مال خرچ کرتا ہے ویسے اس کے ہاتھ سے مال نہیں نکلتا اسپر ایک شبہ شاید سامعین میں سے کسی کو ہوا ہو گا کہ اس حدیث سے نذر کی مذمت مفہوم ہوتی ہے حالانکہ نص میں وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وارد ہے جس سے نذر کا عبادت ہونا معلوم ہوتا ہے نیز علماء کا قول بھی ہے کہ نذر عبادت ہے جو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اسی لئے نذر بغیر اللہ حرام ہے اور عبادت کیلئے حسن لازم ہے پھر نص میں وفاء نذر کا امر ہے اور مامور بہ قبیح نہیں ہو سکتا اس کا جواب بعض محققین نے یہ دیا ہے کہ عبادت لذاتہا نذر مطلق ہے جیسے یوں کہے نَذَرْتُ لِلّٰهِ صَوْمًا وَنَذَرْتُ لَهٗ صَلٰوةً وَصَدَقَةً کہ میں اللہ کے لئے روزہ کی نذر کرتا ہوں یا نماز و صدقہ کی نذر کرتا ہوں اور نذر مذموم نذر مقید ہے گو عبادت بغیرہا ہو جیسے یوں کہے کہ میرا بیمار اچھا ہو جائے تو اتنا صدقہ کرونگا میرا مقدمہ فتح ہو جائے تو اتنے مساکین کو کھانا کھلاؤں گا وغیرہ وغیرہ سبحان اللہ عجیب جواب ہے واقعی شریعت کو انہی حضرات نے خوب سمجھا ہے۔ اور خود حدیث اس فرق کو بتلا رہی ہے کیونکہ کراہت کی علت آپ نے استخراج کو فرمایا ہے اور یہ نذر مطلق میں نہیں ہے بلکہ نذر معلق میں ہے یہ تحقیق درمیان میں ایک حکایت پر بیان ہو گئی ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ ردی چیز اللہ کے نام پر صدقہ نہ کرنا چاہئے اس سے بر حاصل نہ ہوگا جیسے آجکل عادت ہے کہ خدا کے نام کی وہی چیز نکالی جاتی ہے جو سب سے ردی ہو جیسا ہمارے

۲۸۵

ماموں صاحب نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ ایک شخص کے یہاں کھیر پکی تھی کھیر کی ایک رکابی میں کتے نے منہ ڈال دیا تو اس کی بیوی نے ایک مٹی کی رکابی میں اسکو لوٹ دیا اور بچہ سے کہا کہ سب کے ماکو دے آ وہ میاں جی کے پاس لایا میاں جی نے مہینوں میں کھیر کی صورت دیکھی تھی تو ہاتھ مارنے لگے اور اسی طرف سے کھانا شروع کیا جدہر کتے نے منہ ڈالا تھا لڑکے نے کہا میاں جی ادہر سے نہ کھاؤ ادہر کتے نے منہ ڈال دیا تھا میاں جی کو غصہ آیا اور رکابی دور پھینک کر ماری لڑکا رونے لگا کہا اب رونا کیوں ہے ایک تو مجھے کتے کی منہ ڈالی ہوئی کھیر کھلائی اور پھر رونا ہے بچہ نے کہا کہ تم نے رکابی توڑ دی میری ماں مجھے مارے گی کہا مٹی ہی کی تو رکابی تھی کہنے لگا کہ میری ماں میرے بھائی کا گو اس میں اٹھاتی تھی اب وہ مجھے مارے گی اب تو ملا جی کو قے ہونے لگی کہ ظرف و مظروف دونوں ہی نور بھرے تھے تو ایسا انفاق تو حرام ہے اس سے برکا مل ہرگز حاصل نہ ہوگا بلکہ اللہ کے نام پر اچھی چیز کو خرچ کرو جو پیاری ہو ہاں یہ ضرور نہیں کہ سب سے زیادہ پیاری ہو سو پیاری تو ایک پیسہ بھی ہے مجھے خود اپنی حالت معلوم ہے کہ ایک پیسہ ضائع ہو جاتا ہے تو دو چار منٹ تک مجھے تردد ہوتا ہے اور اس کے ضائع ہونے کا تلق بھی ہوتا ہے تو ایک پیسہ کا خرچ کرنا بھی اِنْفَاقِ مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں داخل ہے بس اس کا لحاظ انفاق میں ضرور ہے کہ جو چیز خرچ کرو وہ تم کو محبوب ہو گو کسی دوسرے دولتمند کے نزدیک وہ غیر محبوب ہو کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ کہ اپنی کمائی میں سے پاکیزہ کو خرچ کرو اور اس میں سے خبیث کا قصد نہ کرو بس ہر شخص اپنی کمائی میں سے محبوب کو خرچ کرے گو وہ کسی نواب اور بادشاہ کے نزدیک خبیث ہی ہو مگر تمہارے نزدیک خبیث نہ ہونا چاہیے اس میں غربا کی رعایت کی گئی ہے اگر طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ نہ فرماتے بلکہ اَنْفِقُوا الطَّیِّبٰتِ مطلقاً فرماتے تو غربا کو دشوار ہوتی کہ ہمارے پاس تو جتنا کچھ ہے امیروں کی نظر میں سب ہیچ ہے تو طیبات کاملہ ہم کہاں سے لائیں اس لیے حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ طیبت کاملہ کی ضرورت نہیں بلکہ تمہارے پاس جو کچھ ہے اس میں سے پاکیزہ مال خرچ کرو اور اس میں سے چھانٹ کر ردی مال اللہ کیواسطے نہ نکالو اب یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے وہ یہ کہ حدیث[ع] میں ہے کہ جب نیا کپڑا پہنے تو پرانے کو خیرات کر دے

ع اے ایمان والو خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا ہے اور ردی چیز کی طرف نیت مت لیجایا کرو۔ پارہ ۳ رکوع ۵

ع قال المنذری فی الترغیب حسن الترمذی بلفظ ثم عمد الی الثوب الذی اخلق فتصدق به الخ ترغیب کلمات لقولہ من لبس ثوبا جدیدا ۱۲

اور دیا جو نہ پہنے تو پرانے کو اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ردی مال صدقہ کیا جائیگا تو میں اس
حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ پرانے کپڑے اور جوتہ کو اللہ کے نام پر ثواب کی نیت سے نہ دیا جائے
بلکہ اعانت غریب کی نیت سے صدقہ کیا جائے تم اعانت غریب کے سوا کچھ قصد نکرو۔ چاہے
اللہ تعالیٰ تم کو ثواب بھی دیدیں خوب سمجھ لو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد اس سے وہ پرانا ہو
جو ردی کے درجہ تک نہ پہونچا ہو بہرحال تحصیل بر کیلئے احب الاشیاء کا انفاق ضروری نہیں اور
حضرت ابوطلحہؓ کا احب الاشیاء کا خرچ کرنا یہ اس غرض سے تھا کہ وہ خیر کامل کے قصد سے انفاق
اعلیٰ کرنا چاہتے تھے کیونکہ حضرات صحابہؓ کی یہی شان تھی کہ وہ ہر کام میں اعلیٰ درجہ کا قصد کرتے
تھے۔ دوسرے خود نص میں ایک قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حصول بر کیلئے انفاق
احب الاشیاء ضروری نہیں اور وہ قرینہ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ اور
یہ وقت ہے وفائے وعدہ سابق کا کہ میں نے اوپر کہا تھا کہ دونوں آیتوں کا حاصل ایک ہی ہے
اور دونوں میں مضمون مقصود کا ایک جزو مذکور ہے اسلئے میں نے دونوں کو ساتھ تلاوت
کیا تھا۔ اس دوسری آیت کی مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ آیت سابقہ کی علت ہے کہ تم کو انفاق پر
ثواب کیونکر ملے اللہ تعالیٰ تمہارے انفاق کو خوب جانتے ہیں اس تفسیر پر تو اس کا حاصل
آیت سابقہ سے متحد ہے۔ مگر میری سمجھ میں خود بخود یہ بات آئی تھی کہ یہ آیت پہلی آیت کے مقابل
ہے کہ پہلی آیت میں انفاق محبوب پر بر کامل کے حصول کو موقوف کیا گیا تھا۔ اور اس آیت میں
مَا تُنْفِقُوْا عام ہے محبوب و غیر محبوب دونوں کو مطلب یہ ہے کہ بر کامل تو انفاق محبوب ہی سے
حاصل ہوگی اور ویسے جو کچھ بھی تم خرچ کرو خواہ محبوب ہو یا غیر محبوب ہو بشرطیکہ ردی نہ ہو
اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں یعنی ثواب کچھ نہ کچھ مل ہی جائیگا گو بر کامل حاصل نہو۔ یہ تفسیر
میرے ذہن میں آئی تھی مگر میں اسپر مطمئن نہوا بلکہ تفاسیر میں تلاش کیا تو بیضاویؒ نے یہی لکھا
ہے جو میں سمجھا تھا اس سے میرا بہت جی خوش ہوا اور اطمینان ہوگیا کہ یہ تفسیر بالرائے نہیں
یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ ذوقی تفسیر پر بدون تائید سلف کے ہرگز اعتماد نکیا جائے۔ شاید
اسپر کسی کو شبہ ہو کہ اس سے تو انفاق ردی پر بھی ثواب معلوم ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس سے
انفاق ردی کا جواز یا اسپر ثواب کیسے معلوم ہوا ہاں اس میں محبوب و غیر محبوب کی تعمیم ضرور

ہوگئی کہ اگر غیر محبوب بھی خرچ کرو بشرطیکہ ردی قابل نفرت نہو تو اسپر بھی ثواب مل جائیگا۔ پس اب تین درجے ہوئے ایک محبوب ایک غیر محبوب۔ ایک ردی مبغوض۔ پہلے دونوں درجوں پر تو ثواب ملے گا۔ اول پر زیادہ اور دوسرے پر کم اور تیسرے درجہ کی ممانعت ہے اس پر ثواب نہ ملے گا۔ آیت کی تفسیر تو پوری ہوئی اب بطور تتمہ کے یہ بتلاتا ہوں کہ اس آیت میں سلوک کی ترتیب بھی تبلائی گئی ہے کہ جو شخص انفاق محبوب نکر سکے وہ غیر محبوب ہی سے شروع کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ سب لوگ ایک درجہ کے نہیں اسلئے سب کو انفاق محبوب دفعتہً سہل نہیں تو وہ اول انفاق غیر محبوب سے عمل شروع کریں۔ اور میں نے اس آیت کا تتمہ آیت سابقہ اسلئے کہا حالانکہ اس کا مضمون مقابل ہے پہلی آیت کا مگر پہلی آیت کا مضمون اس سے مل کر ہی پورا ہوتا ہے اسلئے اسکو تتمہ کہا گیا۔ اب ایک بات یہ رہی کہ مما کے من میں اختلاف ہے کہ من بیانیہ ہے یا تبعیضیہ سو دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کیونکہ بیانیہ کا حاصل یہ ہوگا کہ محبوب کو خرچ کرو اور تبعیضیہ کا حاصل یہ ہوگا کہ بعض محبوب کو خرچ کرو۔ اور قواعد سے معلوم ہو چکا ہے کہ کل کا انفاق مطلوب نہیں بلکہ بعض لوگوں کی ایک انفاق کل ممنوع ہے۔

پس من بیانیہ کا مرجع بھی تبعیضیہ ہی کی طرف ہے اب میں ختم کرتا ہوں خلاصہ بیان کا یہ ہوا کہ آیت کا جو مدلول خفی ہے خواہ قیاسی ہو یا منصوص ہو یعنی ترک کیفیات غیر اختیاریہ اسپر عمل کرنا چاہئے یعنی ہوسات وثمرات کی طلب کو قطع کرو اور اعمال کا اہتمام کرو اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

۲۸۸

رسالہ الابقاء ربیع الاول ۱۴۰۸ھ شمارہ ۱۰ جلد ۵۸ — مطابق اکتوبر [illegible]

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ
رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا
وعظ مسمی بہ

التواصی بالصبر

جزو دوم التواصی بالدین

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

التواصی بالصبر وھو الجزو الثانی من التواصی بالدین

این	کہاں ہوا	مکان چودہری نصیر الدین صاحب مظفر نگر۔
متی	کب ہوا	شب ۶ رشوال ۱۳۴۱ھ
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ
کیف	کس ہیئت پر ہوا	جالساً علی الکرسی
لم	کیا سبب تھا	چودہری نصیر الدین صاحب کی درخواست پر ہوا
ماذا	کیا مضمون تھا	ایک دن پہلے تبلیغ اصول پر ایک بیان ہوا تھا اس بیان میں تبلیغ فروع کا طریقہ تبلایا گیا۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ نافع تھا	ہر طبقہ کو عموماً
من ضبط	کس نے لکھا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ
المستمعون	سامعین کی تخمینی مقدار	تقریباً ۳۰۰ مرد
الاشتات	متفرقات	مجمع مستورات بھی پردہ میں تھا جس کی مقدار معلوم نہ ہو سکی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّہْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ہَادِیَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْہَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ یہ وہی سورت ہے جس کی تلاوت شب گذشتہ میں کی گئی تھی اور اسکے متعلق ایک جزو کا بیان کیا گیا تھا۔ حاصل اس کا

یہ تھا کہ اس سورت میں تبلیغ و دعوت الی اللہ کی ضرورت ثابت کی گئی ہے۔ اور اس کے دو جزو ہیں ایک دعوت الی الحق (یعنی العقائد) اور ایک دعوت الی الصبر (یعنی الاعمال) اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ہم ان دونوں میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک جزو یعنی دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد کی طرف گذشتہ رات میں زیادہ روئے سخن تھا گو بیان مشترک ہی ہوا تھا مگر مقصود زیادہ یہی جزو تھا اور اسی کی تفصیل کی گئی تھی اسوقت ایک جزو تفصیل سے رہ گیا تھا یعنی قصداً اس کا بیان نہ ہوا تھا گو ضمناً اس کا بیان بھی کسی قدر ہوا تھا۔ اور وعدہ کیا گیا تھا کہ اگلی شب اگر خیریت رہی اور بیان کا موقعہ ملا تو دوسرے جزو کے متعلق قصداً بیان ہوگا سو یہ وقت ہے اس وعدہ کے ایفاء کا۔ اس لئے اسوقت میں تبلیغ اعمال کے متعلق کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں سنئے ہماری حالت یہ ہے کہ جیسا تبلیغ اعمال کا اہتمام کرنا چاہئے ویسا ہمکو اس کا اہتمام نہیں ہے بلکہ اسمیں بہت کوتاہی ہو رہی ہے جیسا کہ دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ اور جیسا ایک امر مانع ہو رہا ہے تبلیغ عقائد اور دعوت الی الایمان سے اسی طرح ایک امر مانع ہو رہا ہے تبلیغ اعمال سے اور وہ امر یہ ہے کہ ہم کو عادت ہو گئی ہے ترک دعوت الی الاعمال کی۔ اور اس کے مانع ہونے سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یہ عادت عذر ہے کیونکہ جب میں اس کا لغو ہونا بیان کر دوں گا تو اس سے عذر نہ ہونا معلوم ہو جائیگا اور اس کے یہ معنی نہیں کہ ترک دعوت الی الاعمال کیلئے کوئی عذر فی نفسہ بھی نہیں۔ اگر اعذار شرعیہ موجود ہوں اور ان کا تحقق ہو جائے تو اسوقت ترک دعوت جائز ہے مگر اس وقت میں ان اعذار شرعیہ کو بیان نہ کروں گا نہ بیان کی ضرورت ہے کیونکہ کسی عمل کے متعلق بیان اعذار کی ضرورت جب ہو کہ ہمکو اس عمل کا اہتمام ہو اور جہاں مخاطب کو عمل ہی کا اہتمام نہ ہو وہاں اعذار کو بیان نہ کیا جائے گا بلکہ اولاً اس کو اہتمام عمل پر متوجہ کیا جائیگا جب وہ عمل کا اہتمام کرنے لگے اور عمل میں مشغول ہو جائیگا پھر اسکو اعذار شرعیہ سے مطلع کیا جائیگا جیسے ایک شخص نمازی ہے نماز کو ضروری سمجھتا ہے اس کی پابندی بھی کرتا ہے وضو کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور ہمکو معلوم ہے کہ وہ بیماری کی حالت میں بھی وضو کو ترک نہیں کرتا وہاں ضرورت ہے اعذار شرعیہ بتلانے کی کہ ان اعذار سے وضو ساقط ہو کر تیمم جائز ہو جاتا ہے تطہیر ثیاب معاف ہو کر ناپاک کپڑوں ہی سے

نماز درست ہوجاتی ہے استقبال قبلہ معاف ہوکر جس طرح بھی نماز پڑھ سکے نماز صحیح ہے اور
قیام پر قادر نہ ہو تو قعود سے اور قعود پر قدرت نہ ہو تو اضطجاع سے نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت
میں بیان اعذار کی ضرورت کا راز یہ ہے کہ اگر ایسے شخص کو اعذار نہ بتلائے جائیں تو اسکو اعتقادی
اور عملی تنگی پیش آئے گی۔ اعتقادی تنگی تو یہ ہوگی کہ اسکو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے
صدق میں وسوسہ اور شبہ ہوگا جو کہ زوال یا ضعف ایمان کا سبب ہے اور عملی تنگی یہ پیش آئیگی
کہ اگر اسکو تیمم کا قاعدہ نہ بتلایا گیا تو وہ عذر کیوقت مجبور ہوکر وضو ترک کرے گا اور چونکہ وضو کو
شرط سمجھتا ہے اس لئے بے وضو نماز پڑھے گا نہیں یہ عملی تنگی ہے پس ایسے شخص کے سلامت ایمان
اور سلامت اعمال کیلئے ضروری ہے کہ اسکو اعذار شرعیہ کے احکام سے مطلع کیا جائے اس سے
اسکا ایمان تو سلامت رہیگا کہ اسکو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں وسوسہ نہ ہوگا۔
اور عمل یوں سلامت رہیگا کہ وہ کسی عذر کیوقت عمل کو فوت نکرے گا۔ غرض بیان عذر کی ضرورت
وہاں ہوگی جہاں مخاطب ضرورت عمل کا قائل ہو اعتقاداً بھی اور عملاً بھی پھر اسکو کسی موقعہ پر تنگی
پیش آتی ہو بخلاف اسکے جو ابھی عمل ہی کی ضرورت کا قائل نہیں وہ تو اعذار کو سنکر ترک عمل کا بہانہ
ڈھونڈیں گے اور کھینچ تانکر اپنے کو معذوروں کی فہرست میں داخل کریں گے پس اگر ہم یہ دیکھتے
کہ ہم لوگ امر بالمعروف کا اہتمام پوری طرح کرتے ہیں تو اسوقت البتہ بیان احکام اعذار کا موقع
تھا۔ اور جب اس کا اہتمام ہی نہیں چنانچہ عملاً اہتمام نہ ہونا تو مشاہد ہے اور اعتقاداً بھی بعض لوگ
اس کی ضرورت کو پوری طرح محسوس نہیں کرتے جیسا کہ قرائن احوال اسپر شاہد ہیں تو ایسی حالت
میں تو اعذار کو سنکر ہر شخص ترک امر بالمعروف کا بہانہ ڈھونڈیگا اور کوئی بھی اپنے کو عذر سے خالی
نہ سمجھے گا اور اس فریضہ کو اپنے اوپر سے بالکل ساقط کردیگا حالانکہ ایسا کونسا عذر ہے جس سے
فرض بالکل ہی ساقط ہو جائے۔ دیکھو نماز و وضو کیلئے بھی بعض عذر ہیں مگر وہ ایسے وسیع نہیں
جنسے وضو اور نماز بالکل ہی ساقط اور معدوم ہو جائے مگر جس عمل کا اہتمام ہی قلب
میں نہ ہو اسکے اعذار کو سنکر مخاطب عذر کے میدان کو اتنا وسیع کرلیتا ہے کہ فرض کو بالکل ہی ساقط
کردیتا ہے تو ایسے شخص کو اعذار سے ہنوز مطلع نکیا جائیگا اسی لئے میں نے رات بھی عذر کو بیان
نہیں کیا بلکہ یہ عرض کیا تھا کہ جانبیں دو قسم کی ہیں ایک تو یہ کہ ہم کام کو اپنے ذمہ ضروری سمجھیں

الله تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت میں ہو۔ بقرہ ۲۸۶

۲۹۲

پھر عذر سے تنگی پیش آئے اور ایک حالت یہ ہے کہ کام ضروری ہی نہ سمجھے تو جن اعمال کو ہم اپنے ذمہ ضروری سمجھتے ہیں جیسے نماز وضو وغیرہ ان میں عمل کو شروع کرنیکے بعد عذر سے سوال ہوتا ہے اور جنکو اپنے ذمہ ضروری نہیں سمجھتے ان میں قبل از عمل ہی عذر سے سوال کیا جاتا ہے تو مجیب کو لازم ہے کہ پہلی صورت میں تو اعذار کو بیان کرے اور دوسری صورت میں بیان نہ کرے۔ لہذا اسی اصل کے موافق میں اس وقت بھی اعذار کو بیان نہیں کرتا بلکہ تبلیغ اعمال کی ضرورت پر آپ کو متنبہ کرتا ہوں رات میں نے تبلیغ ایمان یعنی دعوت الی العقائد سے مانع یہ بتلایا تھا کہ اس تبلیغ میں مبلغ مخاطب کو ایسے امور سے باز رکھنا چاہتا ہے جو اس کے زعم میں دین اور طاعات ہیں جس سے اسکو ناگواری ہوتی ہے اور اس ناگواری کے خیال سے مبلغ کھٹکتا اور تبلیغ سے رکتا ہے اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ اول تو عنوان تبلیغ کا ایسا ہونا چاہیئے جس سے مخاطب کو ناگواری نہ ہو اور وہ عنوان قرآن ہی نے ہمکو بتلا دیا ہے کہ عقائد کو اخبار صادقہ کے عنوان سے بیان کرو اور جو شخص اس سے بھی ناگواری کرے تو اس کی پروا نہ کی جائے۔ نیز میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی ناگواری مخاطب کی وجہ سے تبلیغ عقائد کو مقدم کیا گیا۔ اور تواصی بالعمل کو مؤخر کیا گیا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تبلیغ اعمال فی نفسہ مہتم بالشان نہیں کیونکہ اگر یہاں ایک وجہ اضافی قلت اہتمام کو مقتضی ہے تو دوسری وجہ شدت اہتمام کو بھی مقتضی ہے وہ یہ کہ بلاغت کا قاعدہ یہ ہے کہ کلام کو جس بات پر ختم کیا جاتا ہے وہ مہتم بالشان اور زیادہ مقصود ہوتی ہے چنانچہ اہل بلاغت اسکو خوب جانتے ہیں اسی لئے بلغاء کا قاعدہ ہے کہ وہ کلام کو اول اور آخر میں زوردار کرتے ہیں کیونکہ ابتدا بھی مقصود سے کی جاتی ہے اور انتہا بھی مقصود پر ہوتی ہے۔ تو اب یہاں دو جزو ہیں جن میں ایک جزو کا اہتمام تقدیم سے ظاہر کیا گیا دوسرے جزو کا اہتمام ختم کلام پر واقع کرنے سے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ جس چیز پر کلام ختم کیا جاتا ہے وہ مخاطب کے ذہن میں باقی رہ جاتی ہے اسلئے ختم کلام پر مقصود اہم ہی کو بیان کیا جاتا ہے۔ پس قرآن کی عجیب بلاغت ہے کہ اس نے دونوں اجزاء کا مہتم بالشان ہونا دو طرز سے ظاہر کر دیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ دو چیزوں کا ایک درجہ میں مہتم بالشان ہونا تو بعید ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک درجہ میں مہتم بالشان نہیں کہتے بلکہ تبلیغ عقائد کی اہمیت اسلئے ہے کہ وہ اصل ہیں اسی لئے ان کی اہمیت کو تقدیم سے

۲۹۳

ظاہر کیا گیا فَاِنَّ الْاَصْلُ مُقَدَّمٌ عَلَی الْفَرْعِ اور اعمال کی اہمیت ایک اعتبار
خاص سے ہے وہ اعتبار خاص یہ ہے اور یہ حقیقت میں وجہ اول ہی سے ناشی ہے کہ جو لوگ عقائد
کو اصل سمجھکر مہتم بالشان سمجھتے ہیں وہ اعمال کو فرع سمجھکر ان کا اہتمام بالکل ترک کر دیتے ہیں اور اتنا
اہتمام بھی نہیں کرتے جتنا فرع کا ہونا چاہیئے پس یہ لوگ عقائد ہی کو ضروری سمجھتے ہیں اعمال کو
ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ تعریف میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے عقائد بہت اچھے ہیں ۔ اس تعریف کو
کافی سمجھتے ہیں اور صحت عقائد کے بعد اس کے اعمال پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اسی لئے
اعمال کے متعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی نہیں کرتے بلکہ غضب یہ ہے کہ اعمال کی کوتاہی
کو منکر بھی نہیں سمجھتے ۔ ہم نے مانا کہ عقائد کا اچھا ہونا بڑی بات ہے اور یہ بھی بجائے خود قابل مدح
ہے مگر سوال یہ ہے کہ اعمال کو غیر ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے اور ان میں کوتاہی کرنے کو نقص
کیوں نہیں سمجھا جاتا اگر آپ کہیں کہ اعمال فرع ہیں تو میں کہتا ہوں کیا فرع کے نقص سے شئے
میں نقص نہیں آتا دیکھئے آپ ایک درخت امرود کا لگائیں جس کا بیج الہ آباد سے عمدہ امرود
کا بڑے اہتمام سے انتخاب کر کے منگایا گیا تھا مگر آپ کے باغ میں آ کر اس عمدہ بیج سے درخت تو
بہت بڑا لگ گیا لیکن پھل ایک بھی نہ آیا تو کیا اس صورت میں آپ اپنے دوستوں کے سامنے
خوش ہو ہو کر اس درخت کی یوں تعریف کرینگے کہ یہ بڑا قیمتی درخت ہے اس کا بیج بہت عمدہ
الہ آباد کے نفیس امرودوں میں سے ہے یا افسوس کے ساتھ یوں کہیں گے کہ اس کا بیج بڑے
اہتمام سے منگایا گیا تھا مگر افسوس اس نے پھل نہیں دیا اور اگر اتفاق سے پھل بھی آیا مگر الہ آباد
جیسا شیریں نہ ہوا بلکہ معمولی امرودوں سے بھی بدتر نکلا تو اس صورت میں ہرگز آپ بیج کی تعریف
کر کے اپنا جی خوش نہ کریں گے بلکہ سخت رنج و افسوس کے ساتھ یہ کہیں گے کہ بڑی مشقت سے
میں نے اسکے لئے الہ آباد سے عمدہ بیج منگایا تھا مگر ساری محنت ضائع گئی پھل بالکل خراب نکلا
میرا مقصود اس مثال سے یہ ہے کہ آپ دنیوی امور میں محض اصل کی عمدگی کو مدح کیلئے کافی
نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ساتھ فرع کی عمدگی پر بھی نظر ہوتی ہے پھر دین کے معاملہ میں کیا وجہ ہے
کہ صرف عقائد (و اصول) کی عمدگی پر نظر کی جاتی ہے اور اسی کو مدح کے لئے کافی سمجھتے ہیں اعمال
(و فروع) کی عمدگی پر کیوں نظر نہیں کی جاتی اور اس کے نقص سے افسوس کیوں نہیں کیا جاتا

اور اس افسوس کا اثر آپ میں کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔ دیکھئے اگر ایک شخص کا چہرہ حسین ہے مگر ہاتھ پیر بھدے ہیں یا انگلیاں مڑی ہوئی ہیں تو ہرچند کہ حسن میں چہرہ ہی کا حسن اصل ہے مگر یہ نہیں کہ ہاتھ پیر کا اعتدال مطلوب نہ ہو گو اس سے آپ کو اتنی نفرت نہ ہو گی جتنی اس شخص سے ہوتی ہے جس کا چہرہ بھی بدشکل ہے مگر ظاہر ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پیر اور انگلیاں بھی حسین ہوں اور چہرہ بھی حسین ہو اس کی طرف زیادہ میلان ہو گا۔ اور پہلے شخص کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے جب آپ یہ کہیں گے کہ چہرہ آنکھ ناک بڑی خوبصورت ہے ساتھ ہی یہ بھی کہیں گے کہ مگر افسوس سکا ہی کہ اسکی انگلیاں مڑی ہوئی ہیں اگر یہ نقص نہ ہوتا تو بہت ہی حسین ہوتا۔ اب بتلائیے کہ اسی طرح حسن دین میں فساد فروع یعنی فساد اعمال کو آپ منکر کیوں نہیں سمجھتے اور ایسے شخص سے آپکا دل کیونکر ملتا ہے جو فروع ایمان میں ناقص ہو اس سے بلا تکلف دوستی کس طرح کیجاتی ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَنْ رَّأىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ (اوكما قال) کہ جو کوئی تم میں سے امر منکر کو دیکھے تو اسکو ہاتھ سے مٹائے یا زبان سے یا دل سے یہ مقتضا ہے امر منکر کا شرعاً۔ پھر یہ کیا غضب ہے کہ ہم لوگ امر منکر کو دیکھکر نہ ہاتھ سے روکتے ہیں نہ زبان سے نہ دل سے نفرت کی جاتی ہے۔ بلکہ اعمال میں کوتاہی کرنیوالوں کی ساتھ وہی بشاشت ہے وہی دوستی ہے جیسے کامل الایمان کے ساتھ ہوتی ہے گویا آپ خدا تعالیٰ کی طرف سے وکیل و مختار ہیں کہ جس چیز کو چاہیں معاف کر دیں اور جس منکر سے چاہیں قطع نظر کر لیں تو بات یہ ہے کہ لوگوں نے عقائد کی اہمیت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے وہ یہ سمجھ گئے کہ اہمیت عقائد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد اصلاح اعمال کی ضرورت ہی نہیں اور یہ بالکل غلط ہے اسلئے اس اعتبار خاص سے اعمال زیادہ مہتم بالشان ہو گئے سو اسواسطے یہاں کلام کو تواصی بالاعمال کے ذکر پر ختم کیا گیا تا کہ اس طرز خاص سے مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ گو اعمال عقائد سے ذکر میں موخر ہیں مگر ختم کلام پر مذکور ہونے سے ان کی اہمیت بھی مطلوب ہے، اور وہ بھی مہتم بالشان ہیں۔ سو یہ اتنی توضیح کی چیز مگر ہماری حالت یہ ہے کہ اعمال کی طرف سے ہم بہت بیفکر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عقائد اصل ہیں اور اعمال فروع مگر میں بتلا چکا ہوں کہ فروع بھی مطلوب ہوتے ہیں اور ان کے انعدام یا نقصان سے اصل میں بھی نقصان آ جاتا ہے جیسا کہ اوپر مثالوں میں واضح کیا گیا۔ دوسرے

نصوص قرآنیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقائد کی تعلیم سے تکمیل اعمال بھی مقصود ہے یعنی عقائد کی تعلیم اس لئے بھی کی گئی ہے کہ ان سے اعمال میں کام لیا جائے۔ اس کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ترجمہ (تم کو جو کچھ بھی مصیبت ارضی یا سماوی پہونچتی ہے وہ سب مقدر ہو چکی ہے قبل ازیں کہ مصیبت کو پیدا کریں اور چونکہ خدا تعالیٰ کا علم کامل ہے اسلئے بیشک یہ بات خدا کیلئے آسان ہے کہ وہ ظہور سے پہلے مصائب وغیرہ کو مقدر کر دیں) اس کے بعد فرماتے ہیں لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (یہ مضمون تم کو اسلئے بتلایا گیا تاکہ تم کسی فوت شدہ چیز پر غم نہ کرو اور حاصل شدہ پر اتراؤ نہیں۔ یہ تعلیل ہے ماسبق کی جس کا تعلق أَخْبَرْنَا ثُمَّ بل لِكَ مقدر سے ہے یعنی ہم نے تم کو اس مسئلہ کی تعلیم اسلئے کی تاکہ تم مغموم نہو اور اتراؤ نہیں۔ اب غور کے قابل یہ امر ہے کہ لام بے غایت کے واسطے لایا جاتا ہے۔ اور اوپر مسئلہ تقدیر کا ذکر ہے تو اس کی علت و غایت دوسری آیت میں بتلائی گئی ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم کو مسئلہ تقدیر اسلئے تعلیم کیا ہے کہ جب تم اسکے معتقد ہو گے تو تم کو حزن و فرح نہوگا۔ اور مسئلہ تقدیر کا یہ اثر مشاہد ہے جو لوگ تقدیر کے معتقد ہیں وہ مصائب و حوادث میں منکرین تقدیر سے زیادہ مستقل اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کا ثمرہ ایک عمل بھی ہے یعنی حصول تفویض و توکل اور اس کا عمل ہونا ظاہر ہے پس عقائد ہر چند کہ خود بھی مقصود ہیں مگر ان کو تکمیل عمل میں بڑا دخل ہے اور یہ دخل مطلوب بھی ہے جیسا کہ آیت میں لِّكَيْلَا تَأْسَوْا سے مستفاد ہوتا ہے اب اسی پر تمام عقائد کو قیاس کر لیجئے کہ مثلاً توحید کی تعلیم خود بھی مقصود ہے اور اس سے اعمال کی تکمیل بھی مقصود ہے کیونکہ جس شخص پر جسقدر توحید کا غلبہ ہوگا اتنا ہی اسکے اعمال کامل ہونگے اسکی نماز دوسروں کی نماز سے اکمل اس کی زکوٰۃ و روزہ دوسروں کی زکوٰۃ و روزہ سے اکمل ہوگی اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا ۔۔۔ واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

اور شیخ شیراز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

پ ۲۷ رکوع ۱۹

امید و ہراسش نباشد زکس — ہمیں ست بنیاد توحید و بس

غرض موحد کامل کی یہ حالت ہوگی جو شیخ نے بیان فرمائی ہے جو ادنیٰ توحید والے کو حاصل نہیں ہو سکتی تو عقائد گو بظاہر جمل خبریہ ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان میں عرض کیا ہے مگر ان سے مقصود جمل انشائیہ ہیں اعتقادیہ بھی عملیہ بھی جیسا ابھی مذکور ہوا اس بنا پر اللہ واحد کا مطلب مطلب یہ ہے کہ اس اعتقاد کے ساتھ عمل میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں پس اپنے عمل میں خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ بناؤ ورنہ ریا ہو جائیگی جو شرک اصغر ہے اور توحید کامل کے خلاف ہے اسی طرح عقلاً خدا کے سوا کسی سے طمع و خوف نہ رکھو کہ یہ بھی توحید کے خلاف ہے رہاں طبعی طمع و خوف کا مضائقہ نہیں کیونکہ وہ تو اضطراراً بے اختیار ہوتا ہے جیسے سانپ کو دیکھکر طبعاً ڈر جانا یا شیر سے ہیبت زدہ ہو جانا مگر عقلاً یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہنا چاہئے کہ بدون مشیت الٰہی کے کوئی چیز نفع یا ضرر نہیں دیسکتی وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ

؎ گر گزندت رسد ز خلق مرنج — کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست — کہ دل ہر دو در تصرف اوست (ابیات)

اور یہ بڑا قیمتی مضمون ہے کہ جمل خبریہ سے محض خبر مقصود نہیں ہوتی بلکہ کوئی انشا مقصود ہوتی ہے اس کی ایک دوسری واضح مثال ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے کہ جب تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو حق تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور اس نزول کی نسبت اجمالی عقیدہ کافی ہے کیونکہ ہم کو نہ اللہ تعالیٰ کے افعال کی کنہ معلوم نہ صفات کی نہ ذات کی بس جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے ہاں اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ عقائد کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اخبار متواترہ یا قرآن سے ثابت ہوں وہ تو قطعی ہیں دوسرے وہ جو اخبار آحاد صحیحہ سے ثابت ہوں وہ ظنی ہیں قسم اول کا اعتقاد فرض اور ثانی کا واجب ہے اول کا انکار کفر اور ثانی کا انکار فسق ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا اب غور کیجئے کہ حضور نے جو یہ خبر دی ہے اس سے آپ کا مقصود کیا ہے کیا صرف یہی مقصود ہے کہ اس نزول کا اعتقاد رکھو یا کچھ اور بھی مقصود ہے ظاہر ہے کہ مقصود یہ ہے کہ اس وقت کو ضائع مت کرو بلکہ اس وقت

حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے نماز و استغفار میں مشغول ہونا چاہیئے چنانچہ دوسری احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی خود تصریح فرمادی ہے قیام لیل اور تہجد کی آپ نے بہت ترغیب دی ہے اور اسکی فضیلت میں بیشمار احادیث ہیں، اسی طرح دعائے نیم شبی کی فضیلت میں بکثرت احادیث ہیں۔ اور یہ بلکہ خود ایسی ہی حدیث کے اخیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نزول فرماکر مخلوق کو خطاب فرماتے ہیں هَلْ مِنْ مُسْتَرْزِقٍ فَارْزُقَهُ وَهَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاغْفِرَ لَهُ عہ وکما قال کیا کوئی رزق کا طالب ہے کہ میں اسکو رزق دوں کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے کہ میں اسکو بخش دوں یہ صاف بتارہا ہے کہ حضورؐ کا اس سے ہمکو مطلع کرنا اسی لئے ہے تاکہ اسوقت میں ہم اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگ لیا کریں۔ بس اسی طرح تمام اخبار اعتقادیہ کو سمجھو کہ ان سے اشارات بھی مقصود ہیں یہ مت سمجھو کہ عقائد سے صرف اعتقاد ہی مطلوب ہے بلکہ ان سے تکمیل اعمال بھی مطلوب ہے کہ ان عقائد سے عمل میں کام لیا جائے گویا بلفظ دیگر یوں کہئے کہ عقائد کو تکمیل اعمال کا آلہ بنایا گیا ہے اور عقائد کا تکمیل اعمال میں دخیل ہونا اس طرح ہے کہ مثلاً دو شخص فرض کیجئے جنہوں نے راستہ میں بادشاہ کو دیکھا جنمیں ایک تو بادشاہ کو پہچانتا ہے ایک نہیں پہچانتا ظاہر ہے کہ بادشاہ کو دیکھنے کے بعد دونوں کی حالت میں بین فرق ہوگا جو شخص بادشاہ کو بادشاہ سمجھتا ہے وہ تو فوراً آداب و تعظیم بجالائیگا اور پوری طرح خدمت و اطاعت کیلئے آمادہ ہوجائیگا اور جو اسکو معمولی آدمی سمجھتا ہے وہ اس طرح آمادہ نہ ہوگا پس شریعت نے جو عقائد ہم کو تعلیم کئے ہیں ان سے ایک تو مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اپنے دل میں جماؤ دوسرا مقصود یہ ہے کہ اس عظمت کے مقتضا سے عمل میں کام لو تو اب اعمال کو غیر مہتم بالشان سمجھنا کتنا بڑا غضب ہے جنکا مقدمہ اور آلہ تکمیل عقائد کو بنایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کے مقدمات اتنے معظم ہیں وہ خود کتنا معظم ہوگا گرمن وجہ ہی۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ ابتلا و امتحان کے لئے جیسا کہ آیت وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ عہ۔ اسپر دال ہے کیونکہ کلمات سے مراد احکام ہیں اس سے معلوم ہوا کہ احکام سے مقصود ابتلاء ہے اور ابتلاء ہوتا ہے مخالفت نفس سے کیونکہ اس میں مشقت ہوتی ہے اور بدون مشقت کے ابتلاء کا تحقق نہیں ہوسکتا معلوم ہوا کہ مقصود خلق انسان سے مجاہدہ و مشقت ہے چنانچہ دوسری جگہ صاف ارشاد ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ

ع کیا ہے کوئی رزق کا طالب کہ میں اسکو رزق دوں اور ہے کوئی مغفرت کا طالب کہ میں اسکو بخش دوں

۲۹۸

عہ اور جب آزمایا ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے چند باتوں میں ...

فی کیدٍ ۔ اب خود سمجھ لیجئے کہ مشقت عقائد میں زیادہ ہے یا اعمال ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ عقائد میں کیا مشقت ہے کچھ بھی نہیں ہاں پہلی بار عقائد باطلہ کو ترک کرنے میں مشقت ہوتی ہے مگر یہ ابتدا میں تھوڑی دیر کیلئے ہوتی ہے یہ نہیں کہ ہر وقت ایک آرہ سا چلتا ہو اور اعمال میں ہر وقت مشقت ہے ہر دم دل پر آرہ سا چلتا ہے کہ اب یہ کرو اب رہ کر وہی ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ کا مصداق ۔ صاحبو ایک مشاق نمازی کو بھی بیماری اور سفر میں اول ہی دن جیسی مشقت ہوتی ہے ۔ بارش اور اندھیری رات اور جاڑے سردی میں نماز کیلئے گھر سے نکلنا اور وضو کرنا سہل نہیں اسی لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباغ وضو علی المکارہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اندھیری میں نماز کیلئے آنیوالوں کو بشارت سنائی ہے (کما فی الحدیث المشہور بَشِّرِ الْمَشَّائِیْنَ فِی الظُّلَمِ اِلَی الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۔

تیسری بات (جو دوسری بات ہی سے متفرع ہے) یہ ہے کہ عقائد کو ایک بار اختیار کر لینے کے بعد ابقاء کی حاجت تو ہے تجدید کی احتیاج نہیں مثلاً اَللّٰہُ وَاحِدٌ ایک بار سمجھ لیا تو اب اسکے ابقاء کی ضرورت تو ہے کہ اسکے ضد کا اعتقاد نہ کیا جائے باقی یہ ضروری نہیں کہ روزانہ اسکے امثال کی تجدید کی جائے بخلاف اعمال کے کہ ان میں ہمیشہ تجدید کی ضرورت ہے ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے وقت ۔ ایضاً ۔ کہہ دینا کافی نہیں بلکہ عملاً نماز کی تجدید لازم ہے ایسے ہی روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ ہے گو نماز روزہ کے سب افراد متماثل ہیں مگر متحد تو نہیں ہیں بلکہ ہر فرد کا وجود مستقل ہے اور اَللّٰہُ وَاحِدٌ کہنے کے بعد اس کی ضرورت تو ہے کہ اسکے خلاف کا عقیدہ نہ ہو مگر تجدید لازم نہیں گو افضل ضرور ہے جیسا کہ حدیث میں ہے جَدِّدُوْا اِیْمَانَکُمْ بِقَوْلِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مگر یہ فرض نہیں چنانچہ اگر کسی شخص کو دن بھر اَللّٰہُ وَاحِدٌ کا تصور نہ آوے مگر اس کے خلاف کا بھی احتمال[1] نہ آدے تو یہ گنہگار نہ ہوگا ۔ بس اللہ واحد کے تصور کی ضرورت صرف اول بار تھی جبکہ اسکے ذہن میں شرک کا عقیدہ تھا یا شرک اور توحید دونوں سے خالی الذہن تھا ۔ اسکے بعد نہ اس کا تصور فرض نہ تجدید لسانی فرض ہاں افضل و مستحب ہے ۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ایک بار اعتقاد کر لیا ہو تو پھر اگر ساری عمر بھی اسکا استحضار نہ ہو

[1] وسوسہ غیر اختیاری مراد نہیں کیونکہ وہ مضر نہیں بلکہ احتمال اختیاری مراد ہے ۱۲ ظ

یہ مطلب نہیں کہ نماز بھی نہ پڑھے جسمیں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔ ہر قعدہ میں آتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ نماز کے اجزاء کو سمجھکر نہ پڑھے جیسا کہ عموماً نمازیوں کی حالت ہے اور ظاہر ہے کہ بے سمجھے نماز پڑھنے سے استحضار مضمون رسالت نہیں ہوگا تو اہل فتویٰ کا اتفاق ہے کہ یہ شخص گنہگار نہیں گو برکات عظیمہ سے محروم ضرور ہے سو یہ اور بات ہے۔ بخلاف نماز کے کہ اسکی تو بہ دلالت (زائد) میں پانچ دفعہ فرض ہی خواہ سمجھکر پڑھے یا بے سمجھے۔ ان وجوہ سے ثابت ہوا کہ مجاہدہ نفس عمل میں زیادہ ہے عقائد میں اتنا مجاہدہ نہیں اور مجاہدہ ہی مقصود ہے انسان کی پیدائش سے تو جسکو اس مقصود میں زیادہ دخل ہوگا وہ اہمیت سے خالی نہیں ہوسکتا پس یہ وجوہ ہیں اہمیت اعمال کے ۔

خلاصہ یہ کہ بعض وجوہ سے عقائد زیادہ مہتم بالشان ہیں مثلاً اس وجہ سے کہ وہ اصل ہیں اور صحت اعمال موقوف ہے عقائد پر بدون صحت عقیدہ کے عمل صالح برباد ہے اور صحت عقائد وجود عمل پر موقوف نہیں اور بعض وجوہ سے عمل زیادہ مہتم بالشان ہے اور یہ ضرور ہے کہ اہمیت عقائد کے وجوہ زیادہ قوی ہیں مگر میں نے اسوقت اہمیت اعمال پر زیادہ زور اسلئے دیا ہے کہ ہملوگوں کو ان کی اہمیت سے بالکل غفلت ہے ہم ان کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے ۔ اور ظاہر ہے کہ جب اعمال میں بھی وجوہ اہمیت موجود ہیں تو یہ ہماری کوتاہی ہے کہ ہم ان کی ساتھ اہتمام کا برتاؤ نہ کریں میں آج کل عام طور پر اپنی جماعت کا حال دیکھ رہا ہوں کہ وہ کسی کے عقائد اچھے دیکھکر پھر اس کی عملی کوتاہی پر اصلا نظر نہیں کرتے نہ اسکے اعمال سے نفرت ظاہر کرتے ہیں نہ دل سے کراہت و انکار کرتے ہیں اور یہ حالت خطرناک ہے حدیث میں اس حالت پر وعید وارد ہے ۔ یہ مضمون اہتمام عمل کا کل رات بیان نہوا تھا ۔ الحمد للہ کہ یہ آج بیان ہوگیا ۔ اب رہ گئی یہ بات کہ ہم اصلاح اعمال و تبلیغ احکام عملیہ میں کیا کوتاہی کر رہے ہیں سو یہ کوئی طویل یا غامض مضمون نہیں جب لوگ اعمال کی ضرورت اور اہمیت ہی سے غافل ہیں تو انکی اصلاح و تبلیغ سے غفلت بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ حالت ہماری یہ ہے کہ ہفتہ کے ہفتے گذر جاتے ہیں کہ ہم کسی کو اِفْعَلْ كَذَا وَلَا تَفْعَلْ كَذَا [ع] کبھی نہیں کہتے ۔ اور یہ کوتاہی اصلاح اعمال و تبلیغ احکام عملیہ میں اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ جنپر قدرت نہیں ہے ان کی تبلیغ کا تو کیا اہتمام ہوتا جنپر قدرت بھی ہے وہاں بھی اس کا استعمال نہیں ہوتا جنپر قدرت ہے وہ یہ لوگ ہیں ۔ بیوی ۔ بچے ۔ نوکر ۔ مرید ۔ شاگرد ۔ اور جنپر قدرت نہیں وہ یہ لوگ ہیں

ف میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں

ع ایسا کرو اور ایسا نہ کرو

۳۰۰

دوست احباب۔ بھائی۔ برادری۔ عزیز۔ قریب اور اجنبی لوگ۔ پھر جنپر قدرت نہیں ان میں
دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جنکو تبلیغ کرنے میں ضرر کا اندیشہ ہے جیسے دشمن اور مخالف۔ اور
بعض وہ ہیں جہاں ضرر کا کچھ اندیشہ نہیں صرف ناگواری کا خطرہ ہے اور ان میں زیادہ تر ایسے
ہی ہیں چنانچہ دوست احباب بھائی اور عزیز سے ضرر جسمانی یا مالی کا کوئی خطرہ نہیں۔ بس انکی
تبلیغ سے محض اسواسطے پہلوتہی کی جاتی ہے کہ ان کو ہماری روک ٹوک ناگوار ہوگی۔ سو اس کا
علاج یہ ہے کہ نصیحت کا عنوان ایسا اختیار کرو جس سے ناگواری نہو اور اسپر بھی کسی کو ناگوار
ہو تو اس کی پروا نکرنا چاہئیے مسلمان کا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

اور جب وہ لوگ بھی جنکو بظاہر قدرت سے خارج سمجھا جاتا ہے زیادہ تر محل تبلیغ ہیں اور انکی
ترک تبلیغ میں بھی ہم معذور نہیں تو بتلائیے جو لوگ ضابطہ سے ہمارے ماتحت ہیں اور ظاہر ہیں
ان کی تبلیغ ہماری قدرت میں داخل ہے وہاں ترک تبلیغ سے ہم کیونکر معتوب و ماخوذ نہوں گے
مگر حیرت ہے کہ ہم موقع قدرت میں بھی تبلیغ و نصیحت سے طرح دے جاتے ہیں اور اس سے بڑھکر
یہ کہ جنپر قدرت ہے وہ بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ جنھوں نے التزام اطاعت کا ہم سے معاہدہ
نہیں کیا جیسے بیوی بچے کہ گو شرعاً انپر ہماری اطاعت واجب ہے مگر انہوں نے صراحۃً اس کا
التزام نہیں کیا کہ تم ہمکو تبلیغ کرو ہم تمہاری تعلیم پر عمل کرینگے مگر ایک تعلق ایسا ہے جسمیں دوسرا شخص
معاہدہ صریحہ سے ہماری اطاعت کا التزام کرتا ہے اور وہ تعلق پیری مریدی کا ہے۔ کیونکہ
پیری مریدی نام ہی ہے معاہدہ اطاعت من جانب المرید و معاہدۂ تعلیم و اصلاح من جانب الشیخ کا
صرف ہاتھ میں ہاتھ لیکر سبق ساپڑھ دینے کا نام پیری مریدی نہیں جیسا کہ آجکل عام طور سے اسمیں
غلطی ہو رہی ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کو بیعت سمجھتے ہیں اور تعلیم و اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے اس لئے
مجھے اسمیں کلام ہے کہ آجکل کسی طالب بیعت کو چپکے سے جلد بیعت کر لینا جائز بھی ہے یا نہیں کیونکہ اسمیں
تقریر ہے اسکی غلطی کی۔ اس طرح بیعت کر لینے سے وہ یہی سمجھے گا کہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ہی بیعت کی
حقیقت ہے نیز آجکل یہ بھی عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بدون بیعت کے نفع نہیں ہوتا گویا لوگوں
نے اصل مقصود کو اس فرع کے تابع کر دیا ہے میرے نزدیک ان غلطیوں پر تنبیہ لازم ہے اور اسکی

۳۰۱

ضرورت ہے کہ طالب کو اولاً اس پر متنبہ کیا جائے کہ بیعت (یعنی ہاتھ میں ہاتھ دینا) نہ مقصود ہے نہ کسی مقصود کا موقوف علیہ ہے صرف رسم مشائخ ہے اور حقیقت بیعت کی یہ ہے کہ مرید کی طرف سے اتباع کا التزام ہو اور شیخ کی طرف سے تعلیم کا التزام ہو اگر دو شخصوں میں ایسا معاہدہ ہو جائے خواہ قولاً یا حالاً کیونکہ معاہدہ کبھی حالیہ بھی ہوتا ہے تو بس بیعت کا تحقق ہو گیا خلاصہ یہ ہے کہ بیعت کی حقیقت التزام ہے یعنی شیخ اور طالب دونوں ایک امر کا التزام کرتے ہیں طالب اطاعت واتباع کا شیخ تعلیم و اصلاح کا اب میری شکایت کا حاصل یہ ہے کہ جہاں صریح التزام ومنہ ہے اطاعت کا غضب کی بات ہے کہ وہاں بھی آج کل تبلیغ نہیں کی جاتی اور اگر بیعت کو صریح التزام نہیں مانتے تو اسکی کیا وجہ ہے کہ مرید کی جانب عملاً دونوں اسکو لازم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مرید اگر پیر کی کسی بات کو نہ مانے تو اس پر عتاب کیا جاتا اور دربار سے نکال دیا جاتا ہے یہ عمل خود بتلا رہا ہے کہ آپ بیعت کو صریح التزام سمجھتے ہیں مگر یہ بے انصافی ہے کہ ایک جانب التزام مانا جاوے دوسری جانب نہ مانا جاوے ایک جانب تو یہ شدت ہے کہ اگر مرید خدمت سے انکار کر دے یا کسی دنیوی کام میں شیخ کی مخالفت کرے تو فوراً معتوب ہو جاتا ہے اور دین کے معاملہ میں نہ شیخ اس کو کچھ کہتے ہیں نہ وہ اسمیں شیخ کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم سمجھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب مرید صراحۃً آپ کی اطاعت کا التزام کر چکا ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اب بھی شیوخ مریدین کی دینی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ صاحبو! تبلیغ سے ایک تو مانع عدم قدرت تھا اور ایک مانع عدم التزام تھا گو عدم التزام واقع میں مانع نہیں بلکہ قدرت کے بعد تبلیغ واجب ہے گو دوسرے نے صراحۃً التزام نہ کیا ہو مگر میں آپ کی خاطر سے تھوڑی دیر کیلئے عدم التزام کو بھی مانع مان کر کہتا ہوں کہ جہاں قدرت بھی ہے اور التزام بھی ہے وہاں حضرت شیخ کیسے خاموش ہیں جس میں ترک تبلیغ کے گناہ کے ساتھ وعدہ خلافی کا گناہ بھی شامل ہے کیونکہ جس طرح مرید نے اطاعت کا وعدہ کیا ہے ایسے ہی شیخ بھی تو اصلاح کا وعدہ کئے ہوئے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مقتضی موجود ہے اور موانع سب مرتفع ہیں پھر بھی پیر صاحب مریدوں کے افعال پر خاموش ہیں کچھ روک ٹوک نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ شیوخ پیری مریدی کی حقیقت کو نہیں سمجھے۔ یا عمداً جان بوجھ کر پہلو تہی کرتے ہیں۔ بس آج کل تو پیری مریدی کی حقیقت لوگوں نے

۳۰۲

یہ سمجھ رکھی ہے کہ پیر صاحب قیامت میں بخشوا لیں گے لوگوں نے رسم بیعت کو مغفرت کا سبب سمجھ رکھا ہے گو اسکے بعد کتنے ہی گناہ کر لیں ۔ چنانچہ اسکے متعلق کچھ الہامات اور مکشوفات یاد کر لئے ہیں کہ فلاں بزرگ سے منقول ہے کہ انکو الہام ہوا تھا کہ ہم تمہارے سب سلسلہ والوں کو بخشدینگے یہ تو وہ ہیں جو دوسروں سے اسلم ہیں ورنہ بعضے اس سے بھی گرے ہوئے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ بیعت اسواسطے ضروری ہے کہ اس سے ہمارے سر پر ایک بزرگ کا سایہ ہو جائیگا تو دنیوی مقاصد میں ہم کو سہولت ہوگی ۔ مقدمات میں دعا اور تعویذ گنڈے کرا لیں گے اور بیعت سے ہماری تنخواہ میں ترقی ہو جائے گی چنانچہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں ڈپٹی کلکٹری سے اس طرف کوئی رہتا ہی نہیں ۔ ان کا مقصود بیعت سے محض دنیا ہے اور ان کے نزدیک دین سے اسکو کچھ تعلق نہیں ۔ یہ تو مریدوں کے خیالات تھے اب پیروں کی سنئے ۔ ان کے نزدیک بیعت سے مقصود یہ ہے کہ مریدوں کے ذمہ ان کی ششماہی یا سالانہ مقرر ہو جائیگا جیسے چار کمینوں کا فصلانہ مقرر ہوتا ہے ۔ پھر پیر صاحب کا کام کیا ہے جسکے عوض یہ فصلانہ دیا جاتا ہے ان کا کام وہ ہے جو بھنگی کرتا ہے ۔ بھنگی نجاست ظاہرہ کا حامل ہے اور پیر صاحب فصلانہ لیکر گناہوں کی نجاست کے حامل ہیں چنانچہ بعض دیہات میں پیر کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو کمینوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ایک چودھری کے ہاں فصل پر اناج تیار ہوا اور گھر والے چاروں کمینوں کا فصلانہ نکالنے لگے تو چودھری کہتا ہے کہ اس سوہرے پیر کا بھی تو حق نکال دو وہ بھی تو اپنا حق مانگنے آویگا ۔ واقعی یہ عجیب راحت و آرام کا پیشہ ہے کہ پیر صاحب گئے اور فصلانہ لے آئے اور سال بھر آرام سے اپنے گھر بیٹھے رہے ۔ اور پیشہ والے اگر فرض منصبی کو انجام نہ دیں تو تنخواہ بند ہو جاتی ہے مگر پیر کی تنخواہ بند ہی نہیں ہوتی ۔ اور خواہ کچھ ہی کر لیں انکی پیری بھی منسوخ نہیں ہوتی چاہے شراب پی لیں یا بدمعاشی کر لیں کیونکہ مشہور ہے کہ پیر کی پیری سے کام اسکے فعلوں سے کیا کام اگر پیر صاحب ڈھنگ کی باتیں بولیں تو حقائق و معارف ہیں اور بے ڈھنگی بے تکی ہانکیں تو رموز ہیں اور خاموش رہیں تو مراقب اور چپ شاہ ہیں انکی ہر حالت میں جیت ہے ۔ افسوس آجکل پیروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو یہود و نصاری نے اپنے احبار و رہبان کے ساتھ کر رکھا تھا وقالت الیہود والنصاری نحن ابناء اللہ واحباؤہ یہ خدا کے بیٹے اور اسکے محبوب بنتے تھے (نعوذ باللہ

۳۰۴

پیری مریدی کا عجیب حال ... (حاشیہ پر ہاتھ سے لکھی تحریر، ناخوانا)

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ) ان کو سب کچھ معاف ہے جو چاہیں کریں اس طریقہ میں عمل کی ضرورت ہی نہیں عمل سے کچھ سروکار ہی نہیں۔ یاد رکھو کہ ایسی پیری مریدی کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں بے عملی سر بیدینی ہے اور خیر بعضے ایسے تو نہیں ہیں بلکہ بیعت کے بعد عمل کی بھی ضرورت سمجھتے ہیں مگر کونسے اعمال کی فرائض و واجبات کی نہیں بلکہ وظائف و اوراد کی ضرورت سمجھتے ہیں کچھ وظیفے پیر سے معلوم کرلئے ہیں ان میں کبھی ناغہ نہیں ہونا چاہئے فرائض ناغہ ہوجائیں۔ نماز کی پروا نہیں کہ وقت پر ہوئی ہے یا بے وقت معاملات سر سے پیر تک گندے ہیں سود لیتے ہیں اور دیتے ہیں رشوت کا بازار گرم ہے اور اسکے ساتھ تہجد کے پابند ہیں اشراق کے پابند ہیں تسبیح بہت لمبی ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے اور پیر صاحب بھی ان مریدوں کی سود کی آمدنی سے ہدیا لیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کے ایک شخص نے خود مجھسے فخراً کہا کہ نماز تو چاہے قضا ہوجائے مگر پیر نے جو وظیفہ بتلا دیا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ جب قضا آئے گی اسوقت اس کا نتیجہ معلوم ہوگا کہ نماز زیادہ ضروری تھی یا وظیفہ۔ اور ان میں بھی اسلم وہ ہیں جو وظیفے ثواب کیلئے پڑھتے ہیں۔ ورنہ اکثر تو دنیا ہی کے واسطے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ کوئی قصیدہ غوثیہ کا ورد کرتا ہے کوئی حزب البحر کا۔ اگر انکو ثواب مطلوب ہوتا تو ادعیہ ماثورہ میں ان سے زیادہ ثواب ہے مگر دنیا مطلوب ہے اسلئے ادعیہ ماثورہ سے دلچسپی نہیں بلکہ اس قسم کے وظائف سے دلچسپی ہے جنسے دنیوی منافع بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ان سے بڑھکر ایک طبقہ اور ہے جو صوفیہ کہلاتے ہیں وہ اسلئے بیعت ہوتے ہیں تاکہ کیفیات اور کشف و کرامت حاصل ہوجائیں یہ لوگ کیفیات کو مقصود سمجھے ہوئے ہیں اسکے لئے ترک لذات کرتے ہیں نیند کم کرتے ہیں غذا کم کرتے ہیں اور اس کا نام رکھا ہے مجاہدہ و ریاضت۔ حالانکہ مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ مخالفت نفس فی المعاصی روٹی کھانے یا ٹھنڈا پانی پینے میں نفس کی مخالفت کرنا مجاہدہ نہیں۔ بلکہ مجاہدہ یہ ہے کہ نفس نے مثلاً تقاضا کیا کسی امرد یا عورت کے دیکھنے کا یا گانا سننے کا یا کسی کی غیبت کرنے کا اس میں نفس کی مخالفت کی اسی طرح تمام معاصی میں غور کرلو۔ مگر یہ صوفی جو مجاہدہ کے مدعی ہیں ان مواقع پر نفس کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ بہت سے لڑکوں اور عورتوں کے گھورنے میں مشغول ہیں اور غضب یہ کہ گناہ کرکے تاویل یہ کیجاتی ہے کہ ہم تو صنعت حق کا مشاہدہ کرتے ہیں مولانا محمد مظہر صاحب سہارنپوریؒ نے ایک ایسے ہی مسخرہ کو خوب جواب دیا تھا کہ اپنی ماں کی شرمگاہ میں جاکر صنعت حق کو دیکھ

۳۰۴

کہ ایسی ذرا سی تنگ جگہ سے تو اتنا بڑا آدمی پیدا ہو گیا۔ غرض ان لوگوں نے مجاہدہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھی اور ریاضت کے معنی اصل لغت میں سدھانے کے ہیں کیونکہ یہ ماخوذ ہے رَوْضُ الدَّابَّۃِ سے جسکے معنی ہیں گھوڑے وغیرہ کو سدھانا۔ اور اصطلاح میں ریاضت کے معنی ہیں تحصیل اخلاق حمیدہ و ازالۂ اخلاق ذمیمہ۔ پس مجاہدہ تو یہ ہے کہ شہوت و غضب وغیرہ کا جب تقاضا ہو تو اس تقاضے کو روکا جائے اور ریاضت یہ ہے کہ اس تقاضے کے منشا کو زائل کر کے اسکے بجائے خلق حسن اور ملکۂ فاضلہ پیدا کیا جائے کیونکہ جتنے معاصی ہیں سب کے مناشی اخلاق ہیں اور ریاضت اسی مرتبۂ خلق کے ازالہ کا نام ہے اور زائل کرنے سے مطلب یہ ہے کہ منشا مضمحل و ضعیف ہو جائے کیونکہ اخلاق رذیلہ کا ازالہ ممکن نہیں یہ سب رذائل فطری ہیں اور حدیث میں ہے اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْهُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ زَالَ عَنْ جِبِلَّتِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْهُ اور ان رذائل کے فطری ہونیکی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو بھی غصہ آتا ہے اور محققین کا قول ہے کہ غضب کبر سے پیدا ہوتا ہے پھر غضب سے غیبت پیدا ہوتی ہے جب بچوں میں غصہ ہے تو معلوم ہوا کہ انمیں تکبر بھی ہے تو بچوں کے اندر ان امور کے ہونے سے معلوم ہوا کہ یہ امور فطریہ ہیں اور امور فطریہ کا ازالہ کلیۃً نہیں ہو سکتا تو جو سالک انکو بالکل زائل کرنا چاہے وہ اس کا مصداق ہے ؎ دماغ بیہدہ پخت و خیال باطل بست

اور یہ میں نے اسلئے ظاہر کر دیا کہ سالکین اس حقیقت کے نہ جاننے سے بہت پریشان ہوتے ہیں بعض دفعہ مجاہدہ کر کے سالک یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھ سے کبر زائل ہو گیا اس کے بعد کسی موقعہ پر وہ پھر ابھرا تو یہ شکستہ دل ہو جاتا ہے اور ہمت پست ہو جاتی ہے کہ افسوس ساری محنت ہی برباد گئی مجاہدہ ضائع ہو گیا یہ بلا تو ہنوز موجود ہے پھر اس غم میں بعض تو خودکشی کر لیتے ہیں اور بعضے خودکشی کر لینے میں بھی بعضوں نے جان دیدی اور بعض نے اپنے کو طریق سے الگ کر لیا کہ اس راہ میں تو کامیابی دشوار ہے ممکن ہی نہیں اسواسطے میں کہتا ہوں کہ زوال سے مقصود اضمحلال ہے اور اضمحلال کے معنی یہ ہیں کہ بعد مجاہدہ کے ان اخلاق رذیلہ کی مقاومت میں پہلی جیسی مشقت نہیں ہوتی ورنہ یاد رکھو کہ مجاہدہ سے نہ حریص کی حرص زائل ہوتی ہے نہ بخیل کا بخل نہ متکبر کا تکبر ہاں اضمحلال ہو جاتا ہے جس کا ثمرہ یہ ہے کہ ان کے مقتضا پر عمل نہ ہو کیونکہ عمل اختیاری ہے پس مقتضائے رذیلہ پر عمل نہ کرنا یہی بڑی کامیابی ہے اور مجاہدہ و ریاضت سے یہی سہل و آسان ہو جاتا ہے۔ غرض اس تقریر سے سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ ایک درجہ تو ہے تقاضے کا معصیت

اسکی مخالفت کرنا تو مجاہدہ ہے اور ایک اس تقاضے کا منشا ہے خلق رذیل اس کے ازالہ یعنی اضمحلال کو ریاضت کہتے ہیں یہ تو انکی حقیقت ہے جسمیں ترک اکل وشرب کو کوئی دخل نہیں یہ اور بات ہے کہ اس حقیقت کی تحصیل میں ترک اکل وشرب وغیرہ سے سہولت ہوجاتی ہے تو وہ مقدمہ ہوا مگر یہ کیا غضب ہے کہ مقدمہ کو مقصود بنا لیا گیا کہ اصل مجاہدہ کا تو پتہ نہیں نہ امردوں کا گھورنا چھوڑیں نہ عورتوں کا دیکھنا اور کھانا پینا سونا کم کرکے مجاہد بنگئے۔ یہ تو جہلاء صوفیہ کا حال ہے اور رہ گئے ذرا لکھے پڑھے ہیں وہ ترک معاصی کا بھی اہتمام کرتے ہیں مگر وہ اس مرض میں گرفتار ہیں کہ احوال وکیفیات کو مقصود ومطلوب سمجھے ہوئے ہیں کسی سے انہوں نے سن لیا تھا اَلْمُجَاهَدَةُ مِفْتَاحُ الْمُشَاهَدَةِ بس یہ لفظ تو یاد کر لیا مگر تفسیر کسی محقق سے دریافت نکی بلکہ اپنی رائے سے معنی گھڑ لئے۔ مجاہدہ کے معنی تو مرنا کھپنا لئے کہ کھانا بھی چھوڑ دے اور پینا بھی اور مشاہدہ کی یہ تفسیر کی کہ اللہ کی طرف خود بخود بدون ارادہ کے لو لگی رہے ذوق شوق ہو کشف ہو یکسوئی ہو استغراق ہو بس وہ اسی کے واسطے ساری کوشش کرتے ہیں اگر کوئی اثر ظاہر ہوگیا کہ تھوڑی دیر کو وساوس کم ہوگئے شوق وذوق پیدا ہوگیا تو خوش ہوگئے کہ بس ہم کامیاب ہیں اور اگر کبھی ایسا نہ ہوا تو اب پریشانی میں مبتلا ہیں شیخ سے شکایتیں کرتے ہیں کہ مجھے تو ذکر سے نفع نہیں ہوتا وساوس بند نہیں ہوتے شوق وذوق پیدا نہیں ہوتا شیخ اگر اناڑی ہے تو وہ ہر شکایت پر دو تین کے لئے ایک وظیفہ اضافہ کر کے مرید کو مجموعۃ الوظائف بنادیگا جیسے علی حزین شاعر نے اپنے ہمسایہ کو تذکرۃ الاولیاء بنا دیا تھا قصہ یوں ہے کہ علی حزین جب دہلی آیا تو اسکے لئے ایک محل بہت عمدہ تجویز کیا گیا وہ اس میں رہنے لگا اسکے دہلیز میں ایک مداری فقیر رہتا تھا وہ رات کو ایک لمبا شجرہ پڑھا کرتا تھا چند روز میں مالک مکان علی حزین کی مزاج پرسی کیلئے آئے کہ اگر کسی قسم کی تکلیف ہوئی ہو تو ظاہر فرمایا جائے تاکہ اس کا بندوبست کیا جائے علی حزین نے کہا اور تو کچھ تکلیف نہیں مگر اس تذکرۃ الاولیاء کو کہیں اور کسی جگہ بسادو۔ راتوں کا سونا ظالم نے تنگ کردیا ہے اس کا شجرہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ تو جیسے علی حزین نے اس فقیر کو تذکرۃ الاولیاء بنایا تھا ایسا ہی میں کہتا ہوں کہ اناڑی شیخ اپنے مریدوں کو مجموعۃ الوظائف بنادیتا ہے پھر بعضے تو ایسے وظائف بتلاتے ہیں جو شرع کے موافق ہیں اور بعضے تو بہت ہی بے تکے وظائف بتلاتے ہیں جو خلاف شرع ہیں۔ جیسے یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ۔ اور ایک وظیفہ مشہور ہے اَللّٰہُ الصَّمَدِیْ یَا مُحَمَّدُ مَدَدِیْ اس میں صمد

۳۰۶

کی اضافت الی الیاء مع لام تعریف کے معلوم کیسی اضافت ہے یہ تو لفظی غلطی ہے اور معنوی
غلطی ندا غیر اللہ ہے۔ اسی طرح کلکتہ میں کرانہ کے ایک پیر زادے ہیں ان کا رات دن وظیفہ یہ تھا
یاحیُّ یا قیّومُ مرُ بکھر دے نقدی کچھ دے تُوم۔ پھر سنا ہے کہ ان کو کلکتہ پہونچکر نقدی بہت ملی
اور ایک وظیفہ بعضے لوگ یہ بتلاتے ہیں اٹھ جھنبیری سا تو ان آیا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس کا
مطلب کیا ہے تو کہتے ہیں اجی بزرگوں کے کلام میں برکت ہوتی ہے معنی سے کیا بحث۔ سبحان اللہ
ہر کلام میں برکت کیونکر تسلیم کر لی جائے چاہے وہ کیسا ہی بے تکا کلام ہو۔ کوئی خدا و رسول کا کلام
تو نہیں جو ایمان لے آیا جاتے۔ اور خدا و رسول کا کلام بے تکا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو وظائف میں
گڑبڑ ہے بعض لوگ اشغال میں گڑبڑ کرتے ہیں چنانچہ ایک شغل یہ بتلایا جاتا ہے کہ سانس آنکھ
ناک کان بند کر لو۔ اور اسکو بڑا ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اسپر غضب یہ کہ مولانا رومیؒ کو اس شغل کا
موجد بتلاتے ہیں اور دلیل میں یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

چشم بند و لب ببند و گوش بند — گر نہ بینی نور حق بر من بخند

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم نے یہ شعر مثنوی میں دیکھا نہیں نہ ہمکو اس میں ہونا یاد ہے
اور اگر ہو بھی تو میں تفسیم کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاصی سے ان اعضاء کو بچاؤ۔ کیونکہ نور
حق کا وعدہ طاعات کے امتثال ترک معاصی ہی پر ہو سکتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ قُل لِّلْمُؤْمِنِيْنَ
يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ط اور حدیث
میں بھی ہے کہ جو شخص کسی نامحرم سے اپنی نگاہ کو روک لیگا پائیگا وہ ایک حلاوت اپنے دل میں پائیگا
دوسرے مولانا کے زمانہ میں یہ اشغال نہ تھے یہ تو جوگیوں سے لئے گئے ہیں اسلئے کہ طبی قاعدہ سے
حصولِ یکسوئی میں یہ اشغال مفید ہیں باقی ثواب میں ان کو کچھ دخل نہیں۔ غرض یہ لوگ اسی ادھیڑبن
میں لگے رہتے ہیں کہ کیفیات وغیرہ کے لئے وظائف پڑھیں یا اشغال کریں اور اس کو بڑا مجاہدہ
اور ثواب سمجھتے ہیں حالانکہ ان کو مقصود سے کچھ بھی مس نہیں اور جو شیخ اس حالت میں ان
مریدوں کو وظیفے ہی بتلاتا جائے اس کے متعلق محقق یوں کہے گا ؎

بے خبر بودند از حال درون — استعیذ اللہ مما یفترون

اسکو اصل مرض کی خبر نہیں جو اس شخص کی پریشانی کا سبب ہے اصل مرض صرف یہ ہے کہ

اس نے یکسوئی اور کیفیت ذوق و شوق وغیرہ کو مقصود سمجھ رکھا ہے اسلئے پریشان ہے اس مرض کا اصلی علاج یہ ہے کہ اس کے ذہن نشین یہ مسئلہ کر دیا جائے کہ یہ کیفیات مقصود نہیں ہیں کیونکہ یہ مامور بہا نہیں ہیں اور مقصود وہی تھے جو مامور بہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحصیل استغراق وغیرہ کا نصوص میں کہیں امر نہیں کسی کو دعویٰ ہو تو دکھلائے ہاں شوق و تثبت کیلئے حدیث میں دعا آئی ہے اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ بعض احوال محمود ہیں مگر مقصود ہونا تو ثابت نہ ہوا کیونکہ یاد رکھو کہ شریعت نے انہیں اشیاء کو مقصود بنایا ہے جو بندہ کے اختیار میں ہوں اور جو شے اختیار انسان سے باہر ہو وہ مامور بہ نہیں ہوتی نہ مقصود ہوتی ہے شاید اس پر آپ کہیں کہ مغفرت و دخول جنت بھی تو غیر اختیاری ہے یہ بھی مقصود نہ ہوتی ورنہ اگر یہ مقصود ہیں تو بتلاؤ قرآن میں انکا کہاں امر ہے میں کہتا ہوں قرآن میں تو ان کا امر جا بجا صراحۃً مذکور ہے سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ[ع] اور اسکا امر اسلئے ہے کہ ان دونوں کا حصول انسان کے اختیار میں ہے شاید آپ اس سے چونکیں گے کہ حصول مغفرت و دخول جنت اختیار میں کہاں تو میں کہتا ہوں کہ امور اختیاریہ کا اختیاری ہونا جس درجہ میں ہے اور جو مبنی انکے اختیاری ہونیکا ہے وہ مبنی یہاں بھی موجود ہے اور اسکا بھی وہی درجہ ہے۔ کیونکہ تمام امور اختیاریہ کے اختیاری ہونیکا مبنی یہ ہے کہ اس کا سبب انسان کے اختیار میں ہے باقی یہ کہ مسبب براہ راست اختیار میں ہو سو یہ کسی امر میں بھی نہیں۔ دیکھئے سیراب ہونا پیٹ بھرنا ملازمت زراعت سے روپیہ حاصل کرنا وغیرہ جو اختیاری کہلاتے ہیں اسی معنی کے اعتبار سے کہ ان کے اسباب اختیار میں ہیں ورنہ مسبب تو کسی کے بھی اختیار میں نہیں عقلاء سب اس پر متفق ہیں۔ اور جب یہ ہے تو بتلاؤ جنت و مغفرت اختیاری کیوں نہیں جبکہ ان کے اسباب اختیاری ہیں یعنی اعمال صالحہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جا بجا اعمال پر مغفرت و دخول جنت کو متفرع فرمایا ہے اور اعمال اختیاری ہیں تو یہ بھی اختیاری ہے کیونکہ سبب اختیار میں ہے اور سبب ہی کے اختیاری ہونے پر شے کا اختیاری ہونا ہی مبنی۔ باقی ان احوال و کیفیات کی طلب و تحصیل کا امر تم بتلاؤ کہاں ہے یا کس عمل پر ان کے ترتب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ بس سالکین کی زیادہ تر پریشانی کا راز یہ ہے کہ وہ غیر مقاصد کے درپے ہوتے ہیں۔

[ع] وَدَوڑو اور سبقت کرو مغفرت کی طرف جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے اور طرف جنت کے جسکی وسعت ایسی ہے جیسے آسمان اور زمین کی وسعت۔ پارہ ۴ رکوع ۱۴

۳۰۸

[ه] فان قلت قال تعالیٰ و فی ذلک فلیتنافس المتنافسون ۰ وھذا ھو الشوق وقال وایای فارھبون وھذا ھو الخشیۃ فکیف لا یکونان مامورین کما قلت ان المامور بہ درجۃ الشوق والخوف العقلی دون الطبعی ۱۲ جامع

یہ حال تو محققین کا ہے کہ وہ کیفیات کے طالب اور ان کے انعدام سے پریشان ہوتے ہیں
وجہ یہ کہ یہ محق ہونے کی ساتھ غیر محقق ہیں۔ اور ایک جماعت بطلین کی ہے جنکو غیر محققین بھی کہا جاتا
ہے ان کی یہ حالت ہے کہ احوال وکیفیات کی طلب میں ان لوگوں سے معاصی تک سرزد ہوتے ہیں
مثلاً بیوی بچوں سے ترک تعلق کر دیتے ہیں تاکہ کیفیت میں فرق نہ آئے۔ میرٹھ کا واقعہ ہے کہ میں ہاں
اپنے گھر میں علاج کے واسطے ان کی ساتھ گیا ہوا تھا اسوقت ایک مسماۃ نے بیعت کی درخواست
کی چند عورتوں نے اسکو کہا تو ان سے بیعت نہ ہو بلکہ ہمارے پیر سے مرید ہونا جنہوں نے پچاس
سال سے بیوی کا منہ نہیں دیکھا ورنہ تو بیوی کو سفر میں لئے لئے پھرتے ہیں اس مسماۃ نے اس قسم کا
جواب دیا کہ تمہارے پیر سے تو میں ہرگز بیعت نہ ہوں گی وہ تو پچاس برس سے خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہے کہ
بیوی بچوں کے حقوق ادا نہیں کرتا میں تو ان سے ہی مرید ہونگی ان کا طرز سنت کے موافق ہے۔ تو اس
ظالم نے پچاس برس سے بیوی کو چھوڑ رکھا تھا شاید اسی لئے علیحدہ رہا ہو گا تاکہ بیوی کے اختلاط سے یکسوئی
وغیرہ کی کیفیت میں خلل نہ آجائے مگر جو کیفیت معصیت کے ساتھ بھی مجتمع رہے ایسی کیفیت خود مردود
ہے یاد رکھو کہ بعض دفعہ کیفیات محمودہ وکیفیات غیر محمودہ میں صورۃً اشتباہ ہو جاتا ہے مثلاً تذلل للخلق
وتواضع کی صورت بعض دفعہ یکساں ہوتی ہے اسی طرح۔ استغناء عن الخلق وکبر کی صورت مشابہ ہو جاتی ہے
ایسی ہی نفسانی یکسوئی اور روحانی یکسوئی میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔ بیوی بچوں سے الگ رہکر جو یکسوئی
حاصل ہوتی ہے وہ نفسانی یکسوئی ہے روحانی نہیں ہے۔ اس تشابہ وتشاکل کو مولانا رومی رح
اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

بحر تلخ وبحر شیریں ہمعناں   درمیاں شان برزخ لایبغیاں

جب کیفیات میں باہم تشابہ ہے تو اب کسی معیار کی ضرورت ہوئی جس سے معلوم ہو سکے کہ کونسی
کیفیت محمودہ ہے اور کونسی مذمومہ سو اسکے لئے معیار صرف شریعت مقدسہ ہے یعنی جو کیفیت کسی
گناہ کا مقدمہ ہو جائے وہ مذموم ہے ورنہ محمودہ ہے اگر یہ معیار سامنے نہ ہو تو پھر کیفیات تو جوگیوں کو
بھی نصیب ہو جاتی ہیں کیا ان کو بھی صوفی اور ولی کہوگے۔ اور آجکل اس کہدینے میں بھی استبعاد
نہیں کیونکہ جب لوگوں نے کیفیات ہی کو مقصود سمجھ لیا ہے اور تصوف انہی کا نام رکھ چھوڑا ہے تو انکے
نزدیک ہر صاحب کیفیت صوفی ہے خواہ مسلم ہو یا کافر چنانچہ آج کل ایک کافر صاحب ریاضت

۳۰۹

کے بہت سے مسلمان معتقد ہیں۔ اور مظفر نگر میں سنا تھا کہ ایک ہندو بابو کے بہت سے مسلمان مرید ہیں۔ اسی طرح بعض دفعہ ہندو کسی مسلمان پیر سے مرید ہوتے ہیں اور وہ مسلمان پیر صاحب اسکو مرید کر لیتے ہیں اور مرید صاحب ہندو کے ہندو ہی رہتے ہیں یہ مصلحت سمجھتے ہیں کہ شاید کسی وقت مسلمان ہو جاویں۔ مگر ہمارے اکابر نے اس سے بھی منع فرمایا ہے۔ گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے پاس ایک ہندو مرید ہونے آیا اور تعجب یہ کہ وہ ایک بہت بڑے بزرگ زمانہ سے مرید تھا ان کا انتقال ہو گیا تھا اسلئے مولانا کے پاس تجدید بیعت کے لئے آیا اور ان مرحوم بزرگ کے ایک معتقد کا خط لایا حضرت مولانا نے صاف فرما دیا کہ بیعت کرنے سے انکار نہیں مگر ہمارے ہاں بیعت کی سب سے اول شرط اسلام ہے۔ مسلمان ہو جاؤ ہم مرید کر لیں گے۔ اس نے یہ شرط نہ مانی حضرت نے مرید نہ کیا۔ بعد میں بعضوں نے عرض کیا کہ حضرت اگر اس کو اسی حالت میں مرید کر لیا جاتا تو اسلام سے قریب ہو جاتا۔ فرمایا ہرگز نہیں بلکہ اور بعید ہو جاتا کیونکہ ذکر و شغل میں خاصیت ہے کہ اس سے کیفیات طاری ہوتی ہیں اور کیفیات میں خاص لذت بھی ہوتی ہے جسکو یہ شخص قرب حق کی لذت سمجھتا اور اس کو کافر رہکر بھی یہ کیفیات حاصل ہو جاتیں تو اسکا یہ خیال پختہ ہو جاتا کہ قرب الٰہی میں اسلام کو کچھ دخل نہیں نہ اسلام کی ضرورت ہے بلکہ کافر رہکر بھی قرب حق حاصل ہو سکتا ہے تو پھر کسی وقت بھی اسکے اسلام لانے کی امید نہ رہتی اور اب جو کورا جواب دیا گیا ہے کہ بدون اسلام کے خدا کا راستہ نہیں مل سکتا اب امید تو ہے کہ شاید کسی وقت اسلام کی ضرورت کا خیال اسکے دل پر غالب ہو۔ اس قصہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کیفیات کافر کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس چیز کے حصول میں اسلام بھی شرط نہ ہو وہ کیونکر مقصود اور قرب کا موقوف علیہ ہو سکتی ہے ہرگز نہیں خوب سمجھ لو کہ ان کیفیات کو قرب میں کچھ دخل نہیں نہ یہ مقصود تصوف ہیں۔ اور ایک مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کفار کو مرید کرنا اسلام سے ان کو قریب کرنا نہیں ہے بلکہ بعید کرنا ہے آجکل ایک صاحب پیر بنے ہوئے ہیں ان سے ہندو بھی مرید ہیں۔ اور ستم پر ستم یہ کہ آپ نے ایک رسالہ میں یہ بھی شائع کیا ہے کہ میرے بعض ہندو مرید مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر آپ کہیں تو ہم مسلمان ہو جائیں میں نے ان کو لکھ دیا ہے کہ نہیں مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہندو رہکر بھی کامیاب ہو سکتے ہیں (یا اسی کے قریب کچھ الفاظ تھے) بتلائیے جو شخص مسلمان ہونے والے کو اسلام سے

روکے اور یہ کہے کہ اسلام کی ضرورت نہیں اسکے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے مگر یہ کمبخت پھر بھی شیخ طریقت اور پیر ہونے کے مدعی ہیں نہ معلوم یہ کیسا تصوف ہے جسکے لیئے اسلام کی بھی ضرورت نہیں سلف کے نزدیک تو تصوف کے معنی تعمیر الظاہر والباطن تھے کچھ عرصہ سے تعمیر ظاہر کو تو لوگوں نے تصوف سے نکال ہی ڈالا تھا اب ایسے خلف پیدا ہوئے جنہوں نے تعمیر باطن کو بھی اس سے الگ کر دیا کہ ایمان و اسلام سے بھی دل کو آباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب ایمان و عمل دونوں اجزا جاتے رہے تو فرمایئے وہ تصوف کیا خاک رہا۔ بلکہ محض جوگ رہ گیا پھر یہ لوگ اپنے کو صوفی کس لئے کہتے ہیں جوگی کہنا چاہیئے۔ انہیں وجوہ سے بعض لوگ تصوف سے بداعتقاد ہوگئے کہ یہ عجیب گورکھ دھندا ہے جس میں نہ اسلام کی ضرورت نہ ایمان کی نہ عمل کی نہ معاصی سے بچنے کی اور ظاہر ہے کہ سب مسلمان تو ایسے جاہل نہیں کہ ان کو دین کی کچھ بھی عقل نہ ہو وہ اس حالت کو تقینی بیدینی سمجھتے ہیں اور ان جوگیوں کی وجہ سے جنہوں نے شیخ اور صوفی کا لقب اختیار کر رکھا ہے اس فیصلہ پر مجبور ہوئے کہ تصوف زندقہ اور بیدینی کا نام ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ کیا چند اناڑی عطائیوں کے غلط سلط نسخوں سے فن طب یا محقق اطباء سے بھی آپ بداعتقاد ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عطائی صوفیوں کی حرکات سے آپ تصوف کو چھوڑ دیں اور محقق صوفیہ سے بھی بداعتقاد ہو جائیں جسطرح آپ علم طب میں محقق طبیب کی تلاش کرتے ہیں اسی طرح تصوف میں بھی محقق صوفی کو تلاش کرنا چاہیئے سب سے بداعتقادی کی کیا وجہ ہے۔ غرض میں کیفیات کے غیر مقصود ہونیکو بتلا رہا تھا کہ ان کے حصول میں اسلام کی بھی ضرورت نہیں تو پھر یہ مدار قرب کیونکر ہو سکتے ہیں اب ایک بات اور کہتا ہوں کہ دین میں مقصود وہ ہوتا ہے جو بدون تخصیص کے حاصل نہ ہو جسکا حصول صرف اختیار پر موقوف ہو اور قرآن میں منصوص ہے کہ بعضے احوال جیسے کشف مرتے ہی سبکو خود بخود حاصل ہو جائیں گے یہانتک کہ کفار کو بھی چنانچہ ارشاد ہے وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ اور فرماتے ہیں فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ اور ارشاد ہے أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا باقی میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ محمود بھی نہیں۔ اگر کسی کو کیفیات محمودہ حاصل ہوں جسکی محمودیت کا معیار آپ کو ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے طاعت میں ترقی ہو اور گناہوں میں کمی ہو تو نور علی نور ہے خدا کی نعمت ہے

اس کی قدر کرے اور نہ حاصل ہوں تو کچھ غم نہ کرے اسوقت اسکو مولانا رومیؒ کا یہ شعر سنایا جائیگا

روزہا گر رفت گو رو باک نیست   تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے جب کوئی یہ کہتا ہے کہ اتنی لاکھ دفعہ ذکر کرتا ہوں مگر نفع نہیں ہوتا تو فرمایا کرتے کیا یہ نفع تھوڑا ہے کہ اتنی لاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہوگئی۔ ہمارے ایک دوست ہیں وہ ذکر و شغل کے پابند ہیں مگر طالب کیفیات ہیں اور کیفیات انکو حاصل نہیں ہوتیں کیونکہ کیفیات کا مدار یکسوئی پر ہے اور یکسوئی کم عقلوں کو زیادہ ہوجاتی ہے عاقلوں کو خاصکر صاحب ذکاوت مفرطہ کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دماغ ہر وقت حرکت فکریہ میں رہتا ہے اسی لئے میں نے ان سے کہدیا تھا کہ تم کو کیفیات کبھی حاصل نہ ہونگے تم صرف ذکر و شغل کو غنیمت سمجھکر کئے جاؤ۔ مگر وہ طلب سے باز نہ آئے ایک صاحب توجہ و تصرف بزرگ کے پاس گئے انہوں نے ان سے روزے رکھوائے اور درود و استغفار معلوم کتنا پڑھوایا پھر ان پر توجہ ڈالی ایک ڈالی پھر دوسرے دن پھر تیسرے دن مگر اپنا اثر ہی نہوا ایک کیفیت بھی حاصل نہوئی۔ اسوقت ان کو میرے قول کی تصدیق ہوئی کہ واقعی میں کیفیات کے قابل نہیں ہوں اسوقت طلب کیفیت دل سے نکلی اور اسکے قبل ان ہی کا ایک واقعہ اور ہوا تھا کہ ان کو ایک ریاست میں جہاں عرصہ تک ملازم رہے تھے کسی کام سے جانا پڑا مجھ سے اجازت لی میں نے اجازت دیدی گو میں جانتا تھا کہ اس سفر سے معمولات ناغہ ہونگے مگر میں نے قصداً یہی سمجھکر اجازت دی تھی کہ ذرا ان کو ذکر و شغل کی قدر تو معلوم ہو چنانچہ اس سفر میں معمولات کے ناغہ ہونے سے ان کو اپنے قلب میں ایک ظلمت سی محسوس ہوئی اور وہ جو ذکر اللہ سے خاص نور پیدا ہوا تھا اس میں کمی ہوتی تو وہ بڑے گھبرائے اور نہایت قلق ہوا میرے پاس خط لکھا جسمیں اپنی تباہی اور بربادی کا رونا رویا تھا۔ جس میں لکھا کہ آج ان معمولات کے ناغہ ہونیکی فکر کیوں ہے اسکا قلق اسقدر کس لئے ہے یہ تو وہی ہے جسکی تم تحقیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بدون کیفیت کے معمولات لاشئے ہیں ان واقعات کے بعد وہ چین سے بیٹھے اور سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا ہی بڑی دولت ہے یہ دولت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ اگر وہ تم سے توفیق سلب کرلیں اور تم ایک دفعہ بھی اللہ کا نام نہ لیسکو تو بتلاؤ کیا کرلیگے سہ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے۔ سنبھلو کیا کیفیات لئے پھرتے ہو۔ تم اس غیر مقصود کی طلب میں مقصود کی بیقدری کرکے کہیں اس سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھنا

۳۱۲

کیونکہ ایک صورت قہر نازل ہونے کی یہ بھی ہے کہ خدا کا نام لینے کی توفیق سلب ہو جائے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ کلمہ توحید زبان سے نکالنا چاہا مگر زبان نہ چلی اور سب باتوں میں زبان چلتی تھی مگر کلمہ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ یہ عارف تھے گھبرا گئے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اس کا کیا سبب ہے الہام ہوا کہ فلاں دن جسکو اتنے سال ہوئے تم نے ایک بیجا کلمہ زبان سے نکالا تھا اور اب تک اس سے توبہ نہیں کی آج اس کی یہ سزا مل رہی ہے کہ کلمہ کی توفیق سلب ہو گئی اس گناہ سے توبہ کرو تو عذاب ٹلے۔ چنانچہ انہوں نے توبہ کی توبہ قبول ہوئی اور یہ وبال رفع ہوا حضرت اسکو معمولی بات نہ سمجھئے کہ آپ کو ذکر توفیق ہو گئی واللہ یہ بڑی دولت ہے ورنہ ہزاروں لاکھوں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں جنکی زبان کو خدا نے توفیق ذکر سے بندکر دیا ہے۔ جیسے ایک حکایت ہے کہ غلام اور آقا بازار کو گئے راستہ میں مسجد آگئی غلام نمازی تھا آقا بے نمازی غلام نے نماز پڑھنے کے لئے آقا سے اجازت چاہی اس نے اسکو اجازت دیدی اور خود مسجد کے دروازہ پر بیٹھ گیا جب نماز ختم ہو گئی اور نمازی مسجد سے نکلنے لگے تو آقا صاحب کو انتظار ہوا کہ اب غلام بھی آتا ہوگا مگر وہ نہ آیا اور بہت دیر لگا دی اسپر آقا نے جھلاکر پکارا کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں۔ غلام نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتے! کہا کون نہیں آنے دیتا۔ کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھکو باہر نہیں آنے دیتا صاحبو! یہ توفیق اور عدم توفیق ہی تو ہے کہ غلام مسجد کے اندر نواب بنا بیٹھا ہے۔ اور آقا صاحب باہر سیڑھیوں پر منتظر لوکر بنے بیٹھے ہیں مگر آج کل ایسے مذاق کے بھی لوگ موجود ہیں جو بجائے اسکے کہ اس خذلان پر قلق کریں فخر کرتے ہیں چنانچہ ایک شخص کا بچھڑا ہاتھ سے چھوٹ کر مسجد میں گھس گیا مؤذن جھلانے لگا کہ لوگ جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں تو وہ بچھڑے والا جواب دیتا ہے کہ میاں جی کیوں بگڑتے ہو جانور بے سمجھ تھا مسجد میں آگیا بھلا کبھی تم نے ہمیں بھی یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کمبخت کے نزدیک مسجد میں جانا کم سمجھ لوگوں کا کام ہے۔ مگر ایسے نامعقولوں کو موت کے بعد جواب معلوم ہو جائے گا یہاں وہ قابل خطاب نہیں ہیں۔ بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذکر اللہ بڑی دولت ہے اسکی قدر کرو اور کیفیات کے درپے ہو کر اسکی بیقدری نکرو۔ مولانا رومی نے اسپر ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک سالک کو شیطان نے دھوکہ دیا کہ تم برسوں سے ذکر شغل تہجد وغیرہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ کوئی پیام ہے نہ سلام ہے تو پھر تم ہی کیوں سرمارتے ہو جب وہ پوچھتے تک بھی نہیں اس دھوکہ کا اسکے ذہن میں

۳۱۴

کچھ جواب نہ آیا تو اس رات اس نے ذکر وشغل و تہجد سب ترک کر دیا سوتے ہوئے کوئی لطیفۂ غیبیہ خواب میں آیا اور اس نے حق تعالیٰ کی طرف سے پوچھا کہ کیوں صاحب آج ہم کو چھوڑ کر کیوں سو گئے نہ ذکر کیا نہ تہجد میں اٹھے اس نے وہی جواب دیا جو شیطان نے دھوکہ میں پڑھایا تھا کہ ادھر سے تو کچھ پیام وسلام ہے ہی نہیں پھر میں کیوں سر ماروں وہاں سے جواب ارشاد ہوا ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست   ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

کہ یہ اللہ اللہ کہنا تھا کہ ایک دفعہ اللہ کہکر دوبارہ زبان سے اللہ نکلنا یہ ہمارا جواب ہی تو ہے کہ ہاں ہم نے پہلا قبول کر لیا ہے اگر پہلا قبول نہ ہوتا بلکہ ناگوار ورد ہوتا تو زبان بند کر دیتے اور ذکر کی توفیق سلب کر لیتے کیونکہ جس شخص کا دربار میں آنا بادشاہ کو ناگوار ہو اور بادشاہ صاحب قدرت بھی ہو تو وہ پہلی ہی دفعہ کان پکڑ کر اسکو نکال دیتا ہے۔ حاجی صاحبؒ نے اس سے ایک مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ جس طاعت کے ایک دفعہ کرنے کے بعد دوبارہ اس کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ پہلی طاعت قبول ہو چکی یہ علامت قبول کی ہے اور گو یہ استنباط قطعی نہیں مگر ظاہر عادۃ اللہ اور وسعت رحمت اسی کو مقتضی ہے پس تغلیب رجا میں یہ بہت نافع ہے جو کہ شرعاً مامور بہ ہے لَا يَمُوتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِرَبِّهِ الغرض آجکل بیعت کی حقیقت و غایت میں عام طور سے غلطی ہو رہی ہے لوگ مقاصد و غیر مقاصد میں فرق نہیں کرتے نہ اعمال کا اہتمام کرتے ہیں نہ اعمال پر روک ٹوک ہے حالانکہ تعلق بیعت میں طرفین سے التزام بھی ہے اطاعت کا اور معاہدہ ہے اصلاح کا پھر بھی وہاں روک ٹوک نہیں صرف وظائف کی بھرمار ہے اور اگر کچھ روک ٹوک ہے بھی تو صرف دو چار اعمال پر جنکا ضروری ہونا سبکو معلوم ہے حالانکہ وہ باتیں زیادہ تبلانا چاہئیں جنکی مخاطب کو ضرورت ہی معلوم نہیں مگر ایسی باتیں کیونکر تبلائیں ان کی ضرورت سے خود شیخ ہی منکر ہیں اور منکر اسلئے ہیں کہ ان سے خود کورے ہیں اسی لئے امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اے عزیز تمہاری اصلاح کی کیا امید ہو جبکہ تمہارے طبیب ہی مریض ہیں۔ صاحبو! بیعت ہونیکے بعد جن چیزوں پر روک ٹوک زیادہ ضروری ہے وہ اس قسم کی ہیں کبر و عجب اضاعت حقوق العباد حسد و بغض۔ فساد ذات البین وغیرہ مگر آجکل ان امور پر مطلق ٹوک ٹوک نہیں حالانکہ پہلے زمانہ میں مشائخ کو اول اسی کا زیادہ اہتمام تھا وظائف تو سالہا سال کے بعد تعلیم کرتے تھے اور یہی نہیں کہ محض زبان سے ان امور پر روک ٹوک کریں بلکہ تدبیروں سے ان امراض کو قلب سے نکال لیتے تھے

مثلاً کسی کو زینت پرستی میں مبتلا دیکھا تو اسے سڑکوں پر یا خانقاہ میں جھاڑو دینا بنا دیا۔ اور جس میں تکبر دیکھا اسکو نمازیوں کے جوتے سیدھا کرنا تعلیم کر دیا جنہیں ایک جولاہے کے بھی جوتے تھے جو اس متکبر کی رعیت کا جولاہا ہے اسکے جوتے سیدھے کرتے ہوئے بس جگر ہی تو کٹ گیا اور دل پہ آرہ ہی تو چل پڑا مگر یہ حالت ایک دو دفعہ میں ہوتی ہے پھر افعال تواضع میں خاصیت ہے کہ ان سے قلب میں بھی تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ کرتے کرتے ہر قسم کی عادت ہو جاتی ہے حضرت شیخ ابوسعید گنگوہیؒ کا قصہ میں نے بارہا بیان کیا ہے غالباً سامعین اکثر اس سے واقف ہونگے کہ سلطان نظام الدین بلخیؒ نے انکے عجب کا کس طرح علاج فرمایا تھا کہ اول انکو حمام جھونکنے کی خدمت سپرد کی پھر سال بھر کے بعد بھنگن سے کہا کہ ان کے سر پر ذرا سی اپنے ٹوکرے کی مٹی جھاڑ دے جب وہ اسپر جھلائے تو ایک مدت تک پھر بھی خدمت ادری اور اسکے بعد مدت تک پھر بھی خدمت لی پھر شکاری کتوں کی خدمت سپرد کی اور یہ کام اس شخص سے لئے جو گنگوہ کے پیرزادے بھی تھے اور قطب زادے بھی تھے اس قسم کی خدمتیں لیکر پھر کہیں ذکر شغل تبلاتے تھے۔ اے صاحب اس قسم کی تعلیم کا تو آج کل کہیں پتہ بھی نہیں۔ حالانکہ ضرورت اسی کی ہے کیونکہ شیخ کو طبیب کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر مریض کو ایک ہی نسخہ نہ دے بلکہ نسخے بدلتا رہے جیسا مریض دیکھے ویسا ہی نسخہ تبلائے اور ایک مریض کو بھی ایک نسخہ نہ دے بلکہ اسکے لئے بھی حسب ضرورت تبدل و تغیر کرتا رہے مگر آجکل شیوخ کے یہاں بس ایک ہی طریقہ سبکے لئے ہے یہ طرز ٹھیک نہیں بلکہ ہر شخص کے مناسب اسکے امراض کی تشخیص کے بعد جدا جدا تعلیم ہونا چاہیے۔ اور ان کو رات دن اعمال و اخلاق پر ٹوکنا چاہیے۔ اور جن اعمال کا دین ہونا عام طور سے معلوم ہے اس کا اہتمام اسقدر زیادہ ضروری نہیں بلکہ جن باتوں کا دینی ہونا لوگوں کو معلوم نہیں ان کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ مثلاً اصلاح اخلاق کو آجکل دنیوی امور سے سمجھتے ہیں اصلاح اخلاق کو دین ہی نہیں سمجھتے مثلاً لوگوں کو اسکا اہتمام ہی نہیں کہ ہمارے فعل یا قول سے کسی کو ایذا نہ پہونچے نہ اسکو دین کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ کہ مسلمان وہ ہے جسکی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسپر اسلام ہی کو موقوف فرمایا ہے گو علما نے اسمیں تاویل کر لی کہ مراد کمال اسلام کا موقوف ہونا ہے مگر حضورؐ کے الفاظ تو یہی ہیں کہ مسلمان وہی ہے جسکے ہاتھ اور زبان سے

مسلمان بچے رہیں یعنی جو ایسا نہ ہو وہ مسلمان ہی نہیں کیا ان الفاظ کا اطلاق کچھ اثر نہیں رکھتا گو مراد وہی ہو جو علماء نے فرمائی ہے۔ اب میں ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکا کس درجہ اہتمام تھا حدیث میں آتا ہے کہ ایک رات آپ حضرت عائشہؓ کے گھر تھے کیونکہ ان کی باری تھی اور وہ رات شب برات کی تھی حضورؐ نصف شب کیوقت حکم ہوا کہ جنۃ البقیع کے مسلمانوں کیلئے جاکر دعا کریں تو آدھی رات آپ اٹھے جسکی کیفیت حضرت عائشہ یوں بیان فرماتی ہیں کہ قَامَ رُوَیْدًا وَفَتَحَ الْبَابَ رُوَیْدًا ثُمَّ خَرَجَ رُوَیْدًا ثُمَّ اَغْلَقَہٗ رُوَیْدًا حضور صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ سے اٹھے آہستہ آہستہ چلے آہستہ ہی دروازہ کھولا آہستہ ہی باہر تشریف لیگئے آہستہ ہی اسکو بند کیا ہر کام آہستہ کیا تاکہ حضرت عائشہؓ کی آنکھ نہ کھل جائے انکو تکلیف نہ ہو حالانکہ حضرت عائشہؓ کون تھیں حضورؐ کی عاشق تھیں جن کا محبوب کیلئے بزبان حال یہ قول تھا ۔ گر بر سر و چشم من نشینی ✤ نازت بکشم کہ نازنینی

اول تو عموماً بیوی کو شوہر سے ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اگر خاوند سوتی ہوئی کو جھنجھوڑ بھی دے تب بھی اسکو ایذا نہ ہو بلکہ راحت ہو اور خصوصی حضرات ازواج مطہراتؓ تو حضورؐ کی سب سے زیادہ عاشق تھیں اور بالخصوص ان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مگر اس تعلق پر بھی حضورؐ نے انکی نیند کا اسقدر خیال فرمایا کہ سب کام آہستہ کیلئے۔ مگر یہ تو عاشق تھیں انکو خبر کیسے نہ ہوتی گو حضورؐ نے سامان ایسا کیا تھا کہ انکو خبر نہ ہو مگر جب مکان حضورؐ سے خالی ہوا تو حضرت عائشہؓ کے قلب نے حالت نوم ہی میں اسکا احساس کیا اور انکی آنکھ کھل گئی آنکھ کھولنے کے بعد جب حضورؐ کو نہ پایا تو بڑی پریشانی ہوئی کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید آپ کسی بیوی یا باندی کے پاس چلے گئے بالآخر پریشانی میں گھر سے نکلیں اور آپ کو جاتے ہوئے دیکھکر بقیع کی طرف چلیں دیکھا کہ حضورؐ امت کیلئے دعا فرما رہے ہیں یہ حالت دیکھکر اطمینان ہوا اور یہ واپس ہوئیں اور پیچھے پیچھے حضورؐ بھی واپس ہوئے اور راستہ میں حضرت عائشہؓ کے قریب ہی آپ بھی پہونچ گئے حضرت عائشہؓ نے اس خیال سے کہ حضورؐ کو معلوم نہ ہو تیز تیز چلنا شروع کیا حضورؐ کو خیال ہوا کہ یہ آگے آگے کون ہے آپنے بھی تیز چلنا شروع کیا یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ بھاگنے لگیں اور حضورؐ سے پہلے اپنے گھر میں داخل ہوکر بستر پر لیٹ گئیں مگر سانس پھولا ہوا تھا اسکو کیونکر دبائیں حضورؐ جو گھر میں تشریف لائے تو آپ کو حضرت عائشہؓ کا سانس پھولا ہوا معلوم ہوا فرمایا یَا عَائِشَۃُ مَا لَکِ حَشْیَا رَابِیَۃً یہ لمبا لمبا پھولا ہوا سانس کیوں آرہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرے آگے آگے تم ہی بھاگی ہوئی آرہی تھیں اسپر حضرت عائشہ

ہنس پڑیں تو حضورؐ نے فرمایا اتخافین ان یحیف اللہ علیکم ورسولہ اسی طرح حضرت
مقداد بن الاسود صحابی فرماتے ہیں کہ ہم چند آدمی بھوکے پیاسے مدینہ پہونچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ہمکو اپنے ذمہ کرلیا حضورؐ کے یہاں چند بکریاں پلی ہوئی تھیں ان کا دودھ آپ نے ہم کو بتلا دیا ہم
سب بھی پی لیتے اور حضورؐ کے لئے بھی رکھدیتے۔ حضرت مقداد فرماتے ہیں کہ ایک رات حضور کو
مکان پر تشریف لانے میں ذرا دیر ہوئی میں یہ سمجھا کہ شاید کسی نے آپ کی دعوت کردی ہوگی اس خیال
سے میں نے آپ کے حصہ کا بھی دودھ پی لیا۔ پی تو لیا مگر بعد میں خیال ہوا کہ اگر حضورؐ کی دعوت
نہ ہوئی ہو اور حضورؐ بھوکے پیاسے رہے تو کیونکر ہوگی بس یہ خیال آنا تھا اور مجھے بے چینی لگی اب
ہر چند کروٹیں بدلتا ہوں مگر چین نہیں آتا یہاں تک کہ حضورؐ بہت دیر میں تشریف لائے اور آہستہ
کواڑ کھولے اور ایسا آہستہ سلام کیا جسکو جاگنے والا سن لے اور سونیوالا نہ جاگے اللہ اکبر کیسا عدل جامع
بین حق اللہ وحقوق العباد تھا کہ نہ تو سونیوالوں کی اتنی رعایت کہ سلام ہی نہ کریں کیونکہ احتمال اس کا بھی
ہے کہ شاید کسی عارض سے کوئی جاگ رہا ہو۔ اور نہ اتنا غلو کہ زور سے اس طرح سلام کریں کہ سب کی آنکھ کھل جائے
چنانچہ آجکل صوفی اور سالکین بھی ان امور کی رعایت نہیں کرتے رات کو اٹھتے ہیں تو زور کے ساتھ کھٹ پٹ
چلتے ہیں۔ استنجا کیلئے ڈھیلے بھی زور سے پھوڑتے ہیں۔ پانی بھی زور سے بھرتے ہیں کلی بھی زور سے
کرتے ہیں۔ آخر یہ کیا طریقہ ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ کسی دوسری قوم کے لئے
ہے کہ وہ اسپر عمل کریں اور تم عمل نہ کرو۔ پورا قصہ یہ ہے کہ پھر حضورؐ اس برتن کی طرف چلے جسمیں دودھ
رکھا جاتا تھا اسکو خالی پایا تو آپ نماز میں مشغول ہوگئے اور نماز کے بعد حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ
اسوقت جو مجھے کھانا کھلائے اسکو آپ بھی روزی دیجئے اسوقت حضرت مقداد سے نہ رہا گیا اور اللہ
کا نام لیکر بکریوں کے نیچے جا بیٹھے تو دیکھا کہ حضور کی دعا کی برکت سے سب کے تھن خوب بھرے ہوئے
ہیں تب بہت سا دودھ لیکر آپ کے پاس آئے اپنے پی لیا تو ان سے کہا کہ تم بھی پیو اسپر یہ بہت ہنسے
حضورؐ نے سبب پوچھا تو سارا واقعہ سنایا۔ غرض حضورؐ کا تو یہ طریقہ تھا مگر ہمکو اتباع نبوی کا ذرا اہتمام نہیں اور
ایک مرض ہم میں یہ ہے کہ کسی جگہ سے کوئی چیز اٹھائیں گے تو اسکو بے جگہ رکھدیں گے جس سے دوسروں کو تلاش
میں پریشانی ہوتی ہے۔ چارپائی بچھائیں گے تو بالکل راستہ میں پھر اسکو وہیں چھوڑ کر کھڑے ہوجائیں گے
چاہے رات کو کوئی الجھ کر ہی گر پڑے اور ہاتھ پانو یا سر ہی پھوٹ جائے۔ اسی طرح جماعت کے بعد

نفلوں کی نیت ایسی جگہ باندھیں گے جس سے لوگوں کو چلنے پھرنے میں تکلیف ہو کسی جگہ سے برتن میں کھانا آیا تو اب یہ نہیں ہوتا کہ اس کا برتن جلدی خالی کردیں بلکہ اسی میں کھانا شروع کر دیں گے بلکہ کئی روز تک اسکو محبوس رکھیں گے اور دوسرا شخص برتن مانگے تو کہتے ہیں کیا ہم رکھ لیں گے میں کہتا ہوں کہ دیر کرنے میں یہی اندیشہ ہے کہ تم رکھ لو یعنی رکھکر بھول جاؤ چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی کے برتن جلدی واپس نہ کئے اور رکھکر بھول گئے پھر مہینوں تک وہ اپنے ہی گھر پڑے رہے اگر مالک کو خود ہی یاد آگئے تو وہ خود بلا سے لیجائے ورنہ بس یہیں رہ جاتے ہیں آخر یہ باتیں کلفت کی ہیں یا نہیں۔ پھر ان سے احتراز کیوں نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح مریدوں کی عادت ہے کہ پیر کے ساتھ کسی جگہ جائیں گے تو جماعت کی جماعت بیس پچیس آدمیوں کی ساتھ جائے گی اور وہ پیر بھی حضرت ہیں جو اس لشکر کو ساتھ لئے جا رہے ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ تم نے مرید کیا ہے یا لام بندی کی ہے۔ کسی پر چڑھائی کرو گے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جس شخص کے یہاں یہ بیس پچیس آدمی جا کر مہمان ہوں گے۔ کیا اسکو گرانی نہ ہوگی پیر کی دعوت اور خدمت کو تو وہ فخر سمجھے گا مگر اس لشکر کی خدمت و ضیافت ضرور اسکو گراں ہوگی پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ان تکالیف کی پروا نہیں ہوتی اور ان کو جان جان کر ایذا دی جاتی ہے اور ذرا دل پر چوٹ نہیں لگتی۔ اب اگر کوئی ان باتوں پر روک ٹوک کرے تو وہ بدنام ہوتا ہے کہ بڑے قانونی ہیں ہر بات کیلئے ان کے یہاں قانون ہے کہ یوں بیٹھو یوں اٹھو۔ یوں کھڑے ہو۔ اے صاحب تم بزرگوں کا تذکرہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ مشائخ کے یہاں زمانہ سابق میں اسی قسم کی تعلیم تھی اور انہی باتوں پر روک ٹوک تھی میرے استاد فرماتے تھے کہ ایک بزرگ کا معمول تھا کہ جو شخص ان کے یہاں مہمان ہوتا اسکے لئے اندازے کچھ زائد روٹی سالن بھیجتے پھر جب سالن روٹی بچکر آتا تو دیکھتے اگر تناسب سے بچا ہوتا تب تو وہ اس کو اپنے سلسلہ میں داخل فرماتے ورنہ صاف کہدیتے کہ تمہاری طبیعت میں بیڈھنگا پن ہے ہم سے تم سے نباہ نہ ہوگا۔ ایک حکایت اور سنی گئی ہے کہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء دہلوی کے یہاں دو شخص مرید ہونے آئے وہ آپس میں مسجد کا حوض دیکھکر کہنے لگے کہ ہماری مسجد کا حوض اس سے بہت بڑا ہے۔ سلطان جی نے یہ گفتگو سنلی بلایا اور پوچھا کہ تمہارا حوض اس سے کتنا بڑا ہے

کہا حضرت پیمائش تو معلوم نہیں۔ فرمایا اچھا جاؤ اس حوض کی پیمائش کرکے لے جاؤ اور اسکو پیمائش کرکے آؤ چنانچہ وہ گئے اور پیمائش کرکے واپس ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت ہمارا حوض ایک بالشت بڑا ہے۔ فرمایا تم تو کہتے تھے بہت بڑا ہے ایک بالشت زیادہ کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے جاؤ تم کو بیعت نہ کرینگے۔ یہ مت سمجھنا کہ حضرت سلطان جی نے ان کو محروم واپس کردیا نہیں بلکہ اتنی بڑی دولت دیکر واپس کیا جو تمام عمر کام آئے گی وہ کیا ؟ احتیاط فی الکلام کا سبق ایسا پڑھایا جو عمر بھر نہ بھولیں گے یہی تو فرق ہے محقق وغیر محقق میں کہ محقق دھتکارتا بھی ہے تو کچھ دیکر اور غیر محقق عمر بھر چمکارتا ہے مگر محروم کا محروم رکھتا ہے میں نے ایک بزرگ کو دیکھا ہے اور ان کا واقعہ سنا ہے کہ ان کے پاس ایک بڑھیا آئی اور آکر فقر وغیرہ کی شکایت کی آپ نے خادم سے فرمایا کہ اس سے کہدو خدا فضل کرے مرید نے یوں کہا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ بس یہ بزرگ اس خادم کے سر ہوگئے کہ میں نے کب کہا تھا تم نے یہ گا اپنی طرف سے کیوں لگایا حضرت غور کیا جائے تو یہ بات ٹوکنے کی ضرورتھی کیونکہ اس تغیر سے کلام کے معنی بدل گئے صورت اولی میں دعا تھی کہ اللہ فضل کرے۔ اور اس صورت میں پیشین گوئی ہوگی کہ بےفکر رہو خدا فضل کردے گا اسی لئے ان بزرگ نے سخت تنبیہ کی کہ تم نے میری بات کو کیوں بدلا مجھے غیب کی کیا خبر۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑنا ظلم ہے تو میں کہتا ہوں یہ ظلم نہیں بلکہ عدل ہے اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ڈاکٹر وطبیب بیمار کی بدپرہیزی پر روک ٹوک کرتا ہے یقیناً اسکو کوئی ظلم نہیں کہسکتا۔ ایسے ہی یہ بھی ظلم نہیں ایک طبیب میرے دوست ہیں وہ کہتے تھے کہ میرے زیر علاج ایک بمبئی کا سیٹھ تھا اس نے کوئی بد پرہیزی کی مجکو معلوم ہوا تو میں نے نبض دیکھنے سے انکار کردیا اور کہدیا کہ جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو علاج کیسے کروں اس نے خوشامد شروع کی میں نے کہا کہ اب تو میں دس ہزار روپیہ لیکر نبض دیکھوں گا۔ دوسرے تیسرے دن وہ شخص دس ہزار روپے کے نوٹ لیکر آیا کہ یہ تو نبض دیکھنے کیلئے فیس ہے اور علاج کی فیس اس سے الگ دونگا مگر ان دوست نے ہمت کی کہ یہ رقم واپس کردی اور کہدیا کہ مجھے تو تیرا علاج ہی منظور نہیں دس ہزار کا ذکر محض تعجیز کیلئے تھا تحدید کیلئے نہ تھا۔ تو حضرت اطبا جسمانی میں جو صاحب کمال طبیب ہیں وہ بھی مریض کی بدعنوانیوں پر ایسی سخت دار وگیر کرتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اطباء روحانی

۳۱۹

ان کی خوشامد کریں ہرگز نہیں بلکہ ان کو سب سے زیادہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان سے تعلق ہی
محض اس واسطے ہوا ہے کہ مریدان کی اطاعت کرے اور یہ اس کی اصلاح کریں۔
حضرت ذوالنون مصری رح کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت کا فلاں مرید
شراب پیکر فلاں جگہ بدمست پڑا ہے آپ کو محسوس ہوا کہ یہ اس کو حقیر اور اپنے کو افضل
سمجھتا ہے اس کا یہ علاج کیا کہ فرمایا جاؤ اس کو اٹھلاؤ وہ جب تک وہاں رہے گا سلسلہ
کی بدنامی ہے۔ اس میں اس کے تکبر کی اصلاح تھی کہ جسکو اس نے حقیر سمجھا تھا اسی کی
خدمت اس کے سپرد کی۔ جب وہ اسکو لیکر چلا رستہ میں جو ملتا تھا کہتا تھا کہ یہ صوفیوں کا
حال ہے دونوں نے شراب پی ہے۔ دوسرا ابھی ہوش میں ہے یہ اخفاء حالت کے لئے
اس کو لیکر چلا ہے۔ تو یہ طریقہ تھا پہلے بزرگوں کا وہ اس طرح مریدوں کی اصلاح کرتے
تھے وجہ یہ کہ ان کو امر بالمعروف اور تبلیغ کی اہمیت کا علم تھا۔ آجکل افسوس ہے کہ ہملوگ
اس فریضہ کو چھوڑے ہوے ہیں جسکی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے قلوب مخلوق کی ہیبت سے
بھرے ہوے ہیں اس لئے ہمکو تبلیغ سے رکاوٹ ہے اور ہر شخص کو تبلیغ کرنے کی ہمت نہیں
ہوتی خواہ ہمکو کیسی ہی قدرت ہو اور دوسرا ہمارا ماتحت ہی کیوں نہو۔ رہا یہ کہ امر بالمعروف
اور تبلیغ کسی عذر سے بھی معاف ہو جاتی ہے یا نہیں سو اس کو عمل شروع کرنے کے بعد
بتلاؤں گا پہلے تم عمل شروع کردو۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالی ہمارے قلوب سے مخلوق کی
ہیبت نکال دے اور ہمکو تبلیغ و امر بالمعروف کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین
وَصَلَّى اللهُ عَلَى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ وَآخِرُ دَعْوٰنَا
أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
اشرف علی ط۔ ۱۶ جمادی الاولی سنہ ۱۳۴۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

الاکرمیۃ بالاعملیۃ والاعلمیۃ

این	کہاں ہوا	قانہ بھون مسجد مولانا والی محلہ خلت۔
متٰی	کب ہوا	۲۷ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ بروز سہ شنبہ بعد نماز ظہر
کم	کتنی دیر ہوا	دو گھنٹہ ۱۵ منٹ
کیف	کس طرح ہوا	تخت پر بیٹھ کر۔
لم	کیوں ہوا	اس مسجد میں ایک نیا حجرہ تعمیر ہوا تھا اس کی خوشی میں مؤذن صاحب نے وعظ کی درخواست کی کہ اس مسجد میں وعظ ہو جائے تاکہ اہل محلہ کو دین پر توجہ
ماذا	کیا مضمون تھا	علم و عمل کی ضرورت اور یہ کہ شرافت بدون علم و عمل کے قابل اعتبار عند اللہ نہیں۔
من الشان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	شرفاء کو جو کہ محض اپنے شرف نسب پر کفایت کئے ہوئے ہیں اور علم دین و عمل سے غافل ہیں۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	تقریباً ۵۰
الاشتات	متفرقات	تسوید تفصیلی ۱۲ شوال ۱۳۴۳ھ کو تمام ہوئی والحمد للہ علیٰ ذالک ۱۲ ظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا وَقَالَ تَعَالٰی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یہ جو میں نے تلاوت کیا ہے یہ دو آیات کے

دو مختلف ٹکڑے ہیں اور گو میرا معمول یہ ہے کہ اکثر ایک ہی آیت کا بیان کرتا ہوں مگر اسوقت چونکہ میرا مقصود دو آیتوں سے حاصل ہوتا ہے اور ان میں بھی ان آیتوں کے اجزا ہیں اسلئے دونوں آیتوں کا ایک ایک جزو تلاوت کیا گیا اور گو تقریر استدلال میں ترتیب بالعکس ہے کہ دوسرا حصہ مقدم ہوگا اور پہلا موخر ہوگا مگر میں نے ادباً ترتیب موجودہ قرآنی کا لحاظ کیا ہے اور ترتیب مصحف اسی طرح ہے جسطرح میں نے تلاوت کی ہے۔ کیونکہ یہ ترتیب مجمع علیہ ہو چکی ہے حضرات صحابہ نے جمع مصحف میں اسپر اجماع کیا ہے جسکی مخالفت کتابت مصحف میں تو حرام ہے اور اگر کوئی اس ترتیب کے خلاف مصحف لکھنا چاہے تو امام اسکو تعزیر کرے اور تلاوت قرآن اور قرأت صلوٰۃ میں بھی اسکی رعایت واجب ہے اور قصداً مخالفت کرنا مکروہ ہے (سہواً ترتیب کے خلاف ہو جائے تو معاف ہے) اور گو اسوقت تلاوت مقصود نہیں بلکہ تبلیغ احکام مقصود ہے اور اس میں رعایت ترتیب واجب نہیں مگر ادباً رعایت کرلی گئی دوسرے حصہ کا ترجمہ تو یہ ہے کہ جو زیادہ ڈرنیوالا ہے وہ خدا تعالیٰ کے یہاں زیادہ مکرم ہے اور پہلے حصہ کا ترجمہ یہ ہے کہ اور کوئی بات نہیں ہے صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے علماء ہی ڈرتے ہیں نتیجہ اس کا نہایت بدیہی ہے جو استنباط کا محتاج نہیں ہے ایک آیت میں اکرمیۃ کا مدار تقویٰ پر رکھا گیا ہے اور دوسری آیت میں خشیت یعنی تقویٰ کو علم پر موقوف کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان بدون علم کے اکرم نہیں ہو سکتا اور اس سے جو میرا مقصود ہے یعنی علم کی ضرورت جو کہ مجموعہ مقصود کا ایک جزو ہے وہ بھی ظاہر ہے محتاج بیان نہیں کیونکہ ان دونوں مقدموں کے ملانے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مقصود بالبیان کیا ہے۔ اور ایک مقدمہ عقلی جو ابھی بیان ہوگا اسکے ملانے سے دوسرا جزو بھی ظاہر ہو جائیگا کیونکہ اسوقت میرا مقصود دو چیزوں کی ضرورت بتانا ہے ایک علم دوسرے عمل سو علم کی ضرورت تو صراحۃً ثابت ہوگئی کیونکہ ایک آیت میں خشیت کو اسپر موقوف کیا گیا ہے اور خوف و خشیت حق تعالیٰ سے ہونا ضروری ہے کیونکہ جزو ایمان ہے چنانچہ مشہور عقیدہ ہے کہ ایمان خوف و رجا کے درمیان ہے تو جو اس کا موقوف علیہ ہوگا وہ بھی ضروری ہوگا تو علم کی ضرورت صراحۃً ثابت ہوگئی اب یہاں ایک مقدمہ عقلی یہ ملایئے کہ خوف جس طرح ایک درجہ میں خود بھی مقصود ہے اسی طرح عمل کیلئے بھی مقصود ہے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کیلئے

زیادہ مقصود ہے چنانچہ نصوص سے اسکی تائید ہوتی ہے جب یہ بات ہے تو اب عمل کی ضرورت
بھی ظاہر ہوگئی کیونکہ خوف وخشیت کا جس طرح ایمان کیلئے ضروری ہونا مسلم ہے اسی طرح خوف
کی ضرورت عمل کی وجہ سے بھی ہے تو عمل بھی ضروری ہوا اب مقصود بالکل واضح ہوگیا کہ علم
بھی ضروری ہے اور عمل بھی اور ہرچند کہ تقوی اور خشیت دونوں کے معنی لغتہً ڈرنے کے ہیں
مگر اطلاقات قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقوی کا استعمال زیادہ تر اس خوف کیلئے
ہوتا ہے جسمیں اجتناب عن المعاصی بھی ہو محض خوف اعتقادی کیلئے کم استعمال ہوتا ہے تو
یوں کہئے کہ تقوی خوف مقرون بالعمل کو کہتے ہیں اور خشیت خوف اعتقادی کو اس بنا پر یوں
بھی کہنا ممکن ہے کہ ان دو آیتوں میں سے ایک میں یعنی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ
میں ضرورت عمل کا بیان ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں اکرمیت تقوی سے حاصل ہوتی ہے جو کہ خوف
مقرون بالعمل ہے اور اکرمیت عند اللہ ہر شخص کو مطلوب ہے تو تقوی کا اختیار کرنا ضروری
ہوا جو مستلزم ہے عمل کو۔ اور دوسری آیت اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا	۳۲۳
میں علم کی ضرورت کا بیان ہے اس طرح کہ خشیت کو مطلوب فرمایا اور وہ مستلزم ہے علم کو
پس ان دونوں جزوں سے علم وعمل کی ضرورت ظاہر ہوگئی اور اس مضمون کے اختیار کی
یہ وجہ ہے کہ اسکی ضرورت گو عام ہے مگر اس مقام پر اور زیادہ ہے یعنی یوں تو ہر جگہ آجکل علم
عمل کی کمی ہے اور یہ مقام بھی اسی عموم میں داخل ہے لیکن یہاں کچھ زیادہ کمی ہے کیونکہ مجھے
یہاں کی حالت اچھی طرح معلوم ہے جس محلہ میں اسوقت بیان ہو رہا ہے میں سالہا سال یہاں
رہ چکا ہوں دوسرے اب بھی میں کچھ زیادہ دور نہیں رہتا ہوں حالات سے اب بھی اطلاع ہوتی
رہتی ہے جنکا حاصل یہی ہے کہ دینی لحاظ سے اس محلہ کی حالت نہایت خراب ہے علم کی طرف
یہاں کے باشندوں کو بہت ہی کم توجہ ہے اسی وجہ سے اعمال میں بھی بہت کوتاہی ہے حالانکہ
اس محلہ میں زیادہ تر وہ لوگ رہتے ہیں جو مدعی شرافت ہیں اور وہ واقعی نسباً شریف ہیں
بھی اور شرافت نسب فی نفسہ صفت بھی عمدہ ہے مگر شرافت نسب پر قناعت کر لینا اور اس پر
فخر کرنا اور اصل شرف کو چھوڑ دینا یہ نہایت غلطی ہے اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ اصل شرف
کیا چیز ہے اور شرافت نسب کی حقیقت کیا ہے۔ حق تعالےٰ نے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ

عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ میں تو اصل شرف کو تبلایا ہے کہ اصلی شرف جس سے انسان خدا تعالیٰ
کے یہاں مکرم و معزز شمار ہوتا ہے تقویٰ اور پرہیزگاری ہے اور اس سے پہلے جزو میں شرف
نسب کی حقیقت بتلائی ہے یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ
شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اے لوگو! ہم نے (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم و حوا)
سے پیدا کیا ہے (پس اس میں تو سب برابر ہیں، اور جس بات میں فرق رکھا ہے کہ) تم کو مختلف
قومیں اور (پھر ان قوموں میں) مختلف خاندان بنائے (سو محض اسلئے) تاکہ ایک دوسرے کو
شناخت کرسکو جس میں یہ شناخت بھی داخل ہے کہ کون ہمارا عصبہ ہے اور کون ذوالارحام
ہے اور کون ہم سے دور ہے تاکہ بقدر قرب و بعد نسب کے ان کے حقوق شرعیہ ادا کئے جائیں اور
میراث میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جائے اور اسکے سوا اور بھی مصلحتیں ہیں نہ اسلئے کہ ایک دوسرے
پر تفاخر کرو ۱۲) یہاں حق تعالیٰ نے مختلف خاندانوں اور قوموں کے بنانے میں یہ حکمت تبلائی ہے
کہ اس سے تعارف اور شناخت ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قریشی
ہے یہ انصاری ہے یہ صدیقی ہے یہ فاروقی ہے اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو امتیاز سخت دشوار ہوتا
کیونکہ ناموں میں اکثر توارد ہو جاتا ہے ایک ہی نام کے بہت سے آدمی ہوتے ہیں تو کسی قدر امتیاز
تو جائے سکونت سے ہو جاتا ہے کہ یہ دہلوی ہے ایک لکھنوی ہے پھر ایک شہر میں بھی ایک نام
کے بہت سے ہوتے ہیں تو محلوں کے نام سے امتیاز ہو جاتا ہے کہ ایک محلہ کا رہنے
والا ہے اور ایک محلہ خیل کا پھر وہاں بھی ایک نام کے دو تین ہوتے ہیں تو قبائل کی
طرف نسبت سے امتیاز ہو جاتا ہے یہ حکمت ہے اختلاف قبائل کی مگر آجکل ہمارے
بھائیوں نے اسی کو مدار فخر بنا لیا ہے اب یہاں دو قسم کے لوگ ہو گئے بعض نے تو نسب
شرف کی جڑ ہی اکھاڑ دی انکو اس سے شبہ ہوا کہ اس آیت میں اختلاف قبائل کی حکمت
صرف تعارف بتلائی گئی ہے اور حکمتوں سے سکوت کیا گیا ہے تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس
اس میں اور کچھ حکمت نہیں ہے لان السکوت فی موضع البیان بیان اس پر نظر کرکے بعض نے تو
شرافت نسب کا انکار ہی کر دیا کہ اس سے شرف کچھ نہیں ہوتا بلکہ جس طرح دہلوی لکھنوی ہندوستانی بنگالی یہ
سب نسبتیں تعارف کیلئے ہیں اور ان سے کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اسی طرح قریشی انصاری سید

۳۲۴

اور فاروقی عثمانی وغیرہ بہ نسبتیں بھی شناخت کے لئے ہیں ان سے بھی کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس شرف عربی سے محروم ہیں ان میں سے بعض نے تو اپنے کو شریف ثابت کرنا چاہا ہے چنانچہ ایک قوم نے اپنا عرب ہونا ثابت کیا ہے اور کہا کہ ہماری اصل راعی ہے چونکہ یہ لوگ جانور پالتے ہیں اسلئے ان کو راعی کہا گیا پھر غلط عوام سے لفظی تغیر ہو گیا اسی طرح بعضوں نے اپنے کو حضرت خالد بن ولید کی اولاد میں داخل کرنیکی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ عرب بننا چاہتے ہیں مگر اس ترکیب میں تکلف تھا کیونکہ تاریخ سے قیاس کا کچھ ثبوت ملتا نہیں محض قیاسات بعیدہ سے کام لینا پڑتا ہے جس سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات بنائی ہوئی ہے اسلئے بعض نے اپنے نقص کو یوں دور کرنا چاہا کہ اہل شرف ہی سے اس شرف کی نفی کر دی کہ شرافت نسب کوئی چیز نہیں اور اس کے متعلق ان کے کچھ لطیفے بھی ہیں جنکے بیان کر دینے کا مضائقہ نہیں چنانچہ ایک شخص سے جو چھوٹی قوم کا تھا کسی نے پوچھا کہ تم کس کی اولاد میں ہو کہا میں آدم علیہ السلام کے بھائی کی اولاد میں ہوں لوگوں نے کہا کہ میاں کیا آدم علیہ السلام کے کوئی بھائی بھی تھا کہنے لگا کیا ان کے کوئی نہیں تھا لوگوں نے کہا ہر گز نہیں کہا کیا پھر سب لوگ آدم علیہ السلام ہی کی اولاد میں ہیں کہا ہاں کہنے لگا پھر تم مجھے کیوں پوچھتے ہو کہ تو کس کی اولاد میں ہے جسکی اولاد میں تم ہو اسی کی اولاد میں سے میں بھی ہوں لوگ اس پر چپ ہو گئے اسی طرح ایک بھنگی کی حکایت ہے کہ وہ کہیں ندی میں ڈوبنے لگا اول تو یوں چلایا کہ ارے اللہ کے واسطے مجھے بچا ؤ جب اس کہنے پر کوئی نہ آیا تو اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ ارے دوڑو جلدی آؤ نبی زادہ ڈوبا جاتا ہے یہ سنکر لوگ دوڑے اور جلدی سے آکر اسے بچایا اب جو نکال کر دیکھا تو بھنگی اس سے پوچھا کہ نالائق تو نبی زادہ کدھر سے ہوا کہنے لگا کہ میں بھی آدم علیہ السلام کی اولاد میں ہوں اور وہ نبی تھے تو میں نبی زادہ ہوا غرض اس قسم کے لطیفے ان قوموں کے بہت ہیں وہ مختلف ترکیبوں سے اپنے کو اہل شرف کی برابر کرنا چاہتے ہیں بعض نے اس نفی میں حضرت علی کے اس قول سے استدلال کیا ہے ؎

النَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَاءٌ ۔۔۔ اَبُوْهُمْ آدَمُ وَالْاُمُّ حَوَّاءُ
مَا الْفَخْرُ اِلَّا لِاَهْلِ الْعِلْمِ اِنَّهُمْ ۔۔۔ عَلَى الْهُدٰى لِمَنِ اسْتَهْدٰى اَدِلَّاءُ

۳۲۵

ترجمہ۔ آدمی صورت کے اعتبار سے سب برابر ہیں کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام اور ماں حوا علیہا السلام ہیں۔ بس اہل علم کے سوا کسی کیلئے فخر نہیں ہے کیونکہ وہی ہدایت پر بھی ہیں اور طالب ہدایت کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں اس سے بعض وہ حضرات جو نسبی شرف نہیں رکھتے اور علم حاصل کر چکے ہیں اسپر استدلال کرتے ہیں کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں بس شرف اگر ہے تو علم سے ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ حضرت علی کا قول ہے یا نہیں پھر جس کا بھی قول ہو مطلب نفی فخر ہے کہ نسب پر فخر نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ امر غیر اختیاری ہے اور فخر عقلاً ان چیزوں پر ہو سکتا ہے جو اختیاری ہوں اور وہ علم و عمل ہے گو شرعاً اس پر بھی فخر کرنا نہ چاہیئے باقی یہ مطلب نہیں کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں دیکھو آدمی کا حسین یا بدصورت ہونا یا اندھا اور سوانکھا ہونا اگرچہ امر غیر اختیاری ہے اور اسپر فخر نہ کرنا چاہیئے مگر کیا کوئی کہسکتا ہے کہ حسن صورت اور سوانکھا ہونا نعمت بھی نہیں یقیناً اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے اسی طرح یہاں سمجھو کہ گو شرف نسب بوجہ امر غیر اختیاری ہونیکے سبب فخر نہیں مگر اس کے نعمت ہونے میں شبہ نہیں اور بعض لوگوں نے حکایات سے استدلال کیا ہے کہ مثلاً ایک بزرگ مر گئے تھے وہ وہ چھوٹی قوم سے تھے کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو علم و عمل کی وجہ سے وہ بعض اہل شرف سے بھی اعلیٰ درجہ میں تھے یا کسی زمانہ میں کوئی زندہ بزرگ اپنے معاصرین میں بڑے مقتدا اور شیخ مانے جاتے تھے حالانکہ وہ چھوٹی قوم کے تھے مگر حکایات سے اثبات مدعا نہیں ہوسکتا حکایات تو توضیح کیلئے ہوتی ہیں اول اثبات مدعی دلیل سے ہونا چاہیئے پھر حکایات سے اس کی توضیح ہونی چاہیئے اور یہاں دلیل سے شرف نسب کی نفی ثابت نہیں ہوتی اس لئے محض حکایات سے استدلال کرنا لغو ہے ہاں بعض نے اس نص قرآنی لتعارفوا سے استدلال کیا ہے کہ بس نسب کا فائدہ محض تعارف ہے اس سے کوئی شرف حاصل نہیں ہوتا مگر اس شخص کو قرآن کی ایک آیت کے ساتھ دوسری آیتوں کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ حق تعالیٰ ایک جگہ یہ بھی فرماتے ہیں وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ اس سے معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے بعد سے ان کی ذریت میں نبوت اور کتاب منحصر کی گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور نبوت

۳۲۶

لہ المترجم: نوح اور ابراہیم کو رسول بنایا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب کو جاری کیا پارہ ۲۷ ر ۲۰۶

وکتاب کا حصر بلا واسطہ ابراہیم علیہ السلام کے بعد سے ان کی اولاد میں ہوا ہے ان کے واسطے نوح علیہ السلام کی ذریت میں ہوا ہے تو اولاد ابراہیم کو باقی خاندانوں پر یہ خاص شرف حاصل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے قیامت تک نبوت اور کتاب اسی خاندان میں منحصر ہو گئی اور اس میں ہزاروں انبیاء پیدا ہوئے نیز اس کی ساتھ (۲) احادیث کو بھی ملانا چاہیے کیونکہ احادیث بھی اسی زبان سے نکلی ہیں جس سے قرآن ادا ہوا ہے اور اسی قلب پر نازل ہوئی ہیں جس پر قرآن نازل ہوا ہے وہ بھی وحی میں داخل ہیں گو متلو نہ ہوں تو احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی فضیلت بیان فرمائی ہے انصار کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ایک حدیث میں ہے اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا کہ جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں اسی طرح

۳۲۷

آدمیوں کی بھی مختلف کانیں ہیں جنہیں بعض سونے کے مشابہ ہیں بعض چاندی کے بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں پھر آپ فرماتے ہیں کہ جو خاندان جاہلیت میں اچھے شمار ہوتے تھے وہی اسلام کے بعد بھی اچھے ہیں جب کہ علم حاصل کر لیں بعض نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں قید اِذَا فَقِهُوْا اہل انساب کو مضر ہے کہ اس میں مدار فضل فقہ کو قرار فرمایا مگر کچھ بھی مضر نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقہ کے بعد خیار فی الجاہلیۃ کو خیار فی الاسلام فرما رہے ہیں تو فقہ کے بعد مساوات نہ رہی بلکہ حاصل یہ ہوا کہ فقیہ غیر صاحب نسب فقیہ صاحب نسب کے برابر نہیں بلکہ فقیہ صاحب نسب افضل ہوگا تو کوئی بات ہے جس سے وہ ممتاز ہوئے ہاں یہ ضرور ہے کہ صاحب نسب جاہل سے غیر صاحب نسب عالم افضل ہے اس کا ہمکو انکار نہیں مگر حدیث سے اتنی بات معلوم ہو گئی کہ شرف نسب بھی کوئی چیز ضرور ہے جس کی ساتھ علم و فقہ مل جائے تو صاحب نسب غیر صاحب نسب سے بہتر ہوگا نیز حدیث میں ہے اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ کوئی تو وجہ ہے کہ حضور نے امامت کو قریش کیساتھ مخصوص فرمایا معلوم ہوا کہ اہل انساب میں شان متبوعیت دوسروں سے زیادہ ہے نیز ایک حدیث میں بطور رجز کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ثابت ہے اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ ۔ اَنَا ابْنُ عَبْدُ الْمُطَّلِبْ ۔ جب جنگ حنین میں حضرات صحابہ کے پیر اکھڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹنے لگے تو آپ نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ میں نبی ہوں یہ جھوٹ بات نہیں

(اسلئے میرا غلبہ یقینی ہے) اور میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں یعنی میں خاندانی اور صاحب نسب ہوں میں ہرگز پسپا نہ ہونگا تو اسمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحب نسب ہونے پر فخر کیا ہے اور دشمن کو ڈرایا ہے کہ تو اپنے مقابل کو کم نہ سمجھنا وہ بڑا خاندانی ہے جس کی بہادری سب کو معلوم ہے اگر شرف نسب کوئی چیز نہیں تو آپنے اَنَا ابْنُ عَبْدُ الْمُطَّلِبْ کیوں فرمایا نیز ایک حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی مِنْ وُلْدِ اِبْرَاهِيْمَ اِسْمٰعِيْلَ وَاصْطَفٰی مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ بَنِيْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰی قُرَيْشًا مِنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰی مِنْ قُرَيْشٍ بَنِيْ هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِيْ مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ رواہ مسلم والترمذی یعنی حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسمٰعیل علیہ السلام کو انتخاب فرمایا (اس سے عرب کی فضیلت عجم پر ثابت ہوئی کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام ابوالعرب ہیں اور ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے اختار اللہ العرب من بین الانام ۱۲) اور اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ میں سے قریش کو منتخب کیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھکو منتخب کیا اور ایک حدیث کے یہ الفاظ ہیں اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ (ای الانس) ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَيْنِ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ فِرْقَةً (ای العرب) ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ قَبِيْلَةً (ای قریش) ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُيُوْتًا فَجَعَلَنِيْ فِيْ خَيْرِهِمْ بَيْتًا (ای بنی هاشم) فَاَنَا خَيْرُهُمْ نَفْسًا وَخَيْرُهُمْ بَيْتًا رواہ الترمذی اس نص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسب مطلق کرم سے خالی نہیں گو اکرم ہونے کو مستلزم نہ ہو کیونکہ اکرمیتہ کا مدار تو تقویٰ ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ تا اس کرم بالنسب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے کرم کو نسب ہی میں منحصر کردیا جائے جیسا کہ اہل قصبات کی عادت ہے یہ دوسری جماعت ہے جس نے نسب کے بارہ میں افراط و غلو کیا ہے جیسا کہ پہلی جماعت نے تفریط کی تھی اہل قصبات نے فخر بالانساب ہی پر قناعت کرلی ہے اصل میں یہ اہل عرب کی عادات تھیں ان کو اپنے انساب پر بڑا فخر تھا چنانچہ ان کے اشعار اس سے بھرے پڑے ہیں یہی اثر ہندوستان کے ان قبائل میں اب تک موجود ہے جو نسل عرب سے یہاں آ رہے اور قصبات میں تو یہ غضب ہے کہ عورتوں کے گھونٹ کی وجہ سے

بھی خاندانوں پر عیب لگا دیتے ہیں نہ اسکی ماں ایسی ہے اسکی دادی ایسی ہے نانی ایسی ہے اس صفت میں یہ اہل عرب سے بھی بڑھ گئے کیونکہ اہل عرب نسب میں عورتوں کی وجہ سے نقص نہیں نکالتے (یہ اور بات ہے کہ نجیب الطرفین کو اکمل سمجھتے ہیں مگر جس کی ماں کم ذات ہو اور نسب باپ شریف ہو اسکو بھی کامل النسب شمار کرتے ہیں ناقص نہیں سمجھتے ۱۲) مگر خدا تعالیٰ نے ماں کا نسب میں اعتبار کرنے کی ایسی جڑ اکھاڑی ہے کہ ان کو سر اٹھانے کا موقعہ نہیں ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بیبیاں تھیں ایک حضرت سارہ وہ تو ان کی خاندان کی تھیں دوسرے حضرت ہاجرہ جنکی اولاد میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں جو ابو العرب ہیں وہ کنیز تھیں تو جو عورت ساری عرب کی جڑ اصل ہے وہ کنیز ہیں اب جو قبائل عرب ہندوستان میں عورتوں کے کھوٹ کی وجہ سے دوسرے خاندانوں میں عیب نکالتے ہیں وہ اس دھبہ کو دھوئیں کس طرح دھوتے ہیں مگر در حقیقت یہ کوئی عیب ہی نہیں اسی لئے شریعت نے نسب میں ماں کا اعتبار نہیں کیا البتہ اولاد فاطمہ میں ماں کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ سیادت کا مدار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ہے اور سیدوں کا شرف دوسرے قبائل پر انہی کی وجہ سے ہے اور یہاں سے بعض علویوں کی غلطی واضح ہوگئی کہ وہ بھی اپنے کو سید کہتے ہیں حالانکہ سیادت کی بناء حضرت علی پر نہیں ہے بلکہ حضرت فاطمہ پر ہے پس حضرت علی کی جو اولاد حضرت فاطمہ سے ہے وہ تو سید ہے اور جو دوسری بی بی سے ہے وہ سید نہیں ہے اب ایک سوال یہاں ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر ایک شخص کا باپ سید نہ ہو اور ماں سید ہو تو وہ سید ہے یا نہیں تو قواعد کے موافق یہ شخص سید نہیں ہے ہاں ماں کی سیادت کی وجہ سے ایک گونہ شرف اسکو ضرور حاصل ہے مگر یہ اپنے کو سید نہیں کہہ سکتا اور اسکے لئے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہے اگر صاحب نصاب نہ ہو بہر حال ماں کا نسب میں اعتبار نہیں البتہ حریت و رق میں اولاد شرعاً ماں کی تابع ہوتی ہے اور اس سے ایک اشکال کا بھی جواب ہوگیا وہ یہ کہ بعض احادیث میں وارد ہے

(مَنْ عَمِلَ كَذَا فَلَهُ اَجْرُ مَنْ اَعْتَقَ اَرْبَعَةً مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ)

حالانکہ حنفیہ کا قول یہ ہے کہ عرب کا استرقاق جائز نہیں اس صورت میں ولد اسمٰعیل کا اعتاق ہی متصور نہ ہوگا تو پھر حدیث میں اعتاق ولد اسمٰعیل کا کیا مطلب ہے بعض نے

تو یہ کہا ہے کہ یہ بطور فرض کے ہے کہ اگر اہل عرب کا استرقاق جائز ہوتا تو ان کا اعتاق سب کے افضل ہوتا اس کا ثواب اس عمل سے ملے گا مگر جواب صحیح اور بے تکلف اس قاعدہ مذکورہ سے حاصل ہوگیا وہ یہ کہ کسی عربی نے عجمیہ رقیقہ سے نکاح کیا تو اولاد نسب میں تو باپ کے تابع ہوگی ولد اسمٰعیل ہوگی اور رق میں ماں کے تابع ہوکر محل اعتاق ہوسکے گی یہ بیچ میں استطراداً کلام تھا اصل مقصود یہ تھا کہ نسب کا شرف شرعاً بھی معتبر ہے اور ایک بہت بڑی دولت و نعمت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسمیں غلو کیا جائے جیسا کہ قصبات میں رواج ہے افسوس یہ لوگ ہڈی بوٹی کو لیکر بیٹھ گئے اور اس سے بڑھکر شرف تھا اس کو چھوڑ بیٹھے اور وہ اصل شرف علم و عمل ہے افسوس شرفاء کو اس کا بالکل خیال نہیں علم دین کی طرف ان کو مطلق توجہ نہیں اور اس محلہ میں تو خصوصاً اس سے بہت ہی غفلت ہے بچے ہیں کہ آوارہ پھرتے ہیں اور رہے ہیں کہ وہ بھی دین سے ناواقف ہیں کسی نے بہت کیا انگریزی پڑھ لی مگر انگریزی کوئی علم نہیں ہے اسکو دین سے کیا تعلق بلکہ اسکو پڑھکر تو اکثر دین سے بے تعلقی ہو جاتی ہے ۳۳۰ اسلئے شرفاء کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو علم دین پڑھانیکا ضرور اہتمام کریں اور میں انگریزی سے منع نہیں کرتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ اس سے پہلے علم دین پڑھانا چاہیئے چاہے اردو رسائل ہی میں ہو اور بڑوں کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیئے شاید وہ اسپر یہ کہیں گے کہ بڈھے طوطے اب کیا پڑھیں گے مگر میں کہتا ہوں کہ بڈھے طوطے اگر پڑھ نہیں سکتے مگر دوسروں سے تو سن سکتے ہیں میں آپ سے پڑھنے کو نہیں کہتا بلکہ آپ کسی پڑھے لکھے آدمی سے مسائل کی کتاب سن لیا کریں طوطے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ہمارے گھر میں ایک طوطا ہے وہ کسی بات پر نہیں بولتا اس کو لاکھ پڑھاؤ مگر کچھ نہیں کہتا لیکن جہاں کوئی لڑکی کتاب پڑھنے بیٹھی تو وہ طوطا بھی ساتھ میں ٹرٹر لگاتا ہے اور اتنا بولتا ہے کہ پڑھنا دشوار کر دیتا ہے تو دیکھئے وہ طوطا بھی کتاب سنکر پڑھنے کی حرص کرتا ہے جب علم کا حیوان پر یہ اثر ہے تو انسان پر کیوں اثر نہ ہو گا صاحبو! پڑھنا پڑھانا اور عالم ہونا درس ہی پر موقوف نہیں حضرات سلف تو سن سن کر ہی عالم ہوگئے تھے یہ درس و تدریس کا طریقہ تو ان کے بعد ہی کے زمانہ سے شروع ہوا ہے ورنہ پہلے تو محض دو چار عالم کتاب ہوتے تھے اور ان کی صحبت میں رہکر مسئلے

مسائل سنکر بہت سے بدون پڑھے ہی عالم بنجاتے تھے اور حضرات صحابہ و تابعین تو محض
سننے ہی سے عالم ہوئے ہیں وہاں کتاب کھول کر پڑھنے کا رواج ہی نتھا بس صحابہ تو حضور
کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور حضور کی باتیں سن سن کر سب عالم ہو جاتے تھے پھر حضرات
صحابہ کی باتیں سن سن کر تابعین عالم ہو گئے اور ہمارے حضور تو اس پر فخر فرماتے ہیں کہ ہمارے
یہاں لکھنا پڑھنا نہیں ہے چنانچہ ارشاد ہے نحن امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب
چنانچہ حضرات صحابہ میں کاتبان وحی معدودے چند تھے ورنہ اکثر صحابہ لکھنا بھی نہیں جانتے
حساب بھی زیادہ نہ آتا تھا مگر وہ ایسے امی تھے کہ بڑے بڑے ارسطو اور افلاطون ان کے
علوم کو سنکر منہ تکتے تھے حضرات صحابہؓ نے ہرقل اور مقوقش کے دربار میں جو حکیمانہ کلام کیا
ہے اسکو سنکر سلاطین بھی حیرت میں رہ جاتے تھے کہ ان پڑھ لوگوں کے یہ علوم ہیں یہ محض
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا اثر تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی ؂

نگارمن کہ بمکتب نرفت و درس نکرد بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

اسلئے نہ پڑھ سکنے کا عذر تو فضول ہے آپ سن سن کر ہی علم حاصل کر لیجئے اور اگر آج بڈھوں کو
گورنمنٹ کی طرف سے قانون یاد کرنے کا حکم ہو جائے تو اسوقت یہ بوڑھے طوطے سب جوانوں کی
طرح قانون یاد کرنے لگیں گے یہ بہانہ محض دین کے کاموں میں ہے دنیا کے کاموں میں بوڑھے
بھی جوان ہو جاتے ہیں غرض علم ہر طرح سے بھی ہو حاصل کرنا ضروری ہے بدون علم کے ایسی
ایسی غلطیاں ہوتی ہیں کہ بعض لوگ عمر بھر نماز غلط ہی پڑھتے رہتے ہیں چنانچہ ایک قریب کے قصبہ
کے ایک بوڑھے میاں جو مہذب اور لکھے پڑھے ہیں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کسی نے
مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ جس طرح فرضوں میں دو رکعتیں بھری ہوتی ہیں اور دو خالی کیا سنتوں میں
بھی یہی حکم ہے میں نے کہا نہیں بلکہ سنتوں میں سب رکعتیں بھری ہوتی ہیں تو وہ بڑے میاں
یہ سنکر بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم تو اب تک سنتیں بھی دو بھری اور دو خالی
پڑھتے تھے یہ تو آج ہی معلوم ہوا کہ سنتوں میں کوئی رکعت خالی نہیں ہوتی۔ اب تبلایئے
کہ بڑے میاں کے پیر تو قبر میں لٹکے ہوئے ہیں اور ابتک نماز کا طریقہ معلوم نہیں یہ ساری خرابی
علم نہ ہونے کی ہے اسی طرح بعض صورتوں میں کسی غلطی سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور کسی غلطی سے

سجدہ سہو واجب ہوتا ہے مگر بدون علم کے لوگ معلوم کیا کیا گڑبڑ کرتے ہیں بس بات یہ ہے کہ لوگوں کی نظر میں احکام الٰہیہ کی وقعت نہیں رہی اسلئے کچھ فکر نہیں کہ نماز درست ہوتی ہے یا فاسد اور اگر درست بھی ہوتی ہو تو اس بے علمی کے سبب بہت لوگوں کو جماعت کا اہتمام نہیں وقت کا خیال نہیں بعضے بہت تنگ وقت میں نماز پڑھتے ہیں افسوس اگر عدالت میں ایک چپراسی آواز دے کہ فلانا حاضر ہے تو اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ پکارنے کے بعد حاضری میں دو منٹ کی بھی دیر نہ ہو گھنٹہ بھر پہلے سے تیار بیٹھے رہتے ہیں اور یہاں پانچ وقت منادی پکارتا ہے اور کان پر جوں تک نہیں رینگتی بلکہ اذان کے بعد اقامت بھی ہونے لگے اور امام کی آواز اور سورت کا شروع ہو جانا بھی سنلیں جب بھی کچھ اثر نہیں ہوتا حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃُ سنکر تو کیا اثر ہوتا افسوس ہم پر حَیَّ عَلَی الْفَلَاح سنکر بھی اثر نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ کی (بھی) کیا عنایت ہے کہ وہ ہماری حالت سے خوب واقف ہیں جانتے ہیں کہ یہ ایسے بھدّے اور نا قدرے ہیں کہ محض علی الصلوۃ کہنے سے نماز کو نہ آئیں گے اسلئے جس طرح بچوں کو مٹھائی وغیرہ سے بھی [illegible] اور بہلایا کرتے ہیں اسی طرح حق تعالیٰ نے ہمکو لبھانیکے لئے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ کے ساتھ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح بھی اذان میں بڑھا دیا کہ نماز میں فلاح کا بھی ہے اسی کے لئے آجاؤ کیونکہ اس جگہ فلاح مطلق ہے جس میں فلاح دنیوی و اخروی دونوں داخل ہیں اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ ہم تو روز نماز پڑھتے ہیں مگر ہمیں تو کچھ بھی نہیں ملتا چنانچہ ایک تھانہ دار نے اپنی بیوی سے کہا تھا [illegible] نماز پڑھتی ہے تجھے کیا ملتا ہے تو بات یہ ہے کہ آجکل روپیہ ملنے کا نام ملنا ہے اگر نماز پڑھکر روپے مل جایا کرتے تب انکے نزدیک یوں کہنا صحیح ہوتا کہ کچھ ملا ہے جیسے ایک پیشکار اشراق تک وظیفہ پڑھا کرتے تھے انہوں نے کسی پیر سے وظیفہ پوچھ رکھا تھا صبح کی نماز کے بعد سے اشراق تک وہ پڑھا جاتا تھا اور یہی وقت رشوت کے معاملات طے کرنیکا تھا اہل معاملہ آتے اور اشاروں سے رشوت طے ہوتی کیونکہ وظیفہ میں بولنے کو منع سمجھتے تھے بس صاحب معاملہ نے ایک انگلی اٹھا دی کہ ایک سو لیلو اور انہوں نے سر ہلا کر دو انگلیاں اٹھا دیں کہ دو سو لونگا پھر اشاروں ہی سے بات طے ہو گئی رقم حاضر ہو گئی اور پیشکار صاحب نے مصلے کا کونہ اٹھا دیا اس نے رقم رکھدی یہ پھر وظیفہ میں مشغول ہو گئے اب دوسرا

۳۳۴

آتا اس سے بھی اسی طرح اشاروں میں بات چیت ہوتی اور جب کسی رقم پر صلح ہو جاتی یہ جائے نماز کا کونہ اٹھا دیتے وہ رقم رکھ دیتا غرض یہ بزرگ جب اشراق کی نماز سے فارغ ہوتے تو گھر میں دو چار سو روپے لیکر جاتے تھے تو ملا آجکل اس کو کہتے ہیں اور اگر کوئی یہ کہے کہ تمکو جنت ملے گی یا خدا راضی ہوگا تو اسکو کچھ مزا ہی نہیں سمجھتے چنانچہ سودلے اپنی بیوی سے پوچھا تھا کہ تو تہجد کیوں پڑھا کرتی ہے کہا ہم جنت میں جائینگے تو وہ مسخرہ کہتا ہے کہ جا پاگل تو وہاں بھی ملانوں طالبعلموں ہی کے ساتھ رہے گی دکیونکہ جنت والے اکثر غربا ہی ہونگے) اور دیکھ ہم جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے سلاطین اور امراء ورؤسا فرعون نمرود شداد قارون اور ابوجہل جیسے ہوں گے تو آجکل فلاح روپے ملنے کو کہتے ہیں اگر کسی نیک کام میں روپیہ ملتا ہو تو اسکو ہر شخص بڑے شوق سے کرتا ہے اور جسمیں یہ نہ ہو اس کی کچھ وقعت نہیں ایک جاہل نے کسی واعظ کو وعظ میں کہتے سنا کہ اللہ کی راہ میں جو ایک روپیہ دے تو اسے دس تو ضرور ملتے ہیں اور بعض کو زیادہ بھی ملتے ہیں سات سو تک۔ اس شخص نے سوچا کہ میں غریب آدمی ہوں مجھے کسی حیلہ کی ضرورت تھی سب سے اچھی تجارت شروع کریں اس سے اچھی تجارت کیا ہوگی اس کے پاس ایک روپیہ تھا اس نے وہی خیرات کر دیا اب دس کے منتظر بیٹھے ہیں جب کئی روز تک دس نہ آئے تو میاں کو دست آنے لگے کہ افسوس میں نے اپنا روپیہ بھی کھویا کیونکہ اس نے ثواب کیلئے تھوڑا ہی دیا تھا محض تجارت کیلئے دیا تھا اتفاق سے ایک دن یہ کسی کھیت میں قضا حاجت کیلئے جو بیٹھا اور استنجا کیلئے ڈھیلا اٹھانے لگا ایک ڈھیلے کے نیچے ایک بٹوہ پڑا ملا جس میں پورے دس روپے تھے بڑا خوش ہوا کہ مولوی نے سچ کہا تھا دوڑا ہوا مولوی صاحب کے پاس آیا اور کہا آپ نے جو وعظ میں کہا تھا کہ اللہ کیلئے ایک دینے سے دس ملتے ہیں یہ بالکل درست ہے مگر مروڑے بڑے غضب کے ہیں آپنے اسکو چھپا رکھا اب سے اس مضمون کیسا تھا اتنا اور کہدیا کرو کہ دس ملنے سے پہلے دست بھی آتے ہیں اور مروڑے بھی لگتے ہیں پھر جس کی ہمت ہوگی وہ دے گا ورنہ نہیں دیگا اسی طرح ایک اور احمق کی حکایت ہے اس نے کسی مولوی صاحب سے توکل کا وعظ سنا تھا کہ جتنا جسکے مقدر میں ہے وہ ضرور ملکر رہتا ہے بس آپ نے یہ سنکر سب کام چھوڑ دیئے اور جنگل میں جا کر بیٹھ رہے مگر بیٹھا ایسی جگہ کنویں کے پاس جہاں راستہ

۳۳۳

چلنے والے ٹھہرتے تھے اب لوگ آتے اور کنویں پر ٹھہر کر سڑک کی طرف مونہ کر کے جس میں اس طرف پشت ہوتی تھی کھانا کھا کر چلدیتے ایک دن گذرا دوسرا دن گذرا پھر ایک مسافر ایسا آیا اس نے بھی اس کی طرف پیٹھ کر کے کھانا کھایا اور چلنے کو ہوا اتو یہ بالکل مایوس ہو گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ مولوی صاحب نے کیسا غلط مضمون بیان کیا تیسرا دن بھی گذر گیا اور اس کا بھوک سے برا حال ہو گیا آخر آپ نے کھنکارنا شروع کیا اور وہ مسافر نے مڑ کر دیکھا تو ایک آدمی نظر آیا جس کا بھوک سے برا حال ہے اسکو رحم آیا اور جو کچھ بچا ہوا کھانا تھا وہ دیدیا۔ کھانا کھا کر کچھ جان آئی تو آپ بھی مولوی صاحب کے پاس دوڑے ہوئے آئے کہ مولوی جی توکل کا مضمون تو درست ہے مگر کھنکارنے کی بھی ضرورت ہے تمہارے بیان میں اتنی کسر تھی آئندہ اسکو بھی ظاہر کر دیا کرو۔ اگر میں نہ کھنکارتا تو جان سے ہی گیا ہوتا غرض بعض لوگ مال ملنے ہی کو فلاح سمجھتے ہیں اور نماز پڑھکر چونکہ فوراً مصلے کے نیچے سے روپئے نہیں نکلتے اسلئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز میں کیا فلاح ہے مگر میں کہتا ہوں کہ کیا مال خود مقصود بالذات ہے بھلا اگر ایک شخص کے پاس ہزار روپئے کے نوٹ ہوں یا نقدی ہو اور وہ ایسی جگہ پہونچ جائے جہاں کوسوں تک نہ کھانا ہے نہ پانی ہے اور اس وقت اسکو بھوک پیاس لگی تو بتلایئے یہ ہزار روپے اسکے کس کام کے اب اگر وہ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دیدی تو کیا آپ اسکو مفلح اور کامیاب کہیں گے ہرگز نہیں معلوم ہوا کہ مال خود فلاح نہیں اب شاید آپ یہ کہیں کہ کھانا پینا تو فلاح ہے ہم اس کے طالب ہیں سو یہ بھی غلط ہے کھانا پینا بھی مقصود بالذات نہیں کیونکہ بعض دفعہ کھانا کھا کر ہیضہ ہو جاتا ہے اس وقت بھی کھانا سبب ہلاکت ہو جاتا ہے معلوم ہوا کہ مقصود اور کچھ ہے وہ کیا ہے چین و آرام جب یہ سمجھ میں آگیا کہ فلاح کی حقیقت راحت ہے تو اب دعوے ہے کہا جاتا ہے کہ نماز سے یہ فلاح ضرور حاصل ہوتی ہے نماز سے قلب کو وہ راحت ملتی ہے جو ہزار کھانوں سے بھی نہیں مل سکتی مگر جیسے بعض دواؤں کا نفع ایک خاص میعاد پر ہوا کرتا ہے چنانچہ اطباء کہا کرتے ہیں کہ اس دوا کو تین دن یا تین ماہ استعمال کر کے پھر آنا اس مدت سے پہلے نفع ظاہر نہ ہوگا اگر چھ ماہ کا اندھا کسی قیمتی سرمہ کو دو تین دن لگا کر سوانکھا ہونا چاہئے۔

تو وہ بیوقوف ہے اسے چاہیئے کہ کم از کم مثلاً تین ماہ تو استعمال کرکے دیکھے اسی طرح نماز کی راحت کا احساس ایک خاص میعاد کے بعد ہوتا ہے جو ہر شخص کے لئے اس کے مناسب ہوتی ہے پس یہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ چار دن نماز پڑھکر مراقبہ کرنے بیٹھ گئے کہ دیکھوں راحت قلب حاصل ہوئی یا نہیں صاحب کسی جاننے والے طبیب روحانی سے پوچھکر نماز کو قاعدہ سے شروع کردو اور کچھ عرصہ تک ادا کرتے رہو پھر دیکھو کیا حال ہوتا ہے انشاء اللہ جلد ہی روز میں یہ حالت مشاہد ہوگی جسکو حضور فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے جو شخص نماز کا عادی ہے وہ جانتا ہے کہ نماز پڑھکر کیا راحت ہوتی ہے مشہور ہے کہ عشا کی نماز پڑھکر آدمی سلطان اللیل (رات کا بادشاہ) ہوجاتا ہے واقعی سلاطین کو کیا راحت نصیب ہوگی جو نمازی کو عشا کی نماز پڑھکر حاصل ہوتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کا ادراک ضد کو دیکھکر کامل ہوتا ہے تو نماز کی راحت کا احساس بھی اس طرح ہوگا کہ کبھی ریل میں نماز پڑھنا دشوار ہوا ہو تو یاد کیجئے اسوقت کیسی پریشانی ہوئی ہوگی اور خدا خدا کرکے کسی اسٹیشن پر آدمیوں کے اترنے سے جگہ ملی ہوگی تو نماز پڑھکر کیسا چین ملا تھا مگر یہ بات ایک زمانہ تک نماز کی عادت ہونے سے نیز اہل اللہ کے پاس بیٹھنے سے حاصل ہوتی ہے اہل اللہ کے پاس بیٹھنے سے نسبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے دلکو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک لگاؤ ہوجاتا ہے مگر یہ نسبت ذوقی چیز ہے اور اسکے حصول کیلئے بھی ایک میعاد ہے اسکی حقیقت قول سے نہیں معلوم ہوسکتی محض ذوق سے معلوم ہوتی ہے ظاہر میں بھی تو ایسی بہت چیزیں ہیں جو بدون ذوق کے معلوم نہیں ہوسکتیں۔ دیکھئے لوگ کہتے ہیں کہ شعر میں مزا آتا ہے مگر کیا کوئی اس مزہ کی حقیقت الفاظ میں بیان کرسکتا ہے ہرگز نہیں ہمارے ایک دوست ہیں انکو اشعار میں مزا نہیں آتا جب وہ کسی کو شعر سے مزا لیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسپر ہنستے ہیں کہ شعر بھی کوئی مزہ کی چیز ہے یہ بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہے جو اس میں مزا آئے ایک دفعہ الہ آباد میں ایک دوست میرے ساتھ تھے ان کی طبیعت شاعرانہ ہے وہ اپنی ایک غزل سنا رہے تھے جس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

۳۳۵

کیا بیٹھا ہے سینہ پر زانو کو دھرے قاتل   ہاں پھیر بھی دے خنجر کیا دیر لگائی ہے

لوگ تو اس سے مزے لے رہے تھے اور وہ حضرت اپنے ہنس رہے اور فتوے لگا رہے
تھے کہ واللہ یہ بالکل جھوٹ ہے ہم نے تو کسی محبوب کو نہیں دیکھا کہ وہ عاشق کے سینہ پر خنجر
چلانے کو بیٹھا ہو اب بتلایئے ایسے لوگوں کو الفاظ سے کیونکر سمجھایا جائے کہ شعر میں یہ مزا ہے
کیونکہ یہ محض ذوقی چیز ہے جسکو یہ ذوق حاصل نہیں وہ اسکے لطف کو نہیں سمجھ سکتا یہی وجہ ہے
کہ فلاسفہ نے صوفیہ کے حال و قال و وجد کو دماغ کی خرابی پر محمول کیا اور کہا کہ حق تعالیٰ
سے محبت نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ غائب ہیں اور غائب کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی اور حیرت
ہے کہ بعض متکلمین بھی حق تعالیٰ کے ساتھ حب عقلی کے تو قائل ہیں مگر حب طبعی کا انکار کرتے ہیں
افسوس عشاق تو محبت میں مرے کھپے جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ محبت حق تعالیٰ سے ہو ہی
نہیں سکتی وہ تو جان دینے کو تیار ہیں اور بہت سے تڑپ تڑپ کر مر بھی گئے اور یہ انکو دیوانہ
کہتے ہیں یہ لوگ عنین طریق ہیں انکو عشق کا چرکا نہیں لگا اسلئے اسکی حقیقت کے منکر ہیں کیونکہ

ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نچشی،

حضرات! یہ لوگ جنکو دیوانہ کہا جاتا ہے ایسے عاقل ہیں کہ ان کے ملفوظات اور حکیمانہ
اقوال کے سامنے ارسطو بھی طفل مکتب ہے تو کیا ایسے عاقلانہ اقوال دیوانوں سے صادر ہوا
کرتے ہیں مگر چونکہ اس محبت نے ان سے سلطنتیں چھڑا دیں جب انہوں نے سلطنت کو حق تعالیٰ
حق دیکھا تو لات مار کر الگ ہو گئے ان کا مذاق یہ ہے

عشق با مردہ نباشد پائدار   عشق را با حی و با قیوم دار   اور ہے

عاشقی با مردگان پایندہ نیست   زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

وہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہیں کرنا چاہتے دنیا اور اسکے لذائذ ان کی نظر میں خاک کی برابر
بھی نہیں رہے اسلئے اہل دنیا کی نظر میں وہ دیوانے شمار ہونے لگے مگر وہ ایسے دیوانے ہیں کہ

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

مگر میں سچ کہتا ہوں کہ زندگی انہی کی زندگی ہے واللہ انکو کھانے پینے میں بھی وہ مزہ آتا ہے
کہ آپ کو اور ہم کو نہیں آتا کیونکہ ان کو کھانے پینے کے وقت میں یہ مستحضر ہوتا ہے کہ یہ نعمتیں

محبوب کی طرف سے ہیں اور محبوب کے ہاتھ سے اگر گلا ہوا امرود بھی ملے تو وہ الہ آباد کے
شاداب امرود سے افضل ہوتا ہے بلکہ محبت کی تو اس سے بھی بڑھکر عجیب حالت ہے کہ
عاشق کو محبوب کی ایذا میں بھی مزا آتا ہے اسی لئے اہل اللہ کو جان دینے میں بھی مزا آتا ہے
کیونکہ عاشق کو محبوب کے ہاتھ سے دھول کھانے میں بھی لطف محسوس ہوتا ہے حضرت عراقی
فرماتے ہیں ؎ نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ❊ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی
حضرت زلیخا نے جب زنان مصر کے سامنے یوسف علیہ السلام کو بلایا تو انہوں نے بدحواس
ہوکر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور ایذا کا مطلق احساس نہوا اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کی محبت میں صحابہؓ کی یہ حالت ہوئی جسکو حضرت عائشہ فرماتی ہیں ؎

لَوَاحِیْ زُلَیْخَا لَوْ رَأَیْنَ جَبِیْنَہٗ ❊ لَآثَرْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوْبَ عَلَی الْیَدِ

واقعی ہزاروں مردوں نے اپنے دل کاٹ دیئے غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جانیں دیدیں
اور عورتوں کی یہ حالت تھی کہ جب حضور غزوات سے واپس ہوتے تو عورتیں سڑکوں پر کھڑی
ہوجاتیں اور آنیوالوں سے اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت پوچھتی تھیں ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک عورت
کا باپ اور خاوند اور بیٹا اور بھائی غرض سارا کنبہ شہید ہوگیا تو حضرات صحابہؓ نے اس کی
تعزیت کی کہ تمہارے فلاں فلاں عزیز شہید ہوگئے تو وہ پوچھتی ہے کہ یہ تبلاؤ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کیسے ہیں صحابہؓ نے کہا حضور تو مع الخیر واپس تشریف لا رہے ہیں تو وہ فرماتی ہیں کہ
بس حضور سلامت چاہییں آپ کے اوپر ہزار ماں باپ اور اولاد فدا ہیں ؎

فِدًی لِرَسُوْلِ اللّٰہِ اُمِّیْ وَخَالَتِیْ ❊ وَعَمِّیْ وَآبَائِیْ وَنَفْسِیْ وَمَالِیَا

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ صحابہ کو یہ تعلق تھا کہ عورتیں اور مرد اور بچے سب کے قلوب پارہ پارہ ہوگئے تھے
غرض محبت کیساتھ مصائب بھی شیریں ہوجاتی ہیں ؎ از محبت تلخہا شیریں بود۔ چنانچہ ان صحابیہ
کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی کی اسقدر مسرت تھی کہ اپنے سارے کنبہ کا مرنا بھول گئیں۔ جب تلخیاں
بھی خوشگوار ہوجاتی ہیں تو محبوب کے لذیذ انعامات میں تو عاشق کو کیا کچھ حظ آئے گا اسلئے
اہل اللہ کو جب کھانے پینے کی چیزوں میں یہ امر مشاہد ہوتا ہے کہ یہ محبوب نے ہمکو دی ہیں
تو انکو وہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ اہل دنیا نے اس کا خواب بھی نہیں دیکھا پھر ان لوگوں کو بھلا ناز

ہیں تو کیوں حظ نہ آئیگا جو خاص قرب محبوب اور حاضری دربار کی حالت ہے اسوقت واقعی طور پر ان کو حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کا ادراک ہوتا ہے کہ نماز عجیب راحت کی چیز ہے یہ تو نماز میں فلاح عاجل باطنی ہے اس کے علاوہ نماز میں ظاہری فلاح عاجل بھی بہت کچھ ہے چنانچہ نماز میں ایک نفع یہ ہے کہ اگر کوئی آپ کو فضول مخالطت فضول مکالمت سے ایذا دینا چاہے تو نماز شروع کر دو جب تک نماز پڑھتے رہو گے کوئی تمہیں کچھ نہ کہیگا۔ دوسرے اگر تم کسی آنے والے کی تعظیم نکرنا چاہو اور تعظیم نہ کرنے میں خطرہ کا اندیشہ ہو تو اس کو آتا ہوا دیکھکر نماز شروع کر دو اس طرح تعظیم سے بھی بچے رہو گے اور دوسرے کو اپنے بے تعظیمی کا بھی خیال نہ آئیگا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ نماز میں انسان دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ تیسرے اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اسطرح خلوت اختیار کروں گا کہ گوشہ نشین بھی مشہور نہوں کیونکہ اس شہرت کے بعد پھر خلوت نہیں رہ سکتی لوگ تنگ کرتے اور ہجوم کرنے لگتے ہیں تو اسکی سہل صورت یہ ہے کہ ہر وقت نفل نماز پڑھا کرے ہمارے ایک عزیز بزرگ تھے جو مشرب سماع رکھتے تھے اسی طرح خلوت اختیار کی تھی کہ بیٹھک ہی میں عام منظر پر رہتے اور ہر وقت نماز پڑھتے تھے جب کوئی ملنے آیا تو سلام کے بعد دو چار باتیں خیر و عافیت کی پوچھ لیتے اور پھر نماز شروع کر دیتے مجھے یہ طریقہ بہت پسند آیا کہ نہ تو وہ بداخلاق مشہور ہوئے کیونکہ جو کوئی بھی آتا تھا اس سے ضرورت کی قدر مل بھی لیا کرتے تھے اور نہ عزلت گزینی میں خلل آیا اور نہ خلوت نشین مشہور ہوئے جو عوام کا ہجوم ہوتا۔ ایک برکت نماز کی یہ ہے کہ اسمیں بڑے بڑے سلاطین اور رؤسا کی برابری ہو جاتی ہے ایک انگریز کالج علی گڈھ میں گیا تو وہاں دیکھا کہ وہاں رئیسوں کے لڑکے پڑھتے ہیں جنکے ساتھ نوکر اور ملازم بھی ہوتے ہیں کہ خدمت کیوقت تو وہ نوکر [illegible] کھڑے رہتے ہیں آقا کے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتے اور نماز کیوقت آقا کے برابر پاس مل کر کھڑے ہوتے ہیں اس نے ان رئیس زادوں سے دریافت کیا کہ نماز میں برابر کھڑے ہونے سے یہ ملازم گستاخ نہیں ہو جاتے انھوں نے کہا کیا مجال ہے جو نماز کے باہر ذرا بھی برابری کر سکیں اسوقت کا یہی حق ہے کہ سب برابر ہوں اور دوسرے وقت کا دوسرا حکم ہے اسکو اس سے بڑی حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ روز نماز پڑھتے ہیں حالانکہ وہ نماز میں آقا کے برابر بھی ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اس میں الفت [illegible]

صفت بڑھ جاتی ہے یعنی وہ آقا کی خدمت اور اسکے حقوق کی بجا آوری بے نمازی لوگ سے زیادہ کرتا ہے واقعی یہ بات مشاہدہ ہے کہ دیندار آدمی جیسے خدا تعالی کے حقوق ادا کرتا ہے بندوں کے حقوق بھی خوب ادا کرتا ہے اسی برابری پر ایک اور قصہ یاد آیا نواب ٹونک جنکا نام وزیر الدولہ تھا بڑے دیندار تھے ایک دفعہ کسی نماز میں وہ آئے اور کسی غریب مزدور کے پاس کھڑے ہوگئے وہ بیچارہ ڈرا کہیں نواب صاحب کو میرا دامن وغیرہ نہ لگ جاوے پھر مصیبت آوے اسلئے وہ ذرا سمٹ کر دب کر کھڑا ہوا جس سے صف میں فرجہ ہوگیا نواب صاحب صف ملانے کیلئے ادہر کو اور کھسک گئے تو وہ اور ہٹ گیا اب نواب صاحب تو اس سے ملتے ہیں اور وہ الگ ہوتا جاتا ہے خدا خدا کرکے نماز پوری ہوئی تو وہ غریب فوراً ہی بھاگا نواب صاحب نے دعا سے فراغت کرکے فرمایا کہ ہمارے پہلو میں کون شخص کھڑا تھا اسکو حاضر کرو خدم حشم نے اسکو حاضر کیا اب تو وہ سمجھا کہ میری کمبختی آئے گی لوگوں نے کہا ڈرو نہیں کچھ نہیں کہیں گے مگر نواب صاحب کے سامنے دبکر گفتگو کرنا دلیرانہ بات چیت کرنا پھر وہ کچھ نہ کہیں گے چنانچہ نواب صاحب کے سامنے پہونچے انہوں نے فرمایا کیوں صاحب یہ کیا حرکت تھی کہ ہم تو صف میں خوب ملنا چاہتے تھے کیونکہ سنت بھی ہے اور تم ہم سے الگ ہوتے تھے کیا نماز میں بھی تم ہم سے ڈرتے تھے اس نے دلیر بنکر جواب دیا کہ نماز میں آپ سے میں کیوں ڈرتا یہ تو خدا کا دربار ہے جس میں بڑے سے بڑے بادشاہ بھی کسی ادنی مسلمان پر ترجیح نہیں رکھتا۔ نواب صاحب نے فرمایا پھر کس لئے تم بچتے تھے کہا میں اسلئے بچتا تھا کہ کہیں آپ کی دنیا مجکو نہ لگ جائے یہ سنکر نواب صاحب اس کے بڑے معتقد ہوے اور حاضرین سے تعریف کی اور رونے لگے اور کہا واقعی اس غریب کی کچھ تنخواہ مقرر کردی۔ نماز کی ایک برکت یہ ہے کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے اطبا بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اخلاق جمیدہ وافعال حسنہ کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑتا ہے اور افعال بد سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے کہ ایک آدمی نمازی ہو اور ایک بے نمازی تو نمازی کی صحت بے نمازی سے ضرور اچھی ہوگی (مگر دونوں یکساں قوی اور قریب قریب بدن کے لینے چاہئیں ۱۲) بلکہ ایک حدیث سے جو ابن ماجہ میں ہے تو معلوم ہوتا ہے گو محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے ذریعہ سے بعض امراض کا علاج کیا ہے

۳۳۹

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ کے پیٹ میں درد تھا وہ آہ آہ کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے اور فارسی میں فرمایا اَشکَمَتْ دَرْدٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ قُمْ فَصَلِّ فَزَالَ وَجَعُ بَطْنِہٖ کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے کہا ہاں فرمایا کھڑے ہو کر نماز پڑھو چنانچہ نماز پڑھتے ہی درد زائل ہو گیا چونکہ یہ مسئلہ احکام میں سے نہیں اسلئے ضعف حدیث اس میں مضر نہیں۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتا کہ نماز پڑھنے سے ہمیشہ درد زائل ہو جایا کرے گا ممکن ہے کسی عارض سے اس نفع کا ظہور نہ ہو مگر یہ تو ضرور ہے کہ نماز سے ایک خاص سرور و نشاط اور قلب کو راحت حاصل ہوتی ہے جس کا اثر صحت پر بھی ضرور ظاہر ہوتا ہے اور ہمکو کی وجہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ نماز سے راحت و سرور کیوں ہوتا ہے کیونکہ ہر اثر کے لئے کسی علت کا معلوم ہونا ضروری نہیں بعض چیزیں بالخاصہ موثر ہوتی ہیں دیکھئے مقناطیس میں جو جذب حدید کی خاصیت ہے اس کی وجہ کوئی نہیں بتلا سکتا اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یہ اثر بالخاصہ ہے جس کی علت بتلانے کی ہمیں ضرورت نہیں افسوس اتنی بڑی عبادت جس میں فلاح اخروی بھی ہے اور فلاح دنیوی بھی ہے اور ہم اس سے ایسے غافل ہیں کہ پانچ وقت خدا کی طرف سے ایک منادی ہمکو پکارتا ہے اور ہم جماعت میں نہیں آتے حالانکہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وَلَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ بِالصَّلٰوۃِ اِلٰی اَنْ قَالَ فَاُحَرِّقَ بُیُوْتَھُمْ بِالنَّارِ (کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز میں ایک شخص کو امام بنا دوں پھر چند آدمیوں کو ساتھ لیکر دیکھوں کہ کون کون لوگ جماعت میں نہیں آئے پھر جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے گھر پھونک دوں اور گو آپ نے ان لوگوں کے گھروں کو پھونکا نہیں مگر چاہا تو تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں اِنِّیْ اَرٰی رَبَّکَ یُسَارِعُ فِیْ ھَوَاکَ کہ میں خدا تعالیٰ کو دیکھتی ہوں کہ آپ کی خواہش کو بہت جلدی پورا کر دیتے ہیں اور بھلا حضور کی یہ شان کیوں نہ ہو جب ادنیٰ ادنیٰ مقبولین کی یہ شان ہے کہ ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   مے دہد یزداں مراد متقیں

تو معلوم ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا چاہا ہے تو خدا تعالیٰ نے بھی ضرور چاہا ہے اب بتلاؤ

جسکے گھر کو خدا اور رسول پھونکنا چاہیں وہ کیونکر بچ سکتا ہے تو جو لوگ جماعت میں نہیں آتے ان کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے شاید تم کہو کہ ہمارا گھر کہاں جلا وہ تو اچھا خاصا موجود ہے تو اس کے متعلق مولانا رومی کا جواب سُنلو فرماتے ہیں ؎

آتشے گرنامدست این دود چیست   جاں سیہ گشت و رواں مردود چیست

یہ تھوڑی آگ لگی ہوئی ہے جسکے دھوئیں نے دل کو سیاہ کر دیا اور چہرہ پر وحشت ظلمت برس رہی ہے اس ظلمت قلب سے بے نمازی کے چہرہ پر بھی ضرور ایک اثر ہوتا ہے جس کو اس کا بے نمازی ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے نمازی کے چہرہ پر جو نور ہوتا ہے وہ بے نمازی کے چہرہ پر نہیں ہوتا اور یہ اثر قلب کا ہے نمازی کے دل میں نور ہے اس کا اثر چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے اس کا اثر چہرہ کی بدرونقی سے ظاہر ہوتا ہے معلوم ہوا کہ آگ ضرور لگی ہے اسی کا یہ دھواں ہے جس نے ظاہر و باطن دونوں کو سیاہ کر دیا ہے دل کی سیاہی یہ ہے کہ بہت لوگوں کو نہ رشوت سے نفرت ہے نہ جھوٹ بولنے سے نہ کسی پر بہتان باندھنے سے نہ کسی کی زمین دبانے اور قرض لیکر انکار کر دینے سے نہ لڑکوں اور عورتوں کو گھورنے سے وغیرہ وغیرہ۔ اور مولانا کا یہ ارشاد حدیث سے مؤید ہے۔ حدیث میں ہے۔ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ کَانَتْ فِیْ قَلْبِہٖ نُکْتَۃٌ سَوْدَآءُ فَاِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُہٗ وَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰی تَعْلُوَ قَلْبَہٗ فَذٰلِکُمُ الرَّانُ الَّذِیْ ذَکَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ رواہ الترمذی حسن صحیح مشکوٰۃ ص ۲۰۷ یعنی جب مسلمان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر توبہ استغفار کر لے تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر گناہ میں بڑھتا گیا تو یہ داغ بڑھتا رہتا ہے یہانتک کہ دل کو گھیر لیتا ہے یہی وہ زنگ ہے جسکی بابت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ یعنی ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کی کرتوتوں کا زنگ غالب ہو گیا ہے۔ اسی کو مولانا ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

ہر گنہ زنگے ست بر مرآۃ دل   دل شود زیں زنگہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی   نفس دوں را بیش گردد خیرگی

۳۴۱

یہ تو بالکل حدیث کا ترجمہ ہے پس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ گناہوں سے دل سیاہ ہو جاتا ہے
اسی کو مولانا نے فرمایا تھا کہ آگ نہیں لگی تو یہ دھواں کہاں سے آیا کہ دل سیاہ ہو گیا اور صورت
پر پھٹکار برستی ہے۔ بزرگوں کا کلام کلیاً یا جزئیاً بالکل حدیث و قرآن کا ترجمہ ہے گو ظاہر
میں اشعار نظر آتے ہیں لکھنؤ میں ایک دفعہ میرا بیان ہوا تو اتفاق سے اس میں مثنوی وغیرہ
کے اشعار زیادہ پڑھے گئے اسوقت ایک غیر مقلد بھی موجود تھے بیان کے بعد کہنے لگے کہ وعظ
تو بہت اچھا ہے مگر اتنی کسر ہے کہ اس میں قال اللہ وقال الرسول کم تھا اشعار زیادہ تھے اگلے
دن پھر بیان ہوا تو میں نے قصداً اشعار زیادہ پڑھے اور ہر ایک شعر کے مضمون کو
حدیث و قرآن سے ثابت کیا تا کہ معلوم ہو جاوے کہ حدیث و قرآن کا ترجمہ ہے اور اگر کسی
جگہ حدیث و قرآن کا ترجمہ بھی نہ ہو تو محقق کا کلام خدا اور رسول کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ
اللہ و رسول ہی کی مراد کو واضح کرتا ہے گو بعینہ ترجمہ نہ ہو بالخصوص مثنوی شریف کہ وہ تو خود
۳۴۴ الہامی کتاب ہے چنانچہ مولانا جامی کا ارشاد ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآن در زبان پہلوی

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ قرآن سے مراد کلام الٰہی پس اس کا مطلب یہ ہے
کہ مثنوی کلام الٰہی ملہم ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ قرآن کا ترجمہ ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اس میں
بہت سی حکایات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں ہاں بعض جگہ بعینہ ترجمہ قرآن بھی ہے مگر
سب جگہ نہیں اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ الہام فارسی میں کیوں ہوا کیونکہ حق تعالیٰ کسی زبان
کے ساتھ مقید نہیں ہیں وہ فارسی میں بھی تکلم اور الہام فرما سکتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر ست — عشق را خود صد زبان دیگر ست

تو یہ اشعار یعنی ہر گنہ زنگیست الخ علاوہ کلام محقق اور کلام ملہم ہونیکے حدیث کا ترجمہ بھی
ہیں اسلئے مولانا کا ارشاد بالکل بجا ہے کہ آگ ضرور لگی ہے اسی سے دل سیاہ ہوا ہے رہا یہ
کہ آگ کے ساتھ سوزش بھی ہوتی ہے اور بے نمازی کو تو سوزش نہیں ہے تو خوب یاد رکھو کہ
سوزش بھی ہے مگر فالج غفلت کی وجہ سے جسم سن ہو رہا ہے اس لئے اسکا احساس نہیں ہے
جیسے کلوروفارم سونگھنے والے کو زخم نشتر کا احساس نہیں ہوتا ایسے ہی ان لوگوں نے غفلت

کا کلورا فارم سونگھ رکھا ہے اسلئے گناہوں کی سوزش کا احساس نہیں ہوتا مگر ایک دن یہ فالج اور یہ سن اور یہ بیہوشی اترے گی اسوقت گناہوں کی سوزش کا احساس ہوگا ؎

فَسَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ　　اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ اَمْ حِمَارٌ

اس وقت غفلت کے غبار نے آنکھوں کو اندھا کر رکھا ہے اسلئے گناہ کر کے بیفکر پھرتے نظر آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم گھوڑے پر سوار ہیں اور دینداروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور انکو گدھے پر سوار سمجھتے ہیں مگر جسدن یہ غبار بیٹھ جائیگا اسوقت معلوم ہو جائیگا کہ گدھے پر سوار کون تھا اور گھوڑے پر سوار کون۔ دوسرے یہ گناہوں کی آگ خدائی آگ ہے جس کی خاصیت یہ ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ اس کا اصل محل قلب ہے اور دعوے سے کہا جاتا ہے کہ گنہگار کا دل بےچین ہوتا ہے اسکو راحت وچین نصیب نہیں ہوتا۔ گناہ سے دل کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے یہ اسی آگ کا تو اثر ہے جس نے اندر اندر دل کو پھونکدیا ہے اور صوفیہ کی تحقیق تو یہ ہے کہ یہ گناہ خود ہی آگ ہیں اور جہنم انہی کی صورت مثالی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہنم کا فی نفسہ وجود نہیں بس معاصی ہی کو مجازاً جہنم کہدیا گیا جیسا کہ فلاسفہ نے نعیم وجحیم کی حقیقت علم وجہل سمجھی ہے مطلب یہ ہے کہ جہنم خارج میں موجود ہے اور اسی طرح موجود ہے جسطرح حدیث وقرآن میں خبر دی گئی ہے مگر اس کی حقیقت یہی معاصی ہیں جہنم کی آگ اور سانپ بچھو وغیرہ سب انہی گناہوں کی صورت ہیں چونکہ اس عالم میں اعراض بھی جواہر بنجاتے ہیں اسلئے یہی گناہ جو یہاں کئے جاتے ہیں ان ہی کی یہ صورتیں تھیں اور پہلے سے بن گئیں۔ امام غزالی نے یہی بات لکھ دی تھی جس کو لوگوں نے جہنم منصوصہ کی حقیقت کے انکار پر محمول کیا اور امام پر فتویٰ لگانے لگے مگر یہ حمل غلط ہے امام غزالی اس سے بری ہیں لوگوں نے ان کے کلام کو سمجھا نہیں یہ مسئلہ میں نے اسلئے بیان کردیا تاکہ اگر کسی کی نظر سے یہ بات گذرے تو غلطی میں نہ پڑے غرض صوفیہ کے قول پر تو یہ گناہ ہی خود آگ ہیں ان کے لئے کسی دوسری آگ کی ضرورت نہیں مرنے کے بعد یہی آگ اور سانپ بچھو بنکر ستائیں گے پس گنہگار مرنے کے بعد تو صورت جہنم میں جائیگا اور اسوقت وہ حقیقت جہنم میں موجود ہے کیونکہ بڑا جہنم یہ ہے کہ حضرت حق ناراض ہوں ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت　　فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت

۳۴۴

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر　　　کنایتیست کہ از روزگار ہجراں گفت

صاحبو جہنم انہی کے واسطے جہنم ہے جنسے خدا تعالیٰ ناراض ہوں اور جس سے خدا راضی ہو اسکے لئے جہنم کوئی چیز نہیں بلکہ ان سے تو جہنم خود پناہ مانگتی ہے ان کے ایمان کے اثر سے وہ خود ٹھنڈی ہونے لگے گی حدیث میں ہے کہ جسوقت مسلمان پلصراط سے گذریں گے جو جہنم کی پشت پر بچھایا جائے گا تو مومن متقی سے جہنم کہے گی جُزْ یَا مُؤْمِنُ فَاِنَّ نُوْرَکَ اَطْفَأَ نَارِیْ اے مومن جلدی سے پار ہو جا تیرے نور نے تو میری ناری کو بجھا دیا۔ نیز مولانا رومی نے ایک جماعت اولیاء کا حال لکھا ہے کہ وہ پلصراط سے گذر کر جب جنت میں پہونچ جائیں گے تو حق تعالیٰ یا ملئکہ سے سوال کریں گے کہ ہم نے سنا تھا کہ پلصراط سے گذرتے ہوئے جہنم بھی راستہ میں آتا ہے مگر ہم کو تو ملا نہیں تو ارشاد ہو گا کہ تمنے ایک باغ سرسبز شاداب دیکھا تھا یا نہیں وہ کہیں گے ہاں باغ تو دیکھا تھا ارشاد ہو گا کہ وہی جہنم تھا جو تمہارے ایمان کی برکت سے گلزار ہو گیا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے دنیا میں آگ گلزار ہو گئی تھی ؎

گلستاں کند آتشے بر خلیل　　　گروہے بآتش برد ز آب نیل

اور نیز قیامت میں انبیاء علیہم السلام اور بعض مومنین اذن شفاعت کے بعد جہنم میں گھس گھس کر دوزخیوں کو نکالیں گے مگر جہنم ان کا کچھ بھی نہ کر سکے گی اور اسوقت بھی زبانیہ جہنم دوزخ میں موجود ہیں مگر ان کو اس سے کچھ ضرر نہیں ہے یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو کامل الایمان ہیں اور جن میں ایمان ضعیف ہے ان کو بھی جہنم پوری طرح نہ جلا سکے گی کیونکہ ان کے دل میں ایمان ہے۔ مومن کے قلب پر آگ کا اثر نہ پہونچے گا اور حدیث مسلم میں ہے کہ اَمَاتَهُمُ اللّٰهُ اِمَاتَةً کہ گنہگار مسلمانوں کو حق تعالیٰ جہنم میں داخل کر کے ایک قسم کی موت یعنی نیند کا سا اثر دیدیں گے پھر ان کو عذاب جہنم کا کافی برابر احساس نہ ہو گا الغرض اصل جہنم تو خدا کی ناراضی ہے اور خدا کی ناراضی گناہوں سے ہوتی ہے تو گناہ خود جہنم ہیں اگر سزا بھی نہ ہو اور ویسے ہی چھوڑ دیئے جائیں تو حق تعالیٰ کا ناراض ہونا ہی خود جہنم ہے بلکہ شریف طبائع کا خاصہ یہ ہے کہ ان کو جرم پر سزا مل جاوے سے غم ہلکا ہو جاتا ہے اور اگر سزا نہ ملے تو رنج زیادہ ہوتا ہے کوئی انکے

جہنم کی حقیقت پوچھے وہ یہی کہیں گے کہ معصیت ہی خود جہنم ہے۔ پس اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی
کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے یا جماعت کی پابندی نہیں کرتے ان کے گھر میں ضرور
آگ لگی ہے اور ایک دن اس کی سوزش کا احساس ضرور ہوگا گو ابھی نہو۔ صاحبو
بعض طاعات کا موقعہ تو کبھی کبھی آتا ہے مثلاً روزہ سال میں ایک بار آتا ہے اور
بعض طاعات سب پر فرض نہیں مثلاً حج اور زکوٰۃ سب پر فرض نہیں مگر نماز تو ایسا
ظاہر فرض ہے جن کی فرضیت سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے امیر و غریب سب پر
یکساں فرض ہے پھر اس کے لئے کوئی خاص ہیئۃ مقرر نہیں روزانہ پانچ دفعہ فرض
ہے تو یہ طاعت سب سے اہم اور ضروری ہے مگر اس کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ ہے کہ
مسلمان بہت کم ایسے ہیں جو اس کے پابند ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوت عملیہ
کمزور ہے اور قوت عملیہ اسلئے کمزور ہے کہ قوت علمیہ کمزور ہے اگر ہم کو گناہوں کا ضرر پورا پورا معلوم ہوتا
تو ترک صلوٰۃ پر ہمکو جرأت نہ ہوتی جیسے سنکھیا کے ضرر کا ہمکو علم ہے تو کبھی تجربہ و امتحان کے لئے بھی کسی
نے نہ کھایا ہوگا نیز اوپر سے گرنے کا ضرر سب کو معلوم ہے تو امتحان کیواسطے کبھی کوئی اوپر
سے نہ گرا ہوگا۔ اور جو لوگ ایسی بیہودگی کرتے ہیں کسی جہل کے غلبہ سے ان چیزوں کی مضرت
کا علم ہی ضعیف ہو جاتا ہے پس معلوم ہوا کہ ہم کو گناہوں کے ضرر کا علم ایسا بھی نہیں
جیسا کہ سنکھیا کھانے اور اوپر سے گرنے کے ضرر کا علم ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ گناہوں کا
ارتکاب بیدھڑک کرلیا جاتا ہے اور ان کاموں کو بھول کر بھی نہیں کیا جاتا اور یہی قوت علمی
کی کمزوری ہے کہ جس چیز کا ضرر سنکھیا کھانے اور اوپر سے گرنے کے ضرر سے بھی اشد ہے
اس کو ہم نے ان سے بھی کم رکھا ہے ورنہ کبھی تو تجربہ کے لئے ان افعال کا بھی ارتکاب کیا
ہوتا جیسے بوجھ بجھکڑ کی حکایت ہے کہ اس کی بستی میں ایک آدمی درخت پر چڑھ گیا تھا پھر اترا
نہ گیا تو شور مچانے لگا آدمی جمع ہوگئے وہ بھی سب بیوقوف تھے کسی کی سمجھ میں کوئی ترکیب
نہ آئی تو بوجھ بجھکڑ کو بلایا گیا اس نے اوپر تلے دیکھکر تھوڑی دیر سوچکر کہا کہ بس تدبیر سمجھ میں
آگئی ایک رسا اسکے پاس پھینکدو اور کہو کمر سے باندھ لے اس نے باندھ لیا پھر لوگوں کو حکم
دیا کہ رسے کو زور سے جھٹکا دو لوگوں نے جو جھٹکا مارا تو بدن تو نیچے آگیا مگر روح اوپر کو

۳۴۵

اڑگئی لوگوں نے پوچھا کہ گرشتے کہا کہ یہ کیا ہوا کہنے لگا اس کی قسمت میں موت ہی تھی ورنہ میں ذ
تو اس ترکیب سے بہت سے آدمی کنویں سے نکالے ہیں اسی طرح ایک بھینس کا سر ناج کی کوٹھی
میں پھنس گیا تھا بیچاری وہیں کی وہیں رہ گئی اب کوٹھی کو توڑتے ہیں تو ناج کا نقصان اور
نہیں توڑتے ہیں تو بھینس کی جان جاتی ہے جب سارے تھک گئے اور کوئی تدبیر سمجھ میں
نہ آئی تو بوجھ بجھکڑ کو بلایا گیا اس نے کہا کہ بھینس کا سر کاٹ دو پھر ایک آدمی سے کہو کہ اوپر
سے اندر گھسکر سر نکال لاوے کیونکہ ناج کی کوٹھی کے دو منہ ہوتے ہیں ایک اوپر وہ بڑا
ہوتا ہے اور ایک نیچے وہ چھوٹا ہوتا ہے (۱) جب سر کاٹ دیا گیا تو بھینس مرگئی اب سر کو
نکال کر لائے بھی تو وہ جڑ کہاں سکتا ہے ... ہم اسکو بیوقوف اور احمق کہتے ہیں مگر ہم
بھی اسی حماقت میں مبتلا ہیں کیونکہ اس نے بھی امتحاناً یہ فعل کئے تھے اسکو اپنے کرنے اور سر
کاٹنے کے ضرر کا علم نہ تھا اگر اسکو ضرر کا علم کافی ہوتا تو کبھی ایسی رائے دینے کی جرأت نہ کرتا مگر
اس نے محض آزمایا ہی تھا جیسے ہم امتحان کے لئے کبھی نماز کو ترک کر دیتے ہیں اور بہت سے
گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس گناہ کا مزہ تو دیکھ لیں پھر نہ کریں گے
اس امتحان کی وجہ یہی ہے کہ ہم کو ضرر کا علم پورا نہیں اگر علم ضرر کافی ہوتا تو تجربہ کی کبھی ہمت نہ ہوتی
اور یہ کچھ علم نہیں کہ دو چار الفاظ یاد کر لئے کہ نماز نہ پڑھنا گناہ ہے رشوت اور سود حرام ہے وغیرہ
وغیرہ علم وہ ہے جسکا طبیعت پر اثر ہو جو دل میں گھس گیا ہو جیسے سنکھیا کا زہر قاتل ہونا دل میں گھسا
ہوا ہے مگر ہماری یہ حالت گناہوں کے متعلق نہیں ہے بلکہ یہاں تو ایسی بےفکری اور دلیری ہے کہ اگر
کوئی ان کو خیر خواہی سے نصیحت کرتا ہے کہ بھائی نماز پڑھا کرو یا برے کام نہ کیا کرو تو یہی لوگ جو چند
الفاظ پڑھے ہوئے ہیں اور تعلیم یافتہ و مہذب کہلاتے ہیں ناصح کو یوں جواب دیتے ہیں کہ میاں
تم ہی جنت میں چلے جانا ہم دوزخ ہی میں سہی۔ بھلا یہ جواب سنکر کوئی کہسکتا ہے کہ ان کو گناہوں
کے ضرر کا علم ہے ہم تو جب جانیں کہ یہی شریف آدمی جو جہنم میں جانے پر تیار ہے ذرا گرمی کر کے بھی
یہ کہدے کہ میاں ہمیں آرام سے گھر میں بیٹھے رہو ہم جیلخانہ ہی میں سہی یا کسی کا گھر جلتا ہو اور کوئی اسکو
خبر دے تو بیفکری کے ساتھ یہ کہدے کہ میاں ہمیں گھر میں راج کرو ہم بے گھرے ہی سہی صاحب
ایک ذرا سے عہدہ بڑے کے ہونے کی بھی سب کو فکر ہوتی ہے مگر افسوس جنت کے بارہ میں

ہم ایسے نحی بنے ہیں کہ گناہوں کی بدولت وہ ہمارے ہاتھ سے ضائع ہوتی ہے تو اس کی ذرا فکر نہیں اب تو سمجھ میں آگیا کہ درحقیقت ہم کو گناہوں کے ضرر کا علم ہی نہیں اور جو کچھ ہے وہ محض الفاظ کے درجہ میں ہے جس کا مفہوم قلب میں کچھ نہیں بس یہ ثابت ہو گیا کہ علمی اور عملی کمزوری گناہوں کا سبب ہے اور یہ بلا آجکل ہر جگہ عام ہے جسکے عموم میں یہ مقام بھی داخل ہے اسلئے میں نے اس مضمون کو اختیار کیا ہے اسی کو حق تعالیٰ نے ان آیات میں بتلایا ہے۔ فرماتے ہیں اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اس میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کے کان کھولے ہیں جو زمینداری پر یا کسی عہدے پر یا شرف نسب اور جائداد و مال وغیرہ پر فخر کرتے ہیں کہ سنلو بڑا شرف خدا کا ڈر ہے یعنی تقویٰ اور پرہیزگاری جس کا حاصل ہے گناہوں سے بچنا اسی سے کامل شرافت حاصل ہوتی ہے۔

اس میں تو ضرورت عمل پر تنبیہ کیا گیا ہے اور اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خدا کا خوف علم سے حاصل ہوتا ہے مطلب یہ ہوا کہ قوت عمل علم پر موقوف ہے پس علم و عمل دونوں کی ضرورت ثابت ہو گئی اب اگر کسی کو فلاح اور اصلاح کی طلب ہو وہ علم و عمل حاصل کرنے کی سعی کرے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب مدرسہ میں آجاویں کیونکہ اسکو آجکل دنیا سے بیکاری کا سبب سمجھتے ہیں تو سن لو کہ علم و عمل کا حاصل ہونا بیکار بننے پر موقوف نہیں آپ سارے کام کرتے رہیں جب بھی یہ دولت مل سکتی ہے گو بعد میں دنیا سے اضطراراً بیکار ہو جانا پڑتا ہے مگر وہ بیکاری ایسی لذیذ ہو گی کہ آپ ہزار کاموں کو اسپر فدا کرینگے اسکو آپ خود اختیار کرینگے باقی ہم ایسے بیکار بننے کو نہ اب کہتے ہیں نہ جب کہیں گے۔ اب میں وہ طریقہ بتلاتا ہوں تو سنئے علم حاصل کرنیکا سہل طریقہ تو یہ ہے کہ آجکل مسائل دینیہ کی کتابیں اردو میں بکثرت ہیں عقائد کی بھی اور احکام کی بھی انکو تنہائی میں دیکھا کیجئے اور فراغ کے اکثر اوقات میں کتب بینی میں رہا کیجئے یا دوستوں کے ساتھ مجلس آرائی چھوڑ دیجئے آپنے ابتک خلوت اختیار کی نہیں اس لئے اس کی قدر نہیں اگر کچھ دنوں خلوت اختیار کر لو تو پھر جلوت سے گھبراؤگے مگر خدا کے لئے تنہائی میں ناول نہ دیکھو اسکو تو اول دیکھو ہی نہیں اور اگر کسی معقول ضرورت سے دیکھو بھی تو جلوت میں دیکھو مگر دوسروں کو نہ سناؤ۔ کیونکہ مجمع میں دیکھنے سے ذہن منتشر رہتا ہے تو اچھی طرح مضمون کا اثر دل پر نہیں ہوتا اور خلوت میں جو مضمون دیکھا جاتا ہے اس کا دل پر پورا اثر ہوتا ہے

۳۴۷

پھر ناولوں کا اثر یہ ہوگا کہ آپ کو عورتوں کے گھورنے اور جھانکنے تانکنے کا خیال ہوگا پھر وصال کی ہوس ہوگی اور وہ ترکیبیں استعمال کروگے جو ناولوں میں دیکھی تھیں جس سے دنیا و آخرت ہر دونوں برباد ہوں گے۔ یاد رکھو خلوت کے معنے یہ نہیں کہ آدمی اکیلا بیٹھا رہے چاہے دل میں کچھ ہی بھرا ہو بلکہ خلوت کے معنی یہ ہیں کہ دل خدا کیساتھ لگا رہے پس جب تک خلوت میں دل خدا کے ساتھ لگا رہے خلوت میں رہو اور جب خلوت میں قلب کو انتشار اور ہجوم خطرات ہونے لگے تو مجمع میں بیٹھو مگر نیک مجمع میں اس سے خطرات دفع ہوں گے اسوقت یہ جلوت ہی خلوت کے حکم میں ہے کیونکہ مقصود ربط قلب باللہ ہے اور اس وقت وہ خلوت سے حاصل نہیں بلکہ مجمع میں بیٹھنے سے حاصل ہے اسی کو شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل   بہ تنہائی اندر صفائی نہ بینی
گرت مال و زر ہست و زرع و تجارت   چو دل با خدا ایست خلوت نشینی

اور ایک بزرگ حق تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں ؎

چوں با ہمہ چو بامنی بے ہمہ   چوں بے ہمہ چہ بے منی با ہمہ

یعنی جو شخص سب کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کا دھیان لگائے رکھے اور ان کی یاد میں مشغول ہے وہ اگر باہمہ بھی ہے یعنی مجمع کے ساتھ ہے مگر بے ہمہ ہے یعنی خلوت میں ہے اور جو شخص خدا کو چھوڑ کر اور چیزوں کا خیال رکھے اور وہ بے ہمہ بھی ہے یعنی خلوت میں ہے مگر باہمہ ہے یعنی خلوت میں نہیں۔ غرض خلوت کے معنی یہ نہیں ہے کہ تنہائی میں بیٹھکر ناول دیکھا کرو بلکہ یہ معنی ہیں کہ تنہائی میں خدا کے ساتھ دل لگاؤ میں یہ نہیں کہتا کہ دن بھر خلوت میں رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے اوقات کو ضبط کرکے کچھ وقت خلوت کا بھی نکالو اور اس وقت میں کسی محقق سے پوچھکر اس کے کہنے کے موافق عمل کرو۔ وہ آپ کو کچھ دیر مطالعۂ احکام کا امر کرے گا کچھ دیر ذکر اللہ بتلائے گا اس طرح خلوت کرکے دیکھو اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ اللہ اللہ کرکے دیکھو پھر تم لوگوں کی صحبت سے خود ہی رستے توڑاؤ گے اسوقت مولانا کا یہ قول صاف واضح ہوجائے گا ؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست   جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے کو شیخ زادہ سمجھکر شیخ سے بھی زیادہ سمجھتے ہیں گویا اپنے کو بجائے شیخ زادہ کے شیخ زیادہ سمجھتے ہیں اس لئے کسی سے طریقہ پوچھتے ہوئے عار آتی ہے۔ صاحبو! بدون جاننے والے کی رہبری کے تو آپ ایک دو میل بھی نہیں جا سکتے پھر خدا کے راستے میں کیوں کر چل سکتے ہو جس کی شان یہ ہے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست　　ہر چہ بر دے میرسی بر وے مایست

مجھے ان لوگوں پر زیادہ افسوس آتا ہے جو صاحب وسعت ہیں کہ ہر کام ان کے اشارہ پر ہوتا ہے صرف زبان ہی ہلانی پڑتی ہے اور پھر بھی وہ عمر عزیز کو فضول کاموں میں ضائع کرتے ہیں۔ اہل حاجت کو تو دنیا کے کاموں ہی سے فرصت کم ملتی ہے مگر اہل وسعت کو کیا ہوا ان کو تھوڑی دیر خلوت میں خدا کو یاد کرنے سے کون چیز مانع ہے یہ فراغ و وسعت بھی بڑی دولت ہے ان کو اس کی قدر کرنا چاہیئے ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

۳۴۹

خوشا روزگارے کہ دارد کسے　　کہ بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت یسارے بود　　کند کارے از مرد کارے بود

تو اگر کسی کو مدرسہ میں آنا گوارا نہو تو وہ اردو رسالے ہی پڑھکر علم حاصل کرے اگر اردو جانتا ہو اور اگر یہ بھی نہو تو کسی اہل اللہ کے پاس جایا کرو اس کی صحبت سے بھی علم وعمل دونوں حاصل ہو جائیں گے اگر روز جانا نہو تو ہفتہ میں ایک دن ہی مقرر کرلو جو تعطیل کا دن ہے یعنی جمعہ کا دن اس سے زیادہ اور کیا آسان ترکیب ہوگی اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

مقام امن ومے بے غش ورفیق شفیق　　گرت مدام میسر شود زہے توفیق

یہ خلوت از اغیار اور صحبت یار یعنی شیخ کے متعلق فرمایا ہے اور ذکر اللہ اور کتب بینی کے متعلق حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست　　صراحی مۓ ناب وسفینۂ غزل ست

صراحی مے ناب سے مراد ذکر اللہ ہے جس کی مستی کے سامنے شراب کی مستی بھی ہیچ ہے اس سے وہ سرور ونشاط حاصل ہوتا ہے جو کسی شراب سے نہیں ہوتا پھر مزا یہ کہ یہاں سرور ہی سرور ہے فساد عقل اور شرور نہیں ہیں یہ ترکیب تو مردوں کے لئے علم وعمل حاصل کرنیکی ہے اور عورتوں کیواسطے

یہ تدبیر سب سے کہ مرد مسائل معلوم کرکے ان کو بتلائیں اور عمل کی تاکید کریں اور دیکھتے رہیں کہ جو احکام ان کو بتلائے گئے ہیں انپر عمل ہوتا ہے یا نہیں یہ کام مردوں کے ذمہ ہے کہ اپنے گھر والوں کو بھی جہنم سے بچائیں ورنہ محض اپنے بچالنے سے وہ سبکدوش نہوں گے اب بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب گھر والوں پر گھر والے کے کہنے سے اثر نہیں ہوتا سبحان اللہ تو کیا باہر والے کہنے آئیں گے اور کیوں صاحب یہ کیا بات ہے کہ کھانے میں نمک تیز ہوجائے تو اسوقت آپ کے کہنے کا اثر کیوں ہوتا ہے۔ یاد کرلو اگر کبھی کھانے میں نمک تیز ہوا ہوگا اور تم نے بیوی کو دھمکایا ہوگا تو اس کا کیسا اثر ہوا ہوگا کہ اس دن کے بعد پھر اس نے کبھی یہ حرکت نہ کی ہوگی اور غلطی سے اگر کی بھی ہوگی تو سال دو سال میں کبھی ایسا اتفاق ہوگیا ہوگا آخر اس کی کیا وجہ کہ نمک کی تیزی پر تو گھر والوں کے کہنے کا اثر ہوا اور نماز روزہ کے لئے باہر والوں کا اثر ہو تمہارا اثر نہو۔ وجہ یہ ہے کہ اپنے نمک تیز ہونے پر تو ناک منہ چڑھا کر کہا تھا اور نماز نہ پڑھنے پر کبھی ناک نہ چڑھائی تھی بلکہ یوں ہی بوجھ سا اتار دیا تھا اور عذر کیلئے کہہ دیا کہ صاحب ہمنے تو بیوی سے نماز کو کہا تھا وہ نہیں پڑھتی ہم کیا کریں اب ہم تو سبکدوش ہوگئے تو یاد رکھو اس طرح کہنے سے تم سبکدوش نہیں ہوتے۔ صاحب جب تم نے بیوی کو نماز کے لئے کہا تھا اور اس نے نہ پڑھی تھی تو کبھی تم نے یہ تو کیا ہوتا کہ اس کے ہاتھ کی روٹی کھانا چھوڑ دیتے کہ میں بے نمازوں کے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹی نہ کھاؤں گا اس کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ہندوستان کی عورتیں اسکو گوارا نہیں کرسکتیں کہ خاوند کسی غیر کے ہاتھ کی روٹی کھاوے اس صفت میں تو وہ حوروں کے مشابہ ہیں حوروں کی شان میں حق تعالی نے فرمایا ہے عُرُبًا اَتْرَابًا کہ وہ اپنے شوہروں کی عاشق ہیں یہی حال ہندوستان کی عورتوں کا ہے یہ بھی خاوند کی عاشق اور تمام ہوتی ہیں اس کی راحت کو اپنی راحت پر مقدم کرتی ہیں جب تک مرد کھانا نکھائے اسوقت تک عورتیں کھانا نہیں کھاتیں بھوکی بیٹھی رہتی ہیں مرد کی بیماری میں یہ اپنی بیماری کو بھول جاتی ہیں بارہا دیکھا گیا ہے کہ کوئی عورت پہلے بیمار ہوئی تو جب تک خاوند اچھا ہے اسوقت تو وہ پڑی گری رہتی ہے اور جہاں خاوند گرا بچھر یہ کھڑی ہوگئی اپنی بیماری کو بھول گئی اور اس کی خدمت میں لگ گئی۔ بنیز ان کے دل پر کسی غیر مرد کا وسوسہ بھی نہیں آتا نہ حلال کا نہ حرام کا آپنے مردوں کو تو غیر عورتوں

۳۵۰

کی طرف جا نکلنے تاکنے دیکھا ہوگا اور بعضے منہ کالا بھی کرتے ہیں مگر عورتوں کو غیر مرد کی طرف
التفات کرتے کم دیکھا ہوگا یہ اپنے شوہر ہی پر نگاہ کو منحصر کرلیتی ہیں اس صفت میں بھی یہ
حوروں کے مشابہ ہیں ان کی صفت میں قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ بھی آیا ہے ہندوستان
کی عورتیں تو اکثر ایسی ہی ہیں مردوں کو تو اس کا بھی خیال ہوتا ہے کہ بیوی حسین ہو
خوبصورت ہو مگر عورتوں کو اس کا بھی خیال نہیں ہوتا خاوند چاہے کیسا ہی بدصورت
ہو وہ اس کی ہوجاتی ہیں ان میں عشقِ زوج کا مادہ بہت زیادہ ہے اور عجب نہیں کہ
اسی وجہ سے یہاں نکاح بیوہ کا معیوب ہوگیا ہوگا گو اب زیادہ عیب نہیں رہا مگر عورتیں
اب بھی اس کو پسند نہیں کرتیں باقی انہوں نے اس میں غلو کرلیا ہے چنانچہ جو بیوہ نکاح
نکرے اس کی تعریف میں کہتی ہیں کہ فلانی تو ایمان پر بیٹھی ہے گویا جس نے نکاح کرلیا وہ
بے ایمان ہے بس یہ غلو اور معصیت ہے ایک بی بی نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ فلانی اول
مرگئی تھی اب اس کا مرد اسکے بعد مرا ہے تو کیا وہ عورت قبر میں بھی عدت بیٹھے گی سوال
تو جہالت کا ہے مگر اس سے شوہر کی عظمت اس کے دل میں معلوم ہوتی کہ وہ مرنے کے بعد
بھی عورت کے ذمہ شوہر کا یہ حق سمجھتی تھی کہ شاید قبر میں اس کو عدت گذارنا پڑے گی
زندگی میں تو شوہر کا حق تھا ہی اس لئے موت کے بعد بھی اس کو باقی سمجھا غرض ہندوستان
کی عورتیں شوہروں کی عاشق ہوتی ہیں ان کو کبھی یہ گوارا نہیں ہوتا کہ مرد کسی اور کے ہاتھ کی
روٹی کھائے اسلئے اگر آپ نماز کی تاکید اس طرح کریں کہ ایک دو دفعہ کہنے سے بھی اگر وہ نماز نہ پڑھے
تو چند روز تک اسکے ہاتھ کی روٹی نہ کھائیں تو اس کا ضرور اثر ہوگا یہ طریقہ ہے عورتوں کی تعلیم کا
اور مردوں کے لئے علم وعمل حاصل کرنے کا سہل طریقہ ابھی بتلا چکا ہوں اب کسی کو کوئی
عذر باقی نہ رہا جب آپ علم وعمل حاصل کرلیں گے اس وقت آپ کو اصلی شرف اور پوری
شرافت حاصل ہوگی بدون اس کے محض نسبی شرف زیادہ وقعت کی چیز نہیں اسی کو حق
تعالیٰ نے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ میں بیان فرمایا ہے اسکے بعد فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ
خَبِیْرٌ اس میں اسپر تنبیہ ہے کہ علم وعمل ہر چند کہ بڑا شرف ہے اور اس سے آدمی اللہ تعالیٰ
کے یہاں معزز ومکرم ہوتا ہے مگر فخر اس پر بھی نکرنا چاہئے اس میں علماء اور صوفیہ کے کان کھولدئے

۳۵۱

ہیں کہ شاید وہ یہ سنکر کہ مدار شرف و اکرمیۃ تقوی ہے جو کہ مستلزم ہے علم کو اپنے علم و تقوی پر
ناز کرنے لگیں اور فخر کرنے لگیں کہ ہم سب سے اشرف و اکرم ہیں تو بتلاتے ہیں کہ پرہیزگاری
اور تقوی کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے تم نہیں جان سکتے کہ عنداللہ کون متقی ہے کیونکہ علم و عمل بھی
موجب شرف ہے جبکہ وہ خدا کے یہاں قابل قبول ہوجائے اور اس کا یقینی علم کسی کو نہیں بلکہ اپنے
علم و عمل کی حالت پر نظر کرکے تو اگر عدم قبول یقینی ہو تو بعید نہیں پھر فخر کرنے کا کیا موقعہ نیز یہ
بھی معلوم ہے کہ علم و عمل کا اعتبار خاتمہ سے ہے اور اس کی بھی کسی کو خبر نہیں کہ ہمارا خاتمہ
کس حال میں ہونیوالا ہے اسلئے فخر کرنا اور اترانا اور ناز کرنا کیا زیبا ہے ہاں اس کو نعمت الٰہی
سمجھکر شکر کرتے رہو سبحان اللہ قرآن مجید کے دو جملوں میں عوام کی بھی اصلاح ہوگئی اور
خواص کی بھی خلاصہ آیت کا یہ ہوا کہ اصل شرف علم و عمل سے ہے جنکو یہ شرف حاصل نہو وہ
اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور محض شرف نسب پر قناعت نکریں اور جنکو شرف
علم و عمل حاصل ہو وہ اس پر فخر و ناز نہ کریں بلکہ نعمت الٰہی سمجھکر شکر کرتے رہیں بس اب
میں ختم کرتا ہوں کیونکہ عصر کا وقت آگیا ہے اور بحمد اللہ جس مضمون کا بیان کرنا مقصود تھا
وہ بقدر ضرورت بیان ہوچکا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو علم و عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم
عطا فرمائیں آمین وَصَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِهٖ
وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ ۝ وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ ہو والحمد للہ
الَّذِیْ بِعِزَّتِهٖ وَجَلَالِهٖ تَتِمُّ الصّٰلِحٰتُ" — اشرف علی رجب

۳۵۲

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

۳۵۳

کا وعظ مسمّٰی بہ

الانسداد للفساد

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبدالمنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر "الابقاء"

متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ملا

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقعہ پر اس کے بیان کا ارادہ تھا اور یہاں کے لئے کوئی دوسرا
مضمون بیان کرنے کا قصد تھا مگر وہاں بیان کا اتفاق نہوا اس لئے اسوقت اسی حدیث کو اختیار
کر لیا ہے تاکہ دوسرا مضمون اور دوسری حدیث تلاش نکرنا پڑے اور پہلے موقعہ کے لئے اسکے
اختیار کی اصل وجہ یہ تھی کہ حق تعالی نے یہ مضمون دل میں ڈالا تھا کیونکہ آج کل اس کی سخت
ضرورت ہے یوں تو ہر مرض کے متعلق علاج کی ضرورت ہے مگر جس خاص مرض کی وبا ر
کے زمانہ میں کثرت ہوتی ہے اس کے علاج و دوا کا خاص اہتمام ہوتا ہے اگر وبا رکا زمانہ ہو تو
پھر کسی مرض کے علاج کے لئے کوئی خاص مرجح نہیں ہوتا بلکہ جتنے امراض لوگوں میں موجود ہوں
ان میں سے ہر مرض یہ چاہتا ہے کہ میرا علاج بھی کیا جائے اور علاج کا طریقہ بیان کیا جاوے لیکن
جب کسی خاص مرض کا شیوع ہو تو اب اس کے بیان کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں اس کا شیوع
خود مرجح ہے پس جس طرح امراض جسمانی میں شیوع و عدم شیوع سے تفاوت ہوتا ہے اسی طرح امراض
نفسانی میں بھی کثرت مرجح ہوجاتی ہے جس مضمون کو میں نے اسوقت اختیار کیا ہے اس کے لئے یہی امر
مرجح کافی ہے کہ اس میں جس مرض کے مفاسد پر متنبہ کیا گیا ہے آجکل اس کی بہت کثرت ہے اور
آجکل سے مراد صرف یہی زمانہ حاضرہ نہیں بلکہ قریب دو تین سال سے اس کا شیوع ہو رہا ہے
اور اصل بنیاد تو اس کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ قتل سے پڑی ہے کیونکہ حدیث میں
ہے کہ جب میری امت میں تلوار نیام سے باہر ہو جائے گی تو پھر قیامت تک نیام نہ ہوگی علماء
سلف نے تصریح کی ہے کہ اس کی ابتدا حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے ہوئی ہے یہ پہلا واقعہ ہے
جس میں مسلمانوں کے اندر اختلاف و نزاع پیدا ہوا اس کے بعد پھر اختلاف بڑھتا ہی گیا کبھی
کبھی انہیں میں کا تو فرق ہوا مگر استیصال کبھی نہیں ہوا تو یہ مرض اسلئے بھی اشد ہے کہ بہت
پرانا ہے اور ظاہر ہے کہ پرانا بخار دق بنکر ہلاکت تک نوبت پہونچا دیتا ہے۔ نیز یہ اسواسطے
بھی سخت ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے تین
دعائیں کی تھیں ایک یہ کہ میری امت قحط عام سے ہلاک نہو دوسرے یہ کہ مخالفین کا ان پر
غلبہ عام نہو جس سے مسلمانوں کا استیصال ہو جائے تیسرے یہ کہ مسلمان آپس میں نہ لڑیں
پہلی دونوں دعائیں قبول ہوئیں اور بحمد اللہ آج تک برابر ان دونوں بلاؤں سے یہ امت

بعضے بد پرہیزی سے خطرناک ہوجاتے ہیں امراض نفسانی میں یہ تقسیم ہی نہیں ہے بلکہ یہاں سب امراض قابل علاج ہیں لاعلاج کوئی نہیں بلکہ ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراض جسمانیہ بھی فی نفسہ لاعلاج کوئی نہیں ابوداؤد و ترمذی کی حدیث میں ہے اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَمْ يَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ دَوَاءً غَيْرَ دَاءٍ وَّاحِدٍ وَهُوَ الْهَرَمُ خدا تعالیٰ نے کسی مرض کو پیدا نہیں کیا مگر اس کے لئے دوا بھی پیدا کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر مرض جسمانی بھی قابل علاج ہے باقی جو ظاہر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر بعضے مرض مایوس العلاج کیوں ہوتے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مرض کے ہمارے نزدیک لاعلاج ہونے سے اس کا فی نفسہ لاعلاج ہونا لازم نہیں ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کی دوا پیدا کی ہو مگر ہمارے علم میں نہ آئی ہو پس ممکن ہے کہ دق کے لئے بھی علم الٰہی میں اور واقع میں کوئی دوا ہو جو ہم کو نہیں معلوم ہوئی اسلئے ہم اسکو لاعلاج کہنے لگے سو اس تقریر سے تو امراض جسمانی میں بھی وہ تقسیم منفی ٹھہرتی ہے لیکن اگر تقسیم کو صحیح ہی فرض کر لیا جاوے اور حدیث کو اکثر پر محمول کیا جاوے تب بھی امراض روحانی میں وہ تقسیم نہیں ہے بلکہ تقسیم کہا جاتا ہے کہ ان میں ہر مرض کی دوا واقع میں بھی ہے اور ہم کو بتلائی بھی گئی ہے یہاں کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا بتلائی نہ گئی ہو سارا مطلب مکمل ہے اور مکمل کیسے نہ ہو جبکہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ نازل ہوا ہے۔ اگر کسی کا روحانی مرض لاعلاج ہوتا اور کوئی مریض روحانی مایوس العلاج ہوتا تو سب سے زیادہ مستحق اس کے وہ لوگ تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ نازل ہوا ہے مگر ان کا کفر بھی فی نفسہ لاعلاج نہ تھا بلکہ ان کی بدپرہیزی کی وجہ سے پیشین گوئی کی گئی ہے۔ بعض مفسرین کا قول تو یہ ہے کہ یہ آیت خاص خاص لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جن کا نام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا گیا تھا۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ بلا تعیین یہ ان سب لوگوں کے بارے میں جن کا خاتمہ کفر پر ہونیوالا ہے اور خاتمہ سے پہلے کسی کو بھی حتیٰ کہ ابوجہل کو بھی علی الاطلاق کافر نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ شاید اخیر میں اسلام لے آتا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید　　　　کہ مسلمان بودنش باشد امید

مگر اب زمانہ وحی کا زمانہ تھا اس وقت خاتمہ کا حال معلوم ہو سکتا تھا کہ کس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے اس لئے جن کفار کی نسبت صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے ان کے نام صحابہ نے اس آیت کی تفسیر میں تمثیلاً بیان کر دیئے۔ اور مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ان جیسے لوگوں کے بارہ میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہوگا سب کافروں کے بارہ میں نہیں ہے مگر اب تو خاتمہ کا حال معلوم ہونا دشوار ہے اگر ظاہر میں کسی کا کفر ہی پر خاتمہ ہو جب بھی یقینی طور پر کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم کو دل کا حال کیا معلوم ہے شاید وہ دل میں مسلمان ہوا ور زبان سے اقرار کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو یا ملا ہو اور اس نے تساہل کیا ہو تو بہت سے بہت گنہگار رہوگا مگر کافر نہ ہوگا بلکہ عند اللہ ایسا شخص مسلمان ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان مرتے ہوئے کلمۂ کفر کہتا ہوا جائے جب بھی کفر کا حکم مشکل ہے فقہا نے اس کا راز سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مرتے ہوئے کسی کے منہ سے کلمۂ کفر نکل جائے تو اس کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے شاید نزع کی وجہ سے اس کی عقل درست نہ ہو اور بیہوشی کی غفلت میں یہ کلمہ زبان سے نکلا ہو اور شریعت میں ایسا شخص مکلف نہیں رہتا بیہوشی میں جو فعل و قول بھی صادر ہو شرعاً معاف ہے یا ممکن ہے کوئی ہوش ہی میں کلمۂ کفر کہہ رہا ہو مگر اس کا مطلب وہ نہ ہو جو تم سمجھے بلکہ کچھ اور مطلب ہو پھر اتنے احتمالات کا ہوتے ہوئے حکم کفر کیونکر لگایا جا سکتا ہے اس پر مجھے ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا کہ جب وہ مرنے لگے نزع کی حالت ہوئی تو لوگ ان کو کلمہ تلقین کرتے تھے اور وہ اس سے اعراض کرتے اور منہ پھیر پھیر لیتے تھے لوگوں نے ان کے پیر بھائی کو جو بجائے شیخ کے تھے اس حال سے اطلاع کی کیونکہ اس اعراض سے سب پریشان ہو گئے تھے عوام کے نزدیک تو بس وہ نعوذ باللہ کافر ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور ان کو آواز دی تو فوراً آنکھیں کھولدیں اور تبسم فرمایا اس سے پہلے وہ کسی سے بات بھی نکرتے تھے کیوں؟ اسلئے کہ ؎

ہر کہ او از ہمزبانے شد جدا   بینوا شد گرچہ دارد صد نوا

وہ ان کے ہم زباں نتھے اب ہم زبان آگئے تو آنکھیں کھول دی اور باتیں کرنے لگے

دوسری وجہ حافظ شیرازی بیان فرماتے ہیں ؂

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ۔۔۔ تا بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

وہ اپنی حالت کسی اور سے اسلئے نہ کہتے تھے کہ اس کا سمجھنے والا کوئی نہ تھا اور ایسے لوگوں کے

سامنے اسرار کا بیان کرنا حرام ہے مولانا فرماتے ہیں ؂

ظالم آں قومیکہ چشمان دوختند ۔۔۔ از سخنہا عالمے را سوختند

یہ وہی لوگ ہیں جو نااہلوں کے سامنے اسرار کو بیان کرتے ہیں ان بزرگ نے اسی سلئے

نااہلوں کے سامنے اپنی حالت بیان نہیں کی جب اہل آ گیا تب کھلے اور کہا کہ حضرت

ان لوگوں کو منع کر دیجئے کہ مجھے تنگ نہ کریں فرمایا یہ تو کلمہ کی تلقین کرتے ہیں کہا یہ مجکو

مسمی سے اسم کی طرف لاتے ہیں خود محبوب کے سامنے ہوتے ہوئے نام کی کیا ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ جب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں تو آپ میرا نام لینے کی آپ کو کیا ضرورت

ہے مگر یہ ایک حال ہے اور صاحب مقام اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے کیونکہ؟ اس طرح کہ وہ مشاہدہ

مسمی کے ساتھ اسم کو بھی جمع کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ محبوب کو یہی پسند ہے کہ دیکھتے بھی جاؤ

اور ہمارا نام بھی لیتے رہو اسلئے وہ دونوں کو جمع کرتا ہے دوسرا راز اتفاقاً ابو نواس شاعر کے

موتہ سے نکل گیا کہتا ہے ؂

اَلَا فَاسْقِنِیْ خَمْرًا وَّقُلْ لِّیْ ھِیَ الْخَمْرُ ۔۔۔ وَلَا تَسْقِنِیْ سِرًّا اِذَا اَمْکَنَ الْجَھْرُ

یعنی مجکو شراب پلاتا جا اور یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے یہ شراب ہے آخر پیتے ہوئے اس کہنے کی

کیا ضرورت تھی اس کو عاشق ہی سمجھ سکتا ہے اس کہنے کی یہ ضرورت تھی تاکہ نام سنکر کانوں

کے ذریعہ سے لذت حاصل ہو اور دیکھکر آنکھ کے ذریعہ سے لذت حاصل ہو اور پیکر زبان کے

واسطے سے لذت حاصل ہو الغرض تمام جسم اس کی لذت سے بھرا ہوا ہو یہی غرض صاحب

مقام کی ہوتی ہے مسمی کے ساتھ اسم کو جمع کرتے ہیں تاکہ قلب کیساتھ زبان اور کان بھی لذت

ذکر میں سرشار ہوں ہر بن مو سے اس کی یاد ہو مگر صاحب حال مشاہدہ کیوقت اسم کو جمع نہیں

کر سکتا اس کی زبان ہی اسوقت نہیں اٹھتی تو وہ بزرگ اس حال میں تھے جو شیخ کو معلوم ہوا یہاں

عوام کیا سمجھنے اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ صاحب مقام نہ تھے ممکن ہے وہ صاحب مقام

بھی ہوں لیکن اہل مقام پر بھی حال کا غلبہ ہو سکتا ہے گو کم ہوتا ہے لیکن اس کا کم کا کوئی وقت مقرر نہیں ممکن ہے ان بزرگ پر وقت موت ہی کے غلبہ ہوا ہو بہر حال اگر شیخ نہ آتے تو لوگ یوں کہتے کہ فلاں کافر ہے ایمان ہو کر مرا مگر شیخ نے حقیقت حال معلوم کر کے سب کو فرمایا کہ یہ تو اسوقت بڑے درجہ پر ہیں مشاہدۂ ذات میں مشغول ہیں ان کو مت چھیڑو اب لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ ؂

درنیابد حال پختہ ہیچ خام	پس سخن کوتاہ باید والسلام

غرض اسوقت تو کسی کے کفر پر یقین نہیں ہو سکتا مگر جس زمانہ میں اَلَّذِيْنَ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ عہ کا مشاہدہ ہو سکتا تھا اس وقت بھی یہ لوگ مایوس العلاج اور ان کا کفر لاعلاج نہ تھا بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں تھا اس طرح سے کہ ایمان لے آتے گو اس کا عدم وقوع حق تعالےٰ کو معلوم تھا مگر عدم وقوع کے یقینی ہونے سے اس کا اختیاری ہونا منفی نہیں ہوا اور میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا بھی ہے تو مریض کو مجبور نہیں کرتا بلکہ بعض تو صاف کہدیتے ہیں کہ یہ مریض بچنے کا نہیں اس کو جو چاہو دو۔ اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبراً دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں وہ اپنے قواعد طبیہ سے اس مرض کو لاعلاج سمجھتا ہے مگر یہ سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں وہ قدرتِ خداتعالیٰ پر نظر کر کے امید وار ہے ؂

عقل در اسباب می دارد نظر	عشق میگوید مسبب را نگر

مگر حق تعالیٰ کو تو علم غیب ہے اگر خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی تو یہ دلالت قطعی ہوتی کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے متعلق علم ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا عہ کے خلاف تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے کیونکہ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ عہ میں خطاب تام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جسمیں تمام کفار کو توحید و ایمان

عہ جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے ۲۹۰

عہ بہ تغیر مضمون ۲۱۲ ظ

عہ اللہ تعالیٰ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق

عہ اے لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو

اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فرمایا گیا ہے۔ پھر اس پر اجماع بھی ہے کہ ابوجہل و ابولہب وغیرہ ایمان کے مکلف تھے اگر وہ ایمان کے مکلف نہ ہوں، اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ نازل فرما دیا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کے ساتھ ہی وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس سے مستثنیٰ نہ تھے اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ نازل ہوا ہے ان کا مرض روحانی لاعلاج نہ تھا اگر روحانی مطب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لاعلاج نہیں رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی جواب یہ ہے کہ یہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضور کو بتلا دیا مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے لَا یُؤْمِنُ اَبُوْ جَھْلٍ وَنَحْوُہٗ مَعَ بَقَاءِ اخْتِیَارِہٖ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا ان کے اختیار سے ہوگا یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان پر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا خوب سمجھ لو۔ اس سے زیادہ کلام کرنا خوض فی القدر جس کی اجازت نہیں غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا اور جب وہ اختیار سے خارج نہیں تو اس کی تدابیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو تو چاہیے کہ آج سے حفظ قرآن کو ترک کر دیا جائے کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ٭ جس میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نعوذ باللہ قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو لکھنا بھی چھوڑ دو چھاپنا بھی چھوڑ دو اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں انکو دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اللہ ہی کافی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو محافظ بھی ہے جتنے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی

کریں گے کیونکہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ میں سب طریقے آ گئے مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہو چکی ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ یہاں تو آپنے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی وارد ہونے سے آپنے یہ تجویز کر لیا کہ جب پیشین گوئی ہو چکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں اس کا جواب دیجئے آخر دونوں میں ما بہ الفرق کیا ہے فرق کا بتلا دیجئے۔ اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ط کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سعی کریں گے اور ہم حفاظت کے طریقے انکے قلوب میں ڈالدیں گے کہ وہ اسکو یاد بھی کریں گے لکھیں گے بھی پڑھیں پڑھائینگے بھی گویا اس طرح ہم ہی قرآن کے محافظ ہیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ بھی دونوں جگہ مشترک ہے یعنی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد آپ کی حفاظت کو بھی اسمیں دخل ہے اسی طرح نا اتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی بد پرہیزی کو اس میں دخل ہے اور اس پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ با اختیار خود بد پرہیزی کرینگے اسلئے نا اتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ خدا اور رسول کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اسکو مستلزم نہیں کہ وہ دائرۂ تکلیف سے باہر ہو جاوے اور اس کی تدبیر نہ کی جاوے اور اسکا راز وہی ہے جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں یہاں جو پیشین گوئی بھی ہوتی ہے مریض کے بد پرہیز ہونیکی وجہ سے ہوتی ہے پس اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ نا اتفاقی کا دور کرنا آپ کی قدرت سے باہر ہے تو اسلئے اس کی تدبیر ہی نکرنا چاہئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگ اس سے با اختیار خود پرہیز نہ کریں گے اسلئے یہ مرض باقی رہے گا لیکن اگر علاج کریں تو علاج کے مفید ہونیکی یہاں نفی

نہیں شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اگر سب نے اس مرض کا علاج کر کے اتفاق کر لیا تو حدیث کی پیشین گوئی غلط ہو جاتی ہے جواب یہ ہے کہ مگر واقع میں سب ایسا کریں گے نہیں بلکہ تھوڑے بہت ضرور ایسے رہیں گے جو نااتفاقی کرتے رہیں گے مگر ان میں تم ہی کو داخل ہونے کی کیا ضرورت ہے اور اس کی کیا دلیل ہے کہ تم ہی اس کے مصداق ہو۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ میں اس پیشین گوئی کے سچا کرنے کے لئے نااتفاقی کرتا ہوں تاکہ اس کا مصداق موجود رہے یہ غلط نہ ہو جائے تو اس سے کہا جائے گا کہ آپ کو اسکے سچا کرنیکی ضرورت نہیں تم کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا قیامت میں آپ سے یہ سوال ہرگز نہ ہوگا کہ تم نے ہماری پیشین گوئی کے سچا کرنے کا اہتمام کیا تھا یا نہیں بلکہ وہاں تو آپ سے ان امور کا سوال ہوگا جن کا امر کیا گیا ہے اور پیشین گوئی کے سچا کرنے کا آپ کو امر نہیں ہوا لہذا یہ جواب مسموع نہ ہوگا میں اس کی نظیر دنیا میں آپ کو دکھلاتا ہوں وہ یہ کہ پولیس میں مردم شماری کا تجربہ سے اوسط مقرر ہوتا ہے کہ اتنے آدمیوں میں اتنے بدمعاش اور جرائم پیشہ ضرور ہوتے ہیں تو کیا کوئی مجرم مجسٹریٹ سے یہ کہسکتا ہے کہ میں نے تو جرم اسلئے کیا ہے کہ پولیس کا قاعدہ میں نے دیکھا تھا کہ بدمعاشوں کا اوسط اتنا ہے تو میں نے اس اوسط کو پورا کرنا چاہا تاکہ یہ قاعدہ غلط نہ ہو جائے اس لئے میں مجرم نہیں ہوں بلکہ حقیقت میں خیر خواہ سرکار ہوں تو کیا مجسٹریٹ اس کا یہ عذر سنیگا ہرگز نہیں بلکہ وکیل سرکار فوراً کہیگا کہ نالائق کیا تیرا نام بھی اوسط میں لکھا ہوا تھا پھر تو اس میں کیوں داخل ہوا۔ جی یہ اوسط تو واقعہ ہے قانون تو نہیں ہے یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اوسط کو دیکھکر خواہ مخواہ اس کے پورا کرنیکے کے لئے جرم کیا جاوے اسی طرح یہ پیشین گوئی حکم تکوینی ہے حکم تشریعی نہیں۔ اب میں اس سے زیادہ اس مسئلہ کی توضیح نہیں کر سکتا کہ سر قدر میں خوض ہو جائے گا۔ میں تو اس حدیث کو پڑھکر ہی پچھتایا کیونکہ اس کو پڑھکر اتنا بڑا کام میرے سر پڑ گیا کہ دقیق اشکالات کو حل کرنا پڑا مگر پچھتانے کی بھی کیا ضرورت ہے اگر میں اس حدیث کو پڑھکر اشکالات رفع نہ کرتا تو خدا سلامت رکھے اردو مسلمانوں کو کبھی نہ کبھی اس کی بدولت یہ حدیث آپ کی نظر سے گذر جاتی کیونکہ آجکل اردو میں حدیث و فقہ کی بہت کتابیں ترجمہ ہو گئی ہیں تو کسی اور جگہ دیکھکر آپ کو یہ شبہات واقع ہوتے اسلئے اچھا ہوا کہ میں

سب کا جواب دے دیا۔ اور اس تقریر سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ قرآن و حدیث کا ترجمہ دیکھ لینا علماء سے مستغنی نہیں کر سکتا بتلائیے اگر آپ اس حدیث کا ترجمہ دیکھ لیتے تو کیا اس سے یہ حقیقت آپ کی سمجھ میں آسکتی تھی جواب سمجھ میں آئی اور محض ترجمہ سے یہ اشکالات حل ہو سکتے تھے جو اس وقت حل ہوئے کبھی نہیں مگر حیرت ہے کہ آجکل اردو تراجم نے لوگوں کو علماء سے مستغنی کر دیا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ اردو میں طب کی کتابوں کا بھی ترجمہ ہو گیا ہے مگر باینہمہ اطباء سے استغناء نہیں ہوا اور جو لوگ اردو رسائل طبیہ دیکھ کر اطباء سے مستغنی ہوئے بھی ہیں ان کو سب لوگ احمق سمجھتے ہیں مگر یہاں اس حماقت میں سب مبتلا ہیں جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آجکل بعض لوگ جو بندۂ اغراض ہیں اس کی کوشش کرتے ہیں لوگوں کو اطباء حقیقی و علماء حقیقی سے پھیر کر اپنی کتابوں کی طرف یا اپنی طرف مائل کریں شاید یہاں کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ جب اردو ترجمہ کے بعد بھی علماء سے استغناء نہیں پھر ترجمہ ہی کیوں کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ مسائل شرعیہ میں دو دقتیں تھیں ایک زبان کی ایک مضمون کی ترجمہ سے زبان کی دقت رفع ہو گئی اور یہ بھی بہت بڑا نفع ہے کہ آدھی محنت کم ہو گئی لیکن زبان اردو ہو جانے سے مضامین کی دقت رفع نہیں ہوتی دیکھئے آجکل قانون سرکاری کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے جس سے زبان انگریزی کے سیکھنے کی دقت تو کم ہو گئی ہر اردو خوان اسکو بے تکلف پڑھ سکتا ہے مگر کیا زبان اردو ہونے سے مضامین کی دقت بھی رفع ہو گئی کہ ہر شخص اس کے ہر مقام کو خود ہی سمجھ لیا کرے ہرگز نہیں میں نے خود ایک بار قانون کی اردو کتاب دیکھی تھی مگر ایک مقام کا مطلب نہ سمجھ سکا کچھ کا کچھ سمجھ گیا پھر ایک وکیل نے اس کا مطلب صحیح بیان کیا تب مجھے اپنی غلطی پر تنبہ ہوا پھر قانون شرعی کے اردو میں ہو جانے سے آپ علماء شرع سے کیوں کر مستغنی ہو سکتے ہیں غرض چونکہ آجکل اردو میں رسائل دینیہ کی کثرت ہو گئی ہے اسلئے اندیشہ تھا کہ کسی کتاب میں یہ حدیث آپ دیکھ لیتے اور اشکالات پڑتے اس لئے میں نے اسوقت شبہات حل کر دیئے۔ اب مطلع بے غبار ہو گیا اب میں اپنی اصلی غرض کی طرف عود کرتا ہوں کہ نا اتفاقی بہت سخت مرض ہے اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دن بدن ترقی

پذیر ہے ہمیں دوسری قوموں سے تو کچھ غرض نہیں اور سچ یہ ہے کہ ہم ان کی حالت کو جانتے بھی نہیں اور جان بھی لیں تو کیا کریں گھر سے فرصت ہو تو کسی کی خبر لی جائے یہاں ہم کو اپنے ہی گھر سے فرصت نہیں اگر آپ کا ایک بھائی بیمار ہو اور ایک پڑوسی اور پڑوسی بھی بدخواہ تو بھائی کو چھوڑ کر پڑوسی کے علاج کو آپ کبھی نہ دوڑیں گے ہاں بھائی سے فراغت ہو جائے تو پھر یہ ہمت کی بات ہے کہ پڑوسی کا معالجہ بھی کر دیا جائے مگر یہاں تو اپنے ہی گھر میں اپنے بھائی بیمار پڑے ہیں ہم کو انہی کے علاج سے فرصت نہیں ہمارا گھر اسلام ہے اور گھر والے اہل اسلام ہیں سو خود مسلمانوں ہی میں نا اتفاقی کا مرض دن بدن ترقی پر ہے جس کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کو نا اتفاقی کا مذموم و مضر ہونا تو مسلم ہے مگر اس کا درجہ معلوم نہیں کہ اس کا ضرر کس درجہ کا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ اب تک اس مرض میں کمی نہیں ہوئی حالانکہ رات دن سب کی زبان پر یہ بات آتی ہے کہ آجکل مسلمانوں کو تنزل ہے اور اسکی وجہ سب یہ بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں میں اتفاق نہیں اور اتفاق کی ضرورت پر ہمیشہ تقریریں ہوتی ہیں مگر پھر بھی نا اتفاقی دور نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ضرر کا درجہ معلوم نہیں اسی سے اس سے اجتناب کا اہتمام نہیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ اجتناب کا اہتمام اسی چیز سے کیا جاتا ہے جس کے ضرر کا درجہ معلوم ہو جائے چنانچہ اگر کسی کو سنکھیا کا مضر ہونا تو معلوم ہو مگر درجہ معلوم نہ ہو تو اسکو اس سے اجتناب کرنے کا زیادہ اہتمام نہ ہوگا اور جس کو درجہ معلوم ہو کہ سم قاتل ہے وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا اس لئے ضرورت ہے کہ نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم کیا جاوے کیونکہ درجہ معلوم نہ ہونے ہی سے اس سے اجتناب کم ہو رہا ہے اور اجتناب کم ہونے کے بعد ارتکاب ہونے لگا اور ارتکاب کے بعد اب یہ حالت ہو گئی کہ بعض لوگوں کو نا اتفاقی کی مذمت سے بھی کبیدگی ہوتی ہے کیونکہ اس کو نا اتفاقی کا مزا پڑ گیا ہے جو اب صفت لازمہ ہو گئی اور ایسی صفات کو ذات سے لا عین و لا غیر کا تعلق ہے تو صفت بمنزلہ ذات کے ہو گئی اور اپنی ذات ہر ایک کو محبوب ہے اسلئے اسکی صفات بھی محبوب ہیں اور محبوب کی مذمت کسی کو گوارا نہیں ہوتی تو اب وہ نا اتفاقی کی مدح کرنا چاہتا ہے مگر اس کی مدح کیونکر کرے کیونکہ نا اتفاقی کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے اس کی مذمت کا انکار تو بہ

کر ہی نہیں سکتا تو اب اس کی کوشش کرتا ہے کہ یہ ثابت کرے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ نااتفاقی اور فساد ہی نہیں بلکہ اصلاح ہے اب وہ حال ہو جاتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ط جو کہ منافقین کی حالت میں وارد ہوا ہے اب انکو مالیخولیا ہو جاتا ہے اور مالیخولیا کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا مریض اپنے کو مجنوں نہیں سمجھا کرتا پھر اس کو دوائیں کیوں کر پلائی جائے اور اسے کیونکر یقین دلایا جائے کہ تو مجنوں ہے او ریہ سارا فساد اس کا ہوا کہ اس شخص کو شروع ہی میں نااتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم نہ ہوا اگر درجہ معلوم ہوتا تو قلت اہتمام اور عدم مبالات اور ارتکاب فساد کی نوبت ہی نہ آتی اسلئے میں نے اسوقت یہ حدیث اختیار کی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نااتفاقی کے ضرر کا درجہ بتلایا ہے فرماتے ہیں اِیَّاکُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَیْنِ فَاِنَّھَا ھِیَ الْحَالِقَۃُ یعنی اپنے کو باہمی فساد سے بچاؤ کیونکہ باہمی فساد مونڈنیوالی چیز ہے اسمیں ابہام وتفسیر کی بلاغت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول تو حالقہ فرمایا جس کا متبادر یہ ہوتا ہے کہ فساد کی وجہ سے سر کے بال منڈ جائیں گے پھر سامع کو اس کے مطلب کا انتظار ہوا کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ہم نے بارہا نااتفاقی کی ہے مگر سر کے بال کبھی نہیں گرے تو ابہام سے سامع کو تفسیر کا مشتاق بنا کر آگے فرماتے ہیں لَآ اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے سر کے بال منڈ جاتے ہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس سے دین منڈ جاتا ہے اور منڈنا کسے کہتے ہیں منڈنا یہ ہے کہ خربوزہ سا سر نکل آئے بال کا نشان تک نہ رہے تو حاصل یہ ہوا کہ فساد باہمی سے دین کا بالکل صفایا ہو جاتا ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نااتفاقی اور فساد باہمی کے ضرر کا درجہ بتا دیا ہے اور واقعی اس سے زیادہ کیا ضرر ہوگا کہ اس سے دین کا صفایا ہی ہو جاتا ہے مگر قربان جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ کے عتاب میں بھی رحمت ہے ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ٭ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

گو اس مقام پر حضور نے فساد باہمی پر بہت بڑی وعید فرمائی ہے مگر ساتھ ساتھ اس میں امید

ت جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت کرو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۱۲ منہ

۳۶۹

کی بھی جھلک ہے بالکل ہی نا امید نہیں کیا کیونکہ آپ نے فساد کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ دین کو مونڈھ دیتا ہے اور مونڈنے سے اسوقت تو اوپر سے صفایا ہو جاتا ہے مگر اندر جڑ باقی رہ جاتی ہے کہ اگر روز استرہ نہ پھیرا جائے تو اگلے دن کھونٹی نکل آتی ہے تو اس میں اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اگر کوئی شخص روز روز مونڈانے کا شغل نہ کرے تو چند روز میں کھونٹی نکل آئیگی اس کے بعد بال اور بڑھیں گے پھر زلفیں ایسی ہونگی کہ لوگ ان میں پھنسا کرینگے اور وہ حال ہوگا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے　　　اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایک زبان والے نے اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا تھا کہ ہم اور تم اور میر صاحب اس کی زلفوں میں پھنسکر سب جیل خانہ چلا گیا یہ تو ایک لطیفہ تھا غرض کیا رحمت ہے کہ ایک ہی لفظ میں غضب بھی ہے اور رحمت بھی ہے آپ نے تَحْلِقُ الدِّيْنَ فرما کر ڈرایا دھمکایا بھی ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ نا امید نہو نا فساد سے دین کی جڑ نہیں جاتی اگر کوشش کروگے تو جڑ سے شاخ اور شاخ سے پھل بھی نکل آویں گے۔ اے صاحبو! غضب کی حالت میں جس ذات کی یہ رحمت ہے ان کی رحمت تو کیا کچھ ہوگی اسی کو سعدی فرماتے ہیں ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو　　　کہ دارد چنیں سید پیشرو

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح دعا فرمایا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُوْنَ فَاَيُّمَا رَجُلٍ اٰذَيْتُهٗ اَوْ شَتَمْتُهٗ اَوْ لَعَنْتُهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ صَلٰوةً وَّزَكٰوةً وَّ قُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ بِهَا اِلَيْكَ (اے اللہ میں بشر ہوں مجھے بھی غصہ آجاتا ہے جیسا اوروں کو غصہ آتا ہے تو جس شخص کو (جوش غضب میں) میں کچھ ایذا دوں یا برا بھلا کہوں یا بددعا کروں تو ان سب کو اس کے حق میں رحمت خاص اور سبب تزکیہ اور موجب قربت بنا دیجئے جس سے آپ اسکو اپنا مقرب بنا لیں) سبحان اللہ کیا رحمت ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ میری بددعا بھی دعا ہی ہو کر لگے تو اُنکی عجیب شان ہے کہ غضب میں بھی آپ رحمت ہی فرماتے ہیں اسپر شاید کوئی خوش ہو

۳۶۴

کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا بھی دعا ہی ہو کر لگتی ہے تو اب جتنی وعیدیں حضور نے بیان فرمائی ہیں سب سے بےفکری ہے کیونکہ آپ کی وعید میں بھی عید ہوتی ہے ذرا کوئی اردو خوان جو قرآن وحدیث ومسائل فقہ کا ترجمہ دیکھکر علماء سے اپنے کو مستغنی سمجھتے ہیں اس اشکال کا جواب تو دیدیں انشاء اللہ منہ ہی تکتے رہیں گے اور کچھ جواب نہ آئے گا بات یہ ہے کہ محض ترجمہ دیکھنے سے مضمون کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی اور جب تک حقیقت منکشف نہو اس وقت تک اشکالات کا جواب بھی سمجھ میں نہیں آتا چنانچہ آپ لئے اردو کتابیں تو دینیات کی بہت پڑی ہونگی مگر ذرا اس کا جواب دیجیئے۔ صاحبو حقیقت کا انکشاف محققین کے پاس رہ کر ہوتا ہے لیجیئے میں اس شبہ کا جواب دیتا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ یہ حدیث انہی بددعاؤں کے متعلق ہے جو غلبۂ بشریت سے بحالت غضب نکل جائیں چنانچہ خود شروع میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ کا لفظ خود اس پر دال ہے کہ یہ ان بددعاؤں کے متعلق ہے جن کا منشا بشریت ہے اور بددعا بغلبۂ عشق تبلیغ کی حالت میں صادر ہو ان کے بارے میں تو ایک حدیث میں یہ وارد ہے سِتَّۃٌ لَعَنْتُھُمْ وَلَعَنَھُمُ اللہُ وَکُلُّ نَبِیٍّ یُجَابُ الحدیث رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِی الْمَدْخَلِ وَرَزِیْنٌ فِیْ کِتَابِہٖ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر (کہ چھ شخصوں پر میں نے لعنت کی ہے اور خداتعالیٰ بھی لعنت کرتا ہے اور ہر نبی کی درخواست قبول ہوتی ہے الی آخرہ اس میں تصریح ہے کہ میری بددعاء لعنت قبول ہوگی اور ان پر خداتعالیٰ کی بھی لعنت ہوگی غرض مخالفت احکام کے سبب سے جو بددعا ہوگی اس کی یہ شان ہوگی ع

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اور یہ شان ہوگی ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

اور جب آپ کی بددعا حق تعالیٰ کی بددعا ہے تو گویا یہ دعا خود حق تعالیٰ ہی فرما رہے ہیں اور اس کی یہ شان ہوگی ؎

چوں خدا از خود سوال وکد کند پس دعائے خویشتن چوں رد کند

ورمولانا پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ حضور کی بددعا کو حق تعالیٰ کی بددعا اور از خود سوال کد کردن

کہتے ہیں یا قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَاِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ جس کی تفسیر میں مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں اِذَا قَرَأَ رَسُوْلُنَا جِبْرَئِيْلُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ یہاں حق تعالیٰ جبرئیل کی قرأت کو اپنی قرأت فرما رہے ہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا جبرئیل علیہ السلام سے کچھ کم ہیں اگر آپ کے فعل دعا کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جاوے تو بعید ہی کیا ہے۔ لوگ صوفیوں پر مسئلہ وحدۃ الوجود میں اعتراض کرتے ہیں وہ ذرا بتلائیں کہ صوفیہ نے کیا ھوسہ ملا دیا ہے وہ بھی وہی کہتے ہیں جو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں فَاِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ مگر صوفی بیچارے ہر زمانہ میں بدنام رہے ہیں کیونکہ وہ خاموش اور صابر ہوتے ہیں اور زمانہ کا قاعدہ ہے کہ لوگ صبر کرنیوالوں کو زیادہ دباتے ہیں اور جو سامنے تنکر کھڑا ہو جاوے اس سے بھاگتے ہیں مگر معلوم بھی ہے وہ صبر کیوں کرتے ہیں وہ صبر کر کے حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ کرتے ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ معاملہ کو اسی کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں پھر وہ انتقام کیسا ہوگا اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے لئے ایسے غضبناک ہوتے ہیں جیسے شیر اپنے بچوں کے لئے غضبناک ہوا کرتا ہے پھر کبھی تو دنیا میں ہی مزا چکھا دیتے ہیں اور کبھی آخرت پر پوری سزا کو ملتوی رکھتے ہیں اور دنیا میں کبھی تو ایسی سزا دیتے ہیں جسکو یہ شخص بھی سزا سمجھتا ہے اور کبھی اس طرح میٹھی مار مارتے ہیں کہ یہ اسکو انعام سمجھتا ہے چنانچہ ایک مجذوب کے کسی سپاہی نے ایک ہنٹر مار دیا مجذوب نے بددعا دی کہ اے اللہ اس کو تھانہ دار کر دے نہ چند ہی روز میں تھانہ دار ہو گیا اب تو بڑا خوش ہوا کہ مجذوب کی دعا قبول ہو گئی چل کر اس سے اپنی خطا معاف کرانا چاہئے اور کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہیے چنانچہ مٹھائی لیکر گیا غنیمت ہے کہ اس نے دوسرا ہنٹر نہ مارا اور نہ آجکل کے عقلاء تو شاید ایسا ہی کرتے کہ جب اس کے ایک ہنٹر مارنے سے یہ عہدہ ملا تو شاید اور مارنے سے کوئی دوسرا بڑا عہدہ مل جائے گا غرض جب وہ مٹھائی لیکر گیا اور کہا جی آپ کی دعا سے مجھے وہی عہدہ مل گیا جو آپ نے فرمایا تھا اس کی خوشی میں یہ ہدیہ لایا ہوں اور اپنی گستاخی سے شرمندہ ہوں کہ میں نے برائی کی اور آپ نے بھلائی کی دعا کی اب میں جانتا ہوں کہ مجھے

کچھ خدمت لیجئے مجذوب نے کہا ہم کو ایسے بچھو لا دو جو کالے ہوں اور ایک ایک بالشت لانبے ہوں اس نے کئی روز بعد آکر کہا حضور ایسے بچھو تو ملتے نہیں مجذوب نے کہا چل میں بتلاؤں ایک قبر پر لے گیا اور اس کو کھدوانا تو ایسے ایسے سیکڑوں بچھو اسی لاش کو لپٹے ہوئے دیکھے دیکھکر ڈر گیا اور معلوم ہوا کہ یہ ایک ظالم تھانہ دار کی قبر ہے اس وقت مجذوب نے کہا بچہ میں نے دعا نہیں دی تھی یہ بددعا دی تھی کہ تجھکو بھی ایسی ہی سزا ملے۔ کیونکہ اب تو حکومت کرکے مخلوق پر ظلم کرے گا تو قبر میں بالشت بھر لمبے بچھو تجھے لپٹیں گے تو یہ سمجھا کہ میں نے تیرے واسطے بھلائی کی دعا کی تھی۔ تو صاحبو! کبھی اہل اللہ کی ایذا رسانی سے حق تعالیٰ ایسی میٹھی سزا بھی دیا کرتے ہیں جسکو آپ نعمت سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ وبال جان ہے پس اہل اللہ کو تکلیف پہونچا کر مطمئن نہ رہنا چاہیئے الغرض صوفیہ چونکہ صابر ہوتے ہیں اس لئے ان پر سب اعتراض کرتے ہیں ورنہ ان کا یہ قول (یعنی وحدۃ الوجود کا مسئلہ) شریعت کے خلاف نہیں اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں اس کو ذرا بسط کے ساتھ بیان کرتا مگر اس وقت ایک ہی آیت پر اکتفا کرتا ہوں بہرحال تبلیغ کے ذیل میں جو وعیدیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں وہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں لہذا ان سے بیفکر نہ ہونا چاہیئے انہی وعیدوں میں سے ایک وعید یہ ہے جو حضور نے فساد ذات البین کے متعلق بیان فرمائی ہے مگر عارفین کا مسلک ہے کہ وہ وعید کا بیان کرتے ہوئے ناامید نہیں کیا کرتے کیونکہ وعید کا جو مقصود ہے یعنی آئندہ کیلئے زجر اور اصلاح وہ ناامید کرنے سے فوت ہو جاتا ہے سو ناامیدی سے اول تعطل کی نوبت آتی ہے کہ آدمی غلبہ حزن کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا پھر تعطل کے بعد گناہوں پر جرأت ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وعید خالص کے سننے سے آدمی مر بھی جاتا ہے چنانچہ حضرت غوث اعظمؒ کا واقعہ ہے کہ آپ نے چالیس سال تک رحمت حق کا بیان فرمایا پھر خیال ہوا کہ شاید لوگوں کو اعمال سے بیفکری ہونے لگی ہوگی اسلئے اسکے بعد آپ نے ایک دن خالص ترہیب کا بیان فرمایا اس کا یہ اثر ہوا کہ مجلس وعظ میں سے کئی جنازے اٹھائے گئے وہ بیان سنکر ان کے دل پھٹ گئے الہام ہوا کہ اے عبدالقادر کیا ہماری رحمت اتنی ہی تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہو گیا ہمارے بندوں کو مار دیا اسی لئے

محتقین غضب کے ساتھ رحمت کا بیان بھی کرتے ہیں اور وعید کے ساتھ امید کو بھی ملا دیتے ہیں تاکہ ناامیدی نہو اور نوبت ہلاک نہ پہونچے چنانچہ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فساد ذات البین پر جو وعید بیان فرمائی ہے اس میں لفظ تحلق اختیار فرمایا ہے جس میں وعید کے ساتھ امید بھی ملی ہوئی ہے کہ اس سے دین منڈتا ہی ہے جڑ سے زائل نہیں ہوتا کیونکہ مونڈنے سے پھر بھی بال نکل آتے ہیں بلکہ بعض دفعہ پہلے سے بھی سخت نکلتے ہیں مگر خدا کے لئے تم اس غرض سے مونڈنے کا ارادہ نہ کیجیو کیونکہ شاید اسی دن خاتمہ ہو جائے تو مُنڈے کے منڈے ہی رہ جاؤگے پس اس وعید سے ڈرنا چاہیے اور قصداً نااتفاقی پر اقدام نہ کرنا چاہیے اور اگر کبھی صادر ہو جائے تو اصلاح سے ناامید بھی نہ ہونا چاہیے۔ یہاں سے ایک مسئلہ اور مستنبط ہوا وہ یہ کہ آجکل جو عموماً اتفاق کے فضائل اور نااتفاقی کی مطلقاً مذمت بیان کی جاتی ہے اور علما بھی عموماً اس مرض میں مبتلا ہیں یہ غلط ہے کیونکہ حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نااتفاقی اس واسطے مذموم ہے کہ یہ دین کو مضر ہے۔ اور اگر دین کو مفید ہو گو دنیا کو مضر ہو تو وہ مذموم نہیں چنانچہ ایک نااتفاقی وہ بھی ہے جسکو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا حق تعالیٰ فرماتے ہیں قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ الآیۃ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے اپنی قوم سے صاف کہدیا کہ ہم میں اور تم میں عداوت وبغض ہمیشہ کے لئے پیدا ہو چکا ہے جب تک کہ تم اللہ وحدہ پر ایمان نہ لاؤ تو کیا اس نااتفاقی کو بھی کوئی بھی مذموم کہسکتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح اس کے مقابلہ میں ایک اتفاق وہ تھا جسکے بارہ میں ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ الخ جس سے صاف معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں جو کفار تھے ان میں باہم اتفاق واتحاد کامل تھا مگر کیا اس اتفاق کو کوئی محمود کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کی بنیادیں اکھاڑ کر پھینکدی تھیں کیونکہ یہ

اتفاق فقط حق پر تھا پس خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب ومحمود ہے جبکہ دین کو مفید ہو اور نااتفاقی تبھی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نااتفاقی دین کو مفید ہو تو اسوقت وہ نااتفاقی مطلوب ہوگی۔ اہل دنیا بھی اپنے معاملات میں اسکو خوب سمجھتے ہیں چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعی علیہ عدالت سے مراجعہ کرتے ہیں تو اس وقت دونوں سے کبھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ کیونکہ اس دعوے سے تمہارے اندر نااتفاقی پیدا ہو گئی ہے اور نااتفاقی مذموم ہے بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص خلاف حق پر ہو اس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کی طرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوے سے دستبردار بھی ہو جائے تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔ صاحبو اگر نااتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو چاہیئے کہ جب کوئی دعوی عدالت میں دائر ہو تو جج مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ نااتفاقی کے مجرم دونوں ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہ عقلا ایسی رائے دے سکتے ہیں بلکہ یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ گو نااتفاقی دونوں طرف سے ہے مگر ایک طرف سے حمایت حق کیلئے ہے اور دوسری طرف سے حمایت باطل کیلئے پس تفتیش وتحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہو اس کی ڈگری ہونا چاہیئے۔ اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے یہاں تو سب کا اتفاق ہے کہ نااتفاقی مطلقاً مذموم نہیں۔ مگر افسوس دین کے معاملہ میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں کہ نااتفاقی چھوڑ دو اور اتفاق پیدا کرو۔ صاحبو آخر یہاں یہ کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ ان دونوں میں سے کس کی نااتفاقی حمایت حق کے لئے ہے اور کس کی حمایت باطل کیلئے پھر جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جاتے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دبایا جائے اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرتے ہیں تو بتلائے کہ صاحب حق صاحب باطل کے ساتھ کیوں کر اتفاق کرے۔ دونوں طرف سے اگر اتفاق ہو سکتا ہے تو عقلاً اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ صاحب حق حق کو چھوڑ دے اور دونوں باطل پر ہو جائیں یعنی دیندار دین کو چھوڑ کر بددین ہو جائے ایک یہ کہ دین دار لوگ بددین

۴۷۲

پر قائم رہے اور بد دین بد دینی چھوڑ دے تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ تو دیندار دین کو چھوڑے اور کچھ بد دین بد دینی کو چھوڑے اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہو سکتا ہے اب عقلاء خود فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کونسی صورت عقل کے مطابق ہے یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق کہا جاوے گا کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بد دین بد دینی کو چھوڑ دے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دیندار کو تو بد دینی سے نااتفاقی کا حق ہے مگر بد دین کو دیندار سے نااتفاقی کا حق نہیں بلکہ اس کو دیندار کے ساتھ اتفاق کرنا چاہئیے۔۔۔ صاحبو! یہ وہ افتراق ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے کیونکہ آپ کی نبوت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے آپ نے آ کر اس اتفاق کو توڑ دیا اور باپ بیٹوں کو باہم جدا جدا کر دیا اور یہ وہ افتراق ہے جسکو حق تعالیٰ بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایۂ بشارت بتلایا ہے جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہے اور اسی لئے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے جو لوگ حق پر ہوں ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کی ساتھ فصل کا حکم ہے پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آجکل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں دونوں کو مورد ملامت بنانے لگتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہیں جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بد دین ہو جانا چاہئے اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کرے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو اول یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون۔ جب حق متعین ہو جائے تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جائے بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ اور اگر آپ کو تحقیق حق کی

فرصت یا لیاقت نہیں تو آپ سے دخل در معقول دینے کو کس نے کہا ہے اپنے گھر بیٹھئے اور تحقیق سے پہلے کسی کو برا نہ کہئے جب یہ معلوم ہو گیا کہ نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے اور نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے تو اب اس حدیث پر یہ سوال وارد ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِیَّاکُمْ وَفَسَادَ ذَاتَ الْبَیْنِ ہی کیوں فرمایا کسی جگہ اِیَّاکُمْ وَصَلَاحَ ذَاتَ الْبَیْنِ بھی فرمانا چاہیئے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ تر فساد نا اتفاقی سے ہوتا ہے اتفاق فساد کم ہوتا ہے کیونکہ اتفاق کی حالت میں قوائے سبعیہ بہیمیہ کو سکون ہوتا ہے ہیجان نہیں ہوتا اور معاصی زیادہ تر قوی بہیمیہ کے ہیجان ہی سے ہوتے ہیں تو جب ان کو سکون ہو گا اس وقت معاصی کا صدور کم ہو گا اور نا اتفاقی میں ان قوی کے اندر استعمال و ہیجان ہوتا ہے اس وقت زیادہ گڑبڑ ہوتی ہے اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اَکْثَرُهُمْ فَاَکْثَرُهُمْ کے لحاظ سے فساد ذات البین کے ضرر پر خصوصیت کے کیساتھ متنبہ فرمایا کیونکہ اس سے واقعی دین کا صفایا ہو جاتا ہے اور اتفاق اگر معصیت میں بھی ہو تو خاص اس کام میں وہ اہل اتفاق کو ضرر پہونچا دے گا مگر اس کا ضرر دوسروں تک متعدی نہ ہو گا اور پھر وہ ضرر مقصود بھی ایک دوسرے سے ارادۃً وقصداً نہ پہونچیگا بلکہ اس دوستی کی وہ مثال ہو گی جیسے ایک شخص نے ریچھ سے دوستی کی تھی کہ تعلیم سے اس کو مہذب بنایا تھا یہاں تک کہ آقا صاحب سو جاتے تو ریچھ کھڑا ہو کر پنکھا جھلتا لوگوں نے منع کیا کہ میاں جانور جانور ہی ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں سونے کی حالت میں اس سے خدمت لینا مناسب نہیں اس نے کہا واہ میرا ریچھ تعلیم یافتہ ہے اس سے کچھ اندیشہ نہیں ریچھ

عہ اس جواب کا حاصل منشاء اشکال کو تسلیم کر کے جواب دینا ہے منشاء اشکال یہ تھا کہ سائل نے لفظ فساد کو اختلاف اور افتراق کا ہم معنی سمجھا ہے اسلئے شبہ کرتا ہے کہ حدیث صرف افتراق ہی سے بچنے کی تاکید کیوں ہے حضرت حکیم الامت نے ایک دوسرے وعظ میں اس شبہ کا جواب منشاء اشکال کو منع کر کے بھی دیا ہے کہ سائل کا فساد کو افتراق و اختلاف کا مرادف سمجھنا غلط ہے بلکہ فساد کے معنے ہیں حالت کا اعتدال شرعی سے نکل جانا اور یہ افتراق ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کبھی اتفاق سے بھی فساد ہوتا ہے اس وعظ میں خلاف ذات البین کے بجائے حدیث میں فساد ذات البین وارد ہونے سے بھی یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ اختلاف فی نفسہ مذموم نہیں بلکہ فساد مذموم ہے پس اگر کسی وقت اتفاق سے فساد ہونے لگے اسوقت وہ اتفاق بھی مذموم ہو جائے گا فلیتنبہ ۱۲ ظ۔

کے تعلیم یافتہ ہونے پر ایک اور لطیفہ یاد آیا رڑکی میں ہمارے ماموں صاحب نے بارش اور کیچڑ کے دن ایک صاحب کو دیکھا کہ پھرک پھرک تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں ماموں صاحب نے کہا صاحب ذرا سنبھل کر چلئے کیچڑ زیادہ ہے کہا میں اقلیدس کے قاعدہ سے چل رہا ہوں میں گر ہی نہیں سکتا یہ کہہ کر تھوڑی دور چلے تھے کہ دھڑام سے گرے ماموں صاحب نے فرمایا کہئے صاحب اب اقلیدس کی کونسی شکل بنی بیچارے کھسیانے ہو گئے تو جیسے ریچھ تعلیم یافتہ تھا ایسے ہی ان حضرت کے پیر تعلیم یافتہ تھے پھر جس طرح ان کے پیروں نے دہوکہ دیا ایسے ہی ریچھ نے دہوکہ دیا کہ ایک دن آقا صاحب سو رہے تھے اور ریچھ پنکھا جھل رہا تھا کہ ایک مکھی ناک پر آکر بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑا دیا وہ پھر آبیٹھی ریچھ نے اڑا دیا بعض مکھی بڑی لیچڑ ہوتی ہے کتنا ہی اڑاؤ پھر آبیٹھتی ہے یہاں تک ریچھ اڑاتا اڑاتا عاجز آگیا اور غصہ میں ایک پتھر اٹھا کر رکھا پھر جو مکھی آکر بیٹھی تو آپ نے تاک کر ناک پر پتھر مارا مکھی تو نہ معلوم مری یا اڑ گئی مگر آقا کے بھیجے کا بھرتا ہو گیا تو جو لوگ کسی گناہ کے کام میں اتفاق کرتے ہیں ان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے کہ وہ ضرر پہونچانے کا قصد تو نہیں کرتے جیسا ریچھ نے آقا کے مارنے کا قصد نہ کیا تھا بلکہ اس نے تو آقا کے دشمن کو مارنا چاہا تھا مگر بدون ارادہ کے ان کے ہاتھ سے ضرر پہونچ جاتا ہے اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم سے کیا ضرر پہونچا خصوصاً یہ علماء و مشائخ کے دوست تو ان کا سنیاناس کر دیتے ہیں خادم منہ پر تعریف کرتے ہیں اور بزرگ صاحب پھنگرتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست ازان شد خار جان	از فریب داخلان و خارجان
اینت گوید نے منم انبار تو	آنت گوید نے منم ہمراز تو
او چو بیند خلق را سرمست خویش	از تکبر می رود از دست خویش

یہ تو شہرت سے دینی ضرر ہوتا ہے آگے فرماتے ہیں کہ اس سے دنیوی ضرر بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ مشہور آدمی پر مخلوق کا طعن و حسد اور رشک اور غصہ اس طرح برستا ہے جیسے مشک کے دہانہ سے پانی گرتا ہے ؎

چشمہا و خشمہا و رشکہا	بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

آگے گمنامی کی ترغیب دیتے ہیں کہ جہاں تک ہو شہرت سے بچو اور اس طرح رہو کہ کوئی تم کو

۳۷۵

جانے بھی نہیں ؎

اشتہار خلق بند محکم است — بند او از بند آہن کے کم ست
خویش را رنجور ساز و زار زار — تا ترا بیرون کنند از اشتہار

مگر یہ وہ شہرت ہے جو اختیار اور طلب سے حاصل ہو اور جو شہرت غیر اختیاری ہو وہ نعمت ہے بعضے اللہ کے بندے گم نام ہونا چاہتے ہیں اور اپنے کو مٹاتے رہتے ہیں مگر جتنا وہ اپنے کو مٹاتے ہیں اور زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں ان کو شہرت سے ضرر نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں حق تعالیٰ کی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے بہرحال مذموم اتفاق کے یہ دوست بہت مضر ہوتے ہیں مگر با ایں ہمہ دوستی کے مفاسد بہ نسبت اس دشمنی کے جو نا اتفاقی میں ہوتی ہے بہت کم ہیں مثلاً دوستی میں ایک دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی اور دشمنی میں غیبت کا بازار گرم ہوتا ہے یہ تو دینی ضرر ہوا پھر بیچ کے نمام اس آتشیں حمام کو دوسرے کے پاس لے جاتے ہیں اور ان باتوں کو مع حاشیہ کے جو بالکل غیر واقعی ہوتا ہے اس کے سامنے نقل کرتے ہیں اب تو متن کیلئے حاشیہ ضروری ہی ہو گیا ہے اور ان حواشی کے غیر واقعی ہونے کا مجکو تو اسقدر تجربہ ہو گیا ہے کہ میں نے جب کسی واقعہ کی تحقیق کی ہے تو بات اتنی نہیں نکلی جتنی کہی گئی تھی پھر باوجودیکہ ہر تجربہ کار کا اس پر اتفاق ہے کہ نقل کرنیوالے حاشیہ چڑھا کر بات کو نقل کرتے ہیں مگر پھر بھی سنی سنائی بات پر اعتماد کر لیا جاتا ہے اور اس کی تحقیق کوئی نہیں کرتا بلکہ بعض تو تحقیق سے رکتے ہیں تا کہ یہ بات کہیں جھوٹی ثابت نہ ہو جائے پھر سارا مزہ ہی جاتا رہے گا۔ اب غیبت سے دوسرے تک بات پہونچی اور اس کے دل میں اول کبیدگی پیدا ہوئی پھر وہ بھی اس کی غیبت کرتا ہے اور وہ بھی بیچ والوں کی بدولت پہلے شخص تک پہونچ جاتی ہے اس سے عداوت میں اور ترقی ہو جاتی ہے تو غیبت عداوت کا باپ بھی ہے اور بیٹا بھی یعنی کبھی عداوت سے غیبت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی غیبت سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نسب ایسا بیہودہ ہو اسکی بیہودگی کیلئے یہی بات کافی ہے پھر جب کوئی کسی کے درپے ہو جاتا ہے تو مشاہدہ ہے کہ دین کا خیال بالکل نہیں رہتا اب نہ ایذا سے دریغ ہے نہ جھوٹ اور فریب سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دشمن کو ضرر پہونچ جائے چاہے اسکی ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کیوں نہ ہو جائے

پھر اس کے لیے ہر ممکن تدبیر سوچی جاتی ہے خواہ دین اور حیا اس کی اجازت یا نہ دے کیونکہ آجکل شرافت تو رہی نہیں ہمارے ماموں صاحب کا اس کے متعلق خوب شعر ہے ؎

ہے شرافت تو کہاں بس شرو آفت ہے ؛ ست ریاست سے گیا صرف ریا باقی ہے

اگر انسان میں دین بھی نہو مگر شرافت ہو تو جب بھی بہت سے بیہودہ کاموں سے بچا رہتا ہے اور جب نہ دین ہو نہ شرافت تو اب اس سے کسی کام سے رکنے کی امید نہیں آجکل شرافت نسب گو باقی ہے مگر شرافت اخلاق نہیں رہی اسی لئے دشمن میں انسان کسی قسم کی حرکتوں سے باز نہیں آتا خصوصاً عورتوں میں تو یہ مرض بہت زیادہ ہے گو ان کی دشمنی شدید تو نہیں ہوتی کیونکہ یہ دشمنی میں کسی کا خون نہیں کرتیں عدالت نہیں کرتیں مگر یہ ان کا کمال نہیں بلکہ پردہ کا کمال ہے جس کی وجہ سے ان کی چادر سے باہر نکالنے کی قوت نہیں اور اسی میں خیر ہے اگر پردہ نہو تو پھر آپ دیکھیں یہ کیا ستم ڈھاتی ہیں آجکل لوگ اس پردہ کے بہت پیچھے پڑے ہوے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کا ثبوت کہاں ہے میں اس وقت تنگی وقت کے سبب آپ کے سامنے حدیث و قرآن تو پیش نہیں کرتا مگر ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ خدا کیلئے اس پردہ کو نہ اٹھائیے ورنہ وہ مفاسد پیدا ہوں گے جن کا انسداد قبضہ سے باہر ہو جائیگا پھر آپ بگڑ کے بعد خود پردہ کرنا چاہیں گے مگر اس وقت ناکامی ہوگی میں آپ سے ایک موٹی بات کہتا ہوں وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے جنکو مجنون بنایا ہے ان کو آپ خود قید کر دیتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ نقص عقل موجب قید ہے جب یہ بات مسلم ہو گئی تو عورتوں کے لئے بھی اسی وجہ سے قید پردہ کی ضرورت ہے کیونکہ ان کا بھی ناقص العقل ہونا مسلم ہے ہاں یہ فرق ضرور ہونا چاہیے کہ جیسا نقص ہو ویسی ہی قید ہو مجنون کامل کے لئے قید بھی کامل ہوتی ہے کہ ایک کوٹھری میں بند کر دیتے ہیں ہاتھ پیر باندھ دیتے ہیں اور مجنون ناقص کے لئے قید ناقص ہونا چاہیئے کہ اسکو بلا اجازت گھر سے نکلنے کا اختیار نہ دیا جائے اور جب جائے ڈولی یا گاڑی میں جائے۔ باقی تعلیم کے لئے پردہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے تعلیم پردہ میں بھی ہو سکتی ہے اگر بے پردہ ہونیکو تعلیم میں دخل ہوتا تو ساری باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوتیں مگر تجربہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں کسی پردہ والی کی برابر بھی نہیں اور اگر کسی

خاص قوم میں باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوں تو اول تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا ان کی عورتوں پر بے پردگی کی وجہ سے کوئی برا اثر نہیں ہوا تحقیق کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس آزادی نے ان کے اخلاق و عفت پر کتنا برا اثر ڈالا ہے پھر ایسی تعلیم کو لیکر کیا چولہے میں ڈالے دوسرے وہاں باہر پھرنے کو تعلیم میں دخل نہیں ہوا بلکہ تعلیم میں دخل اس بات کو ہے کہ اس قوم کو تعلیم نسواں کا اہتمام ہے انہوں نے اپنی عورتوں کو تعلیم کی غرض سے بے پردہ نہیں کیا بلکہ وہ تو بے پردہ پہلے ہی سے تھیں کیونکہ اس قوم میں ہمیشہ ہی سے بے پردگی کا رواج ہے اگر بے پردگی کو تعلیم میں دخل ہوتا تو چاہیے تھا کہ ان کی عورتیں ہمیشہ ہی سے تعلیم یافتہ ہوتیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اب ہی کچھ زمانہ سے ان میں تعلیم پیدا ہوئی ہے جب سے ان کو تعلیم کا اہتمام ہوا ہے اور اس سے پہلے عورتیں تو کیا ان کے مرد بھی جاہل وحشی تھے جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے پس معلوم ہوا کہ تعلیم کا اصل مدار اہتمام پر ہے تو آپ بھی اہتمام کیجئے اور پردہ میں رکھکر ہی اپنی عورتوں کو پڑھائیے یقیناً تعلیم یافتہ ہوجائیں گی۔ آخر ایک زمانہ میں مسلمانوں کی عورتیں بھی تو بہت تعلیم یافتہ ہوچکی ہیں حالانکہ اسوقت بھی پردہ موجود تھا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عروج کے زمانہ میں کتنی عورتیں محدث اور مفسر اور ادیب عالم ہوئی ہیں ۱۲ جامع؛ مگر عورتوں کو پردہ میں رکھکر بھی صرف دینیات کی تعلیم دینا چاہیے جغرافیہ اور تاریخ نہ پڑھانا چاہیے ورنہ ان کو بھاگنے کے راستے معلوم ہوجائیں گے پھر وہ گھر سے ایسی جائیں گی کہ پتہ بھی نہ دینگی بعوض پردہ کی وجہ سے عورتوں کی نااتفاقی شدید تو نہیں ہوتی مگر مدید ہوتی ہے کہ ان میں باہم کشیدگی ہوتی ہے تو زمانہ دراز تک اس کا سلسلہ چلتا ہے نیز ان میں ایک ایسی بری عادت ہے کہ جب کسی بات پر لڑائی ہوگی تو پہلے مردے اکھیڑے جاتے ہیں مردوں میں یہ مرض کم ہے مگر عورتیں جن باتوں کی صفائی بھی کرچکتی ہیں دوبارہ لڑائی کے موقعہ پر پہلی باتوں کو پھر دہراتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسوقت کا معاملہ اگر فی نفسہ خفیف بھی ہو تو پہلی باتوں کی یاددہانی سے سنگین بنجاتا ہے خصوصاً جبکہ یاددہانی بھی دلخراش الفاظ سے جس میں عورتوں کو خاص ملکہ ہے یہ طعن کے موقعہ پر اپنے احسان کو بھی ایسے عنوان سے

جتلاتی ہیں جس سے دوسرے کا کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک خاندان
میں نکاح کی تقریب تھی اور صاحب تقریب کی بھاوج بہت مفلس تھی مگر اس نے قرض اور
ادھار کر کے اس موقعہ کے لئے جوڑے تیار کئے اور صرف دلہن ہی کا جوڑا نہیں بلکہ سب
گھروالوں کے لئے جوڑے تیار کئے گو وہ بڑھیا تو نہ تھے مگر نام کرنے کو کافی تھے چنانچہ
اس نے امید سے زیادہ کام کر کے دکھلا دیا پھر کسی موقعہ پر بھاوج اور نند میں تکرار ہوا
تو بھاوج کیا کہتی ہے کہ ارے میں تو وہ ہوں کہ میں نے نہ ہوت میں بھی تمہارے وقت
میں سارے خاندان پر کفن ڈالا تھا دیکھئے اس نے جوڑے دینے کو کس لفظ سے ادا کیا
کہ ساری لکشنری بھی ایسا لفظ نہ نکال سکتی مگر ان کی لڑائی باتوں ہی باتوں میں ہوتی ہے
اس سے آگے یہ کچھ نہیں کر سکتیں البتہ ایک طرح ان کا فساد شدید بھی ہو جاتا ہے کہ بعض دفعہ
یہ اپنے آپس کے تکرار کو مردوں سے بیان کر دیتی ہیں کہ فلانی نے مجھے یوں کہا اور تمہیں
یہ کہا مردوں میں حرارت ہوتی ہے ان پر زیادہ اثر ہوتا ہے پھر یہ بات ہی تک نہیں رہتے
بلکہ ہاتھ سے بھی بدلہ لیتے ہیں جس سے خون تک ہو جاتے ہیں اسی لئے مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں
کی باتوں پر اعتماد نہ کیا کریں اور عورتوں کو بھی لازم ہے کہ ایسی باتیں مردوں سے نہ کیا کریں
اس کی ایک تدبیر عمدہ یہ ہے کہ چند خاندان ایک گھر میں اکٹھے نہ رہا کریں کیونکہ چند عورتوں
کا ایک مکان میں رہنا ہی زیادہ فساد کا سبب ہے میرٹھ میں ایک باپ بیٹے ایک ہی گھر میں
رہتے تھے بیٹے کو مجھ سے تعلق تھا ان کا ایک خط میرے پاس آیا جس کا خلاصہ دو مضمون تھے
ایک یہ کہ میں بعضی خلاف شرع باتوں پر والد صاحب وغیرہ کو نصیحت کرتا ہوں وہ نہیں مانتے
اور خلاف شرع کام کرتے ہیں دوسرا مضمون یہ تھا کہ والد صاحب اور میں دونوں ایک ہی
گھر میں رہتے ہیں اس لئے بعض شکایات پیدا ہو جاتی ہیں میں نے سارے خط کے
جواب میں ایک شعر لکھدیا سہ کار خود کن کار بیگانہ مکن ۔ یہ تو پہلی بات کا جواب تھا کہ
جب وہ نہیں مانتے تو تم اپنے کام میں لگو آئندہ ان سے تعرض نہ کرو اور سہ
در زمین دیگراں خانہ مکن ۔ یہ دوسری بات کا جواب تھا کہ مکان بدل دو اور
الگ مکان لیکر رہو ۔ چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا پھر جو خط آیا تو اس میں

۷۹ م

لکھا تھا کہ مکان بدلنے کے بعد ہی سے تمام پریشانیاں رفع ہو گئیں اور اب ہمارے تعلقات شگفتہ ہو گئے صاحبو! میرا تجربہ ہے کہ آجکل الگ الگ رہنا زیادہ موجب امن ہے۔ نیز آجکل امر بالمعروف اس طرح کرنا کہ کسی کے پیچھے ہی پڑ جائے مفید نہیں اسلئے میں نے ان کو لکھا کہ جب امر بالمعروف کا اثر نہیں ہوتا تو تم اپنے والد صاحب سے کچھ تعرض نہ کرو اب تم پر امر بالمعروف واجب نہیں یہ تو فتوی کا اور دوسرا جملہ مشورہ کے طور پر تھا کہ تم الگ مکان لیکر رہو کیونکہ آجکل ساتھ مل کر رہنے کا زمانہ نہیں بس اب تو زیادہ وقت تنہائی میں گذارنا چاہیئے اسی میں راحت ہے جیسا کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎ جہد کن در بامردم وفا نا بنشیں ÷ با صدق و صفا ÷ (مراد شیخ عارف) ؎ یا با صنم لطیف و رعنا بنشیں ÷ با شرم حیا (مراد زوجہ عفیفہ) ؎ زیں ہر دو اگر یکے میسر نشود ÷ از طالع خویش ÷ او قات مکن ضائع و تنہا بنشیں ÷ در یاد خدا اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی وحشی بنجاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت نہ ملو کہ اسوقت زیادہ ملنا تمام مفاسد کی جڑ ہے حتیٰ کہ آجکل جو انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ناکام رہتی ہیں ان کا زیادہ تر سبب یہی ہے کہ یہ زمانہ مل کر کام کرنے کا نہیں ہے کیونکہ آجکل ہر کسی دوسروں سے اپنی رائے کا اتباع چاہتا ہے اور جہاں بظاہر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار ہے جس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ نفع اختلاط کا ایسا ہے جو خلوت و وحدت میں نہیں وہ کثرت بھی حقیقت میں وحدت ہی ہوتی ہے کیونکہ وہاں ایک ہی شخص اپنے اثر سے اپنی تائید کے لئے پہلے سے ایسے لوگوں کو سبق پڑھا پڑھا کر لاتا ہے جنکو اس معاملہ کی سمجھ تو کیا ہوتی ہے لفظ بولنا بھی نہیں آتا پس کثرت برائے نام ہی ہوتی ہے پھر اس کثرت کا مدار بھی کسی لیاقت پر نہیں ہوتا محض تمول پر ہوتا ہے یعنی اپنے مقاصد و آراء کی تائید بھی ایسے لوگوں سے کرائی جاتی ہے جو زیادہ مالدار ہوں حالانکہ اس کے لئے اصل ضرورت فہم کی ہے اسی طرح آجکل صدارت بھی مالداروں کو دیجاتی ہے چاہے وہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ صدر کہتے کس کو ہیں کانپور میں ایک جلسہ تھا ایک صاحب کو اس میں اپنی رائے کو قوت دینا تھا تو وہ اپنی تائید کے لئے ایک شخص کو ساتھ لائے اور ان کو راستہ میں خوب پڑھا دیا کہ جب میں تقریر کر چکوں تو تم کھڑے ہو کر اتنا کہدینا کہ میں اس کی تائید کرتا ہوں

۳۸۰

وہ بیچارہ بالکل جاہل تھا اتنا لفظ بھی لے نہ آتا تھا اسکو رٹتا اور یاد کرتا رہا تاکہ ذہن سے نہ نکل جائے اور دلمیں دعا کرتا ہوگا کہ تقریر جلدی ختم ہو تو میں اسکو لفظ کو ادا کرکے چین سے بیٹھوں چنانچہ خدا خدا کرکے تقریر ختم ہوئی تو بیچارے صاحب کھڑے ہوکر فرماتے ہیں کہ میں بھی اسکی تردید کرتا ہوں۔ غریب کو بجائے تائید کے تردید یاد رہ گیا اس پر مقرر نے چپکے سے کہا کہ نہیں تائید۔ تو آپنے کہا میں اسکی تاردید کرتا ہوں یہ بالکل ہی مہمل لفظ تھا مقرر نے پھر لقمہ دیا کہ تائید کہو تائید تو آپ نے تیسری دفعہ تاکید کہا خیر اس کو لوگوں نے غنیمت سمجھا کیونکہ یہ تائید کے قریب ہی تھا تو صاحبو اول تو کثرت رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہوگی پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے تم یوں کہدینا جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی وہ تو ایک ہی شخص کی رائے ہوئی جس کے اب لوگ مقلد ہوتے ہیں باقی شریعت میں تو کثرت رائے کوئی چیز نہیں۔ وقت میں گنجائش نہیں ورنہ اسکو بھی بیان کردیتا۔ تو آجکل ہر شخص اپنی رائے کا اتباع دوسروں سے کرانا چاہتا ہے اسی لئے انجمنوں کا کام نہیں چلتا کیونکہ ارکین انجمن جاو دوسروں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اخلاق کی اصلاح تک نہیں ہوئی ان میں کوئی کسی سے چھوٹا بنکر رہنا گوارا نہیں کرتا اسلئے بہت جلد ان میں اختلاف ہوجاتا ہے پھر ہر ایک اپنی رائے پر ضد کرتا ہے تو چار دن ہی میں انجمن کا خاتمہ ہوجاتا ہے اسلئے میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو کام تنہا ہوسکے وہ مجمع کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرو اکثر دیکھا ہے کہ مجمع میں کام بگڑ جاتا ہے۔ دنیوی کامیابی بھی اکثر نہیں ہوتی اور اگر کبھی کچھ دنیا مل بھی گئی تو دین کا تو ستیاناس ہی ہوجاتا ہے اور جو کام تنہا نہ ہوسکے مجمع ہی کے ساتھ ہوسکے اس کے لئے اگر دینداروں کا مجمع میسر ہوجائے تو کرو بشرطیکہ سب دیندار ہوں یا دینداروں کا غلبہ ہو اور اگر غلبہ دنیا داروں کا ہو اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں تو ایسے مجمع کے ساتھ مل کر کام کرنا واجب نہیں اسوقت آپ اس کام کے مکلف ہی نہ رہیں گے کیونکہ یہ مجمع بظاہر مجمع ہے۔ حقیقت میں یہاں تشتت ہے وہی حال ہوگا تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ تو یوں کہنا چاہیئے کہ مجمع میسر ہی نہیں پھر جو کام اس پر موقوف تھا وہ واجب یا فرض کیونکر ہوگا میں سچ کہتا ہوں کہ آجکل جو تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو اتفاق کرو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ

اتفاق کریں ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے اور اس صورت میں قیامت تک اتفاق قائم نہیں ہو سکتا بلکہ قیام اتفاق کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس کے لئے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میرا اتباع نہ کرے گا تو میں اس کا اتباع کر لوں گا بشرطیکہ خلاف شرع کام نہ کرے۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ آجکل لوگ اتفاق پر تو بہت زور دیتے ہیں مگر اس کی جڑ کو نہیں دیکھتے اتفاق کی جڑ تواضع ہے یہ ایک حجرہ نشین صوفی کی تحقیق ہے جسکے سامنے تمام تحقیقات فلسفیہ گرد ہیں آپ نے ایک صوفی کی تحقیق تو سنلی ذرا اس پر عمل کرکے اتفاق کیجئے دیکھئے کامیابی ہوتی ہے یا نہیں عمل کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقی فلسفی یہی لوگ ہیں یہ حضرات صوفیہ کے ان خواص کو سمجھتے ہیں جنکی حکماء کو ہوا بھی نہیں لگی اس کا تجربہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کسی فلسفی کو کسی محقق صوفی کے پاس چھ مہینے کیلئے چھوڑ دیجئے انشاء اللہ وہ خود اپنے کو احمق کہکر اٹھیگا افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا تھا اس سے دل مشاہیر حکماء کے متعلق پوچھا سب کو لاشے بتلایا پھر صوفیہ اسلام جنید اور شبلی وغیرہم کے متعلق پوچھا اس نے کہا اُولٰئِکَ ھُمُ الفَلَاسِفَۃ حَقًّا۔ کہ سچے فلسفی یہی لوگ ہیں۔ بس جو لوگ اتفاق کے طالب ہیں اور عمل کرنا چاہتے ہیں ان کو پہلے اپنے اندر تواضع پیدا کرنا چاہئیے اور تواضع کیسے پیدا ہوگی؟ اس کے جواب میں تحقیق و دلائل کا تو وقت نہیں مگر مختصراً مان لیجئے کہ اس کا طریقہ یہ ہے ؎

قال را بگذار مرد حال شو	پیش مرد کاملے پامال شو

تواضع حاصل کرنے کے لئے کسی کامل کے قدموں میں پامال ہونے کی ضرورت ہے ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر	دامن آں نفس کش را سخت گیر

سخت گیر کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام کا اتباع کرو اور اس کی بات بات پر ناک نہ چڑھاؤ ورنہ وہی حال ہوگا جو اس شخص کا ہوا تھا جس نے ایک گودنے والے سے کہا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنا دے اس نے ایک جگہ سوئی چبھوئی تو اس نے آہ کی اور پوچھا کیا بناتے ہو کہا پیٹ بنا رہا ہوں کہنے لگا اس کو کہانا تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔ پیٹ کو رہنے دو اس نے دوسری جگہ سوئی چبھوئی اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو کہا دم کہنے لگا کہ شیر دم کٹا بھی تو ہوتا ہے اسکو دم کٹا ہی رہنے دو اس نے تیسری جگہ سوئی چبھوئی اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو کہا کان کہنے لگا شیر بوچا بھی تو ہوتا ہے

۳۸۴

اسکو تو جانے رہنے دو۔ اس نے چوتھی جگہ سوئی لگائی آپ نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بنا رہے ہو کہا
سر کہنے لگا اسکو بھی رہنے دو یہ شیر بے سر ہی سہی گودنے والے نے جھلا کر سوئی پھینکدی۔ اور کہا سہ
شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید ؛ ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید ؛ آگے مولانا فرماتے ہیں سہ چوں نداری
طاقت سوزن زدن ؛ از چنیں شیر ژیاں پس دم مزن ۔ تو اسی طرح جسکو شیخ کی سختی کا تحمل نہو اور
بات بات پر ناک چڑھائے اسکو اصلاح نفس کا نام ہی نہ لینا چاہیئے وہاں تو اس کی ضرورت ہے سہ
گرم گوید سخت گوید خوش بگیر ؛ تجربہ یہ ہے جس طرح اولاد بدون نکاح کے نہیں ہوتی اسیطرح اصلاح
اخلاق بدون کسی شیخ کے پاس پامال ہونے کے نہیں ہوتی اسی کو فرماتے ہیں سہ گر ہوائے ایں سفر داری
دلا ؛ دامن رہبر بگیر و پس برآ ؛ یار باید راہ را تنہا مرو ؛ بے قلاوز اندریں صحرا مرو ؛ اور بعض بزرگوں کی
بابت جو سنا جاتا ہے کہ وہ بدون کسی شیخ کے کامل ہو گئے مولانا نے اسکی بھی حقیقت بتلائی ہے فرماتے ہیں سہ
ہر کہ تنہا نادر ایں راہ برید ؛ ہم بعون ہمت مرداں رسید ؛ یعنی وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور دعا ہی سے
واصل ہوئے ہیں گو ظاہر میں کسی سے بیعت نہ ہوئے ہوں نہ کسی کی صحبت میں رہے ہوں اسکی صورت یہ
ہوتی ہے کہ کسی اہل اللہ نے ایک شخص کو دین کے کام میں لگا ہوا دیکھا اس سے جی خوش ہوا انہوں نے
دعا اور توجہ کر دی جسکی برکت سے وہ واصل ہو گیا مگر اسکے لئے اسکی ضرورت ہے کہ اگر محبت اولیاء اللہ
نہو تو کم از کم ان پر انکار بھی نہو ورنہ توجہ کیسے ہو گی پس یہ ہے تاریخ اتفاق کے حدوث و بقاء کی کہ
اتفاق کا مدار تواضع پر ہے اور تواضع موقوف ہے اصلاح نفس پر اور اصلاح نفس موقوف ہے
شیخ کامل کی صحبت پر یا کم از کم عدم انکار ہی ہو کہ ان کی غیبت و شکایت تو نہ کیا کریں نیز اتفاق میں
علاوہ ان شرائط کے اسکی بھی ضرورت ہے کہ اتنا اختلاط بھی نہ ہو کہ اپنے خاص اسرار دوسروں سے ظاہر
کر دے کیونکہ ممکن ہے کسی وقت یہ تعلق نہ رہے تو پھر ان اسرار کے اظہار پر پچھتانا پڑے گا حدیث میں آتا ہے
أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَا عَسَى أَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْمًا مَا وَأَبْغِضْ بَغِيضَكَ هَوْنًا
مَا عَسَى أَنْ يَكُونَ حَبِيبَكَ يَوْمًا مَا. یعنی دوست سے سنبھل کر دوستی کرو زیادہ کھل کھیل نہ کرو شاید کسی دن
دشمنی ہو جائے تو گھر کے بھید کی دشمنی بہت ضرر دیتی ہے اور اگر کسی کو اپنے دوست کی نسبت عداوت
کا احتمال ہو تو وہ اپنی ہی نسبت یہ احتمال رکھے کہ شاید کسی دن میں ہی بدل جاؤں اسلئے اتفاق میں
بھی احتیاط کی ضرورت ہے اسیطرح اگر کسی سے عداوت کرو تو وہاں بھی حد کے اندر عداوت

کرنا چاہیئے حد سے نہ بڑھے کیونکہ کیا خبر ہے کسی وقت پھر دوستی کرنی کی ضرورت ہو تو اس وقت آنکھیں
سامنے کرنے سے حیا دامن گیر ہوگی اور جس کی دوستی اور دشمنی اعتدال سے ہوگی اسکو کسی وقت بھی پریشانی
نہ ہوگی۔ یہ تو اتفاق کے حدود و اسباب تھے اور میں بتلا چکا ہوں کہ ایک درجہ نااتفاقی کا بھی مطلوب
ہے وہ یہ کہ کسی جماعت نے معصیت پر اتفاق کیا ہو تو ان کی مخالفت اور ان سے علیحدگی شرعاً مطلوب
ہے یا اتفاق تو معصیت پر نہ ہوا تھا لیکن اتفاق کے بعد وہ لوگ معاصی اختیار کرنے لگے تو اسوقت
دینداروں کو ان سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل جہاں دیندار اور بے دین لوگ
کسی کام میں اتفاق کرتے ہیں وہاں بے دین تو اپنے طریقہ پر پختہ ہوتے ہیں اور نہ معلوم دیندار
کیوں ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ بے دین تو وہی کرتے ہیں جو ان کے مذاق کے موافق ہو اور ان کے مذہب
کے موافق ہو اور ان کی رائے میں مفید ہو اور دیندار باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ کام ہمارے
مذہب میں ناجائز یا حرام ہے یا یہ طریقہ ہمارے نزدیک مضر ہے مفید نہیں یا یہ کام ہماری جماعت
کے مذاق کے خلاف ہے پھر بھی بیدینوں کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں تاکہ اتفاق میں فتور نہ آئے
سبحان اللہ صاحبو! اتفاق تو طرفین سے ہوا کرتا ہے جب دوسری جماعت آپ کے جذبات کی رعایت
نہیں کرتی تو اب وہ اتفاق ہی کہاں رہا بس یوں کہو کہ تم ان کی محض خوشامد کر رہے ہو اگر
اتفاق ہوتا تو دوسرے بھی تو تمہاری کچھ رعایت کرتے مگر لوگوں نے آجکل خوشامد کا نام
اتفاق رکھ لیا ہے اسلئے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مخلوق طعن کریگی کہ انہوں نے
اتفاق میں کھنڈت ڈالدی میں کہتا ہوں کہ تم اس طعن سے کیوں ڈرتے ہو صاف کہدو کہ ہاں ہم نے
اتفاق کو توڑ دیا اسلئے کہ اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب نہیں بلکہ بعض دفعہ نااتفاقی بھی مطلوب
ہے جبکہ اتفاق سے دین کو ضرر پہونچ رہا ہو بس اب میں ختم کرتا ہوں کیونکہ بقدر ضرورت میں نے
اختلاف کے مفاسد اور اتفاق و نااتفاقی کے حدود بیان کردئے ہیں اب دعا کیجئے کہ حق
تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق دیں آمین۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس
وعظ کا نام الانسداد للفساد رکھدیا جائے۔ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ
وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اشرف علی

۴۸۸

(بر مکمل)